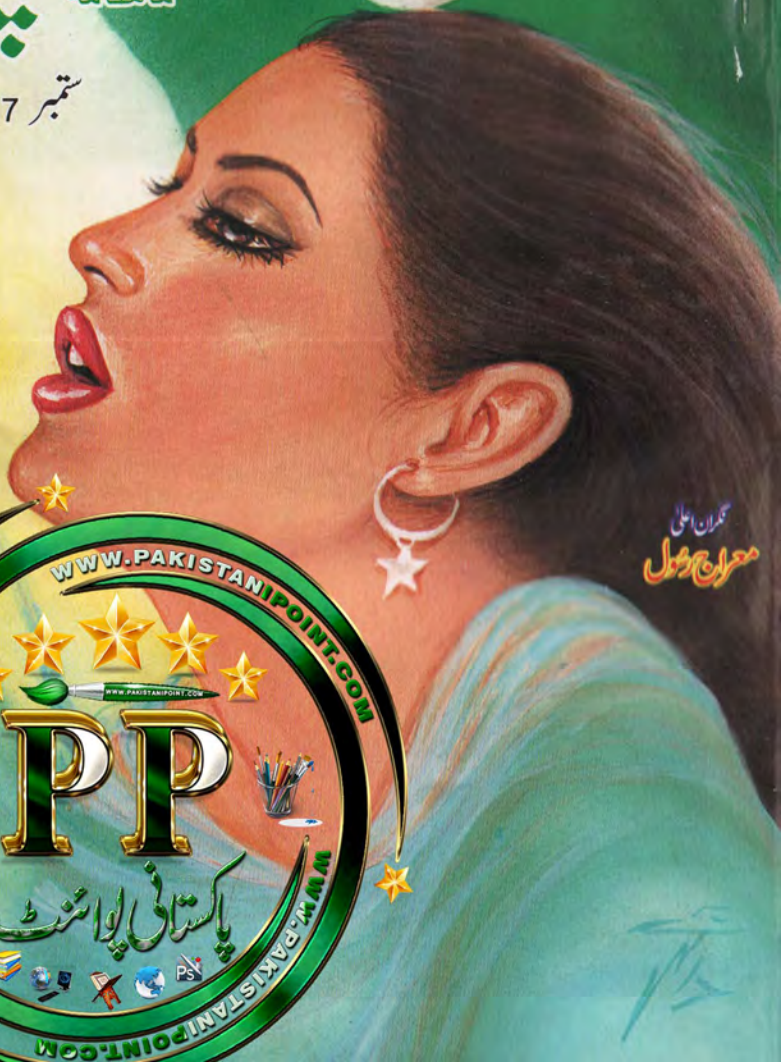


خوبصورت کسانوں کا مجموعہ

سنسنی ڈائجسٹ

ماہنامہ

ستمبر 2017



نگار خان علی
معاون وکیل



مدیر اعلیٰ: عذرار رسول
مدیرہ: یحییٰ احمد



سپنس کی مجلس مشاورت دستارین کی تلخ و شیریں باتیں گلے شکوے اور پر خلوص مشورے



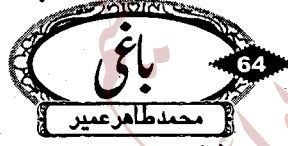
ہندو مندوں کی آزمائشوں پر ایک صاحب فکر کی نظر



نات بیل نقین صورت حال اور بے متی گمان کا دلچسپ احوال



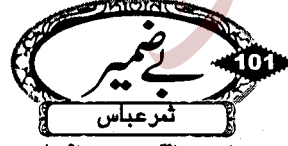
ماضی کا آئینہ۔ ہاقتیار اور بے اختیار انسانوں کے سبق آموز اور عبرت آمیز واقعات



عشق کی جتنوں خیز یوں میں پیار بھرے رشتوں کو روندنے والے ایک باغی کی کٹھا



دور ابتلا میں مبتلا حیار درویشوں کا عجیب قصہ



ایک تامل اور غافل انسان کی اپنے خاندان کی نگہبانی کا عجیب انداز



دوستوں کے روپ میں دشمنی نبھانے والوں کا ماحبرا



کم عمری کی سنسنی خیز محبتوں کے شکار دوستوں کا احوال



محبت کے ساحل پر بے آسرا اور بے بس حیدر کا عبرت ناک ماجرا

جلد 47 • شمارہ 09 ستمبر 2017ء • ذی سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

خط کتابت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس: 35802551 (021) E-mail: jdpgroup@hotmail.com

157 **دہشت زدہ**
شاہ زین رضوان

154 **مخفیانہ شعر و سخن**
قارئین

انتہائی حبالاکی وزیری کی سے کیس حل کرنے والے ایک سراغ رساں کی کاوش



آپ کے ہاتھوں سچی ایک انجمن رنگ رنگ آپ کی پسند، آپ کے ذوق سے ہم آہنگ

186 **وقت**
حسام بیٹ

167 **شہ مات**
زویا اعجاز

ایک عزم بازی کی بازی گری سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک طویل داستان



ایک ایسے بازی گر کا قصہ جس کی کتاب زیت میں شکست کہیں نہیں لکھا تھا

229 **غلطی**
اعتزاز سلیم

225 **آرٹسٹ**
سلیم انور

دولت کے لالچ لمبیں رشتوں کو منہ موٹ کر دے والوں کا خواب



مصیبت اور بے بسی کے عالم میں ایک دور اندیش آرٹسٹ کا کارنامہ

245 **حقدار**
اصف ضیا احمد

233 **حضرت یوسف علیہ السلام**
رضوانہ ساجد

رشتوں اور احساسات کے بیچار اور جذبات کے مابین مسرکہ آرائی



اللہ کے ایک جلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

262 **ذرا سی بتا**
ناہید سلطانہ اختر

259 **سوانگ**
جمال دستی

انتہائی معمولی بات اور زہرست کی کشن راہوں پر مشکل امتحانات سے گزرنے والی ایک عورت کے مہر کی داستان



روپ بدلنے لوگ اور حالات بدلنے فحاشات کا انوکھا انداز

”بھائی اور اپنی ذات اور اپنی مصلحت کے لئے“



عزیزانِ من!
السلام علیکم!

ستمبر 2017ء کا دلچسپ اور خوبصورت شمارہ آپ کے ذوق کی نذر ہے۔ گزشتہ دنوں یوم آزادی بڑے جوش و جذبے سے منایا گیا لیکن حکومتی باروں میں بڑے پیمانے پر تہہ تیہاں روٹنا ہو گیا مگر حکومتی خزانہ جسے ہر دور میں بے دردی سے لوٹا جاتا رہا ہے کیا عوام کی امانت سمجھ کر لوٹا یا بھیجے جانے کا اور تاریخ کو ستمبر سے حرفوں سے لکھنے کا موقع نہ ملتا کیا جانے گا۔ عوام کے نام پر، عوام کے لیے لڑی جانے والی جنگ کہیں انصاف کا پرچار کرنے والوں کی انا اور فتح و شکست کی سمجھت تو نہیں چڑھ جائے گی۔ اس سارے منظر نامے میں کیا کسی جگہ پاکستانی قوم کے لیے بھی تھوڑی سی امید اور ترقی کے آثار نظر آتے ہیں یا اس بار بھی جموںے دلا سے اور تیلیوں پر فرغانے کی رسم ادا کی جائے گی۔ شہر کی 6 تاریخ یوم دفاع اور 7 تاریخ یوم فضا سے حوالے سے ہمیشہ پاکستانی عوام کے دلوں میں پرجوش امگ پیدا کر دیتی ہے لیکن سیاسی بازی گر ان انگوٹوں کو بھی اپنے مفاد میں استعمال کرنے کے لیے چالیں چلتے رہتے ہیں اور بے چارے عوام..... آخر کون ہے جو دریا میں رہ کر مگر کچھ سے بھر کرے..... بہر حال اچھے کی امید تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہتی بھی چاہیے مگر اس درمیانی حرمے میں عوام کی بھلائی کے لیے بھی حقیقتاً کچھ اچھا واقع ہو جانا چاہیے۔ جنہوں نے چند دنوں بعد چلے جاتا تھا بھلا ان کے چند دن پہلے چلے جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ جنگ عوام اور عوامی مفاد میں ختم ہو کر ختم ہو گی۔ آپ کا کیا خیال ہے قارئین..... وقت پر لگا کر اڑتا جاتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے سال گزر جاتا ہے۔ لیجئے جناب بھرے جی کی ادائیگی اور عید الفصحی کی مبارک سائیتیں آگئی ہیں۔ عازمین حج مناسک حج ادا کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں اور عید الفصحی کی روٹیں بھی موٹی منڈیوں کے انعقاد سے عروج پر ہیں۔ نہ صرف روٹیں بلکہ موسیقیوں کی ٹیمیں بھی آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ ہر سال ان مسائل پر بحث ہوتی ہے مگر نتائج مطلقے ہیں بہر حال اقتدار اعلیٰ کچھ سوچے نہ سوچے ہمیں تو لازمی مستحقین کے بارے میں سوچنا ہوگا اور انہیں بھی اپنی خوشیوں میں شریک کرنا ہوگا کہ کبھی اس عید کا متقدّم بھی ہے۔ خیالات کی بلند پروازی اپنی جگہ اور ذہنی حقائق کی نقلی اپنی جگہ لہذا ہم بھی دلکش خیالات کے گھوڑے دوڑاتے ہوئے چلتے ہیں اپنی بزمِ دوستان کی طرف۔

ڈاکٹر نائلہ نصر، پشاور سے حاضر محفل ہیں۔ ”میں پچھلے تین سال سے سسٹمز ڈائجسٹ کو پڑھ رہی ہوں اور اس کی وجہ اس کا قاری کی بہت خوب صورت تحریر ہے۔ بہت حرمے سے خواہ مخواہ جی کش میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کروں لیکن فراموش نہ ہوتی تھی۔ آج کل کریسوں کی چٹیاں ہیں سو چاکر قلم اٹھاؤں (بہت شکر ہے)۔ سسٹمز ڈائجسٹ پچھرو لوگوں کا رسالہ ہے اور بہت خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ ہے جس میں اکثر کہانیاں حقیقت پر مبنی ہوتی ہیں۔ مجھے ناہید سلطان اختر، اساقادری، ڈاکٹر شیر شاہ، طاہر جاوید منٹل، الیاس بیٹا پوری، ڈاکٹر ساجد امجد اور منظر امام کی کہانیاں بہت پسند ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ کش کہانی لکھنے والے کا نام پہلے ضرور پڑتی ہوں۔ ایک کا نمبر انتہائی بہتر ہیں رہا۔ ناہید سلطان اختر کی کہانی میں ایک غیر متوقع موڑ آیا اور میں گنگ ہو گئی۔ بہت خوبصورت کہانی تھی۔ ڈاکٹر شیر شاہ ہمیشہ بہت مختصر اور بہت جامع لکھتے ہیں۔ ڈاکٹر شیر شاہ جیسے لوگ ہماری قوم کا وہ ۱۳۱۳ ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے مگر اللہ کے ہاں ان کے لیے بہت بڑا مقام ہے۔ طاہر، زعداں، محمد، مشرق وغیرہ بہت خوبصورت کہانیاں لکھیں۔ مگر اس عنوان اور ان کہانیوں کو کچھ اور زاویوں سے دیکھتی ہوں۔ ہماری کہانیوں میں صرف اولاد کی غلطیوں کو ہی کیوں موضوع بحث بنایا جاتا ہے۔ کیا ہمیں کسی لکھاری نے گھر سے بھاگنے والی بچیوں کے اور عوام کو بھی سوچا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ رومان انجیر کہانیاں، ڈرامے وغیرہ بھی عوامل ہیں اور ان پر لکھنا چاہیے لیکن کیا ہمیں صرف وہ وجوہات ہیں جن پر لکھنا چاہیے۔ میں نے بھی پڑھے لکھے خاندانوں کو جانتی ہوں جو صرف لڑکالائی کے سچ تعلیم کے انہیں میں سے فرق کی وجہ سے ضد اور انانیا کی اتنی اونچی دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں کہ ان کی زندگیاں تباہ ہو جاتی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بے راہ روی کی بڑی وجہ نکاح کے راستے کو دھوا دینا ہے۔ اسلام نے نکاح کے لیے بڑے آسان اصول بنائے ہیں جن میں دین داری کو سب سے اوپر رکھا گیا ہے۔ ہمارا الیہ یہ ہے کہ ہم صرف گناہ کا رادار مجرم کو مڑا دیتا ہے جسے جو اس کے ذمے داران ہیں ان کو بری الذمہ سمجھتے ہیں۔ والدین کا وہ لاد کو حلیم دینا، پرورش کرنا بے شک بہت بڑا احسان ہے مگر یہ ان پر فرض بھی ہے اور اس حق کو دینے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اولاد کو ساری زندگی اس کے جو بوجھ تلے دبا دیں۔ میری تمام لکھاریوں سے گزارش ہے کہ معاشرے کے ہر کردار کے حقائق ہر زاویے سے سوچا کریں اور ایسی کہانیاں لکھیں کہ پڑھنے والے چاہے والد ہوں یا بھائی یا بیوی، وہ یہ سوچیں کہ گھر سے بھاگنے والی صرف عورت تصور اور نہیں ہوتی بلکہ وہ باپ، بھائی اور خاندان بھی ہوتے ہیں جو صرف اور صرف اپنی سوچ اور خواہش کو غلبہ دیتے ہیں اور عورت کو صرف عورت سمجھتے ہیں، انسان صرف مرد کو سمجھتے ہیں۔ باقی بڑی دلچسپ کہانی ہے ہم چند جگہ چور اٹھ ستم کو نہ جانتے ہیں اور نہ کبھی دیکھا ہے اس لیے عجیب دشت ہوتی ہے ان کے حقائق پڑھ کر۔ وقت ایک بالکل مختلف موضوع پر ہے جس میں Zionism کو بھی موضوع بحث لایا گیا ہے۔ ابھی کاوش ہے لیکن کچھ باتیں بہت مشکل سے سمجھ رہی ہیں۔ تاریخی کہانیوں کا سلسلہ اور بزرگانِ دین کے قصے بہت پراثر ہوتے ہیں۔



میری رائے ہے کہ دو صفحات کا ایک سلسلہ شروع کر دیں جن میں دنیا کی بڑی شخصیات کے متعلق معلومات ہوں یا سسٹمز ڈائجسٹ کے لکھاریوں کے متعلق کوئی بائو گرافی ہو یا ہیرتھر، پاک وہند کے ادب کی قدرا و شخصیات کے متعلق کوئی سلسلہ ہو۔ اللہ تعالیٰ میں سب کو ذات بات، نسل، زبان کے بنیادوں سے آزاد کر کے حقیقت میں ایک پرچم تلے جمع کرے۔ (آمین)۔ (آپ کی رائے کی ہم قدر کرتے ہیں۔ بہت شکر یہ کہ آپ نے سسٹمز کے لیے وقت نکالا)۔“

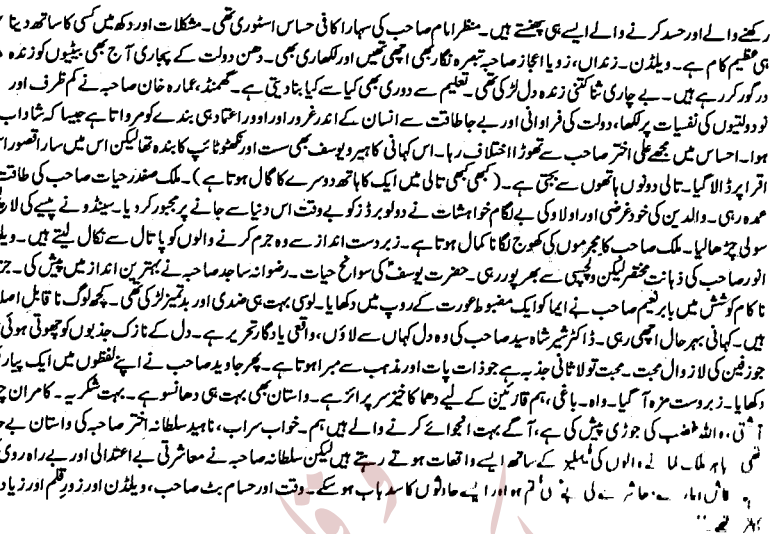
محمد زریں سلطان کی اردو بازار کراچی سے آہ۔ ”اگست کا دلچسپ کچھ رنگیں کچھ گلین شمارہ جب ہاتھوں میں آیا تو سرورق پر یوم آزادی کی مبارک باد دیکھ کر احساس ہوا کہ ہمارا ملک جن نظریات، خیالات اور مقاصد کے تحت حاصل کیا گیا اور قربانیاں..... جو صرف اس وقت کے لیے مخصوص نہیں رہیں بلکہ آج تک کی نہ کسی حوالے سے ان قربانیوں کا سلسلہ جاری ہے۔ کبھی ٹارگٹ کلنگ تو کبھی لوٹ مار اور کبھی سیاسی معرکے آرائیوں کے حوالے سے اور اس سارے چکر میں عوام ہی پتے نظر آئے۔ یہ اقتصادی صورت حال اللہ جانے کب ختم ہوگی اور کب میری پاک سرزمین پر وہ وقت آئے گا جب قوم اپنی زبان سے شکر خداوندی کے ساتھ ساتھ اپنی خوشحالی اور امن کی بحالی کا اقرار کرے گی۔ بہر حال بہت ساری دعا میں اپنے ملک کی ترقی و خوشحالی کے لیے دل سے نکل رہی ہیں۔ اللہ میرے ملک کو بھلائی میں رکھے۔ (آمین)۔ ملکی صورت حال سے ہٹ کر اب آتے ہیں اپنے شمارے کے خدا خدائے کب جانب۔ سب سے پہلے تو اپنی پیاری سی محفل میں ٹانگا جھانکی کرتے ہوئے تہیروں کو پڑھا۔ بہت خوب لکھا اور صمد صاحب کو صدارت کی کرسی صرف ایک ماہ کے لیے مبارک ہو۔ ایڈیٹر صاحب نے بھی کیا خوب لکھا ہے، جہاں عقیدہ مسائل اپنی جگہ مگر سسٹمز کلاسک کے حوالے سے اگر ہم سے رائے مانگی تو ہم اس کی مکمل حمایت کرتے ہیں۔ واقعی ایسا ہونا چاہیے کیونکہ اچھا مواد اچھی تحریریں صرف ایک خاص دور تک محدود نہیں رہتا پائیس بلاتل میں بیکار ہیں۔ یہ مطالعے کے شوق کو ہمیشہ کرنے کے لیے اچھی تحریریں کا دوبارہ چھاپنا ایک اچھا قدم بالخصوص ان مرحوم مصنفین کی فکر میں ہونا چاہیے۔ ان لوگوں کو ہمارا کئی میں اور ان کے سر سے آزاد ہو کر مشکل ہو گیا کہ تاقا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم مصنفین کو خراج میں دینا لے گا۔ اچھا، ہر اولیٰ میں ہوتا کہ ان کی قبروں سے نفی نسل کو بھی واقف کرنا جائے۔ ویلڈن۔ ڈاکٹر ساجد احمد کی تاریخی کہانی سچا ہے۔ مناجات پریمی۔ بہت اچھی لکھی اور اندازہ ہر حالات حاصل کر لے لیے ہر دور میں ہر طبقے نے آزاد زبانی کی اور چاہیں چلے ہوئے اپنے مقاصد حاصل کیے جاتے رہے۔ خوب ریاض کی کہانی اصل و حقیقتات نے ثابت کیا کہ اگر انسان اپنی ٹانگ کا ساڑا اپنے دائرے سے نکلے گا تو کبھی بہت سی پریشانیوں سے بچا جاسکتا ہے۔ بیشک کی طرح اس بار بھی منظر امام نے ہمارا لکھ کر احساس دلایا کہ انسان کا اپنے لیے جتنا کوئی فکری عمل ہے ہی مگر دوسروں کے لیے بھی اپنے وجود کو ہمارا بنانا چاہیے تو اس سے بڑھ کر کوئی نیکئی نہیں ہو سکتی۔ باقی کا پہلا حصہ پڑھا۔ سب سے مصنف ہیں شایعہ مگر تحریر میں جان ہے۔ اچھا لکھنے والوں میں ایک اور اضافہ ہیں۔ دیکھتے ہیں دوسرے دوسرے حالات کی تاریخ اختیار کرتے ہیں اور کارمان چوہری کی دلیرانہ صلاحیتیں دیکھی کا باعث بنی ہیں۔ ذہانت میں تسلیم اور نے انتہائی مختصر انداز میں بڑی بات کہہ دی ہے کہ کام کرنے والوں کے لیے صدیاں درکار نہیں ہوتیں بلکہ کچھ کم کرنے کے لیے ایک لمحہ ہی کافی ہوتا ہے۔ زنداں و دنیا اعجاز کی ایک اور دلچسپ تحریر پریمی۔ اب تو کافی دلچسپ انداز تحریر ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ کرے وہ زور دم اور آزاد ہو..... بہت خوب تحریر پریمی۔ ملک منظر حیات کی طاقتور تحریر بھی بہت طاقتور ثابت ہوئی۔ اگر ظلم کے خلاف اور انصاف کی حمایت میں ایسے ہی قدم اٹھائے جاتے رہیں اور ہمت کا مظاہرہ ہوتا رہے تو کوئی شک نہیں کہ میرا ملک بھی ایک مثالی نظام رائج کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ عمار خان کی تحریر سمجھنے پر پڑھ کر احساس ہوا کہ انسان کا چنانہ بہت چھوٹا ہے، جلدی چمک جاتا ہے۔ جب وہ مفر پر تھا تو دوسروں کو ظالم سمجھتا تھا اور جب تھوڑی سی طاقت پائی تو سمجھنے کے بارے چلنا بھی دوسرے ہو گیا۔ علی اختر کی احساس نے احساس دلایا کہ انسان جب تک اپنی عزت خود نہیں کر سکتا، کوئی دوسرا بھی اس کی عزت نہیں کر پاتا۔ حسام بیٹ کا نیا سلسلہ وقت جواب دہرے دوسرے پرانا ہوتا جا رہا ہے، دلچسپی کے تمام پہلوؤں کو ساتھ لیتے ہوئے کامیابی سے آگے بڑھتا جا رہا ہے۔“

طاہرہ گلزار پشاور سے شامل محفل ہیں۔ ”حسب عادت رضوان بخولی نے بتایا کہ آپ کا خط شائع ہو گیا ہے۔ مجھے امید نہیں تھی کیونکہ مجھے میری سسٹمز لیٹ قلم کار لیکن شکر ہے کہ پھر بھی میرا خط شائع ہوا مگر سیاست دان کا لیفتی نے میرے خط کو کاپی ایسے ایسے کاٹا، وہ حشر کیا جو اگست 1947ء کو بڑے کلب کیشن نے پاکستان کے اصلی حصے کاٹ چھانٹ کے پاکستان میں بخش دیا تھا۔ اللہ تو باری ترقی و ترقی کی نہیں..... (دے داری کی فتنی ہے)۔ دوسروں کے لیے بھی جگہ نکالنا پڑتی ہے (جی)۔ سرورق کی حسینہ، ڈرامے کی دلن سے ملتی جلتی تھی۔ البتہ دھک رنگوں والا دوپٹا اور پٹلے پر ہل کر کی تھیں بہت پیاری تھی۔ ادھر پرے کوئی ایک طرف سسٹمز اور دوسرے کوئی میں جشن آزادی مبارک لکھا ہوا بہت اچھا اور پیارا لگا۔ تمام دوستوں، ادارے والوں اور تمام پاکستانیوں کو جشن آزادی مبارک ہو۔ ادارے والوں سے ایک التجا کہ پیڑا اگل معراج رسول کے بارے میں تو کچھ بتائیں۔ وہ ہمارے اور اردو ادب کے عظیم آج کل کس حال میں ہیں۔ اللہ ان کو صحت کامل عطا کرے، آئن فم آئین۔ اس پر جون ایلیا اور ظاہر ہے میں وہ دہرے ہر میرے الفاظ میں بار بار کے شک کے لیکن ہائے تعصیب پاکستانی عوام اللہ عیساں کی گائے ہیں۔ جو حکومت تھوڑی بہت عوام کی حالت بہتر کرنے کے لیے میدان میں آتی ہے، ان کا خون کرنا دشمن اپنا حق سمجھتے ہیں۔ یہ رافلی صاحب میں تو اپنے خطوط میں سونف لکھ چکی ہوں کہ آپ نئی نسل کے لیے سسٹمز اور جاسوسی کی 1990ء سے پہلے کہانیاں دوبارہ شائع کریں بلکہ اس وقت کے قلم کار سلسلے بھی دوبارہ شروع کریں۔ اس طرح کہ سسٹمز اور جاسوسی میں ایک قسط اور کہانی پرانی ہو اور دوسری قسط اور نئی ہو تو نئی نسل پر اور دم کو لوں یا مان عظیم ہوگا کیونکہ مجھ سمیت بہت سے قاری ایسے ہیں کہ وہ بھی مہنگی کتابیں نہیں خرید سکتے (جی بالکل)..... میں بھی اس بات کا احساس ہے۔“



مغل دستاں کے دروازے پر دسک دی، عادل عباسی کا محبت نامہ تھا جو بہت پڑامید نظر آ رہے تھے۔ نامید یوسف صاحب اللہ آپ کو اس کا تذکرہ طاقٹ حطاکرے، آمین۔ مائی ڈیٹر سفر ہمارے آج کے حکمرانوں کو ایک دوسرے کی عزت اچھا لے اور ملک کی عزت و دنیا میں خراب کرنے سے فرمت ملے گی تو وہ عوام اور ایسے فلاحی اداروں کی طرف توجہ دیں گے۔ صفدر معادیہ کا تمبرہ لگتا ہے ڈیوٹی کے دوران جلدی جلدی میں لکھا گیا۔ پشاور میں تو بہت سخت گرمی ہے۔ ایسی جولائی کا یہ ہفتہ بہت اچھا گزارا اور میں بار بار شو ہوئی۔ صفدر بھائی صدر تک جاسکتے ہیں لیکن ایک بہن سے ملے F.C.W Pesh سے۔ ایک نہیں آسکتے۔ اشفاق شاہین کا تمبرہ لا جواب رہا۔ بھائی امید ہے کہ باغی کی چند قسطوں کے بعد ہمارے فیورٹ رائٹرز ڈاکٹر عبدالرب بھٹی یا ضلّٰی اعظم کا کوئی سلسلہ ہوگا۔ محمد خواجہ بھائی کا تمبرہ بھی بہت لا جواب ہے لیکن حال ہے جو بھی اس بہن کو یاد رکھیں۔ رمضان پاشا کا تمبرہ مختصر لیکن کافی جاندار بلکہ جاسوسا لگتا۔ پابندہ خان کا تمبرہ کافی طویل، لا جواب لیکن جامع رہا۔ اطہر حسین صاحب ویکم۔ آپ کا تمبرہ بہت جامع اور لا جواب رہا۔ زریان سلطان صاحب آپ کا ٹھکڑو کر رہے ہیں لیکن یہ بتاؤ کہ آپ غائب کیوں تھے۔ بھول جانا تو انسانی فطرت ہے۔ میں تو سرکاری جاب کرتی ہوں۔ بیمار بھی ہوں۔ 51 سال کی ہو کر بھی سسٹنس، جاسوسی اور سرگزشت کے لیے میرے تمبرہ کرتی ہوں۔ پرانے تمبرہ نگاروں ہوش میں آ جاؤ۔ پلیز تمبرہ کے مہینے میں آپ سب حاضر ہو ورنہ پھر مان لو کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہوں میں تو اپنے لیے ہوں کی "ابھی تو میں جوان ہوں۔" (بہت خوب..... ہاں کل درست فرمایا)۔ آخر میں مہتاب احمد کا ایک لا جواب تمبرہ بہت ہی شاندار رہا۔ واقعی اگر ادارے کے پاس جواب انکل کی کہانیاں موجود ہیں جو ابھی شائع نہ ہوئی ہوں تو ضرور سسٹنس میں شائع کریں۔ منظر انام صاحب اس بار ایک اور اہم اور تحریر سہارا، ایک اچھوتا خیال۔ واقعی جی جی کو روکنے کے لیے کسی کا حکم نہ ملے اس سے بڑا بد نصیب اور کوئی نہیں ویلڈن انکل منظر انام۔ سلیم انور کی تحریر واقعی ذہانت سے لکھی گئی تحریر ہے۔ سراغ رساں ایجنٹ براؤن نے صرف عجمی آئیے کے ذریعے گولی مارنے والے کو پچھانا۔ ہمارے خان کی گھنٹہ بقی آموز اور اچھی تحریر۔ یہاں تو ہر دوسرا پابندہ شاداب بنا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر شمشاد سید اس بار وہ دل کہاں سے لاؤں ایک لا ذوال تحریر ہے جس میں دلوں کے ٹوٹنے کی کہانی بھی گئی اور سننے کے راہی کے حالات سے ٹوٹے ہوئے دلوں کی فریاد بھی تھی۔ کاش کہ لکھتی اور پشاور ایک بار پھر پڑامن اور پرسکون شہر بن جائیں..... آخر ادارے نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور پیغمبروں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ہونا تو چاہیے تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع کرتے۔ چلو یہ بھی بہت اچھا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے شروع کیا۔ رضوانہ ساجد کے قلم سے حق ادا کر دیا۔ بہت ہی پیارا اور خوب صورت انداز تحریر، جزاک اللہ..... سسٹنس کے آخری صفحات پر نامید سلطانہ اختر کی تحریر خوب سب سب معاشرے میں ہر وقت تحریک پرور ایک ایسے ناسور پر لکھی گئی یادگار تحریر۔ ابن آدم ہر لمحہ بدت خواہ کو ذلیل کرنے کے لیے تیار ہوتا ہے۔ ملک صفدر حیات اس بار طاقتور میں نور بوز کی کہانی لے کر آئے۔ اولاد تو ہوتی ہے اکثر نا فرمان لیکن بہت جیہوں پر غلطی بلکہ عین غلطی والدین کر جاتے ہیں۔ کھار تیلی اگر خاندان میں ان سے کم تر تھا تو میں اس کھار کا تو قصور نہیں تھا۔ سچی تو یہ اذکار کھار نے غلط اور عین قدم اٹھایا لیکن کم بخت سینڈ و پیسوں کے لالچ میں ان کی زندگی جھین لی۔ حسام بٹ صاحب کے وقت نے ابج کر ڈی ہے۔ آخر غلطی اپنی والدہ کی تلاش میں پاکستان پہنچ گیا لیکن آتے ہی ایکشن واہ اب مزہ آئے گا۔ محمد طاہر عمیر کی تحریر باغی تو بہت تیز بلکہ ایکشن کا تیز گانا ہوا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں کوئی انکشاف ایکشن سوڈی دیکھ رہی ہوں۔ سید وکامران بہت بہت کے ساتھ اپنے والد کے خلاف چل پڑا ہے۔ تحریر ریاض کی تحریر دل در معقولات بہت ہی اچھی، سچی آموز تحریر۔ واقعی سچی ایسا بھی ہو جاتا ہے جیسے اس ڈاکٹر کے ساتھ ہوا..... ڈاکٹر ساجد اچھی کی تاریخی تحریر سید سے سنبھانک بہت معقولات اور دلچپ تحریر۔ سید ابی اور اس کے بیٹے سنبھانے اور انگریز عالم گیر کو بہت تنگ کیا لیکن فتح آ خر مسلمانوں کی ہوئی..... بابر جیسے تحریر کا کام کو شش ناکام کوشش ہی رہی۔ لوی جیسے لوگ بھی نہیں سدرہ سکتے۔ شرعاً اس کی تحریر دہری خوشی مغربی معاشرے کی عکاس تحریر۔ کافی اچھی کہانی تھی۔ بھی ایسی آئی کہ مغرب کی پولیس بھی ایسی ہی ہے جیسی ہماری پولیس ہے۔ شاکر لطیف کی تحریر مغرب و مشرق بہت زبردست اور سبق آموز کہانی۔ مشرق واقعی مشرق ہے جہاں ہر رشتہ ایک دوسرے سے جڑا ہے۔ افغان نے بہت صحیح فیصلہ کیا اور اپنے باپ کی عزت کے ساتھ اپنی زندگی بھی اذیتوں سے بچائی۔ علی اختر کی تحریر بہت دلی کرکٹیں، اشارے، کٹر نہیں اور لطافت بھی کافی اچھے گلے تمام پاکستانیوں اور سسٹنس کے قارئین کو 14 اگست مبارک ہو۔ (آپ سب کو بھی مبارک ہو)۔“

آفریدی، حیدر آباد سندھ سے خط لکھ رہی ہیں۔ ”برقی برسات میں اپنے پیارے سسٹنس ڈائجسٹ کے 16 جولائی کو درشن ہوئے۔ سرورق پر یونانی لوکی فیلسفے لکھ کر جشن آزادی کی مبارک باد دے رہی ہے خیر مبارک۔ اللہ سبھی ہمارے ملک کو قائم و دائم رکھے۔ انشا یہ میں جون الیامی نے روزنامہ ظہار سے میں پاکستان کے موجودہ حالات پر دل کھول کر رکھ دیا۔ ہم عوام واقعی اللہ سبھی کی گانے ہیں جو چار اڈا ہے اس کے پیچھے چل پڑتے ہیں۔ پانچ سبھی عوام کے ساتھ مذاق کب تک چلتا رہے گا۔ ادارہ امیدوں بھرا تھا اور ایک اچھے سکتے کی طرف توجہ پڑدول کر دئی۔ مغل میں انٹری دی تو عادل عباسی نظر آئے، مبارک باد دینی پڑے گی مجھ صفدر معادیہ، اشفاق شاہین، محمد خواجہ اور رمضان پاشا صاحبان کے تمبرے لا جواب تھے۔ پرویز احمد لاگہ صاحب یہ سسٹنس کی مغل ہے۔ یہاں ٹانگہ کھینچا آسان نہیں۔ کافی عرصے کی غیر حاضری کے بعد محمد زریان سلطان بھی شریک مغل تھے۔ آصف محمود صاحب شیش محل شاندار اور پر رنگ داستان تھی۔ پابندہ خان صاحب میرا تمبرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ ابتدائی صفحات اور ڈاکٹر ساجد احمد صاحب کی یہ داستان تو بھول، سید اور سنبھانک جاتی ہے۔ بہت ہی عبرت اثرات واقعات تھے۔ پوری داستان دلچسپی سے پھری ہوئی تھی۔ مرتے شروع ہی سے مسلمان حکمرانوں کے لیے دربر رہے رہے۔ مغل در معقولات، تحریر ریاض صاحب کی پھر پوری دوسرے کے کاموں میں کھوج



❖ اوشاراشی کا بھرہ نعلی سندھ سے۔ "نعلی ہاری ماہنامہ میں لکھی کہ: زارت کر دی ہوں۔ سہاس ڈانٹتے سے تعارف میرے بڑے مہیا نے کروایا۔ وہ اس ڈانٹ کے مستقل قاری ہیں۔ میں ان کو سرا اور کرتی رہتی تھی کہ آپ میں تبصرہ لکھیں مگر انہوں نے کبھی نہیں لکھا۔ میری یونی سے چھپائیاں تھیں، میں لکھنے بیٹھ گئی۔ امید ہے اپنی محفل میں جگہ دیں گے۔ (خوش آمدید..... بلکہ تو آپ کو کل کی مگر جگہ کی بلنگ مستقل بنیاد پر ہوئی جا چاہیے..... اب غائب نہ ہو جانا)۔ ٹائلز اچھا کرا سا تھا جشن آزادی کی مبارک باد بھی۔ جون ایلیا صاحب میرے پندیندہ شاعر ہیں اور نثر نگار بھی کمال کی کرتے ہیں۔ فقط نقطہ حقیقت پر مبنی ہوتا ہے۔ اور یہ پاکستانی حالات حاضرہ کا نمونہ ہوتا ہے، ویلڈن۔ محفل میں آئے تو عادل عباسی، کبیر عباسی کی تعریف کرتے نظر آئے۔ اقربا پروری مل گئی ہے۔ (کمال ہے جناب..... آپ سے ذرا سی تعریف برداشت نہ ہو سکی)۔ خیر، ہم آگے بڑھے تو ناہید یوسف آج کی گرم دلی نظر آئی۔ خدا اب کے دل میں رحم ڈالے۔ پرانے تبصرہ رات بہ رات اچھا لگتے تھے، پڑھ کر بہت مزہ آتا تھا۔ اب کے تبصرے عجیبہ ہو گئے ہیں۔ تموزا بہت طنز و مزاح ہونا چاہیے۔ (تو لائیے طنز و مزاح منع کس نے کیا ہے)۔ میں سب سے پہلے چھوٹی چھوٹی کہانیاں پڑھتی ہوں۔ عمار خان کی گھمبیر بہت اچھی لگی۔ گھمبیر تو کسی کی چیز کا ہوسر ادا تا ہے جیسے شاداب کو حد سے زیادہ اعتماد اور دولت کے نشے اور اگر نے مروایا۔ طاہور، ملک مسعود حیات جی، بہت ہی شاندار واقعات ہوتے ہیں۔ ان کی جرم کی کوہنجی لا جواب ہوتی ہے۔ زیجو اور لکارا کی الٹا نک موت پر دل دیکھی ہو گیا۔ سیٹھ ونے دولت کی خاطر ۱۰۰ سالہ ان الزون کا خون کر دیا۔ خود بھی سولی پر چلا۔ علی اختر کی احساس، یوسف اقرار کی گھریلو زندگی پر مبنی بہترین کہانی تھی۔ ذویا اعجاز جی کی زنداں، دل چھوٹی کافی پرانی رسم پر مبنی کہانی تھی۔ بے چاری کا شجر اس رسم کی سمیٹ چڑھ گئی۔ طفل در معقولتا، تجویر ریاض جی کی بہت اچھی کہانی تھی۔ مولیٰ۔ حسد اور دوسرے کے معاملات میں ٹانگ اڑانا بہت تنگنا پڑا۔ سید اسد سنبھلی مکمل اور بہترین داستان تھی۔ سر ہوش کی خرسستوں سے تاریخ ہماری بڑی ہے۔ ناہید سلطانہ اختر بھی ہمیشہ سے لا جواب کردیتی ہیں۔ ان کی یہ داستان تھی تو پرانی کہ سداسے ایسا ہوتا آ رہا ہے مگر اس داستان میں جو معاشرتی ناہمواریوں کو نمایاں کیا ہے وہ قابلِ غور ہیں تاکہ ایسی غلطیاں کوئی اور نہ کرے جو معاشرے میں اس قسم کے جرائم کو جنم دینے کی وجہ بنتی ہیں تاکہ ان وجوہ کا سدباب کیا جاسکے۔ حسام بٹ جی کی وقت अभी زیر مطالعہ ہے، داستان کی سمجھ تو نہیں آ رہی، ہاں امریکا کی سمجھ آ گئی۔ باقی پرتبصرہ اگلے تبصرے میں دوں گی، و اشعار کی محفل بھی اچھی جتنی ہے (بہت عمدہ تبصرہ رہا)۔"

۱۰ اطہر حسین کی کراچی سے شرکت۔ ”یوں تو ہمارا بہت دل چاہتا ہے کہ سسپنس کی شاندار محفل میں شرکت کریں مگر چاہر کبھی تسلسل برقرار نہیں رکھ پاتے اور غیر حاضری ہو ہی جاتی ہے۔ اس کی وجہ دقت کی کہ کب لکس یا اپنی بے پروائی۔ تاہم پچھلے ماہ بھر پور کوشش ہے کہ غیر حاضری نہ ہو اور کچا حیدر کی ہوا تھا کہ حاضری ضرور لگوا لیں گے، امید ہے خط کوشاٹل محفل کر لیا جائے گا۔ سب سے پہلے سلسلے پر تیرہ حاضر ہے۔ باغی کا آغا خاندان دار ہوا ہے۔ امید ہے یہ کہانی اپنا مقام بنا لے گی۔ کہانی میں حقیقت پر مبنی واقعات ہیں اس لیے کہانی مزہ دے رہی ہے۔ ہیروئن بھی مارو حاض میں ماہر ہے۔ کہانی زبردست ہے۔ ویسے ہم سوچ رہے تھے کہ شاید یہ سلسلہ طاہر محفل صاحب کا آنے گا۔ دوسرا سلسلہ وقت بھی ٹھیک ہے۔ مگر کہانی کا ٹیڈو سلو ہے۔ شروع میں کافی تیزی نظر آتی ہے۔ بہر حال کہانی بہتر ہے۔ ناہید سلطانہ آخر کی خواب سرباب بہت ہی زبردست کہانی تھی۔ مصنف نے ہمارے ارد گرد دو نئے والے واقعات کی صیح منظر کشی کی۔ ایمین نے اپنے ماں باپ کی عزت کو دوا پر لگا کر غلط راہ کا تعین کیا اور نہ



صرف یہ بلکہ اپنے ہی مگردالوں کے قتل میں ملوث ہو گئی۔ شیطان نے اس کی عقل سمجھ سب اس سے جھین لی تھی۔ بالآخر اس کے ہاتھ بچتے اور سزا کے کچھ نہ آ کر اور وہ جب تک زندہ رہے گی اس کا ضمیر اسے بچو کے لگا رہے گا۔ وہ دنیاؤ آخرت دونوں سے گئی۔ ویلنٹ نامید صاحب۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی سیوا سے سنبھال کر تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ تاریخی واقعات پڑھ کر مزہ آتا ہے اور معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ ملک مصفر حیات کی طاقتور پڑھی۔ بچیاں بات ہے کہ اس طرح کے کیسز پڑھنے میں کہانی کا سامرا نہیں آتا بس ایسا لگتا ہے کہ آپ کوئی روٹنا ہونے والا واقعہ پڑھ رہے ہیں۔ ایسا نہیں کہ کھارسی کی تحریر ابھی نہیں بس ہمیں یورگ محسوس ہوتا ہے۔ رضوانہ ساجد کی حضرت یوسف علیہ السلام کی سوانح حیات پڑھی۔ یقین جانے ایسی طمانیت ایسا مزہ آ یا کہ مت پوچھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ پڑھتے جائیں اور مکمل کریں مگر ”بانی آئندہ“ پڑا کر مزہ کر رہا ہو گیا۔ کیا ایمان افروز واقعات تھے۔ چھوٹی کہانیاں میں ذرا دیا جائیگا کہ انداز زبردست تھی۔ چودھریوں کی وی روایتی بربریت، یوسف کو محبت کی یاداش میں سزا سے موت دی گئی جبکہ اس کا جرم اتنا بڑا تھا۔ محبت کرنا تو کی جرم نہیں۔ منظر امام صاحب کی کہانیاں مختصر مگر اپنے اندر کوئی نہ کوئی سبق لیے ہوئی ہیں۔ سہارا ابھی کہانی تھی۔ تو یہ ریاض کی عقل درمستقولات بھی بہت ابھی کہانی تھی۔ تک نے ایک قتل کی تحقیقات کرتے ہوئے لاش کی دریافت کی تاہم وہ سب اسی کے کھاتے میں آ گیا۔ شیر شاہ سید کے کیا کہنے۔ بہت بہترین لکھے ہیں۔ شاکر لطیف کی مغرب و مشرق انتہائی سبق آموز کہانی تھی جس میں مغرب و مشرق کے فرق واضح انداز میں اجاگر کیا گیا۔ عمارہ خان کی کھنڈ پچھ خاص تاثر قائم نہ کر سکی۔ علی اختر کی احساس نے بھی کچھ خاص مزہ نہ دیا۔ شرعاً اس کی دہری خوشی تو بڑی پیچیدہ کہانی تھی۔ بابر نعیم کی ناکام کوشش بہتر رہی۔ سلیم انور کی ذہانت مختصر مگر ابھی کہانی تھی۔ محفل شہر و سخن بہترین رہی۔ مجموعی طور پر شمار بہترین تھا۔ آخر میں گزارش ہے کہ طاہر محفل صاحب کی کوئی طویل کہانی یا پھر اچھوتی کہانیاں ہی شائع کرو یا کریں۔“

نامید یوسف کا خط اسلام آباد سے۔ ”اف! اس صبیحے تو ”معروفیت“ ہے کہ ”فرغت“ تک نہیں پہنچ پاری۔ شوہر صاحب اپنی جاب کے سلسلے میں بیرون ملک دورے پر جا رہے ہیں اور کمزور ہوتی ہے۔ کیا کریں کہ پڑتا ہے۔ ہمارے کیا تقریباً سیسہ بھوں کے شوہر چاہتے ہیں کہ انہیں گھر آ کر کچھ نہ کرنا پڑے۔ ہر چیز پر ٹکٹ ملے اور بیٹھے بٹھے تمام کام پلک جھپکتے میں ہو جائیں۔ شوہروں کی یہ خواہش پوری کرنے میں بے چاری اکیلی عورت کا کہاڑا ہوتا ہے۔ بچوں کو سنبھالے، اس پر سزا دیا ہزارے روزہ و اشاہ کی خریداری اور دیگر مصروفیات..... بے سبب کہ ابھی پہلی خواتین کو بلکان کر دیتی ہیں۔ خیر مرے کیا نہ کرتے کہ مصداق شوہر صاحب کی روایتی کے لیے درکار چیزوں کی لسٹ بنائی اور ان کے حصول کے لیے دوڑ پڑے۔ جیسے تیسے انہیں ہر درکار چیز مہیا کی اور اطمینان ہو جانے کے بعد دعاؤں کے ساتھ رخصت کر دیا۔ تمام کاموں سے فراغت کے بعد نہایت سکون سے سہنس تھا۔ محفل میں پہنچے محفل کے تمام دوستوں کو ہماری طرف سے جشن آزادی مبارک۔ یہ ملک ہمیں بڑی قربانیوں کے بعد ملا ہے۔ ہماری تمام پاکستانیوں سے گزارش ہے کہ اس پاک وطن کی قدر کیجیے۔ غلامی کا طوق بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم آزاد فضا میں سانس لیتے ہیں۔ ہمارے جو بھائی بہن بیرون ملک مقیم ہیں، یقیناً وہ مالی آسودگی تو حاصل کر سکتے ہوں گے، مگر انہیں وہاں اپنات اور آزادی کا احساس نہ ہوگا۔ وہ یقیناً اپنے وطن کو یاد ضرور کرتے ہوں گے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ پاک ہمارے وطن کو سلامت رکھے اور دشمنوں کے شر سے محفوظ فرمائے، آمین۔ سب سے پہلے ہم نے تعارف سے پڑھا مشورہ کیا۔ کیا ایمان پر در واقعات ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا مصداق مستقامت مشعل راہ ہے۔ بہت خوب رضوانہ ساجد۔ پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ ”وقت“ کو ہم نے بہت ”وقت“ دیا مگر پھر بھی ہماری تسلی نہیں ہوئی۔ کہانی میں لاطینی زیادہ ہے۔ ایکشن، جنرل وغیرہ کی کمی ہے۔ ہمیں ابھی تک اس میں دلچسپی کا سامان نظر نہیں آیا۔ ہو سکتا ہے اسٹر صاحب اپنا چاک کہانی کا نتیجہ تیز کر دیں۔ پیوستہ رہے شجر سے امید بھار رکھ..... کہ مصداق پڑھتے جا رہے ہیں کہ شاید کچھ دلچسپی کا سامان مہیا ہو جائے۔ باقی طاہر عمیر صاحب کی بہت ابھی لگی۔ نام نیا نیا لگتا ہے۔ خیر، نام سے کیا..... کام آجھا ہوتا چاہیے..... جو کہ ہے۔ پہلی ہی قسط نے اپنے فرائس میں جکڑ لیا ہے۔ بہت تیز تجربہ ہے۔ کہانی کی رفتار اس کی اٹھان بتا دیتی ہے۔ ویلنٹ طاہر عمیر صاحب۔ مزہ آ گیا۔ ویسے طاہر محفل اور طاہر عمیر ناموں میں مماثلت ہے اور دونوں کے کام بھی لا جواب ہیں۔ کیا طاہر نام کا اثر ہے؟ یہ ہمارے ذہن میں آنے والا ذاتی خیال ہے۔ امید ہے کہ باقی کی آئندہ اقاطا مزید ایکشن سے بھر پور ہوں گی۔ نامید سلطانہ اختر کی خواب سراب اس ماہ کی سب سے بہترین کہانی رہی۔ نامید سلطانہ کا تو نام ہی کافی ہے۔ ہر تحریر میں بچسبی اور واقعات و الفاظوں کا چناؤ بہترین ہوتا ہے۔ خواب سراب نہایت عبرت اثر کہانی رہی۔ آج کل کی جو نوجوان نسل کے لیے اس میں ”سبق“ پنہاں تھا۔ ایسی مختار یہ معاشرے کی درگئی میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تاریخی کہانی بھی خوب رہی۔ تاریخی کہانی ہم اپنی معلومات کے لیے دلچسپی سے پڑھتے ہیں اور اس سے ہمیں اپنی تاریخ سے آگاہی بھی ہوتی ہے اور اس میں عبرت آموز واقعات سے سبق بھی حاصل ہوتا ہے۔ چھوٹی کہانی مغرب و مشرق بہت پسند آئی۔ بہت خوب شاکر لطیف۔ آپ نے مشرق و مغرب کی صحیح عکاسی کی ہے۔ منظر امام کی سہارا ابھی اپنی مثال آپ رہی۔ انتہائی سادہ الفاظ میں ہمیں ایک سبق دے گئی۔ شیر شاہ سید صاحب کی تو بات ہی زرنای ہے۔ بہت منفرد کہانی لکھتے ہیں۔ ہم ان کی کہانیاں بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ اس دفعہ معروفیت کے باعث زیادہ کہانیاں نہیں پڑھ پائے۔ تبصرہ بھی لکھتا تھا، سوچو جو کہانیاں پڑھیں، ان پر اپنی ناقص رائے بھیج دی۔ اس وفد کو لڑا کر کہ ملک مصفر حیات کی طاقتور پڑھی۔ وہ یوں کہ کیونچہ وغیرہ ہمیں الجھا دیتی ہے۔ کسی قتل کی تفتیش یا عدالت پولیس کے واقعات میں ہم کیسوی نہیں رکھ پاتے۔ بہر حال کہانی پڑھی تو مزہ آیا۔ مصفر صاحب نے زیادہ والا معما حل کر کے جرم کو پکڑ ہی لیا۔ ابھی کہانی تھی۔ محفل شہر و سخن بھی ابھی رہی۔ باقی رسالہ زپر

✽ مہتاب احمد کا تمبرہ حیدر آباد سے۔ ”تمام قارئین کو بشن آزادی 14 اگست مبارک ہو۔ اللہ رب العزت ہمارے ملک کو ترقی عطا فرمائے اور دشمن ملک کی سازشوں اور شر پبندوں کے شر سے محفوظ فرمائے۔ آمین۔“ جون ایلیا صاحب کا انشاء یہ پڑھا۔ کیا کہنے جون صاحب کے۔ ان کی یہی خوشی انہیں ممتاز کرتی ہے کہ انہوں نے سالوں پہلے اپنی دانش مندی سے تمام حالات کی صحیح نظر کشی کی ہے۔ انشاء یہ کے بعد فہرست پرنگہ و دوزانی تو ناہید سلطانہ کا نام دیکھ کر سب سے پہلے خواب سراب میں جا بیٹھے۔ معاشرتی بگاڑ اور اپنی خواہشات کی خاطر خوشی رشتوں کی بے کسی پر مبنی کہانی نے روتے کھڑے کر دیے۔ ایک بیٹی نے اپنی پسند کی خاطر پہلے ماں باپ کی عزت و آؤ پر بگاڑ کر پھر پسند کے حصول کے لیے ان کی جان لینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ مصوم بھائی کو بھی جینٹ چڑھا دیا۔ مگر حاصل کیا ہوا؟ سوائے رسوائی، ذلت، عداوت اور بچہ پتا دے کے۔ زبردست کہانی تھی۔ لیکن بے شمار تزلزلیں ہمارے ارد گرد موجود ہیں۔ اس طرح کی کہانیاں ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں کہ ہمیں اپنے اندر بدلاؤ اور راہِ راست پر چلنے کی ضرورت ہے۔ بہت خوب ناہید صاحب۔ اس کے بعد ملک مفرد حیات کی طاقتور پڑھی۔ ملک صاحب نے زہو کے غیاب کا معما احسن طریقے سے حل کیا۔ اچھی کہانی تھی۔ حسام بٹ صاحب کی دقت ہم شوق سے پڑھتے ہیں۔ بٹ صاحب ہمارے فیورٹ رائٹر ہیں۔ ان کی کہانی وقت اپنا رنگ خوب جمداری ہے۔ نیا سلسلہ باغی و اچھی اپنے اندر باغیانہ پن سموئے ہوئے ہے۔ کہانی انتہائی تیز رفتاری سے شروع ہوئی ہے اور اندیش میں عجیب سی منطقی دے گئی۔ اب اگلے قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعات نے دل ایمان کی روشنی سے منور کر دیا۔ ہمیں اپنے مذہبی لٹریچر کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اس سے آگہی کے دروازے ہوتے ہیں اور زندگی کے معاملات میں راہنمائی بھی ملتی ہے۔ تاریخی کہانی سہا سے سنبھانک پڑھی۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے تاریخی واقعات کو اس قدر خوب صورت انداز میں بیان کیا ہے کہ اہل علم و ادب اس میں حیرت و حیرت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر شمشاد شہید کی وہ دل کہاں سے لکھی ہیں۔ ”میں نے اہل علم و ادب کی ہمتی میں سہا سے سنبھانک پڑھی۔ ڈاکٹر شمشاد شہید کی وہ دل کہاں سے لکھی ہیں۔“ ہائی کہانیاں اس لمبک دہلی مکمل شہر و مہلن ہمیشہ کی طرح پوری آپ کتاب سے جگمگ رہی تھی۔ مطالعہ میں عادل مای ہمالی چلے پھرے۔ ”ہمارا ہمارا“ ناہید ہفت فائبرہ میں جا ہمارا تھا۔ ختم نہ کر کے ہم کہانیاں کیسویں سے پڑھتے ہیں لیونلہ ان کا انداز ہاں اچھا ہے۔ ویسے تو مکمل کے تمام دوستوں کے خطوط اپنی اپنی جگہ لاجواب ہوتے ہیں۔ ہنس کی مکمل میں آکر احساس ہوتا ہے کہ ہم ایک مکمل ہیں۔ اللہ اس مکمل کو شاد و باد رکھے، آمین۔ ہماری سٹس کی انتظامیہ سے درخواست ہے کہ نو اب صاحب اور کاشف زہیر مرحوم کی جو کہانیاں شائع نہیں ہوئیں انہیں شائع کریں۔ یہ دونوں رائٹر اپنی مثال آپ تھے۔ اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔“

✽ دوست محمد خان کی پشاور سے شرکت۔ ”ایک عجیب سی دشت ہے، ہر طرف پریشانی ہے۔ نفسی کا عالم ہے۔ ان سب پریشانیوں سے بچھا چھڑتا ہوئے ہم ایک اسٹال پر پہنچے اور سٹس پر نظر پڑے ہی ساری پریشانی ختم ہو گئی اور یوں ہمیں سٹس 18 تاریخ کو ملا۔ سب سے پہلے ہماری نظر ناٹل پر پڑی اور ہم ایک حبیبہ کے حسن سے شال پر اس کا رشک اٹھائے۔ جیسے شادی سے پہلے دہن تیار ہوتی ہے۔ جون ایلیا صاحب کی باتیں بڑی خوبصورت ہیں۔ خدا ہمارے وطن کو اور بھی خوب صورت بنائے اور خدا اس کی حفاظت کرے۔ ایڈیٹر صاحب آپ نے بالکل ہمارے دل کی بات کی۔ سٹس کلاسک کے عنوان سے آپ نے بات کی۔ تو ہم کب سے کہہ رہے ہیں کہ یہ سلسلہ شائع کریں۔ ہم اس کا انتظار کریں گے۔ آگے بڑھے اور دوستوں کی محفل میں چھلانگ لگائی۔ کرسی صدارت پر عادل مای صاحب براجمان تھے۔ بھی بہت بہت مبارک ہو۔ بڑا شاندار تمبرہ تھا آپ کا۔ عادل مای بھائی و فرات میں بھال پورہ کی کیا چیز مشہور ہے؟ ناہید یوسف باجی و ذر پر اعظم کے عہدے پر براجمان تھیں۔ بانی دوستوں میں مفرد معاویہ، اشفاق شاہین، محمد خواجہ، رمضان پاشا، پانچندہ خان سلیمان خیل ظاہرہ بھگزار اور اسی احمد خان، اطہر حسین اور محمد زریان سلطان کے خطوط بہت شاندار تھے۔ زریان بھی کیوں تھا ہوتے ہوئے تم کو یاد کریں گے۔ (یہی تو نہایت ہے)۔ طاہرہ باجی کو میری طرف سے سلام کیونکہ ہمارا اور ان کا شہر ایک ہے۔ احسان عمر، بقیس خان نادر سیال تم لوگ کہاں تم ہو گئے۔ سیوا سے سنبھانک ڈاکٹر ساجد امجد، سینی آموڈ کہانی۔ یہ بادشاہت بھی کیا چیز تھی اس کے لیے ہر طرف سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ چلو اچھا ہو کر اس وقت ہم نہیں تھے۔ سہارہ مظہر امام سینی آموڈ کہانی۔ یہ بادشاہت بھی کیا چیز تھی اس کے لیے ہر طرف سازشیں ہوتی رہتی تھیں۔ چلو اچھا ہو کر اس وقت ہم نہیں تھے۔ سہارہ مظہر امام صاحب کی اچھی کہانی، بالکل دینا کی جتنی چیز دوسرے کا کندھا ہوتا ہے۔ یہی سب سے بڑا سہارا ہوتا ہے۔ اگر دیوار کو دوسری دیوار کا سہارا نہ ہوتو دیوار گر جاتی ہے۔ محمد طاہرہ میر کی ہائی پڑھی۔ چھٹی قسط تھی۔ آگے پتا لگے گا۔ ذہانت سلیم انوری گزرا رہے لائق تھی۔ زہرا ان دو باغیازی کی دیہاتی پس منظر میں گہمی گئی اچھی کاوش تھی۔ شرمعاس صاحب کی دہری خوشی بھی اچھی کہانی تھی۔ محمد عیادہ خان کی بہترین کہانی جس میں شاداب خان طاقت کے نشے میں اپنے آپ کو سب کچھ بھینسا تھا۔ علی انزہر کی احساس پڑھی۔ یوسف پڑا اتر آیا۔ اقرامی بد مزاج عورتوں سے خدا ہر کسی کو پتا ہ میں رکھے۔ اپنے عمارتی خدا کے ساتھ ایسا سلوک، ایسی عورتیں دنیا میں بھی خوش نہیں ہوئیں اور اپنی آخرت بھی تباہ کر دیتی ہیں۔ حسام بٹ کی دقت میں اس واقعہ پر بھی گہمی گئی اور امید ہے کہ کہانی کا ٹیمپو آگے جا کر بہت دلچسپ ہوگا۔ وہ دل کہاں سے لاؤں، ڈاکٹر شمشاد شہید کی پیاری کہانی جس میں اول سے لے کر آخر تک کہانی نے ہمیں جکڑے رکھا۔ مغرب و مشرق میں شا کرلیف صاحب نے بڑی اچھی نظر کشی کی ہے۔ جہاں مغرب کے مار پھردا زما معاشرے میں عورت کچھ بھی کر سکتی ہے اور شرق میں عورت اپنی حیا اور شرم کی وجہ سے مجبور ہوتی ہے۔ حضرت یوسف، رضوانہ ساجد ایمان اور فزادہ واقعہ یوسف کے والد محترم حضرت یعقوب کے ممبر سے سبق ملتا ہے۔ خواب سراب میں ناہید سلطانہ اختر نے عورتوں کو سبق دیا ہے۔“



کرنیل جیسے لوگوں کے پیچھے مت بھاگیں، وہ صرف سراب ہوتے ہیں۔ لڑکیاں نادانی میں ایسی غلطیاں دہراتی ہیں اور پھر پچھتاوے کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ مختل شعروں جن میں ہادیہ ایمان بابا ایمان، ملک محمد ظفر، ردا جاوید، صفدر محادیہ، اشفاق شاہین، میمنہ خان'..... کھکشاں الور، آذر عمران اور سائرہ نواب کے اشعار اچھے تھے۔ کتر نہیں بھی اچھی تھیں۔“

✽ خلیق ربانی انجم چارسدہ سے شامل محفل ہیں۔ ”اگست 2017ء کا شمارہ سات کو ملا اور کئی نشستوں میں تمام کیا۔ انشائیہ ہوتے ہوئے ”آپ کے خط“ میں پہنچا۔ ”آپ کے خط“ میں اداری ٹوٹ میں یہ بات/ وضاحت دل کو لگی کہ..... ”جیسا کہ آپ سب جانتے ہیں کہ سہنس ڈائجسٹ کے اجراء کو تقریباً چار عشروں سے زائد وقت گزر چکا ہے۔ لہذا قارئین کی جگہیں بھی بدل چکی ہیں۔ جنہوں نے جوانی میں سہنس کی رفاقت اپنائی وہ یقیناً اب بڑھاپے کی طرف گامزن ہیں اور جوانی کی سہنس کی یادگار تحریریں نہیں پڑھ سکتے، ہم ان کے لیے خاص طور پر گزشتہ 70 اور 80 کی دہائی کے شماروں سے نادر اور یادگار تحریریں سہنس کلاسک کے عنوان تلے لگائے گئے ہیں۔ اس حوالے سے میں نے بھی ایک خط بہت پہلے لکھا تھا۔ (آپ سے پہلے بھی یہ شمارہ قارئین نے خطوط میں ہمیں اس سلسلے میں آمادہ کیا اور اسی تناظر میں ادارے نے اسے شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ دیگر آراء اپنی جگہ مگر کہاںوں پر تبصرہ کہاں سے بھیجی؟“

✽ رمضان پاشا گلشن اقبال کراچی سے خط لکھ رہے ہیں۔ ”ماہ اگست 2017ء کا سہنس کا سرورق بہت کٹھ تھا۔ سرورق جتنا ٹھکا گیا رہا تھا، یہی سرورق اتنا ہی ٹھکانا۔ فہرست بھی سادہ اور قابلِ دیدی۔ انشائیہ حسبِ معمول درج تھا۔ خطوط کی محفل میں اول نمبر پر آنے والے عادل عباسی کو مبارکباد۔ موصوف کا طویل تبصرہ بھی جامع اور شاعرانہ تھا۔ اشفاق شاہین صاحب آپ کا شکر ہے کہ آپ نے اپنے تبصرے میں میرا ذکر کر لیا۔ ظاہر ہے کہ صاحب آپ نے میرے نام کے ساتھ بھی لکھا، میرا سرورق خون پڑھ گیا۔ اس دفعہ جتنا تبصرہ اچھے تھے، البتہ کوثر اوالہ کے آصف محمود کا تبصرہ اچھا نہیں لگا۔ موصوف کا ”شیش کلن“ کے بارے میں پور کھائی۔ ”اور پر لوک سدا حارگی“ پڑھ کر دل پر ایک گھونسا سا لگا۔ ”وقت“ کے بارے میں موصوف کی بددقتی قابلِ معافی ہے۔ غیر ملکی کہانیوں میں ”دل در معقولات“ بہترین تھی۔ ”سہارا“ میں مزہ نہیں آیا۔ طبع زوہا کہانیوں میں ”باغی“ بہت ہی عمدہ تھی۔ آخر میں ”جاری ہے“ دیکھ کر بڑا اطمینان آیا۔ (کیوں کہانی گھڑے کس بات پر۔ اچھی تحریر ہو یا کوئی بھی چیز ایک دم نہیں ملتی) ”ذہانت“ بہت مختصر بہت دلچسپ، طبع زوہا کہانیوں میں ”احساس“ بھی بہت خوب تھی اور ”زندان“ خوب سے خوب تر۔ ”وقت“ پڑھنے کے لیے وقت کا تینا میرے لیے وقت طلب کام بن گیا، آخر کار میں نے وقت نکال کر وقت پڑھ لی۔ (یہ وقت کی مہربانی ہوگئی)۔ کہانی اب مجمع معنوں میں میرے معیار پر آگئی ہے۔ اگلی قسط میں بڑی اضافت اور دھس پٹاس ہونے والی ہے، مزہ دو بلا ہونے والا ہے۔ ”وہ دل کہاں سے لاؤں“ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خصوصی موضوع سے بہت کر محبت کی کہانی لکھ دی۔ یہ بھی قابلِ قبول ہے۔ ”مغرب و شرق“ کی کہانی کچھ زیادہ متاثر نہ کر سکی۔ ”ناکام کوشش“ بھی پسند نہیں آئی، اس میں کیا تھا جو پسند کی جائے؟ ”غراب سراب“ کہانی بہت ہی عمدہ اور اعلیٰ پائے کی تھی۔ (تبصرہ کا شکریہ)۔“

✽ اور سید احمد خان کا خط ناظم آباد کراچی سے۔ ”اگست کا شمارہ ڈاکٹر صاحب کے فن کا منہ بولا ثبوت تھا۔ انشائیہ بھی وقت کے حساب سے اپنی جگہ درست تھا جب تک کوئی مدا نہ ہو جب تک امید بر ہی قائم رہتا ہے جب تک بھی امید پر نہیں آتی۔ (یہی تو بچنے کا فن ہے جناب) اگست میں پاکستان کو بے سات مشرے ہو جائیں گے۔ مفاد پرستوں، پیسے و جاہ جٹ کی طبع کرنے والوں نے پاکستان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا مگر یہ بھی برحق ہے کہ ہمیں بحیثیت مسلمان امید اچھی رکھنا ہے۔ ادارہ یہ بھی بردت تھا۔ سرفہرست آنے پر عادل عباسی کو مبارکباد۔ اشفاق شاہین اور رمضان پاشا صاحب کا بہت شکر ہے تبصرہ پسند کرنے کا۔ بہن ظاہر ہوگزار بھی محفل میں حاضر تھیں۔ ہماری دعا میں ہمیشہ آپ کے ساتھ ہیں کہ آپ کی دکھ کی گھوٹی خوشیوں میں بدل جائیں، آمین۔ باقی دیگر ”سہنس“ کے ساتھی اور دوست بھی جلوہ گر تھے۔ سب کو سلام۔ آپ سب کو عید الفصحی اور جشن آزادی مبارک ہو۔ سب سے پہلے ڈاکٹر ساجد امجد کی تحریر سید ابی اور اس کے بیٹے سہنا کے حالات و واقعات پڑھے۔ تاریخ کے گوشے سے روشناس ہوئے۔ باقی کہانیوں میں ”دل در معقولات“، ”منظر امام کی“، ”سہارا“ بہت اچھی اور منفرد لگیں۔ ”نا سلسلہ“ ”باغی“ محمد ظاہر عمیر کی کہانی بہت پسند آئی۔ امید ہے اسی طرح دلچسپی پر قرار رہے گی۔ ”ذہانت“ بھی عمدہ رہی۔ ”زندان“ بھی بلاشبہ اچھی کہانی تھی۔ زوہا کا شمار بہت اچھا لکھ رہی ہیں خدا کرے کہ وہ دہم اور زیادہ۔ دہری خوشی نے بھی خوشی کے لحاظ سے مہیا کیے۔ ٹھنڈے پانی کی محفل اور اشعار کی محفل میں بھی مزہ آیا۔ احساس نے بھی اپنے ہونے کا احساس دلا یا۔ ”وقت و ذہول کہاں سے لاؤں“ مغرب و شرق اور داستان یوسف، ناکام کوشش اور غراب سراب بہترین کہانیاں تھیں۔“ (رسالے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ)۔

✽ زاہد احمد کی ناگن چوگرگی کراچی سے آمد۔ ”سب سے پہلے تو میں آپ کو ایک اندوہناک خبر سناؤں جو کہ میرے لیے بہت ہی صدمے کا باعث ہے کہ میرا گیارہ سالہ بیٹا عبدالکبیر حادثاتی طور پر آگ سے جل کر ایک مختل سول اسپتال کے برنس سینٹر میں زیرِ علاج رہ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون) بہت افسوس ہوا یہ جان کر۔ اللہ آپ کو میر اور بچے کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، آمین)۔ میں تو کچھ رہا تھا کہ میرا غم اور صدمہ بڑا ہے مگر میرے اللہ نے دوسرے دن ہی بتا دیا کہ ایسے لوگ بھی جن کے غم اور صدمے تم سے بھی بڑے ہیں۔ یعنی میرے ایک دن پہلے خلیق احمد پور شرقہ کا حادثہ ہوا۔ اگلے ہونے آکل ٹکڑے کے لوگ جو بیڑوں پر بھر رہے تھے، چاک ابلنے لگے کئی خاندانوں کو کتنا کے کھات اتار دیا۔ بتائیں اگست کا سہنس آیا یا نہیں، بہر حال ساری کہانیاں اور سلسلے پڑھنے کے بعد اپنی محفل میں پہنچا تو اچھی یہ کیا ماجرا ہے۔

سانجھ

علی اختر

زندگی کا کوئی بھی دور ہو یا لمحہ... اپنے
دامن میں نہ صرف کچھ نیا لاتا ہے بلکہ گزرنے کے
بعد یادیں بھی چھوڑ جاتا ہے لیکن... صرف ان
کے لیے جو اس پل کی زد میں آئے ہوں۔ 1857ء کی
جنگ میں جہاں بے شمار داستانیں رقم ہوئیں اور بڑے
بڑے سورماؤں کے بہت سے کردار آج بھی تاریخ میں اپنے
کارناموں کے حوالے سے زندہ و جاوید ہیں، وہیں ایک
طوائف زادی کے محبانہ جذبات اسے بھی تاریخ میں...
ایک خوب صورت جگہ عطا کر گئے۔ بے شک ہزاروں، لاکھوں
نہ سہی مگر سیکڑوں دلوں میں اس کی جاں نثاری کا فسانہ
محفوظ ہے۔ اگرچہ خود اسے یقین نہ تھا کہ کوئی اس کی قربانی کو
یاد بھی رکھ سکے گا کیونکہ وہ تو ایک طوائف زادی تھی۔ اس کلنگ
کو اس نے جس خوب صورتی سے اپنی پیشانی سے صاف کیا وہ اپنی
مثال آپ ہے اور یہ بھی ثابت ہو گیا کہ کردار حیثیتوں سے نہیں عمل سے
تشکیل پاتے ہیں۔ وہ کہ جس کا ہر سویرا بڑا روشن اور تابناک ہوتا
تھا مگر... جب زندگی کی سانجھ ہوئی تو ایک ایسی روشنی اس کے ماتھے پر
رقم تھی جس نے اس کے ماتھے کو بے مثال بنادیا... شاید اس کے خلوص کے پیش
نظر تاریخ میں اس کے کردار کو بھی سنہرے حروف میں لکھا جاسکے۔

ماضی کا آئینہ۔ باختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثراوقات



میرٹھ میں انگریز فوجیوں کی بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ جہاں کے انگریز فوجی اور اعلیٰ فوجی عہدیدار ایسی گرمی اور دھوپ کی لو سے بچنے کے لیے بچوں کو لے کر شملہ چلے جاتے تھے۔ اس سال گرمی کی شدت پہلے سے کہیں زیادہ کی اور انگریز اپنے بال بچوں کو گاڑیوں اور چھکروں پر لا کر پہاڑوں کی طرف جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ویسے بھی ایسے موسم میں انگریز فوجیوں کی یہاں اس لیے ضرورت نہ تھی کہ اب میرٹھ پر ان کا قبضہ مضبوط ہو چکا تھا اور وہ شہر پر اپنے مضبوط قبضے کی وجہ سے آرام طلب اور طاقت کے نشے میں اس قدر سرشار ہو چکے تھے کہ اب وہ خود اعتمادی کے غرور

میرٹھ کی یہ صبح یہاں اترنے والی دوسری صبحوں کے مقابلے خاصی اداس تھی جیسے ہر پہر پروردنی چھائی ہو۔ شہر کی تمام سڑکیں سسنان اور ویران تھیں۔ مٹی کی تیز دھوپ نے جہاں دوسری رنگینیوں کو چاٹ لیا تھا... اس کی جسم کا لٹی شعلہ میں فوجی بارکوں میں گرمی اور اس کی پھتوں کو جھلسانے لگی تھیں۔ فوجی اپنی اپنی بارکوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ سامنے پر پڑے کے گراؤنڈ میں آم کے چاروں طرف درختوں پر جیسے غیر مرئی قوتوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ویرانی نے ہر سوا پنا قبضہ جمایا ہوا تھا اور چھاؤنی کا وسیع و عریض میدان پارے کی جھیل کی طرح جھلجھل کر رہا تھا۔



مفتخ دست تھا۔ اس کے ہندوستانی نوجوانوں پر جنرل ہوگف کو بڑا ناز تھا۔ اس دستے کے سپاہیوں کو بھی بارک پور کے فوجیوں کو کارتوس کے نہ استعمال کرنے پر انگریز افسروں کی جانب سے دی جانے والی ذلت آمیز سزاؤں اور گرفتاری پر بڑا رخ تھا اور ان کارتوسوں کو استعمال کرتے وقت ان کے بھی چہرے نفرت سے سرخ ہو جاتے تھے اور مارے خوف کے ہاتھ کاٹنے لگے تھے۔ اس خبر کا سننے آنے والے لکمانڈر کرنل کارمانگیل ہاتھ کو بھی علم ہو چکا تھا۔ وہ اسی اپریل کو انگلینڈ سے تازہ دم میرٹھ میں تعینات ہو کر آیا تھا۔ اسے سپاہیوں کا یہ طریقہ عمل پسند نہ آیا۔ اسے لگا کہ نئے کارتوسوں پر سپاہیوں کا اس طرح ناک بھوں چڑھانا بغاوت اور سرکشی کے مترادف ہے۔ فوج میں سرکشی سب سے بڑا جرم سمجھا جاتا ہے۔ وہ بڑے دنوں سے اس موقع کا منتظر تھا کہ کسی دن ہندوستانی فوجی اس کے سامنے ایسی نفرت کا اظہار کریں تو وہ انہیں سبق سکھا دے۔ بالآخر اسے یہ موقع بھی مل گیا۔ ایک دن اس نے تیسرے سوار دستے کو پریڈ پر بلایا اور کارتوس دینے سے پہلے انہیں تعین دلانے کی کوشش کی کہ۔۔۔

”کارتوس پر گائے یا خنزیر کی چربی نہیں لگانی جاتی پھر بھی اگر آپ لوگوں کو اس کا وہم ہے یا کسی نے تمہیں شک میں ڈال دیا ہے تو ان کارتوسوں کو دانت سے کاٹنے کے بجائے ہاتھ سے فوج کرا لگ کر دو۔“

سوار دستے کے سپاہیوں نے اس کی باتوں کو خاموشی سے سنا۔ جب کارتوس انہیں دیے جانے لگے تو دستے کے نوٹے سپاہیوں میں سے فقط پانچ سپاہیوں نے کارتوسوں کو پکڑا۔ بقیہ نے انہیں لینے سے انکار کر دیا۔ کرنل ہاتھ سپاہیوں کی اس خود سری پر حیران رہ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کی نافرمانی پر انہیں کڑی سے کڑی سزا دے تاکہ انہیں نافرمانی کی دوبارہ جرات نہ ہو لیکن فوجی اصول و ضابطے کے تحت وہ اپنے سینئر جنرل ہوگف کی اجازت کے بغیر کچھ کرنے سے قاصر تھا۔ وہ غصے میں کھولتا ہوا اپنے آفس میں چلا گیا اور پریڈ منسوخ کر دی گئی۔

یہ 6 مئی 1857ء کی وہی صبح تھی جس روز فضا سوگوار گنتی تھی۔ جیسے مین کر رہی ہو۔ ہر شے پر مردہ جھاتی ہوئی تھی اور فوجی بارکوں میں موجود سپاہیوں کے چہروں پر بھی خوف طاری تھا۔ لگ رہا تھا کہ آج کچھ ہونے والا ہے۔ سرایتیکی اور خوف بارکوں سے نکل کر شہر کے گلی کوچوں، پارکوں پر بھی قابض ہو چکا تھا۔ پھر بارکوں سے بات نہ جانے کس طرح

میں سارے عیش حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ شہر میں کئی ہفتوں سے طرح طرح کی افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ ملک میں کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ صاحب لوگ بھی ان افواہوں سے بے خبر نہ تھے۔ رات کے کھانے کے بعد جب ہندوستانی ملازم اور پنکھا قلی رخصت ہو جاتے۔۔۔۔۔ اور انگریز افسر اکٹھے بیٹھتے تو اکثر ان افواہوں پر تبصرہ ضرور کرتے۔ اپنی اپنی معلومات کا تبادلہ کرتے، شراب کے پیگ چڑھاتے باتیں افواہوں سے شروع ہوتیں اور جیسے جیسے نشہ چڑھتا جاتا افواہوں کی پریشانی تھمتھمتے اور جنول پر ختم ہو جاتی۔ ان گرم افواہوں میں ایک افواہ تھی کہ فوجیوں میں چچائیاں تقسیم ہو رہی ہیں پھر ایک اور افواہ یہ بھی گردش میں تھی کہ بارکوں میں ہندوستانی سپاہیوں کے تکیوں کے نیچے سے کنول کے پھول برآمد ہوئے ہیں۔ یہ کام کون اور کس مقصد کے لیے کر رہا تھا کسی کو معلوم نہ تھا۔

اس شام بھی کھانے سے فارغ ہو کر انگریز فوج کے نچلے درجے کے فوجی شراب پینے اور گھپیں لڑانے کو اکٹھے ہوئے تو ان میں سے ایک فوجی افسر نے اپنے سے جونیئر سے سوال کیا۔

”ولیم۔۔۔ تم جانتا۔۔۔ یہ چچائیاں کا کیا سلسلہ ہے؟“
”نوسر۔۔۔ سنا ہے وہ فریول کرتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”لگتا ہے۔۔۔ کہنی کی حکومت آنے سے انڈین گدھوں کو زیادہ بھوک لگنے لگی ہے۔۔۔۔۔ ایک اور نے جواب میں کہا تو سارے ٹھٹھار کے ہسنے لگے۔

”اور سنو۔۔۔ سنا ہے، بارک پور میں ان ہندوستانی فوجیوں نے کارتوس لینے سے انکار کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کارتوسوں پر لگی ہوئی چربی کی وجہ سے وہ انہیں اپنے منہ سے نہیں توڑیں گے۔“ کسی اور نے تبصرہ کرتے ہوئے بتایا۔

”ہمیں کیا۔۔۔ ہم تو شملہ جا رہا ہے۔ کل اپنے بچوں اور بیوی کو لے کر۔۔۔۔۔“ ان میں سے بڑے افسر نے قہقہہ لگا کر کہا۔
”ان حرام خوردوں کو پکڑ لیا گیا ہے اور سزائیں دے دی گئی ہیں۔“ کسی نے کہا۔

”کورت مارشل کرنا چاہیے تھا۔۔۔۔۔“ ایک بولا۔
پھر وہ سارے اپنی اپنی بولیاں اور رائے دیتے ہوئے اٹھ کر چلے گئے۔ میرٹھ کی فضاؤں میں اب آئے روز ایسی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔
میرٹھ میں فوجیوں کا تیسرا سوار دستہ سب سے بڑا اور

انمول موتی

☆ زمین والے تمہارا کچھ نہیں بڑھ سکتے اگر تمہارا تعلق آسمان والے سے پختہ ہو جائے۔ جب سجدے طویل ہو جائیں تو مشکلیں قلیل ہوجاتی ہیں۔
☆ جب انسان اپنی غلطی کا وکیل اور دوسرے کی غلطی کا جج بن جائے تو فیصلے نہیں فاسلے ہوجاتے ہیں۔

☆ زندگی سے پوچھا گیا سب کو اتنا غم کیوں دیتی ہو۔ زندگی بولی میں تو سب کو خوشی دیتی ہوں، پر ایک خوشی دوسرے کا غم بن جاتی ہے۔
☆ دوسروں میں جہالت تلاش کرنا جاہلوں کا کام ہے۔

☆ خوشی میں اللہ پاک کی تعریف کریں۔ مشکل میں اللہ پاک کو یاد کریں۔ خاموشی میں اللہ پاک کی عبادت کریں۔ تکلیف میں اللہ پاک پر یقین کریں ہر لمحہ اللہ پاک کا شکر ادا کریں۔

مرسلہ: راجحہ یحییٰ - سندھی ہوئی نیو کراچی

انتظامات ملل کر لیے گئے تو طرمان کو میدان میں لایا گیا۔ حسب سابق ان کی سزائیں پہلے انگریزی اور پھر اردو میں سنائی گئیں۔ سن رسیدہ سپاہیوں کو کالے پانی اور نو جوانوں کو دس، پندرہ اور بیس سال قید کی سزائیں دی گئیں۔ اپنے جرائم کے لحاظ سے سزائیں بے حد سخت تھیں مگر قیدیوں پر ان سزاؤں کا کوئی اثر نہ دکھائی دیتا تھا۔ وہ بڑے وقار اور ضبط کے ساتھ کھڑے رہے۔ جب دور سے جھٹکے ہوئے، بیڑیوں اور زنجیروں کی آوازیں سنائی دیں اور جب وہ پانچ چکیں تو قیدیوں کو حکم دیا گیا۔

”اپنے جوتے اتار دو۔“

مٹی کی تیز دھوپ اور پھیل میدان میں اب وہ ننگے پاؤں کھڑے تھے۔ قیدیوں کی سرکاری وردیاں لے لی گئیں اور انہیں عام کپڑے، جھٹکیاں اور بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ اس تمام عمل کو مکمل ہوتے ہوئے دن کے بارہ بج چکے تھے۔ ان قیدیوں کو انگریز فوجیوں کی نگرانی میں دوبارہ جیل مجبوا دیا گیا۔ ہندوستانی چٹان کے پاس سے جب یہ قیدی گزرے تو کئی مسلمان اور سکھ قیدیوں نے اپنے اپنے مذہبی نعرے لگائے اور کئی ایک نے پکار کر اپنے ساتھیوں کو کہا۔

”جھانٹیں ہمیں بھول نہ جانا.....!“

ان کے نعرے اور باتیں سن کر دیسی سپاہیوں میں

اکل کر شہر کے گلی کوچوں میں پھیل گئی۔ جو بھی سنتا۔ وہ ہندوستانی سپاہیوں کے اس اقدام کی تعریف کیے بتاتہ رہتا۔ لوگ سنتے، آگے سناتے اور فوجیوں کو شاباش دیتے۔

کرنل ایتھرنے اس واقعے کی اطلاع جنرل گف کو دی۔ جنرل گف نے اس واقعے کی سپہ سالار افواج کو رپورٹ کر کے اس سے مشورہ مانگا۔ فوج کے سپہ سالار نے معاملہ دیکھا۔ فوجیوں کا یہ رد عمل صریحاً انگریز افسروں کی حکم دہ لی تھا۔ وہاں سے ان فوجیوں کا فوراً کورٹ مارشل لے لے انہیں سخت سزائیں دینے کا حکم جاری ہوا۔ 7 مئی کو ان سپاہیوں کو گرفتار کر کے ایک پرانی عمارت میں ڈال دیا گیا۔ اس سے اگلے دن جمعہ تھا۔ اس روز ان قیدیوں کو بلایا گیا۔ اور ان سے انگریز افسروں نے اس عمارت کے کھلے کچن میں زمین پر بیٹھنے کو کہا جبکہ آفیسرز کے لیے کرسیوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایک دیسی سپاہی کے ہاتھ میں طومون کی لسٹ دے کر سب کو باری باری بلانے کا حکم دیا گیا۔ ”ماتا دین.....“ دیسی سپاہی نے پہلا نام پکارا۔ ماتا دین ایک سن رسیدہ سپاہی تھا۔ جو زمین سے بے مشکل اٹھا اور آفیسرز کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”ہاں تو ماتا دین تم کیا کہتا۔“ صاحب نے فرد جرم پہلے انگریزی اور پھر اردو میں پڑھ کے سنائی اور اس سے سوال کیا۔

”صاحب۔ میں نے یہ جرم نہیں کیا۔“ سپاہی نے دوسرا نام پکارا۔

”بلد یوسنگھ۔“ بلد یوسنگھ جلدی سے کھڑا ہوا۔

صاحب نے اس کی فرد جرم پڑھی اور اس سے بھی وہی سوال کیا۔ تو بلد یوسنگھ نے بھی صحت جرم سے انکار کر دیا۔ اس طرح تمام طومون کو ان کے جرموں کی تفصیل بتائی گئی مگر ان سب کا ایک ہی جواب تھا کہ: ”ہم نے ایسا کوئی جرم نہیں کیا.....!“

طومون کو دوبارہ حوالات بھیج دیا گیا۔

9 مئی کو فیصلے کا دن مقرر کیا گیا اور اس کے لیے بھی پریڈ کا میدان چنا گیا۔ چھاؤنی میں موجود تمام بارکوں سے دیسی اور انگریز فوجیوں کو میدان میں اس مقصد کے لیے لایا گیا کہ انہیں انگریزوں کی طاقت کا اندازہ ہو جائے اور آئندہ کے لیے وہ عبرت پکڑیں۔ میدان میں انگریزی دیتے سامنے کھڑے کیے گئے۔ ان کی رائفلیں بھری ہوئی تھیں۔ ان کے پیچھے توپ خانہ تھا اور توپ خانے کے پیچھے دیسی سپاہیوں کو کھڑا کیا گیا مگر ان کی رائفلیں خالی تھیں۔ جب سارے

وہ رات گئے تک یہی باتیں کرتے اور اپنے آئندہ لائحہ عمل کے بارے میں سوچتے رہے اور پھر انہوں نے مل کر فیصلہ کر لیا۔ ایک ایسا فیصلہ جس کی بازگشت پورے ملک کے کونے کونے میں سی گئی اور جس نے انگریزی اقتدار کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔

10 مئی کو دیہی ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔ میرٹھ کی چھاؤنی میں قتل و آتش زنی کا بازار گرم ہو گیا۔ سواروں کی تیسری رجمنٹ نے جیل کا رخ کیا۔ جہاں ان کے 85 رفقاء اسیر تھے۔ جیل کا پھانک توڑ دیا گیا۔ ان پچاسی قیدیوں کے ساتھ دوسرے قیدیوں کو بھی چھڑا لیا گیا۔ جن کی تعداد بارہ سو کے قریب تھی۔ ایک ہنگامہ بپا ہو گیا تو ایک طوفان کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

”لور کی عالی“ کان پور شہر میں طوائفوں کا ایک ایسا ہی محلہ تھا جیسے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بازار حسن، لڑکی بازار، رتن بازار کے ناموں سے قائم تھے۔ کان پور میں اس محلے کا نام لور کی عالی تھا۔ دوسرے شہروں کی طرح اس بازار میں بھی دو اقسام کی طوائفیں موجود تھیں۔ ایک گانے بجانے اور ناچنے والی اور دوسری جسم بیچنے والیاں۔ اگرچہ یہ ایک ہی محلے میں رہتی تھیں مگر الگ الگ دھندوں کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ ان کا کوئی رابطہ یا تعلق نہ ہوتا تھا۔ ناچنے گانے والی طوائفیں بے حد مہذب، تعلیم یافتہ اور خود کو دوسرے طبقے سے اس لیے بھی اعلیٰ سمجھتی تھیں کہ ان کے ہاں شرفاؤ اور امرا کے علاوہ نوابوں کے بچے تہذیب سیکھنے آتے تھے۔ ان طوائفوں کے اپنے اپنے الگ گھرانے اور ڈیرے ہوتے تھے اور ان ڈیروں کی مالکین جو بیٹے کے اعتبار سے خود بھی طوائفیں ہوتی تھیں، اپنے آپ کو خاتم کھلواتی تھیں۔ ہر خانم کے پاس ایک بڑا ڈیرا یا حویلی ہوتی تھی جس میں طوائفوں کے حساب سے کمرے ہوتے تھے، جن میں ان کی رہائش ہوتی تھی۔ خانم ان طوائفوں کی کفالت کرتی تھیں۔ باقاعدہ ان کے دھندے سے ایک مخصوص رقم ان کو دی جاتی اور باقی خانم اپنے پاس رکھتی تھی۔ پولیس اور انتظامیہ سے خانم رابطہ رکھتی تھی اور ہر اونچ نیچ پر خود ان کی ذمہ داری اٹھانی تھی۔

لور کی عالی میں ایسی ہی ایک خانم کی بڑی اور ٹھیکے دار حویلی میں ہر وقت طوائفوں کا ایک جھگڑا رہتا تھا اور اس کی خاص وجہ خانم کا رویہ تھا۔ وہ ہر ناچنے اور گانے والی کے ساتھ اپنے بچوں اور بہنوں کی طرح پیار کرتی اور ان کا خیال رکھتی

حرکت پیدا ہوئی تو ایک بڑے انگریز افسر نے برطانوی پلٹن کے سپاہیوں کو تیار ہو جانے کا حکم دیا۔ بے بس فوجیوں کا اضطراب ختم ہو کر رہ گیا۔

ذلت اور حقارت کے یہ تلخ گھونٹ پی کر جب دیہی سپاہی اپنی بارکوں میں پہنچے تو ان کے دل بڑے پوچھل تھے اور ان کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اس روز شام تک وہ اپنے کھولتے ہوئے ذہنوں کو لے کر بارکوں میں پڑے رہے۔ جب شام کو وہ اپنا غم غلط کرنے بازار کی طرف نکلے تو عورتوں نے انہیں دیکھ کر طعنے دینے شروع کر دیے۔

”تم جوڑیاں پہن لو..... اور یہ رانگلیں ہمیں دے دو.....!“ ایک عورت نے طنزیہ انداز میں آواز دے کہا۔

”کیا تم ایسے مرد ہوتے ہیں۔ لعنت ہے تم پر..... تم سے زیادہ غیرت تو زنخوں میں ہوتی ہے۔ تمہارے سامنے تمہارے ساتھیوں کو سزا کیسے ملیں اور تم خاموشی سے سنتے رہے.....!“ دوسری عورت آگے بڑھ کر بولی۔

انگریز تمہیں پکڑنے آ رہے ہیں.....!“

اس کے بعد وہ زہریلی اور طنزیہ ہنسی بننے لگیں۔ ایک تو دیہی سپاہیوں کے دل دو ماخ پہلے سے کھول رہے تھے۔ اوپر سے عورتوں کے طعنے سن کر وہ پوچھل قدموں سے دوبارہ بارکوں میں پہنچے تو انہیں واقعتاً اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی اور یہ 9 مئی کی رات ان کے لیے بڑی تکلیف ثابت ہوئی۔ انہیں وہ رہ کر اپنے ان ساتھیوں کا خیال آ رہا تھا جنہیں اس قیامت خیز گرمی میں جیل کی کھڑکیوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ ان میں سے کئی ایک کو کچھ دنوں کے بعد کالے پانی پیچھ دیا جائے گا۔ جہاں سے آج تک کوئی قیدی زندہ بچ کر نہیں پلٹا۔

پھر انہیں خیال آتا کہ اتنی وفاداری کی سزا یہ قید و بند کی صعوبتیں اور یہ کالا پانی ہی تھا تو لعنت ہے ایسی وفاداری پر..... اور ایسی نوکری کرنے سے فائدہ جس میں صرف ذلت ہی ذلت ہو..... لیکن اس کے ساتھ ہی انہیں اپنے بال بچوں کا دھیان بھی آ جاتا اگر وہ نوکری چھوڑتے ہیں تو ان کا گزارہ کیسے ممکن ہوگا۔ وہ اور ان کے خاندان بھوکے مرجائیں گے لیکن پھر وہی خیال انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا..... کہ ذلت کی زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ غلامی کی یہ سختیاں اور ڈٹیں کب تک برداشت کرتے رہیں گے۔ مرنا تو انہیں ہے ہی..... پھر ایک ہی بار کیوں نہیں۔

تھی۔ اسی خانم کی حویلی کے ایک کمرے میں کان پور کی مشہور مغزیہ حسن بانو کو ہر ہائش رکھتی تھی۔ اس کا اصل نام تو حمیدہ بانی تھا لیکن عرف عام میں اسے حسن بانو کو ہر کہا جاتا تھا۔ اس کی ساس مذہباً ہندو تھی۔ کہا جاتا ہے کہ پھر اس نے کسی مولوی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا اور مسلمان ہو گئی تھی۔

خانم اس کو بے حد چاہتی تھی کیونکہ خواص میں اس کی پذیرائی دوسری گانے اور ناچنے والیوں سے زیادہ تھی۔ اس کے گلے میں جیسے شیرینی اور آواز میں ایک جادو تھا جس کا ہر کوئی اسیر تھا۔ نوابین کے بگڑے بچوں، رئیس زادوں اور امیروں کا ایک تاننا بندھا رہتا تھا۔ جب اس کا دربار لگتا تھا۔ پچھلے کچھ دنوں سے اس کی طبیعت طویل تھی، جس کی وجہ سے خاصاً وہ بار بھی نہیں لگ رہا تھا۔ خانم کو اس کی وجہ سے خاصاً

الغصان تھی اور ہاتھ اس لیے ابھی اس کی سمت کی بہت لڑائی ہو رہی تھی۔ نواب ابھی ایک ایڈی ڈالٹر سے اس کا علاج ہال رہا تھا تو اغشاف ہو کر وہ حاملہ ہے۔ یہ سنتے ہی خانم کا ہاتھ ٹھنکا۔ نہ جانے کتنے دن اور اب انتظار کرنا ہوگا۔ جب یہ خبر حویلی میں موجود دوسری طوائفوں کو لگی تو حویلی میں طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور اندازوں کی کندیں مختلف آتے جاتے نوابوں، رئیس زادوں پر ڈالی جانے لگیں۔ ان میں اب باقاعدہ شرطیں لگنے لگی تھیں کہ حسن بانو کو ہر کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوگی یا بیٹے کی۔

بازار حسن کا ہمیشہ سے یہ اصول رہا ہے کہ یہاں کی طوائفوں میں ہمیشہ لڑکی کی پیدائش کو نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ اس دن بھی حویلی کی ساری نوچیاں خانم کے گرد بیٹھی ہنسی مذاق اور ایک دوسرے سے تھیز چھا لڑ رہی تھیں۔ خانم الگ اپنی گڑگڑائی (چھوٹا حقہ) لیے بیٹھی تھی اور انہیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ حسن بانو کو ہر کو انہوں نے گھیرے میں لے رکھا تھا اور اس کے ساتھ مذاق کر رہی تھیں۔

”اللہ نے بیٹی کا منہ دکھانا ہے۔“ ان میں سے ایک بولی۔ ”میری پیش گوئی بھی غلط ثابت نہیں ہوتی۔“ ابھی اس کی بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ ایک چلبلی سی نوچ بیوی۔

”ہاں..... ہاں اس کی پیش گوئی بھی غلط نہیں ہوئی کیونکہ اس نے اپنی اماں کے بارے میں بھی پیش گوئی کی تھی۔ سچی تو یہ خود پیدا ہوئی تھی۔“

اس بات پر وہ ساری ہلکھلا کر ہنس دیں۔ خانم بھی طرائے بنانہ رہ گئی۔

”خانم..... اگر حسن بانو نے لڑکی کا منہ دکھایا تو ہم

آپ سے مضائقہ نہیں ہے۔“

”اللہ تمہارے منہ میں کبھی شکر ہو..... بہت مضائقہ بانوں کی.....“ خانم نے ہنس کر جواب دیا۔

بات ان سے نکل کر اب چلیجیوں اور سازندوں تک پہنچ گئی تھی۔ اسی شام ایک دوسری نوچ بیوی کا دربار لگنے سے پہلے انہوں نے خانم کو گھیر لیا۔ خانم کو ان سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔

”اللہ بیٹی کا منہ دکھائیں.....“ ایک بولا۔

”چاندنی بیٹی آپ کی گود میں اترے ہماری دعا ہے.....“ دوسرے نے دعا دی۔

”مگر خانم..... ہم اپنا حق اور نیک ضرور لیں گے۔“ ان سب کا مطالبہ تھا۔

”ضرور ملے گا دادا..... سب کو ملے گا۔ اللہ میری سن ہانو کو وہ دن دیکھنا نصیب کرے۔“

پھر وہ شہ گزری بھی آگئی۔ اس روز صبح سے ہی علاقے کی ڈالٹر نے خانم کی حویلی کے چکر لگانے شروع کر دیے تھے۔ وہ بھی کوئی دوا لے کر آتی اور بھی کوئی نصیحت کر جاتی۔ اسی شام حسن بانو کو ہر کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی تو حویلی میں ایک جشن کا سانس بندھ گیا تھا۔ ہر چہرہ خوشیوں سے دمک رہا تھا اور ہر نوچ بیوی بار بار آ کر حسن بانو کو بیٹی کی پیدائش پر مبارک بادوں سے رعبی تھی۔

”لڑکی اتنی خوبصورت تو نہیں..... ایک نے دوسری کو بتایا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ نواب وحید الزماں کے چہرے بشرے پر گئی ہے۔ پہلے دن سے اس کی چٹکی کھاتی تھی۔“

”اری جا..... نواب کا چہرہ اتنا بڑا بھی نہیں۔ میں نقش خوبصورت ہیں۔ صرف رنگ کے سانولے ہیں!“ دوسری نے جواب دیا۔

”ہائے میرے اللہ..... تو بھی اس کی چاہنے والی نکلی...“

..... اسی نے اس کی کمر پر دھول جتاے ہوئے کہا۔

بیٹی کی پیدائش پر خانم نے پوری برادری میں مضائقہ بانٹی بلکہ اپنی حویلی کی نوچیوں اور سازندوں میں درجہ بدرجہ انعامات کی بھی بارش کر دی۔

”اللہ میری چاندنی بیٹی کو لمبی عمر دے.....“ خانم نے بیٹی کو گود لیتے ہوئے دعا دی۔

”خانم بیٹی کا نام تم نے ہی رکھنا ہے.....“ حسن بانو کو ہر نے تحیف آواز میں کہا۔

”ہاں..... ہاں کیوں نہیں..... میری بیٹی کا نام عزیز النساء ہوگا..... اور میں اس کی پرورش، تربیت میں کوئی فرق

نہیں آنے دوں گی۔ چہرے آفتاب اور چندے ماہتاب ہوگی میری بیٹی..... اور دیکھنا حسن یا تو تمہاری طرح اس کے گلے میں بھی کوئل بولے گی۔“

عزیز النساء ابھی بہ مشکل سے چند دن کی ہوئی تھی کہ ایک روز حسن بانو کی طبیعت بے حد خراب ہوگئی۔ علاقے کی ڈاکٹر نے اپنی سی تمام تر کوشش کر دیکھی مگر اس کی طبیعت سنبھلنے لگی نہیں سنبھل رہی تھی۔ ناچار اسے شہر کے ایک بڑے اسپتال میں لے جایا گیا۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے بھی علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

اسپتال میں حسن بانو کو لائے ہوئے دو ہی روز گزرے تھے جب اس نے موت کو گلے لگایا۔

خانم کی حویلی میں ایک کھرام سا بچہ ہو گیا تھا۔ ہر آنکھ اٹکبار اور ہر سینہ ماتم کنناں تھا۔ لور کی عالی محلے کے جس جس گھر میں بھی یہ خبر پہنچی، انہوں نے اپنے اپنے طور پر اس صدمے کا بہت اثر لیا۔ حسن بانو کو ہر گھنٹی ہی اس قدر اخلاق اور شرافت کا پیکر کہ کتنے دنوں تک خانم کی حویلی میں اس کا سوگ منایا جاتا رہا۔

”جس بنالوگو ہر کی بیٹی نہیں میری اپنی بیٹی ہے“ خانم کے یہ دعوے سن کر لوگ کہنے لگے تھے کہ خانم پر حسن بانو کی بے وقت موت کا تھوڑی دیر کے لیے اثر ہے۔ پھر یہ آہستہ آہستہ خود ہی ختم ہو جائے گا مگر خانم نے اپنا کچھ کر دکھایا۔ اس نے عزیز النساء کو اپنی بیٹیوں کی طرح پالا اور اس کی تربیت میں بھی کوئی کمی نہ رہنے دی۔ عزیز النساء خانم کی اس قدر چیتھی تھی کہ حویلی میں موجود دوسری نوچیوں کو لگتا تھا کہ یہ خانم کی سگی بیٹی ہے۔ وہ بھی بھی خانم کی تک چڑھی۔

جب ذرا عمر کی سیزھیاں چڑھتے شعور کو پہنچی، تو اس کو اور بھی یقین ہونے لگا تھا کہ لوگ ایسے ہی اسے کسی اور کی بیٹی کہتے ہیں۔ وہ اصل میں خانم ہی کی بیٹی ہے اور خانم شخص دوسری طوائفوں کی طرح اپنی عمر چھپانے کی خاطر اسے کسی اور کی بیٹی بتاتی ہے۔ وہ حویلی میں موجود دوسری نوچیوں پر اپنا رعب بھی جماتی اور بعض اوقات تو ان کے کسی مذاق پر باقاعدہ انہیں ڈانٹ بھی دیتی تھی۔ جب اس کی تربیت مکمل ہوئی، موسیقی کی تعلیم بھی پوری ہوئی تو ایک روز..... عزیز النساء کی زندگی کا پہلا باقاعدہ دربار چایا گیا۔ عزیز النساء کے گلے سے کوئل کی طرح آواز نکلتی تو دربار میں ہر بیٹھا ہوا شخص جھوم جھوم گیا۔ اس کی ایک ایک تان، لپٹے اور گلے سے نکلنے والی مریکوں نے تو گو یاد رہی لوٹ لیا پھر بھی عزیز النساء اسی دن سے عزیزن کے نام سے شہرت سنبھل گئی۔

☆☆☆

توپوں میں سے چار توپوں کو انگریز سپاہی..... دھکیل کر میدان کے درمیان لائے۔ جھکڑیاں لگے چار سپاہیوں کو ان کے دہانوں سے باندھنے کے لیے ان کے ہاتھوں کی جھکڑیاں کھول دی گئیں اور انہیں پیچھے باندھا پھر توپوں کے دہانے سے باندھ کر انہیں سر کرنے والے تھے کہ باقی کھڑے سپاہیوں میں سے چار سپاہی آگے بڑھے۔ باقی سپاہیوں کو محض اس لیے میدان میں لایا گیا تھا کہ وہ ان قیدیوں کو نکلنے والی سزا سے عبرت حاصل کریں۔ ان اسیر قیدیوں میں سے وہ چاروں آگے بڑھے۔ باقی 24 سپاہی طنزوں کی صف میں اسی طرح کھڑے تھے۔ وہ چاروں بڑی ہمت اور بہادری سے آگے بڑھ کر بولے۔

”میدان جنگ میں ہم نے ہمیشہ پیش قدمی میں پہل کی ہے اور سب سے آگے رہے ہیں۔ اس لیے آج بھی یہ سعادت ہم کسی دوسرے کو نہیں لینے دیں گے..... پہلے ہمیں توپ دم کیا جائے!“

انگریز توپیلے ہی دیکھی سپاہیوں میں پلٹنے والے بغاوت کے حربوں سے تنگ آئے ہوئے تھے اور انہیں سخت سے سخت سزا میں دے کر انہیں دباننا چاہتے تھے۔ انگریز انفر ”مز“ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً اپنے سپاہیوں کو حکم دیا اور پہلے سے بندھے سپاہیوں کو کھول کر ان جو شیشے سپاہیوں کو توپوں کے دہانوں سے باندھ دیا۔ اس نے توپوں کو اشارہ کیا اور توپیں داغ دی گئیں۔ جوانوں کے جسموں کی بونیاں اڑ کر میدان میں دو دو ریتک بکھر گئیں۔ ان کے بعد دوسرے سپاہیوں کو بھی یہی سزا دی گئی۔ یہ واقعہ چھپرہ کے میدان میں پیش آیا جس کی اطلاع پورے ملک میں پھیل گئی۔

دیکھی فوج نے انگریزوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا۔ ان کی وفاداری، مردانگی اور اپنے کام سے محبت کے واضح ثبوتوں کو بھی انگریزوں نے وقت آنے پر پس پشت ڈال دیا اور اس کے صلے میں دیکھی فوج کو کیا دیا گیا۔ ظالمانہ سزائیں، تشدد کے واقعات یہی وہ اسباب تھے جو 1857ء میں دیکھی سپاہیوں کی بغاوت کا سبب بنے۔ انگریزوں نے دیکھی سپاہیوں پر میدان جنگ میں تو اعتماد کیا لیکن عام حالات میں نظم و ضبط کے نام پر ان کے مذہبی معاملات میں مداخلت کرنے سے گریز بھی نہیں کیا۔ انہیں انگریز فوجیوں کے مقابلے میں کم رعایتیں دیں اور وہ بھی آہستہ آہستہ چھین لیں۔ چھپرہ میں ان دیکھی سپاہیوں کا

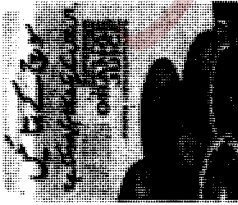
مرکز نام تجویز کرنے پر جیسے 1300-CC کار

ان تینوں سے کسی ایک پر ☒ کا نشان لگائیں۔ یا خود تجویز کریں۔

FRUITY JUICE

SKY JUICE

KING JUICE



دوسرا انعام موثر سائیکل

تیسرا انعام LCD سونی

اس جوش کے پکٹ کا نام تجویز کریں

اور جیتیں بے شمار انعامات

2

شناختی کارڈ نمبر

١٠

المذبح

یانا م خود تجویز کریں

اور بھیہیں ایریا BOX P.O 167 گوجرانوالہ

مقدمہ چل رہا تھا۔ انہوں نے بھی کم تنخواہ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ہڑتال کی تو دیسی سپاہیوں میں سے انگریز افسر نے 24 سپاہیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ فوجی عدالت نے انہیں توپ دم کرنے کی سزا دی۔ سزا دینے کے بعد انگریز افسر کو خیال آیا کہ دیسی فوج میں کہیں پھر سے اشتعال نہ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ ان سے ہتھیار لے لیے گئے اور گورافوج کو حکم ملا کہ توپوں کے دہانے ان کی طرف موڑ دیے جائیں تاکہ ان میں ہمت نہ ہو کہ اپنے ساتھیوں پر ہونے والے وحشیانہ ظلم کو دیکھ کر وہ پیش قدمی کر سکیں۔ اگر ایسا کریں تو ان پر گولہ باری شروع کر دی جائے۔ دوسری چھاؤنیوں میں بھی دیسی سپاہیوں کو بغاوت کرنے پر یہی سزا دی گئی۔

یہ وہی فوجی تھے جنہوں نے ارکاٹ کے محاصرے میں خود چاول کی پیچھے پی کر راتیں گزاری تھیں اور انگریزوں کو چاول کھلائے تھے۔ 1824ء میں پہلے بھی ایک بار اسی بارک پور کی چھاؤنی میں دیسی سپاہیوں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا تھا۔ ان سپاہیوں کو حکم دیا گیا تھا کہ برما کے محاذ پر جانے کے لیے وہ اپنا سامان خود اٹھائیں۔۔۔

.... اور بار برادری کے مصارف اپنی جیبوں سے ادا کریں، اسیر دیسی سپاہیوں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تھا۔

”ہمارے ساتھ ملک سے باہر جانے کا معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اگر ہمیں باہر بھجوانا ہے تو دو گنا جہت ملنا چاہیے کیونکہ ملازمت کا اصول بھی یہی ہے“ بات مکنا نذر انچیف ایڈورڈ ہنٹ تک پہنچی تو فوراً وہ چھاؤنی میں پہنچا۔

”کیا مسئلہ ہے؟“ اس نے دیسی سپاہیوں سے پوچھا۔

”سر..... ملازمت دینے وقت ہمارے ساتھ اس طرح کا کوئی معاہدہ ہوا تھا کہ ہمیں لڑنے کے لیے ملک سے باہر بھیجا جائے گا؟“

”تو..... پھر اب.....؟“ وہ غصے سے دباڑا۔

”اگر بھجوانا ہے تو ہمیں اس سے بھی انکار نہیں مگر ہمیں اس کا دو گنا جہت دیا جائے۔“ فوجیوں نے دلیل دی۔

”اڑا دو..... ان کمینڈوں کو..... حکم عدولی کرتے ہیں سالے“

اس کے حکم پر توپوں اور انٹکوں کی گولیوں کی ان پر بو چھا کر دی گئی۔ بیشتر سپاہی مارے گئے جو باقی اپنی جانیں بچانے کو دریا میں کودے، وہ وہیں ڈوب کر ہلاک ہو گئے۔ ان واقعات کے علاوہ اور بھی کئی ایسی مثالیں موجود تھیں جب سپاہیوں کو زائد تنخواہیں یا مراعات مانگنے پر سرعام درختوں پر سولیاں دے دی گئیں۔

اس کے علاوہ ہندوؤں، سکھوں اور مسلمان سپاہیوں کے مذہبی معاملات میں دخل اندازی کرنے کی مثالیں موجود تھیں۔ انہیں انگریز فوجی وروی پسینے پر مجبور کرنا، پکڑیوں کی جگہ ٹوئیاں پسینے، سکھوں کو ہندوؤں کی طرح بالیاں پسینے اور ماتھے پر تلک لگانے کے احکام جاری کرنا، مسلمانوں اور سکھوں کو ڈاڑھیاں منڈوانے پر مجبور کرنا اس میں شامل تھا جس کے نتیجے میں دیسی سپاہیوں میں ابتدا ہی سے انگریزوں کے خلاف بددلی اور شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ جو آہستہ آہستہ سنگت کے بعد 1857ء میں شعلہ بن کر بھڑکی۔ ان سپاہیوں نے انگریز حاکموں کے طرز عمل کے خلاف بھی اعلانِ احتجاج کیا اور بھی سازش کی، کبھی مکا نڈا ایکشن کیا اور کبھی سامنے آ کے مقابلہ کیا، پتھر میں فوجیوں کا مقدمہ.....

ویلور کی بغاوت، بارک پور میں اعلانِ بغاوتی کا مظاہرہ، پنجاب میں فوجیوں کے مقدمے اس کی بین مثالیں تھیں۔

فوجیوں میں یہ احساس محرومی بھی پروش پا رہا تھا کہ انگریز فوجیوں کے مقابلے میں ان کی تنخواہوں، الاؤنسز اور مراعات کم رکھ کر ان سے نا انصافی کی جا رہی ہے۔ جلتی پر تیل کا کام بارک پور میں چربی لگے کارٹوسوں کی قسم تھی جس پر یہاں کے فوجیوں نے بغاوت کا علم بلند کیا پھر دوسری چھاؤنیوں میں آگ بھڑکی اور آخر میں میرٹھ تک اس کے شعلے جا پہنچے۔

بارک پور میں دیش منگل نامی سپاہی کے ہمراہ دوسرے سپاہیوں نے اتوار 29 مارچ 1857ء میں انگریز جنرل ہیرس پر گولی چلانا چاہی اور دوسرے انگریز افسروں کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا تو دیش منگل پا نڈے پر مقدمہ چلا کر دوسرے دن اسے بھائی دے دی گئی۔ اس کے ساتھی ایٹوری پا نڈے کو بھی بھائی دے دی گئی۔ اس حادثے کے بعد گورنر جنرل کے حکم سے 34 ویں دیسی رجمنٹ توڑ دی گئی۔ بارک پور میں اس رجمنٹ کی سات کمپنیاں تھیں جنہیں ایک ساتھ ختم کر کے اس کے سپاہیوں کو دوسری رجمنٹوں میں بھیج دیا گیا۔ یہ سپاہی جن رجمنٹوں میں بھی پہنچے، بغاوت کی اڑٹی چنگاریاں اپنے ساتھ وہاں تک لیتے گئے۔ کارٹوسوں کا اشتعال انگیز معاملہ، ظالمانہ سزاؤں کے دیے گئے احکامات کے خلاف نفرت ان کے ساتھ ساتھ دوسری فوجی چھاؤنیوں تک بھی پہنچ گئی۔

اس طرح اب معاملہ صرف فوجیوں کی حد تک نہ رہا تھا۔ اس کی بجائے عوام تک بھی پہنچ چکی تھی اور جگہ جگہ انگریز حکومت کے خلاف سرکوشیوں کی ابتدا ہو چکی تھی۔ گلیوں،

1857ء کی جنگ آزادی میں کمپنی بہادر کے خلاف مورچا لگانے کی ٹھانی۔

☆☆☆

عزیز بن بانی جوان کیا ہوئی، خانم کے دوبارہ سے دن پھر گئے۔ حسن بانو کو ہر کی وفات سے جس کام پر زوال آ گیا تھا، وہ عزیز بن بانی کے دربار لگانے سے بڑی تیزی سے نہ صرف بحال ہو گیا بلکہ وہ پہلے سے زیادہ بڑھنے لگا۔ عزیز بن بانی کا دربار ہر روز لگتا اور اس کے تماشا بینوں میں دن بدن اضافہ ہونے لگا تھا۔ عزیز بن بانی کو ناپتا تو نہ آتا تھا۔ البتہ گائیکی میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اس کے گلے میں اللہ نے لوح بھرا ہوا تھا۔ کوئی کی طرح کوئی آواز میں جب وہ گیت شروع کرتی تو سننے والے اس پر واہ واہ کرتے نہ سکتے تھے پھر عزیز بن ویسے بھی اپنی ساتھیوں میں مقبول تھی۔ حویلی میں رہنے والی دوسری بچھیوں پر اس کا خوف اس لیے بھی بھارتا کہ وہ خانم کے زیادہ نزدیک تھی بلکہ حویلی میں آنے والے نئے لوگوں کو تو یہ پتا تھا کہ عزیز بن بانی خانم کی بیٹی ہے اس لیے وہ بھی اس کا بے حد احترام کرتے تھے۔

جیسے جیسے زمانہ بیتا جا رہا تھا، عزیز بن بانی کے جوہن پر بھی نکھار آتا جا رہا تھا پھر تہذیب و تمدن تو زمانے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اب لکھنؤ کی طرح کان پور کے نواب اور رئیس زادوں میں شہدہ بین آنے لگا تھا۔ وہ بھی اب بچھیوں اور طوائفوں کو ایک دوسرے کے مد مقابل لا کر ان کے فن کو پر کھنے لگے تھے بلکہ بعض مغلطو ایسا کرتے ہوئے باقاعدہ مزے لینے لگے تھے۔ عزیز بن بانی کو جب اس بات کا پتا چل جاتا تو وہ دربار کرنے سے گریز کرنے لگتی تھی۔ پہلے پہل ایک دوبار ایسا ہوا تو خانم نے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”جان کیوں گھبراتی ہو۔ باہر دربار کرنے میں تمہارے ساتھ ہی تو جاتی ہوں.....!“

نواب وجاہت مرزا ان دنوں تازہ تازہ اپنے والد کی بے پناہ دولت کا اکیلا وارث بنا تھا۔ نوجوان تھا، اس لیے بہت جلد بری سوسائٹی میں بیٹھنے کی وجہ سے مقبول ہو گیا، پھر ایک ایسا وقت بھی آیا جب کان پور کی کوئی مچی ایسی ہو گی جو نواب وجاہت مرزا کو نہ جانتی ہو۔ طوائفوں کے تو کوٹھے اس کی وجہ سے آباد ہونے لگے تھے۔ وہ بغیر بازی اور مرغوں کی لڑائی کا دلدادہ تھا۔ ایک روز نہ جانے اس کے من میں کیا آئی اس نے گھر پر جشن منانے کی ٹھانی اور کان پور کی مشہور بانی شرفن کو دربار کے لیے مدعو کیا..... اس کے ساتھ ہی عزیز بن بانی کو بھی بلا لیا۔ اگرچہ عزیز بن بانی نے دربار

مخلوں، شاہراہوں اور چوکوں پر انگریز فوجیوں کے رویے کے خلاف لوگوں میں اشتعال اور نفرت پانی جانے لگی تھی۔ لوگوں کے ذہنوں میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات بڑھتے چلے گئے کہ یہ سپاہی نہ صرف ان کے وطن ان کے دیس کے رکھوالے ہیں بلکہ شہریوں کی جان مال اور عزتوں کے بھی محافظ ہیں۔

اوپر سے لگائے گئے فوجی اپنی محرومیوں کی داستانیں لے کر جہاں بھی گئے، انگریز حکمرانوں کے خلاف نفرت میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ میرٹھ کے جن 85 سپاہیوں کو بیڑیاں پہنائی گئی تھیں... ان کی وجہ سے میرٹھ میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی اور انہوں نے انگریز حکمرانوں کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز کر ڈالا تھا۔ فوج تو فوج عوام لے ساتھ بھی ان کا ملک ظالم تھا۔ انگریز کی عمل داری میں لگی ہوئی تھی۔ انہوں نے ہندوؤں میں لوبی بھائی بنائیں تو انہوں نے ہاں اپنے ملازموں کے ذریعے گاؤں گاؤں لگان بھی اٹھاتا شروع کر دیا۔ حکومت ان کی بھی، سکہ ان کا چلتا تھا، حاکم، منج، پولیس، بابوٹھی کیا..... سب ان کے ماتحت تھے۔ اس لیے انہیں پوچھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ وہ جس طرح چاہتے دھونس زبردستی بے چارے عوام سے لگان اٹھا کرتے۔ ان کی دیکھا دیکھی سود خور مہاجنوں نے بھی من مانی کرنا شروع کر دی تھی۔ وہ بھی اپنے ہر کاروں اور ملازموں کو اپنے دیے گئے قرضے واپس لینے کو گاؤں اور دیہاتوں میں بھجواتے اور... ادا بھی نہ کرنے والوں پر بے تحاشا مظالم ڈھاتے، جس کی انہیں کھلی چھٹی تھی۔

انگریز حکمرانوں سے بے زاری اور نفرت کے محرکات مختلف علاقوں اور طبقوں میں الگ الگ تھے۔ کوئی ریاست کی مضبوطی پر خفا تھا، کوئی پنشن کی بندش پر ناراض تھا، کسی کو انگریزوں کی وعدہ خلافی پر غصہ تھا، کسی کو جاگداد کے نکل جانے کا غم تھا، کسی کو فارسی کی جگہ انگریزی زبان کے رائج ہونے کی شکایت تھی، کوئی عدالت اور جیل کے قوانین کو ناپسند کرتا تھا۔ علمائے کرام فرنگیوں کو اسلامی اقتدار کے دشمن جانتے تھے۔ عوام ٹیکسوں اور محصولات کے بوجھ تلے دبے کراہ رہے تھے اور فوجی انگریزوں کی نسلی منافرت اور دوسری بدسلوکیوں سے بیزار تھے۔ غرض ان گنت وجوہات اور بے شمار اسباب تھے، جو انگریزوں سے نفرت کا سبب بنے ہوئے تھے جس کی وجہ سے بغاوت نے جنم لیا۔ گویا چپاتی تو ایک علامت تھی، زندگی اور زندہ رہنے کی..... ایک کنایہ تھی تہذیب اور تاریخ کا جس نے

کرنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا تھا کہ وہ باہر دربار نہیں کرے گی... مگر نہ جانے وجاہت مرزا نے خانم کو کیا سکھایا تھا کہ خانم نے اس کے ہاں دربار کرنے کی ہامی بھری۔

اس رات نواب وجاہت مرزا کے دولت کدے پر بے شمار ڈنسا... امر اور اس کے ساتھی جمع ہو گئے تھے کیونکہ نواب وجاہت مرزا نے اس کی کشمیری انتہا کی بھی کان پور میں ایک ہی وقت میں دو بہترین گانے والیاں انھیں بوری تھیں۔ شرفن خود شعر کہتی تھی اور زیادہ تر دربار کرتے ہوئے اپنی ہی غزلیں گاتی تھی۔ اس نے دربار شروع کیا اور گت لگا کے اپنی غزل سنانا شروع کی مگر پتا نہیں شعروں میں کچھ جھول تھا یا گنگی میں لکڑھاٹٹ موجود تھی جو بری طرح سے محسوس ہو رہی تھی لہذا جلد ہی اسے ہٹا دیا گیا۔

اس کے بعد عزیزن نے گانا شروع کیا تو اس کی ابتدا سے ہی تماشا بینوں نے اپنی جیبوں کے منہ کھول دیے۔ اس کی اڑتی ہوئی تانوں اولیٰ بیٹیوں پر لوگ اش اش کر رہے تھے اور عزیزن بھی خوب مزے لے لے کر گارہی تھی۔ اس روز عزیزن کی شہرت چار دانگ پھیل گئی۔ اب کان پور میں ہر بندے کی زبان پر عزیزن بانی کا نام تھا اور ہوتا بھی کیوں نہ... اس نے کان پور کے سخن آشنا لوگوں کو یہ یاد کرادیا تھا کہ گنگی خدا کی دین سے اور یہ ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔

دربار لگا کر جب خانم اور عزیزن واپس لوٹیں تو خانم عزیزن بانی کے آگے پیچھے پیچھی جا رہی تھی۔ ”تم نہیں جانتیں۔ وہ سماں دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا جب عزیزن گارہی تھی تو یوں لگتا تھا جیسے آسمان سے حوریں اتر آکر اس کی سنگت کر رہی ہوں... ایک نور کی کرنیں تھیں جو عزیزن کے گلے سے نکل نکل بکھر رہی تھیں اور لوٹتے تھے کہ سنبھالے نہیں سنبھال رہے تھے۔ شرفن تو اس کی گت لگاتے ہی اٹھ کر چلی گئی تھی۔ تماشا بینوں نے ٹھٹھے مارے، فقرے اڑائے مگر وہ بھی کہ شرمندگی کے باعث کسی سے آنکھ نہیں مل رہی تھی۔ ہائے میرے ربا... دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا وہ منظر... آج میری بیٹی نے میری تربیت کی لاج رکھ لی۔ میں آج بہت خوش ہوں۔ جاؤ... وادائے کو اس کے سر کا صدقہ اتارے... اللہ میری بیٹی کو نظر بد سے بچائے۔“

اور حوٹلی کی ساری کچیاں حیران و پریشان خانم کی باتیں سن رہی تھیں۔

☆☆☆

چچائی کی کہانی کہاں سے اور کب شروع ہوئی... کچھ علم نہ تھا۔ صرف قیافوں کو بنیاد بنا کر اس کی...

بارے میں بیان کیا جاتا رہا مگر یہ حقیقت ہے کہ چچائی نے کبھی بہادر کے خلاف جتنا مضبوط مورچا بنایا کسی ہندوستانی نے نہیں بنایا۔ چچائی گاؤں گاؤں چکر لگاتی اور قریہ قریہ گھومتی پھری۔ چچائی کے بابے میں ہار شاہ ظفر کے طبیب حکیم احسن جاتے ہیں کہ چچائی کی تحریک اودھ سے شروع ہوئی۔ فریڈ آف انڈیا کے معصف رسل کا دعویٰ ہے کہ اس کی ابتدا ایک پنڈت کے مشورے سے راجا مادھو سنگھ نے کی۔ بہر حال یہ صرف اندازے تھے۔ حقیقت کوئی نہیں جانتا تھا لیکن اس کی توجیہات مختلف انداز میں کی جاتی ہیں۔ چچائی پہلے کس کھر سے نکلے اور کدھر روانہ ہوئی، کوئی نہیں جانتا۔ وہ نہ تو گرفتار ہوئی، نہ ہی اس پر پابندی لگائی جاسکی۔ وہ ایک نہ بھی، جو کسی کی پکڑ میں آئی۔ اس کے بے شمار روپ تھے، اس کے ٹکڑے ٹکڑے بھی کئے گئے لیکن اس کی پرت سے کوئی خفیہ پیغام نہ نکلا، اسے سکھا کر پیرا بھی گیا لیکن پھر بھی کبھی بہادر کو ماپوس ہونا پڑا۔

سال ۱۸۵۷ء میں تھرا میں بغاوت تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ ۱۰ مارچ کی آرمی تاریخیں تھیں۔ میں ایک روز دفتر پہنچا تو کیا دیکھا ہوں بیڑ پر نہایت گھنٹیا آنے کی بنی ہوئی چار چھوٹی مہواری اور سیڑھی روٹیاں دھری ہوئی ہیں جو اپنی بناوٹ اور موٹائی میں بسکت کی طرح تھیں۔ نقیض کی گئی، تو پتا چلا۔

”ایک گاؤں سے کوئی شخص آیا تھا اور چوکیدار کو اس ہدایت کے ساتھ ایک روٹی تھا کہ رخصت ہو گیا کہ ایسی ہی چار روٹیاں اور بنا کر قریہ گاؤں کے چوکیداروں میں بانٹ دو۔ انہیں بھی ایسا کرنے کی ہدایت کروینا۔ چوکیدار نے اس حکم کی تعمیل کی لیکن پولیس کو بھی تمام ماجرا سنا دیا!“

دوسرے دن ضلع کے دوسرے علاقوں سے بھی ایسی اطلاع ملی۔ مسٹر تھران کو چچائی پر کسی خفیہ اطلاع یا علامت کا شک نہ گزرا مگر عام لوگوں میں زبردست ہراس پھیلنے لگا اور احساس نفرت شدید ہونے لگا۔ پانی اور آٹے کو گوندھ کر ایک چپٹی سی روٹی وہ لوگ پکاتے اور اسے ایک ہر کارہ لاتا اور دوسرے اسے آگے بڑھا دیتے۔ لاڈ لیکنگ کے مطابق...

”ایک ہر کارہ اسے لے کر گاؤں کے چوہری کے پاس جاتا اور اس چچائی کو آگے بڑھانے کا کہا۔ اس طرح یہ چچائی جگہ جگہ پھرتی۔ کوئی بھی اسے لینے سے انکار نہ کرتا، کوئی شہ نہ کرتا تھا، کوئی سوال و جواب نہ کرتا۔ بیشتر لوگوں نے اسے انتہاء اور تیاری کا سگنل سمجھا۔ یعنی چچائی کا مقصد لوگوں کو خبردار کرنا ہے کہ کوئی زبردست بدھٹوئی ہونے والی ہے!“

1857ء کی جنگ میں لگتا ہے کہ یہ بھی چپانی کا بھائی بن گیا۔ بنگال کے لوگ جب آگرہ سرکار کے خلاف بغاوت کو اٹھتے تو کنول کے اس سرخ پھول نے باغی فوج کے ہر اول دستے کا کام کیا۔ وہ خفیہ پیغام رسانی کرتا۔ وہ غیر بنگالیوں کو یاد دلاتا کہ اب بنگال تمہاری نہیں غیروں کی ملکیت ہے۔ ہندوستان کی یہ روایت شروع سے ہی رہی ہے کہ ایک علاقے کے باشندوں نے کسی عملی قدم اٹھانے سے پہلے نہایت ہوشیاری سے لوگوں کو ایک ایسی ذہنی اور جذباتی فضا میں لاکر رکھ دیا کہ جہاں سے آگے کسی بھی منصوبے کی راہیں سازگار ہوتی چلی سکیں۔ ایسی فضا پیدا کرنے کے لیے لوگوں کی زندگی ہی کی کوئی نمائندہ چیز بطور علامت چن لی جاتی اور اسے آگے چلانے کے لیے کسی بھی شخص کے ہاتھ میں اسے تھما دیا گیا۔ لوگ اس شخص کو تھم بھول گئے لیکن وہ علامت گاؤں گاؤں اور ہاتھوں ہاتھ گردش کرتی رہی پھر کسی کو پتا نہ چلا کہ وہ شے..... پہلے اس شخص کی عملی اور کہاں کہاں پھرتی رہی۔ اس علامت سے اس کی عملی اقدام کا کوئی پتا چلا منشور نہ ہوتا تھا۔ یہ تو محض اشارہ تھی کہ آئندہ کچھ ہونے والا ہے۔

بنگال میں دوسرے ہندوستان کی طرح سرخ کنول کا پھول بھی خفیہ پیغام کی علامت بنا۔ جیسے ہندوستان میں چپائی علاقہ علاقہ سفر کرتی تھی، اسی طرح بنگال میں سرخ کنول کا پھول محو سفر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ.....

”ایک آدمی نظر آیا، اس کے ہاتھ میں سرخ کنول کا پھول تھا۔ یہ پھول اس نے (ہندوستانی) رجنٹ کے سالار کو دیا۔ سالار نے وہ پھول دوسرے فوجی کے حوالے کیا۔ اس کے بعد ایک پھر دوسرا اور پھر تیسرا لیتا گیا اور آگے بڑھتا رہا جب وہی پھول رجنٹ کے آخری فوجی کے ہاتھ میں پہنچا تو وہ آدمی پھول لے کر نظر سے اوجھل ہو گیا اور دوسری چوکی پر نمودار ہوا۔ ایسا لگتا تھا کہ بنگال میں کوئی فوجی دستہ کوئی چوکی ایسی نہ رہی ہوگی جہاں کنول کا پھول ہاتھوں ہاتھ گردش کرتا ہوا نہ پہنچا ہو۔ سازش کی اس سادہ علامت کی تشہیر اودھ پر کمپنی سرکار کے قبضے کے فوراً بعد شروع ہو گئی تھی!“

چپاتی کی طرح پھر ایک وقت میں بنگال سے نکل کر ہندوستانی فضاؤں میں بھی یہ پھول اپنے پیغام کی خوشبو پھیلانے کو نکل گیا۔ سرخ کنول کا پھول چپاتی کی طرح بے زبان تھا۔ خاموش تھا، وہ کیا کہتا تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا۔ ٹریولین (Trevelyan) اپنی کتاب ”کان بور“ میں لکھتا ہے۔

”کنول کے سرخ پھول نے سچ سچ تمام لوگوں کو یک
جان کر دیا تھا۔ اس لیے کہ بنگال میں سپاہیوں اور کسانوں کو

عام لوگوں کے خیال کے مطابق چپائی کا مقصد ان کے ذہنوں پر یہ اثر ڈالنا ہے کہ مغربی ان سے معاش کے ذرائع جھین لیے جائیں گے، اس لیے لوگوں کو متحد ہو جاؤ۔ دوسرے افراد نے اس تصور کو تقبیروں میں اڑا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ یہ ملکی باشندوں کی عام توہم پرستی سے زیادہ کچھ نہیں۔ چپائی کا یہ سفر کسی محدود علاقے تک نہ تھا۔ ہندوستان کے شمال، جنوب، مشرق اور مغرب میں..... جہاں جہاں ہمینی کی مکمل داری تھی اور لوگوں میں فرنگیوں کے خلاف کوئی جذبہ نہ تھا... وہاں یہ چپائی موجود ہوتی تھی۔ لارڈ کینگنگ کو پہلی کی سرگرمیوں کا علم شمال مغرب سے ہوا۔ شمالی ہند کے اکثر حاکموں نے اس کی شکایت کی۔ گوڑ گاؤں کے کلکٹر نے اپنی رپورٹ میں اس کی اطلاع حکومت کو دی تھی۔ حاکم نے یہ اطلاع اپنے درباریان نے رپورٹ کی۔ حاکم اور درباریان نے اس اطلاع کو سمجھتے ہی اس کے بارے میں رائے اور انداز لے کر نامہ نامہ خانہ پور تک پہنچانے لائے۔ لیکن نظام راج کا تھا لیکن لطف کی بات یہ مٹی کہ انگریز مہمدیہ ادارے کسی خطرے کی علامت نہیں سمجھتے تھے۔ اب یہ چپائیاں پنجاب تک بھی پہنچ چکی تھیں۔ اس میں مرحوم دربار لکھنؤ کا ہاتھ تھا۔ جھانسی اور بہار میں بھی یہی ہوا۔ سحر دی علاقے میں چپائیاں اس طرح تقسیم کی گئیں کہ ایک شخص افسرنے دیکھا۔ ایک ہرکارہ ہے جو روٹیوں کا پلندا پشت پر لٹکا ہے پھر رہا ہے۔ ایک جگہ لوگوں کا مجمع دیکھ کر اس نے دونوں توڑ توڑ کر تقسیم کرنی شروع کر دیں۔ افسرنے پوچھا کہ یہ کیا ہے.....؟ تو اس نے جواب دیا۔

”ہندوستان کی پرانی رسم ہے کہ جب کوئی مالک یا سردار اپنی رعایا سے کام لیتا چاہتا ہے تو ان کی وفاداری اور ساتھ حاصل کرنے کے لیے اسی طرح روٹیاں پختی جاتی ہیں جس نے روٹی کا ایک ٹکڑا قبول کر لیا، یوں جانو..... اس نے وفاداری کا حلقہ اٹھالیا“

افسر نے دوبارہ پوچھا۔ ”بھلا وہ کون سا کام ہے.....؟“
ہرکارے نے ایک پراسرار غم سے جواب دیا۔
”ابھی تو مجھے خود بھی معلوم نہیں!“

بغادت کا شعلہ بجڑکا، عدالتیں کلیں، سولیاں گاڑی گئیں، شہادتیں ہوئیں، لوگوں کو گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ سلطانی گواہوں سے لے کر انگریز مؤرخوں نے اپنے اپنے انداز سے لگائے لیکن چپائی پہلے بھی غلط نہ تھی، پھر بھی مہربہ لے رہی۔

سرخ کنول کے پھول کو بنگال کا پھول کہا جاتا ہے مگر

دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ کہہ رہے ہوں، یہ سب سرخ ہونے والا ہے۔ ان کی نگاہوں اور ان کی نظروں کو ایک جنبش سے غیر معمولی۔ پراسرار اور عین معانی محل جاتے تھے۔“

اس طرح چپانی کی طرح کنول کا پھول بھی اپنا خفیہ سفر جاری رکھے ہندوستان کے قریب قریب اور بچے بچے میں گھوم کر لوگوں کے ذہنوں اور دلوں میں نفرت کے شعلے بھڑکا رہا۔

☆☆☆

تانتیا ٹوپے ہمیشہ اپنا تعارف اس طرح کرتا تھا۔ ”میرا نام تانتیا ٹوپے اور میرے باپ کا نام بڈوگ ہے۔ میرا اصل وطن پرگنہ جو لا ضلع پٹوہ ہے لیکن میں بھور (کانپور) میں رہتا ہوں۔ میری عمر اس وقت چالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہے۔“

تانتیا ٹوپے مرہٹوں کے پیشوا ”نانا صاحب“ کا معمولی ملازم تھا۔ تانتیا کی سرگرمیوں کا آغاز کان پور پر انگریزوں کے قبضے کے بعد سے ہوتا ہے۔ نانا صاحب، بالا صاحب اور راجا صاحب بخور کو چھوڑ کر پور میں مقیم تھے کہ اطلاع ملی دہلی فوج کی رجمنٹ 42 شیوراج کھنچ گئی ہے۔ فوج نے نانا صاحب سے درخواست کی کہ کسی قابل اعتبار شخص کو ہمارے پاس بھیجا جائے نظر انتخاب تانتیا پر پڑی۔ تانتیا شیوراج سے اس فوج کو لے کر بخور گیا۔ جہاں انگریزی فوج سے کان پور کا قبضہ چھڑانے کے لیے لڑائی ہوئی۔ تانتیا ہار گیا اور وہ نانا صاحب سے چلا۔ بخور سے شکست کھا کر تانتیا نانا صاحب کے حکم پر گوالیار پہنچا اور وہاں کی فوج اپنے ساتھ مالٹی فوج کا کچھ حصہ کالمی کے مقام پر چھوڑا اور دوسرے حصے کے ساتھ کان پور پر حملہ کیا۔ کان پور میں انگریزی فوج کا چیف کمانڈر یورپی جنگوں کا شہرت یافتہ جرنل ویڈن تھا۔ جو کمانڈر... انجیف سرکولین کیمبل کے کھنڈے چلے جانے کے بعد باہر سے کمک حاصل کر سکتا تھا۔ کیمبل کو کھنڈے کے انقلابیوں نے مصروف کر رکھا تھا۔ تانتیا نے ویڈن ہم کی اس پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر اس پر حملہ کر دیا اور نصف کان پور کو انگریز کی عمل داری سے چھڑا لیا۔ اس معرکے کی تفصیل سے پتا چلتا ہے کہ تانتیا نے اپنی غیر منظم فوج کے ساتھ برطانیہ کے نامور کمانڈر اور اس کی بہترین فوج کو اپنی فہانت اور ہنرمندی سے زبردست شکست دی۔ ابھی جنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ خلاف توقع سرکولین کیمبل کھنڈے سے کان پور کھینچ گیا اور گیارہ روز کی اس جنگ میں بالآخر تانتیا کو شکست اٹھانا پڑی۔

تانتیا کو نانا صاحب کی طرف سے حکم ملا کہ چرکھاری

پر حملہ کر دو۔۔۔۔۔ جہاں کا راجا انگریزوں کا وفادار ہے۔ گیارہ روز تک تانتیا نے محاصرہ کیے رکھا۔ بعد میں راجا نے شکست قبول کر لی تو اور گرد و کے بہت سے راجے تانتیا کے ساتھ مل گئے۔ انہی دنوں جھانسی کی رانی لکشمی بائی کو انگریز فوج نے محصور کر لیا تو اس نے راجا صاحب سے امداد کی درخواست کی جو اس وقت کالمی کھنچ گئے تھے۔ تانتیا کو اس مہم پر مامور کیا گیا، جہاں اسے شکست ہوئی۔ اس کے بعد گوالیار پر حملہ کیا گیا جو کہ جھانسی کی رانی کی مدد سے تانتیا نے جیت لیا اور گوالیار پر قبضہ کر لیا۔ انگریز تانتیا کی وجہ سے بے حد پریشان تھے اور ان کی خواہش تھی کہ تانتیا کو کسی طریقے سے گرفتار کر لیا جائے۔ مراد اور کوئٹہ سرانے میں انگریزوں کے ساتھ جہازوں میں تانتیا کو شکست ہوئی۔ رانی لکشمی بائی انہی معرکوں میں ماری گئی۔ اس کے بعد تانتیا ادھر ادھر روپوش ہو گیا۔ اب وہ چھاپا ماروں کی طرح اچانک انگریزوں پر حملہ کرتا تھا پھر اس نے ادھر ادھر کے لوگوں کو اکٹھا کر کے چھاپا مار دیتے بنانا شروع کر دیے۔ اس کے لیے اس نے پورے وسطی ہندوستان، گجرات، راجستھان کے کئی چکر لگائے۔ کبھی کبھی اپنے ضلع کان پور میں بھی پہنچ جاتا۔ انگریزی فوج تانتیا کی گرفتاری کے لیے ایڑی چونی کا زور لگا رہی تھی لیکن تانتیا کو ہر جگہ عوام کا اعتماد حاصل تھا۔ اس لیے وہ ہر بار گرفتاری سے بچ جاتا تھا۔ بالآخر وہ پاروں کے جنگل میں روپوش ہو گیا۔

☆☆☆

باغی ہندوستانی سپاہی اپنی اپنی جگہوں اور اپنے محاذوں پر انگریزی سرکار کے خلاف کارروائیوں میں مصروف تھے۔ عوام کی نفرت میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا تھا مگر معاشرے میں کچھ ایسے بھی تھے جو ابھی تک انگریزوں کی حمایت میں تھے۔ یہ وہ طبقہ تھا جو انگریزوں کا مراعات یافتہ تھا یا پھر وہ رئیس تھے جو ابھی تک اپنی عیاشیوں میں مصروف تھے۔ نوابین کے بیٹے، ختم لڈھانے والے شہر شامل تھے اور ان کے لیے بازار حسن کی جگہ راتیں اپنی کہانیاں سنانے کو بے چین رہتی تھیں۔ جنگ آزادی کے دوران اور اس کے بعد انگریزوں نے ہندوستانی عوام پر جو مظالم توڑے ان کی داستان بڑی دلخراش ہے۔ کوئی شہر کوئی قصبہ، کوئی علاقہ ایسا نہ تھا جہاں درختوں سے لاشیں نہ لٹکائی ہوں۔ سڑکوں بے گناہ اور نہتے عریاں بچوں، بیٹاروں کو گولیاں مار کر ہلاک کر ڈالا، کچھ کو توپوں کے دہانوں سے باندھ کر اڑا دیا گیا۔ گاؤں کے

اور اس پر جم گئیں جو انتہائی خوبصورت اور بے مثنی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے سے اپنی خوبصورتی کا غور اس طرح جھلک رہا تھا جیسے وہ کسی کو اپنے پاؤں کی شوکر کے قابل بھی نہ جانتی ہو۔ اس پر طرہ یہ کہ ناز و انداز ایسا جو ہر کسی کی جان نکالنے کا مظاہرہ ہوا ہو اگر وہ کوئی اور ہوتی تو شاید اس کے ناز اٹھانے کو کوئی نہ ہوتا، مگر یہاں تو اس کے ناز اٹھانے کو ہر کوئی لپکا پھرتا تھا۔ تماش بینوں کی دم بخود نظریں اور رکتے ہوئے سانسوں سے لگتا تھا۔ جیسے محفل کو سائب سوگندہ گہرا ہو مگر وہ ایسی ناز نہیں مچھی کہ اپنے خمار حسن کے سبب کسی کو آٹھ بھر کر نہیں دیکھتی تھی اور پھر جدر ایک بار اس کی نگاہ پڑ گئی، سب اسی طرف دیکھنے لگے، رنگ بکے مارے چلے جاتے ہیں کہ اس کی نگاہ نازان کی طرف کیوں نہیں اٹھی لیکن وہ بھی پوری کی پوری کاٹیاں مچی۔ تھوڑا مسکرا کے، ہونٹوں کو سیکٹر کے ہنسی اور جان بوجھ کر ان پر عذاب اتارتی تھی۔ دربار میں پاؤں رکھتے ہی وہ سب کی آنکھوں کا تارابن بیٹھی تھی۔ اس نے بڑی ادا کے ساتھ بیٹھی خانم کے پاؤں کو ہاتھ لگایا، زمین پر پڑے طاؤس (موسیقی کا ساز) اٹھایا، اپنی نازک اندام انگلیوں سے اس کے تاروں کو چھیڑا۔ تماش بینوں کو اک بار یوں لگا جیسے کسی نے ان کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا ہو۔ سازندوں نے اپنے اپنے سازوں کو اس کی نلے کے ساتھ ہم آہنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے ابھی گت شروع ہی کی تھی کہ اچانک دھڑام سے دروازہ کھلا اور جھینم میاں گھبرا ہوا اندر داخل ہوا۔ جھینم میاں اس بازار کا کچن (دلال) تھا۔ وہ پریشانی کے عالم میں نہ جانے ادھر ادھر کیا دیکھ رہا تھا کہ خانم کی نظریں اس پر پڑیں۔ دونوں کی نظریں آپس میں ملیں تو آنے والے کو کچھ حوصلہ ہوا، پھر جیسے اس کی پیچھے ہٹ گئی۔

”خانم.....خانم.....وہ.....یہ.....“

اس کی بے ترتیب بات نے دربار کو بکھرا کر رکھ دیا۔ سب حیران نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ نوچی پر سے ان کی نظریں ہٹ چکی تھیں۔ نوچی کو لگا جیسے اس کا منہ ٹوٹ گیا ہو۔ وہ تیزی سے طاؤس چھوڑ کر کھڑی اور بھاگتے ہوئے اندر چلی گئی۔ چھپن میاں ابھی تک گھٹکھارہا تھا اور اپنی بات پوری نہ کر پا رہا تھا۔ خانم نے انتہائی غصے سے اس کی جانب دیکھا اور زور سے بولی۔

”چھبیں میاں کیا میاں تک رہا ہے۔“

وہ بے ربطی سے بولا۔ "وہ..... میں ادھر آ رہا تھا کہ بازار میں ایک ڈھانٹا بندھا شخص میرے قریب آیا، میں

گاؤں انگریز سرکار کے حکم پر جلا دیے اور جان بچا کر بھاگنے والوں پر پیچھے سے گولیاں برسائی گئیں، جو دیہاتی ہاتھ اٹھائے ان کے پاس آئے اور سلام کر کے اپنی جان بچانے کی آس میں قریب آئے ان کو یا تو گولی مار دی گئی یا پھر زندہ درختوں سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ جو ان عورتوں کو گرفتار کر کے ان پر بیلی کے بلوگڑے چھوڑ دیے۔ دیسی فوجیں 1857ء کے انقلاب کی روح رواں تھیں اور انگریز مؤرخ اسے ”سپاہیوں کی بغاوت“ کہہ رہے تھے لیکن جب سزا میں دینے پر آتے تو عوام اور سپاہیوں میں کوئی فرق روانہ رکھتے۔ ان کے نزدیک اگر دیسی سپاہی بغاوت کے جرم وار تھے تو عوام جاسوسی کرتے اور ان سپاہیوں کو سمجھوتہ مہیا کرتے تھے جو کہ ان کے نزدیک بغاوت سے بڑھ کر برا تھا مگر وہ بھی عام فلاحی مقاصد کے لیے ایسا ہی نہیں کیا۔ انہیں ہزاروں کے علاوہ خوبصورت رئیس زادے، زمیندار، دولت مند اور آزادی کی خلع و برقع پہننے والے لوگوں نے اپنے آپ کو بے دریغی سے کھوپڑیوں پر ٹکرائے، وہ اپنے آباء کی دولت کو بے دریغی سے کھوپڑیوں پر ٹکرائے، گانے والیوں اور طوائفوں پر لٹاکے خوش ہو رہے تھے۔ ایسے ہی کان پور کے محلے لور کی مالی کے کوٹھے پر تقریباً پچاس سالہ بڑھیا جس کا رنگ سانوا لٹھا، اس نے اپنے سارے بالوں کو رنگ کیا ہوا تھا، مگر آسمے کے بالوں کی چند لٹوں کو بالکل سفید رکھا ہوا تھا جو اس کی شخصیت کو اور بھی خوبصورت بنا رہی تھیں۔ ملل کا سفید دوپٹا۔ بڑھیا کپڑے (جو ریشم اور روئی کے دھاگوں سے بننا ہوا تھا) کا پاجامہ جس کے بڑے گلے پانچے تھے۔ ہاتھوں میں مونڈے مونڈے سونے کے کڑے، جو اس کی موٹی کلائیوں میں خوب بیٹھے ہوئے تھے۔ کانوں میں ہرے موتیوں لگی چھوٹی چھوٹی بالیاں، جن میں ہرے رنگ کی آنچ بہت قیمتی ہیرے دے رہے تھے اور ان کی مالیت اس وقت کے 13 لاکھ سے کم نہ ہوگی۔ وہ اپنے سامنے پاندان کھولے بیٹھی تھی اور قریب ہی چاندی کی گولڈزی (چھوٹا حقہ) رکھی ہوئی تھی۔ دربار ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ تماشا بین ایک نیم دائرے کی شکل میں بیٹھے تھے۔ خانم سے ذرا ہٹ کر سازندے اپنے اپنے ساز سنجالے بیٹھے تھے۔ مجرا شروع ہونے کو تھا۔ ابھی تماشا بین ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں اور غصے غلوں میں لگے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ایک اٹھارہ بیس سال کی نوچی احاطہ کردار میں آجپنی۔ تماشا بینوں کی نظرس اک دم انھیں

ٹھنک کر رہ گیا تو وہ تیزی سے مجھے کوئی چیز پکڑاتے ہوئے
 بولا۔ ”اے کوتوال یک پہنچا دینا اور اسے کہنا۔۔۔۔۔ اس جیسی
 اور چار بنا کے آگے تقسیم کر دے۔“
 ”لعلت ہے تم پر چھین میاں تم مرد ہو کے اتنے
 ڈرے ہوئے ہو۔ لاؤ مجھے دو۔۔۔۔۔ دیکھتی ہوں کیا سانپ
 ہے۔۔۔۔۔!“ یہ کہہ کر خانم نے ہاتھ آگے بڑھا کر کپڑے میں
 لپٹی چیز پکڑ لی۔ اس کی تھکلی تو اس میں سے چپائی نکلی۔
 بے ڈھبھی۔۔۔۔۔ چپٹی سی۔۔۔۔۔ جیسے کسی انارڑی عورت نے اسے
 بنایا ہو۔

”اودہ چپائی۔۔۔۔۔“

چپائی کا لفظ دربار میں کیا پھیلا تمام تماش بین کھس
 پسر کرتے ہوئے آہستہ آہستہ دربار سے نکلنے لگے اور چند
 لمحوں میں دربار اجڑ کر رہ گیا۔۔۔۔۔ چپائی کا خوف ان دونوں
 پورے ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا جس کے ہاتھ میں چپائی
 آ جاتی، لگتا، جیسے کسی نے زندہ سانپ پکڑا دیا ہو اور وہ جلد از
 جلد اسے دوسرے تک پہنچا کر کھکھ کا سانس لیتا۔

”کھنکار ہو تم۔۔۔۔۔ تو اسے میرے سجے ہوئے دربار
 میں لے کر کیوں لے گیا کسی اور کوٹھے پر مرمکھ گیا ہوتا۔
 سب چوہٹ کر کھکھ دیا۔۔۔۔۔ جا۔۔۔۔۔ لے جا اسے اور
 کوتوال کے حوالے کر دے“ خانم غصے سے دہاڑی۔

”میں نے جانا کہ کوتوال شہر تو آپ کے کوٹھے ہے لگا
 بندھا ہے تو مجھے یہی مناسب لگا کہ اسے آپ کے حوالے
 کر دوں۔“ چھین میاں نے پرسکون ہو کر کہا۔

خانم نے چپائی دوبارہ لپیٹ کر اس کے حوالے کرتے
 ہوئے کہا۔ ”لے جا۔۔۔۔۔ اور دیکھنا۔۔۔۔۔ اپنا منہ سرپیٹ کے
 جانا۔ راستے میں کوئی دیکھ، پہچان نہ لے۔ ایسا ہوا تو خواخواہ
 سرکار میں شکایت ہو جائے گی۔ یہ لے پکڑا اسے۔۔۔۔۔“

”کوتوال سے میری آج کل ان بن ہے۔ ورنہ میں
 اسے رکھ لیتی اور اسے خود پہنچا دیتی۔ اب جاؤ۔۔۔۔۔ میرا منہ کیا
 دکھ رہے ہو۔ بھاگ کر جاؤ۔۔۔۔۔ ذرا دیکھ بھال کے۔۔۔۔۔ اس
 موٹی چپائی نے تو پورے دیس کا جینا دو بھر کر دیا ہے۔ پتا
 نہیں کیا کھل کھلائے گی۔ ہر کوئی اس سے خوفزدہ ہے۔“

☆☆☆

امراؤ جان ادا کا تعلق فیض آباد کے ایک متوسط
 گھرانے سے تھا۔ شکل و صورت کے لحاظ سے وہ اپنی ہم
 جویوں سے اچھی تھی مگر اس کا شمار خوبصورتوں میں نہیں ہوتا
 تھا۔ وہ خود اپنے بارے میں کہتی ہے۔
 ”شکل و صورت میں بھی اپنی ہم جویوں سے اچھی

تھی۔ اگرچہ درحقیقت خوبصورتوں میں میرا شمار نہ ہو سکتا تھا
 مگر ایسی بھی نہ تھی، جیسی اب ہوں۔ مٹکتی ہوئی بچی رنگت تھی،
 ناک نقشہ بچی خیر سے ایسا برا نہ تھا، ماتھا کسی قدر اونچا تھا۔
 آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ بچپن میں پھولے پھولے گال
 تھے۔ ناک اگرچہ ستواں نہ تھی، مگر خوبصورت تھی۔ ذیل
 ڈول بھی بن موافق اچھا تھا۔ اگرچہ اب ویسی نہیں رہی۔
 نازکوں میں میرا شمار نہ جب تھا، نہ اب ہے۔ اس قطع پر
 پاؤں میں لال گل بدن کا پاجامہ، چھوٹے چھوٹے پانچوں کا
 ٹینو کی کرتی تن زیب کی اور حسنی، ہاتھوں میں چاندی کی تین
 تین چوڑیاں، گلے میں طوق، ناک میں سونے کی تھنی اور
 سب لڑکیوں کی تھنیاں چاندی کی تھیں۔ کان ابھی تازہ تازہ
 جھدے تھے۔ ان میں نیلے ڈورے پڑے تھے۔ سونے
 کی بالیاں بننے کو گئی تھیں!“

اس کی شادی اس کی پھولی کے بیٹے کے ساتھ طے
 ہو چکی تھی۔ معنی تو برس کے کن میں ہو گئی تھی۔ ادھر سے شادی
 کا تقاضا ہو رہا تھا مگر ادھر روپے کی کمی تھی، جس کے سبب
 شادی رکی ہوئی تھی، حالانکہ جینز کا سارا سامان بنا ہوا
 تھا۔ ان کے مکان سے تھوڑی دور ایک بدعاش دلاور خاں
 کی رہائش تھی جو کہ لکھنؤ کی قید میں برسوں رہا تھا۔ اب پتا
 نہیں کس کی سفارش سے چھوٹ آیا تھا۔ اس کی امراؤ جان
 ادا کے ابا سے دشمنی تھی۔ نہ جانے کس سبب سے وہ خار کھاتا
 تھا۔ اس کے والد نے کبوتر پال رکھے تھے جن میں سے ایک
 کبوتر اڈکر دلاور خاں کے پاس چلا گیا۔ لینے گئے تو اس نے
 اڈا کر کر دیا۔ کبوتر کی قیمت چار آنے لگائی تھی، مگر وہ آٹھ
 آنے مانگتا تھا۔ ایک روز اس کے والد نوکری پر گئے اور یہ
 کھلیتی ہوئی ادھر نکل گئی تو دلاور خاں نے اسے بہلا بھسلا کر
 اغوا کر لیا اور پھر ڈرا دھکا کر اسے لکھنؤ لاکر خانم جان کے
 ہاتھ فروخت کر دیا۔ قیمت صرف سوا سو روپے لگی اور اسے
 اپنی مہری حسینی بوا کی تحویل میں دے دیا جس نے اس کی
 بڑی اچھی طرح سے تربیت کی۔ پہلے ہی روز حسینی بوا سے
 امراؤ جان کا جو کالمہ ہوا، وہ ایسے تھا۔

”بچی تو کہاں سے آئی ہے؟“ حسینی بوا نے سوال کیا۔
 ”میں فیض آباد سے آئی ہوں۔“ امراؤ جان
 نے روتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہارے ابا کا کیا نام ہے؟“ حسینی بوا نے پھر پوچھا۔
 ”جعدا!“ امراؤ جان نے بتایا۔
 ”اور تمہارا کیا نام ہے؟“ حسینی بوا نے اگلا سوال کیا۔
 ”امیرن۔“ بچی نے جواب دیا۔

”یوں تو میرا طوائف کا پیشہ ہے اور یہ ہم لوگوں کا (ہاں) ہوا فقرہ ہے۔ جب ہم کسی کو دام میں لانا چاہتے ہیں، اس ہارنے لگتے ہیں۔ ہم سے زیادہ مرنا کسی کو نہیں آتا۔ لہذا سائیں بھرنی، بات بات پر رو دینا، دو دو دن کھانا نہ کھانا کنوں میں پاؤں لٹکا کے بیٹھ جانا، کھکھیا کھا لینا..... یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ کیسا ہی سخت دل کا آدمی کیوں نہ ہو ہمارے فریب میں آ ہی جاتا ہے!“

پھر ایک ایسے ہی فریب میں امراؤ بھی آ گئی۔ خانم جان کی نو چوہں میں سے خورشید جان پہلے ہی اپنے کسی آشنا کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اس کے ڈیڑھ ماہ بعد ایک روز حویلی میں ایک شخص فیض علی آیا جس نے بڑے بڑے موتیوں کی مالا جس میں زمر کی ہڑیں لگی تھیں، ایک جوڑی ہیرے کے کڑوں کی اور دو انگوٹھیاں سونے کی اس کے آگے رکھ دیں۔ پھر وہ بغیر کسی خوف کے امراؤ کے پان آئے لگا۔ ایک ڈیڑھ ماہ میں اس نے امراؤ کو اتنا روپیہ اور زور دیا کہ اس کا صندوق سادے اور جڑاؤ گہنوں سے بھر گیا پھر نو بہت یہاں تک آ پہنچی کہ جب تک فیض علی نہ آتا تو اس وقت تک امراؤ کی آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتیں، امراؤ کا بی بھی اس وقت نہ لگتا تھا جب تک وہ فیض علی کو نہیں دیکھ لیتی تھی۔ راتوں کو آنے والے لوگوں کو بھی سمجھ آ گئی تھی کہ امراؤ اب بکاؤ مال نہیں رہی بلکہ وہ کسی کی پابند ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ جلد ہی کھسک جاتے۔ جو جگہ کر بیٹھ رہتے، ان کو امراؤ کسی نہ کسی بہانے سے خرغانے لگی تھی۔

پناتل جوہری بھی امراؤ کے چاہنے والوں میں سے تھے۔ فیض علی کے آنے سے پہلے وہ روزانہ آیا کرتے تھے۔ مگر پھر کم آنے لگے۔ ایک مرتبہ چندہ دن کا غوط لگا یا پھر جب آئے تو کچھ اداس اداس، معمولی باتوں کا جواب دیتے اور پھر خاموش ہو جاتے۔ امراؤ نے سبب پوچھا تو بولے۔ ”کیا تم نے نہیں سنا، ہم تو تباہ ہو گئے۔ گھر میں چوری ہو گئی، چشتیوں کا سب اٹا اٹھ گیا۔“

امراؤ نے حیرانی سے پوچھا۔ ”چوری ہو گئی، کتنے کا مال گیا؟“

”سب اٹھ گیا، رہا کیا..... دو لاکھ کا جواہر اٹھ گیا۔“ پناتل نے افسردگی سے بتایا۔

”بہت افسوس ہوا۔“ امراؤ نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہاں جی، افسوس تو ہے۔ آج کل شہر میں چوریاں بہت ہو رہی ہیں۔ نو اب ملکہ عالم کے ہاں چوری ہوئی۔ لالہ کوہر پر شاہ کے ہاں چور مٹس آئے۔ اندھیر چھا ہوا ہے۔ سنا ہے، چور سے کہتے تھے۔“

”بھئی یہ بھلا کیا نام ہوا؟ یہ نام تو ہمیں پسند نہیں۔ ہم تو امراؤ کہہ کر پکاریں گے،“ حسینی بوانے دلار سے کہا۔

اسی دن سے امیرن کا نام امراؤ ہو گیا، جب اس کو طوائفوں کے شمار میں لایا گیا، تو لوگوں نے اسے امراؤ جان کہنا شروع کر دیا۔

امراؤ کا سن ابھی اس قدر نہ تھا مگر پھر بھی وہ ذہین تھی اور سمجھنے لگی تھی کہ اب اس کی ساری زندگی اسی جگہ زمرے کی چنانچہ اس نے بھی اسے مقدر کا لکھا سمجھ کر خود کو اس ماحول میں رہا سہا لیا پھر ماحول کے مطابق اس کو گانے بجانے کی تربیت دی جانے لگی تو گانے میں بھی جلد ماہر ہو گئی۔ اوپر سے گلہ اللہ تعالیٰ نے بڑا سرا یا دیا تھا۔ گانا کہنے کے بعد دوسری تعلیم کے لیے ایک مولوی صاحب کو رکھا گیا۔ سات آٹھ برس اس سے ہاضق رہی اور ہر علم میں حافی ہوتی چلی گئی پھر ایک وقت آیا کہ اسے تمام طوائفوں کی طرح خانم جان نے ایک لگا۔ لہذا اسے دیا اور دربار لگانے کی بھی اجازت مل گئی مگر ابھی وہ ناز و ادا نہیں جو کہ طوائفوں کا خاصا ہوتی ہیں وہ زرت بجاد، وہ لگا ہوں کی چٹون کاری، ابھی وہ اس سے نا آشنا تھی حالانکہ چودہ کے سن کو پہنچ چکی تھی۔ پہلے پہل خوفزدہ اور دوسروں سے دبی دبی رہی مگر جلد ہی اسے پہلے بھرے کے لیے نواب شجاعت علی خان کے بیٹے کی شادی پر بھیجا دیا گیا اگرچہ اس سے پہلے ایک مشہور زمانہ بڑوے سے آئی بانی گا چکی تھی جس کے گانے کی پورے شہر میں دھوم تھی۔ بڑے بڑے گویے کان پکڑتے تھے، گویا پوتھیاں اس کی نوک زبان پر تھیں گھڑا گیا کہ چار محلے ادھر آواز جائے اس کے بعد امراؤ کی باری آئی۔ گودہ پہلی بار محفل میں بھر کر رہی تھی لیکن اٹھتی جوانی اور اس پر مستزاد اس کی پھرتی چالاکی اور لہجہ پن تھوڑی دیر گت تا پہنچ پھر اس نے جو غزل کی تان اڑائی تو ہر شخص محظوظ ہونے لگا، تمام محفل وجد کے عالم میں جھوم رہی تھی۔ اس کے ایک ایک شعر کو دس دس بار گویا گیا اور یوں امراؤ جان کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔

پھر ایک وقت ایسا آیا جب امراؤ جان کی گائی غزلوں کی دھوم پورے لکھنؤ میں ہونے لگی اور اس کے حصول کے لیے کل تو جیسے ایک معمولی بات ہو کر رہ گئے۔ امراؤ جان خود بھی شعر کہنے لگی تھی اور اب تو وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھی جہاں وہ اپنی قبیل کی کسی بھی نوچی کے کان کترنے لگی تھی۔ ذہین تو وہ شروع سے ہی تھی، اب وہ اس قدر بے باک ہو چکی تھی کہ اپنے بارے میں بڑے دھڑلے سے کہنے لگی۔

آدمیوں نے دھاوا بول دیا۔ فیض علی اور اس کا ساتھی فضل علی موقع پا کر نکل گئے۔ پچاس ساٹھ آدمی گرفتار ہوئے، جن میں امراؤ جان بھی تھی۔ گڑھی جاتے راستے میں راجا صاحب کو بتایا گیا کہ ان عورتوں میں امراؤ جان بھی ہے جو لکھنؤ سے آئی ہے۔ راجا نے امراؤ سے لکھنؤ کے بارے میں جتنے بھی سوالات کیے، ان کے جوابات امراؤ نے بڑی متانت سے دیے۔ راجا نے امراؤ کو چند دنوں کے لیے اپنا مہمان رکھا۔ پھر رہائی ہوئی۔ راجا کی قید سے رہائی پر امراؤ نے ایک غزل کہی جس کا مطلع تھا۔

اے ادا، قہر محبت سے رہائی معلوم
کب اسیر غم میاد رہا ہوتے ہیں
پندرہ بیس دن کے بعد امراؤ گڑھی سے نکلی۔ راجا نے دس اشرفیاں اور دو شالہ، ایک رومال، ایک رتھ مع تین بیل دیا۔ گویا راجا نے امراؤ جان کو ایک ڈیڑھ دار پتہ بنا کر رخصت کیا۔ ایک گاڑی بان اور دو آدمی امراؤ کے ساتھ کیے۔ وہاں سے وہ اناؤ پہنچی۔ یہاں آکر اس نے راجا کے آدمیوں کو رخصت کیا۔ صرف گاڑی بان اپنے ساتھ رکھا۔ ایک سرائے میں رہنے کا بندوبست کیا۔ وہ باہر بیٹھی سرائے کی مالکن کا اپنے گاہکوں سے مول تول دیکھ رہی تھی کہ فیض علی کا سہاس نظر آ گیا۔ وہ بھی سیدھا سی کے پاس گیا اور بتایا کہ فیض علی کو امراؤ کی اناؤ آنے کی خبر مل گئی ہے۔ وہ رات کے کسی پہر یہاں سرائے میں آئے گا۔

وہی ہوا، رات ڈیڑھ بجے فیض علی سرائے میں آیا اور معمولی بات چیت کر کے گاڑی بان کو رخصت کر کے گنگا کو عبور کر کے صبح ہوتے ہی کان پور پہنچ گئے۔ اس نے امراؤ کو لاشی حال کی سرائے میں اتارا اور خود مکان تلاش نہ کر سکا۔ تھوڑی دیر بعد مکان تلاش کر دیا اس نے امراؤ کو لے کر اس مکان میں اترا یا پھر کھانا لانے بازار گیا۔ فیض علی نامی گرائی ڈاکو اور ان کا ساتھی تھا۔ وہیں دوبارہ سے پکڑا گیا۔ امراؤ اس کے انتظار میں ساری رات بیٹھی رہی۔ ناچار اگلی دو پہر اس مکان سے باہر نکلی۔ بازار میں سے گزر رہی تھی کہ دیکھا فیض علی کو جھڑپیاں لگی ہوئی ہیں اور وہ سرکاری سپاہیوں کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ یہ ماجرا دیکھ کر وہ سن سی ہوئی۔ وہیں خشک گئی، ایک ایک قدم سوسن کا ہو گیا۔ خیریت یہ ہوئی کہ ان لوگوں میں سے کسی کی نظر اس پر نہیں پڑی، وہ اُٹکتے چلے گئے۔

امراؤ حیران و پریشان کچھ دیر اپنی جگہ کھڑی رہی پھر نہ جانے اس کے ذہن میں کیا آئی۔ وہ ایک جگہ کی طرف

باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ مرزا علی بیگ کو تو ال شہر خود حیران ہیں۔ شہر کے چور سب طلب ہو گئے تھے۔ کسی سے کچھ پتا نہیں چلا۔ لوگ کانوں پر ہاتھ رکھتے کہ یہ ہمارا کام نہیں۔“

ابھی امراؤ سے پتہ نہ ملے دوسرا دن تھا، جب شہر کے چوک میں شور ہوا۔ امراؤ جلدی سے چلن کے پاس کھڑی ہوئی، تو پتا چلا کہ چور گرفتار ہو چکے ہیں اور ان میں فیض علی بھی شامل ہے۔ مگر رات کے پچھلے پہر حسب معمول فیض علی اس کے پاس آئے اور بولے۔ ”آج ہم باہر جاتے ہیں، پرسوں آپہیں کے ہم چلو گی؟“

”تم جانتے ہو کہ میں با اختیار نہیں ہوں۔ مجھ پر خانم ہی کو اختیار ہے۔“ امراؤ نے جواب دیا۔

”مجھے پہلے ہی پتا تھا، تم لوگ بڑے بے وفا ہوتے ہو۔ ہم تم پر جان بھی دے دیں، تو ہمیں آگے سے خشک ہی جواب ملتا ہے۔ اچھا تو امرادو حسینی کو بلواؤ۔ ہم خود پوچھ لیتے ہیں۔“ فیض علی نے کہا۔

فیض علی نے امراؤ کے ساتھ آج تک جو سلوک کیا تھا، اس کے ناتے تو امراؤ کو فوراً اس کی بات مان لینی چاہیے تھی مگر وہ بھی مجبور تھی۔ اس نے بو حسینی کو بلوایا اور اس سے امراؤ کو ساتھ لے جانے کا کہا۔

”کہاں لے جاؤ گے؟“ بو حسینی نے پوچھا۔

”فرخ آباد۔ میں ایسا دیا آدمی نہیں ہوں، وہاں میری ریاست ہے۔ اگر خانم صاحب منظور کریں تو دو مہینے کی تنخواہ جتنی بلکہ اس کے علاوہ جو کچھ کہیں میں دینے کو تیار ہوں۔“ فیض علی نے پیشکش کی۔ بو حسینی نے واپس آ کر جواب دیا۔

”ہم لوگ انہیں باہر جانے نہیں دیتے!“

یہ جواب سن کر فیض علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے تو امراؤ نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ فیض علی کے ساتھ ضرور جائے گی۔ اس نے اپنے ارادے سے فیض علی کو آگاہ کیا، تو وہ کھل اٹھا اور پھر اس کے تیسرے دن وہ فیض علی کے ساتھ لکھنؤ چھوڑ گئی۔ لکھنؤ چھوڑ کر وہ کس طرح در بدر ہوئی، یہ الگ کہانی رہی کیونکہ فیض علی یہاں آ کر بھی گرفتار ہو گیا۔ امراؤ اکیلی رہ گئی، چنانچہ اس نے واپس لکھنؤ جانے کے بجائے کان پور جانے کا قصد کر لیا۔

☆☆☆

غلغلہ تھا۔ اک شہر تھا جو امراؤ کے ساتھ ہی کان پور شہر میں اٹھ گیا تھا۔ رائے بریلی سے گڑھی چار پانچ کوس پر تھی جب فیض علی کے قافلے پر راجا شیو دھیان سنگھ کے

رہے ہو؟“ عزیز نے پوچھا۔
 ”ہم تو خدمتگار ہیں، ہمیں بھلا یہ کہاں کا اختیار حاصل ہے کہ اپنی طرف سے کچھ کہیں۔“ خدمتگار نے جواب دیا۔
 ”اور کون کون بلایا ہے؟“ عزیز نے پوچھا۔
 ”فی الحال تو آپ ہی کو سندیس بجھوایا ہے۔“ خدمتگار بولا۔
 ”ہوں.....“ عزیز نے کچھ دیر سوچا پھر بولی۔
 ”اچھا۔ تو ہم حاضر ہیں۔ کہاں تشریف رکھتی ہیں آپ کی بیگم صاحبہ؟“

”کہیں تو میں لے جاؤں گا آکر۔ وہ فی الحال آپ کے محلے سے ہٹ کر ایک کرائے کی کوٹھری میں رہتی ہیں۔“
 پھر اس نے عزیز کو پتا بھمایا۔
 ”ٹھیک ہے میں خود ڈولی میں آ جاؤں گی۔“
 عزیز نے یہ کہہ کر خدمتگار کو رخصت کیا۔

پھر اسی شام عزیز تیار کرتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ آٹھم میں اتاری اس نئی نوچی کو اس کی کہاں ضرورت پڑگئی۔ اگر مکمل دعوت ہوتی تو شہر کی اور بھی طوائفیں تھیں جنہیں دعوت پر بلایا جاسکتا تھا۔ صرف وہی کیوں؟ پہلی پہلی ملاقات ہے، اسے ذرا ٹھٹھا سے اس کے پاس جانا چاہیے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے مہین بنی دوپٹا اوڑھا اور اس کو اپنے کندھوں سے نیچے گرالیا۔ پچلی کا پھنسا پھنسا شلوکا اودھی گرنٹ کا سرخ مہار دالا پاجامہ، کالوں میں صرف یاقوت کے آدیزے، ناک میں ہیرے کی کیل، گلے میں سونے کا لوکھا ہار، ہاتھوں میں موتیوں کی سرنیں، بازوؤں پر روتن اور پاؤں میں سونے کی بیڑیاں پہن کر ایک بار کمرے میں گلے قدام آئینے میں اپنا روپ دیکھا تو خود ہی حیرت زدہ رہ گئی۔

وہ اپنی ڈولی میں بیٹھ کر امراؤ جان کے مکان پر اتری۔ کہاروں نے ڈولی اس کے دروازے کے سامنے رکھی اور دروازے پر دستک دی۔ ایک مہری نے آکر دروازہ کھولا۔

عزیز نے ڈولی کا پردہ سرکایا اور ڈولی سے باہر پاؤں رکھے۔ دروازہ عبور کر کے وہ اندر داخل ہوئی تو امراؤ اس کے استقبال کو کھڑی تھی۔

”خوش آمدید.....مرحبا۔ جیسا سنا تھا، ویسے ہی پایا۔“
 امراؤ نے عزیز کو گلے لگاتے ہوئے تعریف کی۔
 ”جی شکر یہ!“ عزیز نے بھی تسلیات ادا کرتے ہوئے کہا۔

”آئیے اندر بیٹھتے ہیں۔ کچھ باتیں کرتے ہیں، پھر

پہلی۔ تھوڑی دیر گئی تھی کہ ایک اور پہلی ہی گلی نظر آئی تو وہ اسی لے اندر چلی گئی۔ اس گلی میں ایک مسجد تھی۔ وہ بھاگل کراہی مسجد میں پناہ گزین ہو گئی۔ کان پور میں انہی امام مسجد کی وساطت سے ایک کمرہ کرائے پر لیا۔ کھانے پینے کا سامان بازار سے خرید لیا۔ ایک نوکر لیا کھانا پکانے اور اوپر کے کام کاج کو وہ خدمت گار نوکر رکھ لیے۔ اس کے بعد ذرا آرام ہوا تو سازندوں کی تلاش شروع کی۔ بہت سے لوگ آئے مگر کوئی پسند نہ آیا۔ آخر لکھنؤ کا ایک طبیب مل گیا۔ اس کی معرفت دوسرا کیلے بلوائے گئے جن کا تعلق کان پور سے تھا۔ طائفہ درست ہوا۔ شب کو پہر ڈیڑھ رات گئے تک گانے کا جرجر چاہنے لگا۔

شہر میں مشہور ہو گیا کہ لکھنؤ سے کوئی طوائف آئی ہے، اور مراد آنے شروع ہو گئے۔ شاعری بھی لکھنے لگی، پھر تو ہمارا ایسا ہوا کہ ہاں جلے میں جانا نہ ہوتا۔ تو اے ہی

رہا کی جس مانی ہمارا اور ہمارا ہی زندگی ملی تھی اور ہمارا اور ہمارا ایسے گالے والوں میں ہونے لگا۔ کان پور میں اس کے حوصلے نے زیادہ قدردانی ہونے لگی تھی۔ کسی امیر رئیس کے ہاں ایسی کوئی تقریب شادی بیاہ کی نہ ہوتی تھی جس میں امراؤ کو بلانا باعث فخر نہ سمجھا جاتا ہو۔ یہاں تک کہ کان پور میں شہرت کی حد یہاں تک پہنچ گئی کہ شام کو اس کے ہاں بہت اچھا بیچ رہتا تھا۔

اس شہر کی تمام طوائفوں کو اس طرح باہر سے آئی ہوئی ایک طوائف کا دھڑلے سے ان کے کاروبار پر چھاجانا بہت ناگوار گزرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس محلے کی تمام طوائفیں اس ٹوہ میں تھیں کہ آخروہ کون ہے، جوان کے ہاتھوں سے ان کا تمام کاروبار چھینتی جا رہی ہے۔ خورشید جان خورشید، عزیز بانی، شرفن کو اس بات کا بہت قلق تھا۔ ممکن تھا کہ وہ سب مل کر اس کے خلاف کوئی رد عمل ظاہر کریں کہ ایک روز امراؤ جان کا ایک خدمت گار عزیز بانی کے پاس اس کا پیغام لے کر پہنچا۔

”اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو آج کی شام بیگم صاحبہ نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔“

”آج..... آج تو میں بہت مصروف ہوں۔ دربار سنا ہے، پھر رات کے کسی پہر مجھے مجھے پر بھی جانا ہے۔“ عزیز نے یہاں بتایا۔

”اگر آپ کو ناگوار نہ ہو تو بیگم صاحبہ خود آپ کے ہاں اترنے کو تیار ہیں۔“ خدمتگار نے دوبارہ سے کہا۔
 ”کیا یہ بھی انہوں نے کہا یا اپنی طرف سے تم کہہ

کھانا کھا نہیں گے!“ امراد نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر دونوں اندر کمرے میں آ گئیں۔

”بہت شہرت کی بیٹی آپ کی۔ اور لکھنؤ میں بھی اکثر تمہاری باتیں ہوا کرتی تھیں۔ میں اکثر کہا کرتی تھی کہ کبھی کان پور گئی، تو آپ کو ضرور بلوں گی۔“ امراد نے ہنستے ہوئے بات شروع کی۔

”ہمارے ہاں بھی جب ہم کبھی اکٹھی بیٹھتی ہیں تو ادھر ادھر کی تمام مشہور گانے اور ناچ دکھانے میں مہارت رکھنے والیوں کا اکثر ذکر ہوتا رہتا ہے۔“

”اور ان میں آپ کا تو اکثر ذکر ہوتا ہے۔ لکھنؤ کے بازار میں آپ کا تو ایک نام ہے۔ بڑی شہرت ہے، آپ کی۔ میری بھی بڑی حسرت تھی کہ آپ سے ملوں۔“ عزیز نے بھی آہستہ آہستہ بات آگے بڑھائی۔

”مقدروں کی بات ہے۔ میں نے کبھی نہ سوچا تھا کہ کان پور میں آن بسوں گی۔ لکھنؤ میرا میری تو نہ تھا، ہر بھولت موجود تھی۔ اگر نہیں تھی، تو یہ خود مختاری نہ تھی۔“ امراد نے دیر سے دیر سے کہنا شروع کیا۔

”یوں نہ کہیے، یہ تو کان پور کی خوش قسمتی ہے کہ آپ جیسی مشہور زنانہ گانیکہ اور شاعرہ نے اس دھرتی کو شرف بخشا۔“

اے ادا ہم کبھی نہ مانیں گے
دل کو دل کی خبر نہیں ہوتی

امراد جان نے اس کے جواب میں اپنا شعر پڑھا تو عزیز نے بے اختیار پول اٹھی۔

”واہ واہ۔ جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔ آپ خوب کہتی ہیں۔ ہمارے ہاں بھی دو شاعرات بیٹھی ہیں، ان میں سے ایک تو خورشید جان خورشید ہیں اور دوسری شرفنہ..... مگر جو جیل پرواز آپ کے ہاں ہے، وہ دوسروں کو کہاں نصیب۔“

”اللہ..... تو خورشید جان یہاں چھپی بیٹھی ہیں۔“ امراد جان نے برملا بے ساختگی سے کہا۔

”تو کیا آپ ان سے واقف ہیں؟“ عزیز نے پوچھا۔
”ان سے کون واقف نہیں۔ یہ بھی تو لکھنؤ سے تھیں، لکھنؤ چھوڑا اور ادھر آ گئیں۔“ امراد نے بے یقینی سے کہا۔
”یہ خورشید خویصورتی میں تو یکساں ہیں، مگر تو ان کی

آواز میں مرکبیاں اور لوج ہے اور نہ ہی اسے ناچنا آتا ہے۔ بس اپنی سندرتا کی بنا پر کان پور مارے بیٹھی ہے۔ خیر سے امین کان پوری سے زانوئے تلمذ رکھتی ہے۔ وہی زیادہ ان کی کفالت بھی کرتے ہیں۔ شاید خود ہی لکھ کر اسے دیتے ہوں۔ کان پور میں اس کا خاصا چرچا ہے مگر تعجب نہیں۔ ایک

بات کہوں۔ اپنے آگے اس کا چراغ نہیں جلتا۔“ عزیز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہوں..... بہت خوب۔ وہ تو کیا ہمارا اپنا چراغ آپ جیسی محب وطن اور لوک سدھار کے کاموں میں دلچسپی لینے والی مجاہدہ کے آگے نہیں جلتا۔“ امراد جان نے عزیز کا ہاتھ پکڑ کر پیار سے کہا۔

”اللہ۔ اپنے آپ بھی مجھے بتائیں گی۔ یہ آپ کو کس نے کہہ دیا کہ ہم مجاہدہ ہیں۔ ارے ہم تو کچھ بھی نہیں ان سپاہیوں کے آگے، جنہوں نے اپنی زندگیاں ملک و قوم کے لیے وقف کر رکھی ہیں۔ ہم خاک پا کے برابر بھی نہیں ہیں۔“ عزیز نے انکساری سے جواب دیا۔

”بس بس، رہنے دیں۔ آپ اتنا بھی نہ بنیں۔ لکھنؤ تو کیا پورے ملک میں آپ کے نام کا ڈنکا بج رہا ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے، خواص میں تو جھانسی کی رانی اور جون آف آرک کا نام ہے، مگر عوامی سطح پر ملک و قوم کی خدمت کرنے والوں میں عزیز کا نام مشہور ہے۔ مگر میں سوچتی ہوں، ہم عورتیں ہیں، جتنا بھی ملک و ملت کا کام کرتی رہیں، کس کام کا۔ نہ نام ہوتا ہے اور نہ ہی تاریخ ہمیں اچھے نام سے یاد کرتی ہے۔ پھر ہم تو دیسے ہی رسوائے زمانہ طوائفیں ہیں۔“ امراد جان نے حقیقت بیان کی۔

”ہمیں نام کی کبھی بھی چاہ نہیں رہی۔ تاریخ ہمیں یاد رکھے یا ہمارے نام کو بھول جائے مگر ہمارے سن میں ہے کہ قوم کے لیے کوئی تو ایسا کام کر جائیں جس سے یہ پتا چلے کہ رائدۂ درگاہ اور معاشرے کی سب سے کتر عورتوں کے سینے میں بھی ملک و ملت کی اتنی ہی محبت ہے، جتنی ایک سپاہی کے دل میں ہے۔“ عزیز نے جذباتی ہو کر جواب دیا۔

”تو آج سے ہم دونوں پکی سہیلیاں ہو گئیں بلکہ بہنیں.....“ امراد جان نے اپنے سر کی اوڑھنی عزیز کے سر پر پھیلاتے ہوئے کہا۔

”بالکل پکی۔“ عزیز نے بھی ہنستے ہوئے اپنا دوپٹا امراد کے ساتھ بدل لیا۔ اسی دوران مہری نے آواز دی کہ کھانا تیار ہے۔

دونوں نے مل کر کھانا کھایا، اس دوران بھی زیادہ تر باتیں ملک کے حالات سے متعلق ہوتی رہیں۔

”اب آتی جاتی رہتا۔“ امراد نے کھانے کے بعد عزیز کا ہاتھ پکڑ کر وعدہ لیتے ہوئے کہا۔

”تو کیا آپ ہمارے ہاں نہیں آئیں گی؟“ عزیز نے پوچھا۔

ہیں۔ اس سے آگے بڑھنے اور جوش دلولے سے جنگ و جدل کرنا اپنے بس میں کہاں..... توبہ توبہ۔“ امراؤ جان نے اپنے کانوں کو پکڑتے ہوئے کہا۔

تو عزیز نے اس کے دلوں ہاتھوں کو تھام کر اپنے گالوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

”تم جو کر رہی ہو، وہ بھی تو ایک جہاد ہی ہے۔ لوگ شعر و شاعری سے، اپنی تقاریر سے لوگوں میں نئی روح پھونکتے ہیں۔ تم بھی ان میں سے ہو۔ خدا تمہارے جذبوں کو سلامت رکھے۔“

☆☆☆

فرصت ہی کہاں تھی، عزیز نے اس روز کے بعد اسے وقت ہی نہ ملا کہ وہ امراؤ کے پاس دوبارہ سے جاتی۔ بس وہ تو اپنے کاموں میں ہی اس قدر مصروف تھی کہ دوسری طرف اسے دھیان کا موقع ہی نہ ملا تھا۔ بڑے دنوں تک وہ ان ہماچار کارروائیوں میں مصروف رہی تھی۔ آج ہی اسے ان کے وقت دار موقع ملا تھا۔ ملکی حالات دن بدن بگڑتے چلے جا رہے تھے۔ کاروبار ویسے ہی بند ہو چکے تھے۔ دربار اور بھرے ختم ہو کر رہ گئے تھے۔

وہ اپنے کمرے میں بڑی اداس بیٹھی تھی، پھر پتا نہیں کیوں اٹھ کر باہر کے دروازے کی چلن کے پاس آگئی۔ اس نے باہر نظریں دوڑائیں، خال خال لوگ ادھر ادھر آ جا رہے تھے کہ اچانک اس کی نظریں امراؤ کے سار کیے پر پڑیں۔

اس نے اپنے خدمتگار کو آواز دی جو اس کی آواز سننے ہی بھاگا بھاگا آیا۔

”وہ ادھر جو شخص جا رہا ہے، اسے جا کے کھو بیگم صاحب اسے بلارہی ہے۔“

خدمتگار بھاگ کر گیا اور اس کو ساتھ لے آیا۔ ”اسے کمرے میں بٹھاؤ اور پانی چائے کا پوچھو۔ میں آتی ہوں۔“ یہ کہہ کر عزیز نے اپنے کمرے خاص میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر کو چلتی، تو سار کیے کے سامنے خدمت گار نے کھانے کا سامان اور گڑ لٹری رکھی ہوئی تھی اور پان لگا کر اسے دے رہا تھا۔

”ہاں تو تم ہی تھے جو امراؤ جان کے ساتھ سنگت کرتے تھے؟“

”جی ہاں۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔

”کیا حال ہے امراؤ کا؟“

”وہ تو جی..... جس روز آپ ان کے ہاں اتری تھیں، اس کے دوسرے دن ہی کان پور چھوڑ کر واپس چلی گئی تھیں۔“ سار کیے نے بتایا۔

”کیوں نہیں۔ جی جان سے آؤں گی۔ میری تو زندگی کی سب سے بڑی خواہش تمہارے ملنے سے پوری ہوئی ہے۔ خود شید جان سے بھی سبھی ملوں گی۔“ امراؤ نے اہستہ سے کہا۔

”تو کیا اب لکھنؤ نہیں جائیں گی؟“ عزیز نے پوچھا۔
”لکھنؤ کس منہ کو لے کر جاؤں گی۔ خانم سے کیسی شرمنگی ہوگی، ساتھ والیاں کیا کیا نہیں کی۔“ امراؤ نے اسی سے کہا۔
”تو واقعی لکھنؤ کبھی نہ جاؤ گی....“ عزیز نے

دوبارہ پوچھا۔

”لکھنؤ میں میرا کھانا ہی کیا ہے۔ تمہیں تو علم ہے، ہمارا کھانا ہمارے پاس ہے۔ جہاں رہیں گے، کوئی نہ کوئی قدر دان ہوا وہی کھانا کھا کر رہ جائے گا۔ میں نے اس بار کھانا کھا کر دیکھا ہے، خانم کی دیکھیں وہاں کھانا تو ایسی قدر دان کھاتا ہے کہ اسے کھانا کھانا کہنا ہی نہیں آتا۔“

”کوئی کھانا، اللہ کو بھی منظور تو ہی جان سے۔“
بندی آپ کے ان احسانات کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔ لو اب مجھے اجازت دیجیے گا۔“ عزیز نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”سچی بات ہے کہ آج میری برسوں کی خواہش پوری ہوئی ہے۔ بڑا انتظار تھا کہ میں آپ جیسی نڈر اور ملک و قوم کی ہمدرد عورت کو دیکھوں جس نے ہم جیسی راہیوں کی دھول کا نام اونچا کر رکھا ہے۔“ امراؤ جان کی آنکھیں یہ کہتے ہوئے چمک پڑیں۔

”ارے نہیں میری بہن۔ میں نے کوئی انوکھا کام نہیں کیا اور نہ ہی کوئی سراہے جانے والا کارنامہ انجام دے رہی ہوں۔ معمولی سا کام ہے جو آپ بھی کر سکتی ہیں۔ کان پور کی کوئی بھی عورت سرانجام دے سکتی ہے۔ میں تو کبھی ہوں، آپ بھی میری ساتھی بن جائیں۔“ عزیز نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”نہ بابا۔ میرے بس کا کام نہیں ہے۔ مردوں کا لباس پہن کر ڈھانڈا باندھ کر ہاتھ میں تختہ پکڑ کر دھامیں دھامیں لوگوں کو رانی پھروں۔ میرا تو خون کی سرخی دیکھ کر ویسے ہی جی ادبھ جاتا ہے۔ کہاں گھڑ سواری کرنی جنگ کرتے مردوں کے کندھے سے کندھا ملا کر لاشیں مگرانی پھروں۔ عزیز نے بڑے حوصلے اور ہمت کا کام ہے۔ یہ تم جیسی مردانہ صفات رکھنے والی عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔ ہم تو دور سے ہی آپ کے جذبوں کو سلام کرنے والی ہوا کرتیں

”تفصیل سے بتاؤ۔ اس کا تو ارادہ جانے کا نہیں تھا۔“ عزیز نے دوبارہ سے پوچھا۔
 ”دست کہا..... مگر اسی رات لکھنؤ سے چند لوگ آئے تھے۔ وہ ان کے ساتھ چلی گئی۔“ سارٹیکے نے بتایا۔
 ”یقیناً وہ گوہر مرز اور بوا حسینی ہوں گی۔ پھر کیا ہوا؟“ عزیز نے استفسار کیا۔
 ”وہ بڑی بڑی خزانہ تھی، آنکھوں میں آنسو بھر کے بولی اللہ بنی۔ کیا سخت دل کر لیا ہے۔ تمہیں کسی کی محبت ہی نہیں۔“ وہ کہنے لگی۔
 ”بس پھر کیا تھا، بیگم صاحب نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے نہ صرف معذرت کی بلکہ اسی دن لکھنؤ جانے کا ارادہ کر لیا۔ انہوں نے فوراً سامان باندھا اور مکان کے کرائے کے ساتھ نوکروں چاکروں کے حساب بے باقی کرنے میں وہ دن نکل گیا۔ اگلی صبح پوری شکر مکرانے پر منگوئی۔ ضروری اسباب اس پر لاد لیا اور فضول سامان ہم ایسے نندیوں میں بانٹ دیا اور خود لکھنؤ روانہ ہو گئی۔ سنا ہے، جاتے جاتے توبی خورشید جان خورشید کو بھی داپس لے جانے کی دعوت دی تھی مگر وہ عین وقت پر درپوش ہو گئی اور جانے سے رہ گئی۔ واہ رے مقدر۔ کتنے عرصے بعد کام ملا تھا۔ وہ بھی کالے نصیبوں کے ہاتھوں اجڑ گیا۔“ سارٹیکے نے ایک ٹھنڈی آنسو بھرتے ہوئے کہا۔
 ”اللہ مالک ہے۔ وہ خود کوئی اور سبب بتا دے گا۔“ عزیز نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا اور اپنی طرف سے کچھ اس کی نذر کرتے ہوئے اسے رخصت کیا۔
 ”تو امراؤ..... اچھا بیٹا پا دکھایا۔ اچھی دوستی نبھائی۔ کیا اسے محبت اور چاہت کہتے ہیں؟ جاتے ہوئے مل کر بھی نہیں گئیں۔ اب کے پچھڑے تو پتا نہیں پھر ملاقات ہو بھی پائے گی یا نہیں۔ مگر عزیز اس قدر بے وفائیں ہے کہ وہ تمہاری محبت اور تمہاری چاہت کو بھلا پائے گی۔ کبھی نہیں۔ شاید زندگی بھر نہیں۔“ عزیز نے آنکھوں میں یہ سوچتے ہوئے خود بخود آنسو آگئے اور پھر اسے امراؤ کا وہ شعر یاد آ گیا۔
 دشت جنوں کی سیر میں بہلا ہوا تھا دل
 زندان میں لائے پھر مجھے احباب گھیر کے
 ☆☆☆
 کان پور شہر میں طوائفوں کے محلے ”لور کی عالی“ میں دو بی تو کچھیاں شہرت کی بلندی پر تھیں۔ ان میں ایک خورشید جان بھی، پری کی صورت، شہبائی رنگت، ناک نقشہ کو یا صانع قدرت نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہو۔ آنکھ میں یہ معلوم ہوتا

تھا کہ موتی کوٹ کر بھر دیے ہیں۔ سرخ، سفید ہاتھ پاؤں سڈول، نور کے سانچے میں ڈھلے ہوئے، بھرے بھرے بازو، گول کلاٹیاں، جامہ زیبی وہ قیامت کی کہ جو پہنا معلوم ہوا کہ یہ اسی کے لیے بنا ہے۔ اداؤں میں وہ دلفریبی، وہ بھولا پن کہ جو ایک نظر دیکھے ہزار جان سے فریفتہ ہو جائے۔ جس محفل میں جا کے بیٹھ جائے معلوم ہو کہ ایک شیخ روشن ہو گئی۔ بیسوں طوائفیں بیٹھی ہوں، نظر اسی پر پڑتی ہے۔ جب سے دربار کرنا شروع کیا، خورشید جان سے خورشید جہاں ہو گئی۔ خود سخن طراز بھی مگر اس حسن و خوبی پر آواز بالکل ہی بندھی۔ کان پور کے مشہور شاعرین کان پوری سے تلمیذ رہتی تھی اس کا اپنا شعر تھا۔
 ہم ترپتے ہیں، تو ہنس ہنس کے فرماتے ہیں
 کیا ہوا تھا، یہ ترا و جگر وصل کی رات
 دوسری لور کی عالی محلے کی مشہور مغنیہ..... حسن بانو گوہر (حمیدہ بانی) جواب بڑھا پے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کی وفات بیٹی کی پیدائش کے بعد ہوئی۔ بیٹی کی پرورش اسی محلے میں ہوئی۔ بیٹی کا نام عزیز النساء رکھا گیا۔ لور کی عالی اس زمانے کی تہذیب سے آراستہ طوائفوں کا محلہ تھا۔ اس کی دادی ہندو تھی لیکن وہ اسلام کی حقانیت سے آشنا ہوئی تو اپنا آبائی مذہب ترک کر دیا اور اپنی آخر صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لے آئی۔ عزیز النساء کی والدہ اسے جنم دے ہی فوت ہو گئی مگر اپنے پیچھے ایک حویلی نما مکان چھوڑ گئی۔ عزیز النساء اسی گھر میں پئی بڑھی۔ وہ جب جوان ہوئی، تو عزیز النساء سے عزیز بن بانی ہو گئی۔ اونچا بلقا، شکرنی رنگ روپ، موٹی بڑی آنکھیں، کمان ابرو، تازے گلاب کی پتیوں ایسے ہونٹ، غم چھوٹی ناک میں جھلجھل کرتا ہیرے کی کئی کا کوکا، اوپر سے کول کی طرح آواز۔ عزیز بن بانی کا بالا خانہ بھی حسن اخلاق، تہذیب و تمدن، آداب و شائستگی کا بالا خانہ تھا جہاں رکھ رکھاؤ کے آداب سے اعتراف کی اجازت نہ تھی۔ عزیز بن کے مزاج میں ہندو اور مسلم دونوں تہذیبوں کا استخراج تھا۔ گوہر خورشید جہاں خورشید کی طرح سخن طراز نہیں تھی مگر اس کا شعری ذوق بہت عمدہ تھا۔ اسے حضرت امیر خسرو، میر تقی میر، غالب، ذوق غرض بہادر شاہ ظفر کا کلام از بر تھا۔ میر ابائی کے بھجن اور بھکت کبیر کے دوہے بھی یاد تھے، جنہیں وہ موعظ کی نزاکت سے برجستہ پیش کر کے داد حاصل کرتی اور غزل، گیت، بھجن، دادرا، شعری، بری اور بدائی کے گیتوں سے اپنی سریلی آواز کا جادو چکانی تھی اور یہی چیز اسے خورشید جہاں خورشید سے

منفرد کرتی تھی۔

ہم اس نازک ادا کی خوشیوں پر جان دے رہے ہیں
شیر کے جس میں غرے ہوں فرس کی جس میں جھلجھلی ہو
عزیز نے پھر مسکرا کر سلام کیا اور خانم کے نزدیک بیٹھ
گئی۔ خانم نے آج بھی آدھیں اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔
”اللہ بری نظروں سے بچائے!“

عزیزان نے جیکسی اور چرائی نظروں سے ارد گرد دیکھا اور پھر نظروں ہی نظروں میں اپنے سازندوں کو ہلکا سا اشارہ کیا۔ اس کے اشارہ کرتے ہی طبورے میں جان پیدا ہوئی۔ طلے نے ہٹھکورا بھر اور اس نے گت شروع کر دی۔ سامنے بیٹھے تماشا بینوں نے واہ واہ کا شور مچا دیا۔ تھوڑی دیر تک گت دربار میں مجرا کرتی رہی پھر اس نے غزل چھیڑ دی، سرگم صاف تھا۔ جب اس کے گلے سے مور چھٹا نکلا تو سننے والے لام بخود ہو کر بیٹھ رہے۔

عزیز بانی ایک ایسی شخصیت تھیں جس کی دراز رائی زلفوں میں الجھنے اور اس کی نقلی آنکھوں میں ڈوبنے والے بے شمار تھے لیکن کسی میں یہ جرأت تھی یہ نہیں کہ اس کی شراب و دوا تھو کا جام اپنے ہونٹوں سے لگا سکے۔ اس کی اداؤں نے فریفتہ اور جرأت اظہار کی بے باکی کی وجہ سے اسے ”جنگلی“ کے نام سے جانے والے پکارتے تھے۔ وہ اپنے ہی زمانے کی مشہور اور گھنڈی پنچنی امرا و جان ادا کی سہیلی بھی تھی جو کان پور کی ایک بڑی سی حویلی میں بڑے شمس سے رہتی تھی۔ اس حویلی کے بے شمار کمرے تھے جن میں خانم کی نوچیاں رہتی تھیں۔ ہر وقت دس بارہ نوچیاں تو یہاں موجود ہی رہتی تھیں مگر یہ سب ناچنے گانے والی تھیں۔ ان میں طوائف کوئی نہ تھی۔ حویلی کے مختلف کمروں میں مختلف کچھیاں رہتی تھیں، جن کے اپنے اپنے سازندے اور اپنے اپنے دربار الگ لگانے کے لیے اوقات مقرر تھے۔ یہ حویلی پریوں کا گڑھ لگتی تھی، جدر بھی نظر دوڑاؤ ان بیبیوں کے ٹھنڈے ٹول، گانے بجانے اور گیت سنگیت کی محافل میں طلبوں، ساریگیوں کی آوازیں آتی تھیں۔ ناچنے گانے کی تربیت دینے والے استادوں کی جھڑکیاں، مصاحبین اور خدمت گاروں کا ایک الگ جم غفیر تھا جو سب اسی ایک حویلی میں رہتے تھے۔ یہاں ناچ گانے کے علاوہ نوچوں کو کھینے پڑھنے کی تعلیم، رکھ رکھاؤ اور تہذیب سکھانے والے استادوں کا بھی آجانا ناگاہتا تھا اور اسکول جانے اور فن تعلیم سے آراغی کا سامان بھی موجود تھا اسی لیے شہر کے امیر، رئیس اور معزز لوگوں میں جا کر اپنے فن کا مظاہرہ کرنے ان میں حوصلہ بھی تھا۔

آج بھی جب وہ دربار کرنے کو بھی، تو اس نے
چڑھے کالے گرنٹ کے بڑے بڑے پانچوں والوں پاجامہ
پہنا جو سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا۔ دیکھنے والوں کا سانس سنبھلنے
والی بدن پر کسی کسائی کرتی، گھاس رنگی چڑی، کانوں میں
سننے کے بڑے بڑے بالے، ہاتھوں میں کڑے، مکھے
میں موتیوں کا شاہ ہار پہن کر جب وہ اپنے قد جتنے شیشے کے
سانے کھڑی ہوتی تو اسے ایک لمحے کو یوں لگا جیسے اس کا عکس
بھی اسے صدقے داری جانے لگا ہو۔ اس نے ایک بار پھر
شیشے کے آگے گھوم پھر کر اپنے ہارنگ کا جائزہ لیا، پھر جب
اسے ہر طرح سے یقین ہو گیا تو وہ آہستہ آہستہ پاؤں
اٹھاتے ہوئے اس کمرے میں آئی، جہاں وہ بار لگا تھا۔

[illegible]

ایک نازک غزلی نوہی ہر ایک کو یان پتا بنا کر دے
دری تھی۔ جب اس نے دربار میں پاؤں رکھا تو پان دینے
والی نوہی ایک مصوم مسکراہٹ چھینک ہوئی کمرے سے نکل
گئی۔ اس کے آتے ہی سب کی نظریں اس کی جانب
اٹھیں۔ اس نے جبکہ رکھنا نازک سا ہاتھ اٹھایا اور ماتھے
تک لے جاتے ہوئے درباری سلام پیش کیا تو یک وقت
بسم اللہ کی آوازیں اٹھیں۔ اس نے مسکراتے ہوئے ہر
طرف نظر دوڑائی اور شکر یہ ادا کرتے ہوئے اپنی مخصوص
لہجہ پر بھی تو محاکا طرف سے آواز اٹھی۔

ہیں، ہر تال اور سرکری پرواہ وادہ کرتے ہیں۔

اسی طرح کا ایک تماش بین دلبر جان نے بھی پھانس رکھا تھا۔ وہ جب بھی عزیزن بانی سے ملتی، اسی کے تذکرے لے کر اور مزے مزے سے اس کی حرکتوں اور باتوں کو عزیزن بانی کے گوش گزار کرتی رہتی تھی۔ جب بھی عزیزن اس کی باتوں سے اکستا جاتی، تو وہ اسے جھڑک بھی دیتی تھی لیکن اس کے باوجود ایک دلبر جان ہی تھی جس سے عزیزن بانی کی گاڑھی چھٹی تھی۔

☆☆☆

وقت کا جن ایسا غصیٹ ہے کہ اگر وہ حالات کی بوتل میں قید رہے تو ہر طرف خیر کا ڈنکا بجتا ہے مگر جب یہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے تو پوری دنیا پر قابو پانے کی ضد میں معاشرے میں بے حد بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ لوگوں کو بغاوت پر اکساتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار رکھ کر خوش ہوتا ہے۔ ایسی ہی ہوا پورے ہندوستان میں آج کل پھیلی ہوئی تھی۔ ملک میں ہونے والے واقعات اور ان کی خبریں سن کر ہر شخص بے چین تھا۔ پورا ملک توڑ پھوڑ کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔ پرانی بادشاہیاں اپنی آخری سانسوں پر تھیں۔ انتشار اور بگاڑ نے پورے معاشرے پر اپنے پنجے گاڑ لیے تھے۔

جب ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی میں کامیاب مداخلت کی صورت بانی نہ رہی اور انگریزی فوج کے قدم شہر میں جم گئے تو انگریز سرکار نے اس وقت کے مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو بھی لال قلعے سے ہمایوں کے مقبرے میں منتقل کر دیا۔ نئے حکمرانوں نے عوام کا جینا دو بھر کر دیا تھا۔ فروری 1857ء کو ہی لوگوں نے نئی نئی خبریں سننا شروع کر دی تھیں۔ لوگوں کے کاروبار غصہ ہونے لگے تھے۔ بازار حسن میں بھی کاروبار ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ چپانی سے لے کر سرخ کنول کے پھول کی کہانی اپنے دامان میں چھپی کہانیاں لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچتی رہیں۔ تانیا ٹوپے کان پور کے لوگوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ بھرتا رہا۔ اب لوگوں کو یقین ہونے لگا تھا کہ انگریزوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے جنگ ناگزیر ہو چکی ہے۔ انہی دنوں ایک روز عزیزن بانی نے دلبر جان سے کہا۔

”وطن میں جو جنگاری سلگ رہی ہے، مجھے لگتا ہے، یہ جلد ہی شعلہ جوالہ بن کر سب کو خاستہ کر ڈالے گی۔“

”بات تو کچھ ایسی ہی لگتی ہے۔“ دلبر جان نے دکھ بھرے لہجے میں جواب دیا۔

ہر فنکار پر اگر خدا تعالیٰ کی نظر ہو تو ایک ایسا مقام آتا ہے جب وہ خواص سے نکل کر عوام میں اپنی شہرت بنا لیتا ہے۔ اب نہ صرف کان پور میں عزیزن بانی کی خوبصورتی اور گانگی میں خوش گلوئی کے تذکرے عوام تک پہنچ چکے تھے بلکہ اس کی گانگی ہوئی غزلیں، ٹھریاں اور بھجن گلیوں اور بازاروں میں لوگ گاتے پھرتے تھے۔ اس کا ایک اثر اور بھی ہوا کہ اب دوسری نوچیاں بھی اس سے دلی دہلی سی رہنے لگی تھیں۔ ویسے بھی جب عزیزن بانی خانم کے زیر اثر آئی تھی، یہاں حویلی کی ساری نوچیوں، سازندوں اور دوسرے خدمتگاروں کو بھی علم تھا کہ عزیزن بانی خانم کی اپنی بیٹی ہے۔ خانم نے اس کی پرورش سے لے کر اس کے جوان ہونے تک اور اس کے بچپن کی ناز برداریوں سے لے کر نوجوانی کے غرور اور تمکنت، تعلیم و تربیت کسی بات میں کمی بھی تو نہ چھوڑی تھی۔ اس لیے حویلی کی تمام نوچیوں پر اس کا دیدہ تھا۔ وہ کسی کو گھاس بھی تو نہ ڈالتی تھی۔ عزیزن بانی کی بیٹی تھی تو صرف دلبر جان سے زیادہ بیٹی تھی۔ وہ جب فارغ ہوتی تو دلبر جان کے کمرے میں آ جاتی یا پھر دلبر جان اس کے کمرے میں موجود ہوتی۔ کہتے ہیں کہ نوچیاں اور طوائفیں اپنی گفتگو اور اپنے انداز و اطوار میں بڑی مہلی ڈلی ہوتی ہیں۔ چلبلاہٹ اور بات بات پر چھیڑ چھاڑ، عشوہ طرازیوں اور غزے سب ان کی اپنی پیدا کردہ ہوتی ہیں، جن کی وجہ سے وہ بگڑے رئیس زادوں، بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچنے امیروں، دولت لٹانے والے لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنا مقصد نکالتی ہیں۔ دلبر جان میں یہ ساری خوبیاں موجود تھیں۔ سب طوائفوں کا قاعدہ ہوتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی کو اپنا بنا کر رکھتی ہیں۔ ایسے شخص سے وہ بہت فائدے اٹھاتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ جب کوئی نہ ہوا تو اس سے دل بہلایا، سودے سلف کا آرام رہتا ہے۔ دوسرے آدمی سے منگواؤ، تو بے ایمانی کا دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ یہ مارے خیر خواہی کے انچی سے اچھی چیز پھر بھر سے ڈھونڈ کر آپ کے قدموں میں لا ڈالتے ہیں۔ بنیاد پر تو حد سے زیادہ خدمت کرتے ہیں۔ طرح طرح کے آرام دیتے ہیں، رات بھر پاؤں دباتے ہیں۔ صبح کو دو ابنا کر پلاتے ہیں۔ حکیم صاحب سے حال کہتے جاتے ہیں۔ دوست آشنائوں میں تعریفیں کرتے رہتے ہیں۔ ”چرکھٹ“ چھسا کر لاتے ہیں۔ جہاں شادی بیاہ ہوا ناچ کا انتظام اپنے ذمے لے کر بھرے میں انہی کو لے جاتے ہیں۔ محفل میں بیٹھ کر اہل محفل کو توجہ کرتے ہیں۔ وہ ناچ یا گاری ہے، یہ تال دیتے ہیں۔ ہر مہر پر آہ کرتے

لیکن.....! دلبر جان نے خوف اور حوصلے کی ملی جلی زبان میں کہا۔

”شاباش دلبر جان مجھے تم سے یہی توقع تھی، دیکھ میں نے ایک روز نواب میرا اولاد علی سے خنجر مانگ لیا تھا۔“

”عزیز ازاں۔ اگلی بات بعد میں۔ پہلے تمہیں میری ایک بات کا آج جواب دینا ہوگا۔ بولو جج بتاؤ گی۔“

دلبر جان نے شونی سے پوچھا۔

”پوچھو میری جان۔ آج تم نے میرے کہے کی لاج رکھی ہے، جو پوچھو گی بتاؤں گی۔“ عزیزن بانی نے ہنس کر اس کے گال پر چٹکی کاٹنے ہوئے کہا۔

”بڑے دنوں سے یہ باتیں میرے کانوں میں پڑ رہی ہیں کہ تم نے خواتین کا ایک فوج کی طرح کاربیکڈ تیار کر رکھا ہے اور کان پور میں جتنے معرکے بھی ہوئے ہیں، ان میں تمہاری اس بریکڈیز نے بڑھ چڑھ کر نہ صرف حصہ لیا ہے بلکہ انگریزوں کو سب سے زیادہ پریشان کیے ہوئے ہے..... اور..... اور میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ تم ہی نے اس عورت کو تربیت دی ہے جو پتھیل کے درخت پر چڑھ کر انگریز فوجیوں کو گولیوں سے بھون ڈالتی ہے۔“

”بڑی گنتی ہو۔ یہ تم نے کس سے سنی اور تمہیں کس نے خبری کی ہے؟“ عزیزن بانی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”یہ میری بات کا جواب نہیں۔ میں نے جو پوچھا ہے وہ بتاؤ۔ رہی بات ان باتوں کی تو تمہیں پتا ہے جس طبقے سے ہمارا تعلق ہے، وہاں آنے والا شخص نہ صرف اپنے اندر کی باتیں کھول دیتا ہے بلکہ اپنی جھینس بھی الٹ جاتا ہے۔“ دلبر جان نے اسی انداز میں کہا۔

”ہوں۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہاں میں بتا رہی تھی کہ یہ خنجر مجھے خوبصورت لگا تھا۔ اس لیے میں نے اس روز میرا اولاد علی کو موڈ میں دیکھتے ہوئے یہی کہہ کر اسے رکھ لیا تھا اب ہم روزانہ رات کے اندھیرے میں دونوں اس حویلی میں نکلا کر س گے اور جہاں کوئی گورا نظر آئے گا، اسے نشانے پر رکھ لیا کریں گے، وہ بھی تو اسی طرح کے ظلم ہمارے آدمیوں عورتوں پر کر رہے ہیں۔“ عزیزن بانی نے کمال خوبصورتی سے اس کی بات بدل کر اپنا منصوبہ اسے بتایا۔

”مگر اس بات کی ہشک خانم کو بھی تو لگ سکتی ہے، اس کا پھر ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟“

دلبر جان کے اندر کا خوف بولا۔

”تم اس کی مجھ پر چھوڑو۔ وہ میں سنجال لوں گی۔ مجھے صرف تمہاری حمایت اور ساتھ کی ضرورت ہے۔“

”تم دیکھ رہی ہو کہ جتنے بھی بڑے بڑے سرمایہ دار، رئیس اور حکمران طبقہ ہے، وہ انگریز کی سرکار کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہیں۔ مجال ہے انہیں ذرا بھی احساس ہو حالانکہ عوام کو زیادہ فکر لگی ہے کہ وطن ان کے ہاتھوں سے لکھتا جا رہا ہے۔ اس لیے تیسرے درجے کے لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ ان کی ایک سانجھ بن رہی ہے۔ انگریزوں کے خلاف نفرت بڑھتی جا رہی ہے۔“ عزیزن بانی نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

دلبر جان نے بھی دکھی انداز میں جواب دیا۔ ”مگر ہم کیا کر سکتے ہیں، بس اللہ ہی رحم فرمائے گا!“

”کیوں نہیں کر سکتے، ہم بھی انہی لوگوں میں سے ہیں۔ ہم ایسے کم ہمت تو نہیں اور نہ ہی ہم ایسے نچلے درجے کے لوگوں سے کسی بات میں کتر ہیں۔ ہم ان سے اونچے ہیں۔ ہم اپنی قوم اور اپنے آپ کے برے بھلے کا سوچ سکتے ہیں۔ ہم تو وہ ہیں، جن سے شرفاء آ کر تیز سکتے ہیں۔ تہذیب و تعلیم کا درس لیتے ہیں۔ وہ جو آج بڑے ہیں، انہیں ہم نے ہی بولنے، اٹھنے بیٹھنے کے انداز سکھائے ہیں۔ اگر آج کے اس لمحے میں ہم لوگ پیچھے رہ گئے تو آنے والا وقت ہم کو الزام دے گا۔ ہمارے لیے جس روپے کا ماتم کرے گا۔ بولو..... کیا تم چاہتی ہو کہ لوگ تمہیں برے نام سے یاد کریں؟“ عزیزن بانی جذباتی ہونے لگی تو دلبر جان اس کا رویہ دیکھ کر پوچھ نہی۔

”ہم کر بھی تو کیا سکتے ہیں۔ ہم عورتیں ہیں، کمزور اور ناتواں پھر ہمارا نام کون سا تاریخ میں آتا ہے۔“

”دلبر جان! تو بھی پاگل ہے، ہم کسی صبلے یا سائکش کے لیے یہ کام کریں گے۔ ہماری تاریخ تو ایسی عورتوں سے بھری پڑی ہے، جنہوں نے مردوں کے کندھے سے کندھا ملا کر ہر مقام پر کام کیا۔ جنگیں لڑیں۔ زنجیوں کی مرہم پٹیاں کیں۔ تم نے نہیں سنا آج کے دور میں بھی ایسی عورتیں موجود ہیں۔ جہانسی کی رانی اور حضرت محل جیسی عورتیں بھی مردوں کے دوش بدوش آزادی کے لیے لڑ رہی ہیں۔ رہی بات ہمارے آباء کی توان کی عظمت و حشمت کی کہانیاں گو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قصر گنتا میں ڈھونڈی گئیں۔ آج اگر ان روشتاں روایات کو زندہ کرنے کا موقع ملا ہے، تو ہمیں پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ ہمیں بھی اس سانجھ میں اپنا حصہ ڈالنا ہوگا۔“ عزیزن بانی کا جذبہ بانی پن اس کی نہ صرف گفتگو بلکہ اس کے جسم کے انگ انگ سے جھانک رہا تھا۔

”بات تو کچھ کچھ میری بھی سمجھ میں آ رہی ہے

بندھے تھے۔ سامنے آتے ہی ان میں سے ایک سوار جو اسلحے سے لیس تھا، وہ چٹانک لگا کر ان کے نزدیک آیا۔ اس نے منہ سے ڈھانٹا اور عزیزان بانی فوراً بول اُٹھی۔
”تانتیا..... تم!“

”ہاں عزیزان! مجھے تمہاری ساری کارروائیوں کا علم ہوتا رہتا ہے۔ میں مبارک باد دیتا ہوں کہ اب کان پور کی عورتیں بھی اس جنگ میں ہمارے ساتھ شریک ہو چکی ہیں۔ یہ کچھ اسلحہ میں تمہیں دینے آیا ہوں۔ تمام مجاہد بہنوں میں تقسیم کر دیتا اور ہاں کل تک گھوڑے بھی تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ مجھے جلدی ہے، میں جا رہا ہوں۔“

یہ کہہ کر تانتیا چٹانک لگا کر گھوڑے پر سوار ہوا، وہ رانٹلیں اور تھپے اس کے پیروں میں ایک بوری کی شکل میں چھپک گیا تھا، عزیزان اور دلبر جان نے وہ بوری اٹھائی اور حویلی لے آئیں۔

”اب اگر خبری ہو جائے تو ہم سب ماری جائیں گی۔“
دلبر جان نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

”کچھ نہیں ہوتا، حوصلہ رکھو۔ موت تو پھر بھی آتی ہے، اگر وطن کی آزادی کے لیے آجائے تو اس سے بڑھ کر اور کیا نعمت ہوگی۔“ عزیزان نے ہمت و حوصلے سے جواب دیا۔
اسلحہ لٹنے سے عزیزان بانی کے حوصلے اور بڑھ گئے تھے۔

4 جون 1857ء کو انگریزوں نے تانتیا سے جھڑپوں کے بعد پورے کان پور پر قبضہ کر لیا تو لوگوں کے ساتھ ساتھ عزیزان بانی کی نفرتوں میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اس نے اور نوچیوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اب وہ اپنے ہمیں بدل کر اور اپنے جسون پر اسلحہ جا کر پورے شہر کا چکر لگاتیں۔ ایک انگریز مورخ کے مطابق.....

”وہ اسلحہ باندھے گھوڑے پر سوار، بجلی کی طرح شہر کی گلیوں اور فوجی چوکیوں میں چکر لگایا کرتی۔ کبھی گلیوں میں گھوم گھوم کر بے حال اور زخمی سپاہیوں کو دودھ، مٹھائی اور پھل بانٹتی تھی اور کبھی زخمی سپاہیوں کی مرہم پٹی کرتی تھی۔ انگریزوں کے قلعے کی دیوار کے نیچے باقی سپاہیوں کا حوصلہ بڑھاتی اور محاذ جنگ پر گولہ بارود اور سپاہیوں کے لیے ناشتا اور کھانا بھی پہنچاتی تھی!“

انہی دنوں کان پور میں مولوی سید احمد اللہ جیسے مرد مجاہد کا ورود ہوا۔ مولوی سید احمد اللہ کو انقلاب اودھ کا روح رواں سمجھا جاتا تھا۔ وہ سید احمد شہید کے مقتولوں میں سے تھے، جنہوں نے سید احمد علی کا نام بدل کر سید احمد اللہ کر دیا۔ انہوں نے زمانے کے رواج کے مطابق دینی تعلیم حاصل

عزیزان بانی نے دوبارہ سے تعین دہانی چاہی۔
”کیوں اداس ہوتی ہو، دلبر جان نے پہلے کبھی تمہارا ہاتھ پھوڑا ہے، میری رگوں میں بھی پشمان کا خون ہے، وہ ظلم پر چپ کیے مگر رہے گا۔“ دلبر جان نے پورے جوش سے عزیزان کا ہاتھ دباتے ہوئے جواب دیا۔

ان کے علاقے ”نور کی عالی“ میں طوائفوں کے چلنے تو دیکھی ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ لوگ خوف کے مارے نکلتے ہوئے ڈرنے لگے تھے اور دولت رکھنے والے تو پہلے ہی بزدل ہوتے ہیں۔ گا بکی کم ہونے کی وجہ سے انہیں اور بھی قتل کیلئے کا موقع فراہم ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ہمیں بدل کر مردوں کے پٹڑے پہنیں، ان کی طرح اپنے منہ اور سر پر ڈھانٹے باندھیں اور باہر کی گلیوں میں نکل جاتیں۔ انہیں جہاں بھی کوئی انگریز نظر آتا، اسے گولی مار کر گردا دیتیں اور آگے نکل جاتیں۔ آہستہ آہستہ ان کی کارروائیوں کی دھوم مارتا، کان پور میں پھیل گئی اور گوروں نے ڈر کے مارے راتوں کو گھروں سے باہر نکلتا بند کر دیا۔

☆☆☆

”خوشی اس بات کی ہے کہ میرے شہر کے لوگ بھی بیدار ہونے لگے ہیں۔ انہیں بھی اس بات کا احساس ہونے لگا ہے کہ انگریز ان کا دشمن ہے۔ وہ ایک ایسا نیکوڑا ہے، جو آہستہ آہستہ پورے ہندوستان کو اپنی گرفت میں لینے پر تلا ہوا ہے۔“ تانتیا ٹوپے نے اپنے ایک ساتھی سے کہا، جو اس کے لیے خبر لے کر آیا تھا کہ کان پور میں چھاپا مارا کارروائیاں شروع ہو چکی ہیں۔

”ڈھانٹے باندھے لوگ راتوں کو گلیوں بازاروں میں نکلتے ہیں اور انگریزوں پر حملہ آور ہو کر انہیں جان سے مار رہے ہیں۔ پتا نہیں وہ کون لوگ ہیں۔ کان پور میں تو انہوں نے راتوں کو انگریزوں کا باہر نکلتا بند کر دیا ہے۔“ ساتھی نے پوچھا۔ ”شاید سردار آپ کو ان کی کچھ خبر ہو۔“ اس نے کچھ وقفے کے بعد دوبارہ پوچھا۔

”وہ کوئی بھی ہوں۔ یقیناً ان کی سوچیں اور ان کے منصوبے ہم سے ملتے جلتے ہیں تو پھر وہ ہمارے ہی ساتھی ہوئے نا۔“ تانتیا نے خنجیدگی سے جواب دیا۔

وہ اندھیری راتوں میں سے ایک رات تھی۔ جب عزیزان بانی اور دلبر جان مردانہ ہمیں میں شہر کے بچوں کی تلاش میں پھر رہی تھیں کہ اچانک ایک موڑ پر وہ دونوں ٹھٹھک کر رہ گئیں۔ سامنے سے گھوڑوں پر سوار دو آدمی ان کے سامنے آ گئے۔ ان کے منہ پر بھی ڈھانٹے

کرنے کے بعد فن سپاہ گری میں بھی مہارت حاصل کی۔ وہ جے پور سے ٹونک اور وہاں سے گوالیار آئے اور ایک بزرگ محراب شاہ کے پاس قیام کیا۔ محراب شاہ سیاسی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ انہوں نے احمد اللہ شاہ کو فرنگیوں کے خلاف جہاد کرنے کی تلقین کی۔ اس کے بعد سے وہ ایک نیا فلسفہ حیات، ایک نیا پیغام عمل لے کر نکلے۔ وہ وہلی آئے۔ وہاں کے حالات دیکھ کر دلبرداشتہ ہو کر آگرہ آگئے جہاں انہوں نے کئی سال تک قیام کیا۔ وہ بھٹے میں دو دن بیٹھیں جلوس نکالنے جس کے آگے نقارہ بجتا ہوتا۔ اسی مناسبت سے لوگ انہیں ”ڈنکا شاہ“ کے نام سے پکارنے لگے۔ اس وقت وہ اپنے آتشیں لب و لہجہ سے اپنی نقارہ کے ذریعے لوگوں کو جہاد کی تلقین اور مجاہدین کا لبو کراتے تھے۔ کان پور پر قبضے کے بعد وہ کان پور میں آئے تو ان کی نقارہ رسن کر لوگ ان کے پیغام پر جہاد کے لیے تیار ہو گئے کیونکہ انگریزوں کی دراز دستیوں کے ہاتھوں کیا امیر، کیا غریب..... سبھی تالاں ہو چکے تھے اور دل سے چاہتے تھے کہ فرنگیوں کو ملک سے نکالنے کی کوئی تدبیر کی جائے۔ مولوی احمد اللہ شاہ نفرت کے اس شدید جذبے کو منظم کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ سیر و سیاحت کے باعث ان کا تجربہ بھی بہت وسیع ہو گیا تھا اور مختلف شہروں میں ان کے حامی اور مددگار بھی پیدا ہو گئے تھے۔ جب کان پور میں ان کا ورود ہوا، تو پورے شہر میں شور مچ گیا کہ ”ڈنکا شاہ“ اب کان پور آگئے ہیں۔ اب انگریزوں کو یہاں سے بھاگنا ہوگا۔ رات بھر شہر کی گلیوں اور محلوں میں چکر لگا کر وہ دونوں تھک چکی تھیں اور اپنے اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھیں۔ جب حویلی میں ایک شور مچا۔ عزیزین بانی کی آنکھ کھلی۔ وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی اور اس شور سے متعلق دریافت کیا۔ ایک مہری نے بتایا کہ آج شہر کے چوک میں ”ڈنکا شاہ“ کا تبلیغی جلوس نکل رہا ہے جس کے بعد ان کا خطاب بھی ہوگا۔

ڈنکا شاہ کا نام عزیزین نے بھی سن رکھا تھا۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ گئی اور ان کی تعلیمات سے بھی مستفید ہوگی۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوئی اور دوڑتی ہوئی دلبر جان کے کمرے کی طرف چلی گئی۔

☆☆☆

جون جولائی کی سخت گرمیوں، جس اور بدلوں میں سانس روکنے والے دن تھے۔ محلہ ”لور کی عالی“ میں جشنوں، درباروں اور مشاعروں کی سانس بھی ملکی حالات

کے پیش نظر رکی رکی چل رہی تھیں۔ طوائفوں کے گاہکوں میں بھی قدرے کمی واقعی ہو چکی تھی اور وہ اٹھتے بیٹھتے اپنے کاروباری مندرے کی باتیں کرتے آخر میں انگریزوں کو بددعا نہیں دینے لگی تھیں۔ وہی نوچیاں جو ایسے حالات میں بھی اپنے کاروبار بچائے رکھنے کی دعوے دار تھیں، اب علی الاعلان ہندوستانی فوجوں کی حمایتی بن چکی تھیں۔ ایسے موسم میں جب کسی نوچی کی دھاڑی لگ جاتی، تو وہ بہت خوش ہوتی تھی۔

ایک ایسے ہی دن کا ذکر ہے جب ایک سترھی پنچھری عورت عزیزین کی حویلی میں داخل ہوئی۔ اس کا رنگ گورا اور چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا۔ روٹی کی طرح کے سفید بال مگر انہیں بڑی مہارت سے سنہیلا ہوا تھا۔ کمر میں قدرے خم آیا ہوا تھا۔ اس نے تن زیب کا کرتہ، مین سکھ کا پاجامہ اور سفید ملل کا نقس دوپٹا بڑے سلیقے سے اوڑھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے اور انگلیوں میں مندریاں پہن رکھی تھیں۔ وہ ہانپتی کانتی ہوئی حویلی میں آئی اور ایک خدمتگار سے عزیزین بانی کا پوچھا۔

خدمتگار نے فوراً عزیزین بانی کو اس کی آمد کا بتایا تو عزیزین نے حسب روایات اس کے ہاتھ بڑھیا کے لیے ہان دان بھجوا یا اور اسے مزید کہا کہ وہ چاندی کی منتش گڑ گڑی تازہ کر کے اس کے سامنے رکھے۔ وہ خود جلدی سے تیار ہو کر اس کمرے میں پہنچی جہاں اس بڑھیا کو بٹھایا گیا تھا۔

”جی بتائیے، میں عزیزین ہوں۔“ وہ اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔

”اللہ خوش رکھے، لمبی عروے۔ جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔“ بڑھیا رک کر بولی۔

”کیسے، کیسے تشریف آوری ہوئی؟“ عزیزین نے بات آگے بڑھائی۔

”وہ ہماری بیگم صاحبہ نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔ ان کے اکوٹے بیٹے کی سالگرہ ہے۔ وہاں عورتوں کا جلسہ رکھا ہے، تمہارا بھرا ہوگا۔ دربار لگے گا صرف عورتوں کا۔“ ابھی وہ باتیں کر رہی تھیں کہ خانم بھی اس کان کر ادھر آ گئی، وہ اس کی بات سن کر فوراً بول اٹھی۔

”دیکھیے اماں بی۔ عزیزین ناچتی نہیں ہے، وہ تو صرف گاتی ہے۔ اس کے گلے کا سارا کان پور معترف ہے۔ ناچنے والی چاہے تو کوئی دوسری لے جاؤ۔ ویسے بھی عزیزین کھلا جلسہ نہیں کرتی۔“

اس کے جاتے ہی ایک کھارڈولی کے قریب آ کر بولا۔
 ”بی بی جی! یہ کچھ وہ دے گیا ہے۔ لے لیں۔“
 عزیز نے ہاتھ باہر نکالا، تو کھار نے کنول کا پھول
 عزیز کے حوالے کر دیا اور بولا۔ ”بی بی وہ کہہ رہا تھا بیگم
 صاحبہ کو دے دینا اور کھانا آگے دے دے۔“
 عزیز نے کنول کا سرخ رنگا پھول دیکھتے ہی بے
 ساختہ کہہ دیا۔

”تانتا..... یہ تم تھے۔“ یہ کہہ کر اس نے سرخ کنول
 کا پھول کھار کے ہاتھ سے لے لیا۔ کھاروں نے ایک بار پھر
 ڈولی اٹھالی اور لور کی عالی کی طرف بڑھنے لگے۔ جب وہ
 ایک کھلی جگہ پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا۔ دس پندرہ فوجیوں
 کی لاشیں وہاں پڑی تھیں، جنہیں گوروں نے باغی کہہ کر
 پکڑا اور یہاں لاکر گولیوں کے آگے رکھ لیا۔ وہ اپنی طرف
 سے انہیں ہلاک کر کے چلے گئے تھے۔ کھار ان کے قریب
 سے ڈولی لے کر نکلے جا رہے تھے، جب عزیز نے کونان کی
 لاشوں کے نیچے سے ایک سانس لیتی، کانپتی آواز سنائی
 دی۔ ”پانی.....!“

عزیز نے ڈولی رکوائی اور ڈولی میں سے نکل کر
 لاشوں کی طرف بھاگی۔ کھار بھی اس کے پیچھے ادھر بھاگے۔
 وہ دو لاشوں کے بیچ میں زخمی حالت میں پڑا کر رہا تھا۔
 عزیز نے خادم کو اشارہ کیا تو وہ دوڑتا ہوا ڈولی کی
 طرف گیا اور ادھر سے پانی کی بوتل اٹھالایا۔ عزیز نے
 بوتل زخمی کے منہ سے لگا دی۔ اس نے پانی پنی کر تھوڑی دیر
 بعد آنکھیں کھول دیں۔

”اے کندھوں پر اٹھا کر حویلی لے چلو۔“ عزیز نے
 اپنے آندیسوں سے کہا۔ وہ پینتیس چالیس سال کا کٹھن
 جسم کا دیسی فوجی سپاہی تھا۔ گندم گوں رنگ۔ دیسی پکڑی
 باندھے ہوئے سپاہیوں کی وردی پہنے ہوئے تھا۔ اسے
 غنودگی کی حالت میں حویلی پہنچایا گیا۔ عزیز نے اس کی
 مرہم پٹی کی۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے بتایا۔

”میرا نام بخش الدین ہے۔ میں کان پور کے باغی
 سپاہیوں کا سرغنہ ہوں۔ میں اور میرے ساتھی کتنے دلوں
 سے انگریزوں کی ہٹ لٹ پر تھے، رات وہ انگریزوں کے
 قابو میں آ گئے۔ انہیں گرفتار کر کے اس کھلے میدان میں لایا
 گیا اور انہیں گولیوں کی باڑ پر رکھ لیا گیا۔ میرے سمیت سب
 گولیاں کھا کر گر پڑے۔ ابھی مجھ میں جان باقی تھی جب میں
 نے دیکھا، میرا ایک ساتھی گولی کھا کر گر پڑا، وہ زخمی تھا لیکن
 باہمت تھا۔ وہ دوبارہ اٹھا تو گورے نے اسے پکڑ کر سہارا

”دیکھیے۔ مجھے صرف عزیز کا کہا گیا ہے اور اسی کی بات
 کرنی ہے۔ میں کسی دوسری فوجی کو لے جا کر خود کو مشکل میں کیوں
 ڈالوں۔ آپ اس کی کہیے۔“ بڑھیا نے اسی انداز میں کہا۔
 ”دیکھیے اماں بی۔ ایک تو ایسے ہی پورے ملک میں
 افراتفری پڑی ہوئی ہے۔ انگریزی فوجیں اور ہندوستانی
 سپاہیوں کے درمیان جگہ جگہ جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ گورے
 مولی گا جروں کی طرح یہاں کے لوگوں کو کانا کر پھینک رہے
 ہیں۔ سرعام درختوں کے ساتھ بے گناہوں کو پھانسیاں دی
 جا رہی ہیں۔ تو پ بندوقیا جا رہا ہے، ایسے میں آپ کی بیگم کو
 کیا سوچنی سالگرہ منانے کی۔“ عزیز نے اکتائے
 ہوئے لہجے میں کہا۔

”بنیاد بڑوں کے چو نچلے ہیں۔ ان کی وہی جائیں،
 ہم تو ان کی مہریاں ہیں۔ ہماری ڈولی ٹکی، ہم اچھٹکے۔ رہی
 بات ڈر اور خوف کی..... تو ہم ان کی حفاظت کو سپاہی
 بھجوا دیں گے۔“

”نہ بھو..... ہم تو نہ جانے کی۔“ عزیز نے کانوں کو
 ہاتھ لگاتے ہوئے جواب دیا، تو خاتم نے بڑی خشک نظروں
 سے عزیز کو دیکھا۔ عزیز کی نظر میں خاتم سے چار ہوئیں
 تو اس نے نظروں ہی نظروں میں پیشکش کو قبول کرنے کا اشارہ
 کیا۔ تب عزیز نے بھی آبادی کا اظہار کر دیا۔

جلے کی رات جب عزیز وہاں سے فارغ ہو کر
 واپس آ رہی تھی، بیگم صاحبہ کے ساتھ پیچھے ہوئے سپاہی ڈولی
 اٹھائے کھاروں کے ساتھ خوش گلیاں کرتے چلے آ رہے
 تھے اور عزیز نے ڈولی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ایک
 دوسری نوپھی بھی تھی، جس نے جلے میں ناچتا تھا۔ وہ بھی
 دونوں سرگوشیوں میں مصروف تھیں کہ معادور سے بے تحاشا
 گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر یہ آوازیں بڑی
 تیزی کے ساتھ ان کے قریب آئیں۔ کھار اور سپاہی ڈولی
 وہیں رکھ کر بھاگے اور درختوں کی اوٹ میں ہو گئے۔

تھوڑی دیر تک بے تحاشا گولیاں چلتی رہیں۔
 عزیز نے اور دوسری فوجی بھی پچھی ڈولی سے نکل کر درختوں کی پناہ
 میں چلی گئی تھیں۔ جب ڈر افارنگ کی آواز تھی تو عزیز نے
 اپنی ساتھی کے ہمراہ ڈولی میں آ بیٹھی۔ کھار ابھی ڈولی
 اٹھانے ہی کو تھے کہ ایک بار پھر گھبرا کر انہوں نے ڈولی کو
 زمین پر اتار دیا۔ عزیز نے ڈولی کا تھوڑا سا پرہر کا کے
 دیکھا۔ ایک دیسی سپاہی کھاروں سے گفتگو کر رہا تھا جسے دیکھ
 کر کھار خوفزدہ ہو گئے تھے۔ وہ سپاہی کچھ دیر ان کے پاس
 رکا اور پھر کچھ ان کے حوالے کر کے دوسری طرف نکل گیا۔

دیا۔ جب وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوا تو اسے ایک بار پھر گولی باردی گئی۔ یہ دیکھ کر میں بے ہوش ہو گیا، پھر مجھے نہیں پتا، میں کہاں ہوں۔ ہوش آیا، تو میں یہاں تھا۔ آپ کون؟“

”میرا نام عزیزین ہے۔ میں بازار حسن کی سب سے بڑی اور مشہور نوچی ہوں۔“ عزیزین نے بتایا۔
”اوہ.....“ شمس الدین کے منہ سے نکلا۔

”مجھے وطن کے رکھوالے دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ ان رکھوالوں کو جو ہم جیسے بے عزتوں کی بھی رکھوالی کرتے ہیں۔“ عزیزین نے کہا۔

”کوئی عزت اور کس کی رکھوالی۔ جب ظالم اور حملہ آور جیت جاتے ہیں، تو وہ اسی طرح جشن مناتے ہیں مگر جب ان کی راہ روکنے والے پیدا ہو جائیں اور ان کی راہوں میں رکاوٹیں کھڑی کرنے لگیں تو وہ پاگل کنوں کی طرح ادھر ادھر بھونکتے اور سونگھتے پھرتے ہیں اور جہاں جہاں انہیں ایسے بندے مل جاتے ہیں، انہیں پکڑ کر ان پر ظلم کی انتہا کر ڈالتے ہیں تاکہ دوسرے اس سے عبرت پکڑیں۔ مگر جب ظلم بڑھ جاتا ہے، تو باؤ سخت ہو جاتا ہے، تو بغاوت بھی بڑھ جاتی ہے۔ لوگوں کو اب سمجھ آ چکی ہے۔“

شمس الدین نے جواب میں عزیزین کو بتایا۔
”کیا ایسے وہ ہمارے وطن کو چھوڑ... جائیں گے؟“

عزیزین نے اگلا سوال کیا۔
”کوشش تو کر رہے ہیں۔ دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے؟“

شمس الدین نے جواب دیا۔
اب کوئی بہادر کے خلاف لوگوں کا دباؤ بڑھنے لگا تھا، جگہ جگہ سے بغاوت کی خبریں آنے لگی تھیں۔ انگریزوں کو ہندوستانی سپاہیوں کی چھاپا مار کارروائیوں سے خوف آنے لگا تھا۔ انہی دنوں انگریز سرکار نے فیصلہ کیا کہ اپنی عورتوں، بیویوں اور بچوں کو ایک جگہ اکٹھا کر کے ان پر پہرا بٹھادیا جائے۔

اس مقصد کے لیے انہوں نے نانا صاحب، بالا صاحب اور راؤ صاحب بخور سے رابطہ کیا جنہوں نے مل کر ایک بڑی حویلی میں ان سب کو اکٹھا کر کے انہیں پناہ دے دی۔

☆☆☆

”بی بی گھر“ میں تقریباً ڈیڑھ سو انگریز عورتوں اور بچوں کو پناہ دے دی گئی۔ یہ 25 جون 1857ء کا دن تھا جب پورے کان پور میں بغاوت کے شعلے پوری توانائی سے بھڑکنے لگے تھے۔ انگریزوں کے خلاف عوام کی نفرت پورے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ راؤ صاحب نے صلاح مشورے کے بعد

عزیزین بانی کو ”بی بی گھر“ کا انچارج بنادیا۔
ان ہی دنوں شمس الدین کے زخم بھی مندمل ہو چکے تھے۔ اتنا عرصہ یہاں رہنے اور عزیزین کی بے لوث تہاداری نے شمس الدین کے دل میں عزیزین کی چاہت پیدا کر دی تھی۔ ایک روز شمس الدین نے اس سے کہا۔
”میرے زخم اب مندمل ہو چکے ہیں۔ لہذا میں سوچ رہا ہوں کہ وہاں میدان میں چلا جاؤں۔“

”بس اتنی جلدی.....“ عزیزین کے منہ سے اچانک نکلا۔
”اتنے دن تو ہو چکے ہیں، تمہاری ساری سرگرمیوں اور کاروبار کے درمیان رکاوٹ بنے ہوئے، اب مجھے جانے ہی دو۔“ شمس الدین نے دوبارہ کہا۔

”لگ تو یوں رہا ہے، جیسے تم کل ہی یہاں آئے ہو۔ کچھ دیر تو اور مہمان داری کرنے دو۔“ عزیزین نے پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

”جی تو میرا بھی جانے کو نہیں کر رہا مروت کی مجبوری ہے۔“ شمس الدین نے آخر اپنے دل کی بات کہہ ڈالی۔ پھر اسے لگا کہ عزیزین اس کی بے باکی کا برا نہ مان جائے، تو اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ گوروں نے اپنی عورتوں اور بچوں کو باغیوں سے بچانے کے لیے ایک حویلی میں اکٹھا کر دیا ہے اور اس کا نام ”بی بی گھر“ رکھا ہے۔“

”تمہیں کس نے بتایا ہے؟“ عزیزین نے اس کے چہرے پر آنکھیں جماتے ہوئے پوچھا۔

”فوجی ہوں۔ ارد گرد پر بڑی سیکیورٹی اور چوکنی نظر رکھتا ہوں اور اپنے خبر کے بارے میں بھلا نہیں کیوں بتاؤں۔ جو میں نے پوچھا ہے، اس بارے میں جواب دو.....“

ٹھیک ٹھیک! شمس الدین نے پریم سے پوچھا۔
”انگریزوں میں انکار کروں اور کہہ دوں مجھے کچھ علم نہیں تو.....“ عزیزین نے بھی گفتگو میں ملامت اور محبت کے ملے جلے انداز میں جواب دیا۔

”مجھے یقین ہے۔ تم کم از کم میرے ساتھ ایسا نہیں کر پاؤ گی۔“ شمس الدین پورے یقین سے بولا۔
”اس قدر بھروسہ کرنے لگے ہو۔“ عزیزین نے

چون سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
”اتنی بیدارے قریب رکھ کر ایک بھروسہ ہی تو تم نے دیا ہے مجھے۔“ شمس الدین نے اسی انداز میں جواب دیا۔

”تو سنو۔ یہ سب راؤ صاحب کی آشریں باؤ سے ہوا ہے اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ مجھے اس بی بی گھر کا

”جنگیں مردوں اور خاص کر سپاہیوں کا زیور ہوتی ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ یہ زیور کہنا جائے۔ اب مجھے جانا ہی ہوگا۔“ ٹمس الدین بولا۔

”خاموش آنکھوں سے جھٹکتی ہوئی کہانیاں بھی زیور ہی ہوتی ہیں۔ اب میرا بھی یہاں رہنا بیکار ہے۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ میدان میں تمہارے کندھے کے ساتھ کندھا ملا کر لڑوں گی۔“ عزیز نے حوصلے سے کہا۔

”نہیں عزیز! جنگیں لڑنا عورتوں کے بس کی بات نہیں اور لوگوں کے دلوں پر راج کرنے سے یہ کام اور بھی مشکل ہے۔“ ٹمس الدین نے ٹمس کر جواز پیش کیا۔

”وہم ہے تمہارا ٹمس الدین۔ اگر یہ عورتوں کا کام نہیں تو تاریخ کے صفحات سے ان عورتوں کے نام بھی نکال دو جنہوں نے جنگیں لڑیں۔ زخیوں کی مرہم پٹی کی۔ سپاہیوں کے لیے رسد بہم پہنچائی۔ انہیں پانی پلایا۔ اس کی آج بھی مثالیں موجود ہیں۔۔۔ کہہ دو تو نام گنوا دوں۔“ عزیز نے جذباتی انداز میں بولی۔

”نہ بابا! میں تمہاری عظمت کا قائل ہو چکا ہوں۔ تمہاری دلیلیں دہاتی ہیں۔“ ٹمس الدین نے ہنستے ہوئے ہار مان لی۔

”تو پھر چلوں تمہارے ساتھ؟“ وہ خوشی سے بولی۔

”نہیں ابھی نہیں۔ وقت آیا تو میں خود تمہیں اجازت دے دوں گا۔“ ٹمس الدین نے کہا۔

”تو پھر ایک وعدہ کرو کہ اس سہلی سے ملنے کو یہاں آتے جاتے رہو گے۔ ان آنکھوں کو یہ چہرہ دیکھنے کی عادت ہی ہو گئی ہے۔“ عزیز نے جذباتی ہو کر بولی۔

”ہوں۔“ ٹمس الدین نے کہا۔

”نہیں باغداد جا سکتا۔“ ٹمس الدین سنجیدگی سے بولا۔ ٹھوڑے وقت کے بعد وہ پھر بولا۔ ”لو، اب میں چلتا ہوں۔“

ٹمس الدین نے جانے کے بعد بھی عزیز نے رابطہ رکھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ کئی دنوں سے عزیز نے دیکھ رہی تھی کہ ”بی بی گھر“ میں پناہ لینے والی انگریز عورتیں مجاہدین کی خبری میں لوٹ پائی جانے لگی تھیں۔ ادھر ادھر کے حالات اپنے بھائیوں، خاندانوں اور جاننے والوں کو دیکھی سپاہیوں کی کارروائیوں سے متعلق نہ صرف اطلاعات دینے لگی تھیں بلکہ اپنی حمایتی ہندوستانی عورتوں کو بی بی گھر میں بلا کر ان سے حالات کا پتا لگاتیں اور کوروں کو یہ اطلاعات بہم پہنچانے لگی تھیں۔ عزیز کو ان کی ایسی باتوں سے نفرت

انچاریز بنا دیا گیا ہے۔“ عزیز نے اسے سب بتا دیا کہ کس طرح انہیں اکٹھا کر کے ایک حویلی میں رکھ دیا گیا اور اس کا نام بطور انچارج کیسے منتخب ہوا۔

”عزیز! ایک بات کہوں۔ اگر انگریز ہماری عورتوں اور بچوں کا لحاظ نہیں کرتے تو ہمیں بھی ان کی عورتوں اور بچوں کو تحفظ نہیں دینا چاہیے۔“ ٹمس الدین نے سنجیدگی سے کہا۔

”تمہاری بات بجا مگر میرا اور تمہارا مذہب پناہ میں لیے لوگوں کی ہر حال میں حفاظت کی تلقین کرتا ہے۔“ عزیز نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔

”مگر ان پر ذرا گہری نظر تو رکھ سکتی ہو۔ یہ بے اعتباری اور مطلبی قوم کی عورتیں ہیں۔ کسی وقت بھی دغا دے سکتی ہیں۔ اور ہاں! یہ پڑھے لکھوں والی باتیں تمہیں کس نے سکھائی ہیں۔“

”خود پڑھی ہیں۔ شاید تمہیں علم نہیں۔ ہم خاندانی نوچیاں ہیں۔ ہم اپنا جسم نہیں بیچتیں۔ ہم صرف گانا بجانا اور ناچ کرتی ہیں اور تم جیسے لوگوں کو نچواتی ہیں۔ ہمارے گھروں میں بھی بچوں کو اسی طرح تعلیم دلائی جاتی ہے، جیسے عام لوگوں کے بچے حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے گھر بھی ایک مولوی صاحب پڑھانے آیا کرتے تھے جن سے میں نے الف، ب کے بعد کریم کے علاوہ محمود نامہ، آمد نامہ، گلستان ہوستاں پڑھی۔ اس کے سارے شعروں کے معنی بھی یاد کئے۔ اس کے علاوہ فارسی کی اور بہت سی کتابیں۔ عربی کی صرف دھج۔ منطق کے رسالے۔ کیا کچھ نہیں پڑھا اس طوائف نے۔“ عزیز نے ایک ہی سانس میں بتایا تو ٹمس الدین کی حیرانی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

”اب تمہارا کیا خیال ہے؟“ عزیز نے اسے حیران دیکھ کر پوچھا۔

”اب مجھے یہاں سے چلے ہی جانا چاہیے۔“ ٹمس الدین نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

”اور اس باندی کے لیے کیا حکم ہے؟“ عزیز نے شہڈی آہ بھر کر پوچھا۔

”تم کوئی میری پہنچ میں ہو جو میں تم پر اپنا حکم چلاؤں۔“ ٹمس الدین نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایک بات کہوں۔ طوائف سے لوگوں کی آنکھیں کبھی جھوٹ نہیں بولتیں اور تمہاری تو آنکھیں، انگ انگ کچھ اور بول رہا ہے مگر زبان اقرار نہیں کر رہی۔“ عزیز نے کے تجربے نے جواب دیا۔

ہونے لگی تھی۔ اس نے اپنے طور پر اس کی کھونج لگائی، تو اس پر انکشاف ہوا کہ انگریزوں کی بہت سی کارروائیاں انہی پناہ حاصل کرنے والی عورتوں کی مہیا کر رہے تھیں۔

جب بات اس کے بس سے نکلنے پر آئی تو ایک روز جب رات کے اندھیرے میں وہ ٹمس الدین سے ملی تو اس نے ساری باتیں اس کے گوش گزار کر دیں۔

”تم ایسا کرنا کہ لی لی جی گھر کا دروازہ ایک روز اس طرح کھلا رکھنا کہ جیسے پتا چلے کہ تم دروازہ بند کرنا بھول گئی ہو۔ ہم چھاپا ماروں گا گروپ ان پر حملہ آور ہو کر ان آفات کا قلع قمع کر دے گا۔“ ٹمس الدین نے تجویز پیش کی اور پھر وہی ہوا جس کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔

اس رات چھاپا مار ہندوستانی سپاہیوں نے لی لی گھر پر شب خون مارا اور انگریز عورتوں سمیت ان کے بچوں کو قتل کر دیا۔ لی لی گھر کو آگ لگا کر جلا دیا گیا۔

عزیزین بانی کو اس جرم کی پاداش میں گرفتار کر لیا گیا اور اسے جہولاک کے سامنے پیش کیا گیا۔ جہولاک عزیزین بانی کو دیکھتے ہی اس کے ضمیر کا اسیر ہو گیا۔ اس نے پہلی پیشی پر عزیزین کو فراخ دلانہ پیشکش کی کہ اگر عزیزین اس بات کا اعتراف کر لے کہ وہ جنگ آزادی میں شریک رہی ہے اور آئندہ کے لیے معافی مانگ لے تو اسے رہا کیا جاسکتا ہے۔ یہ پیشکش کرنے کے بعد اسے اگلی پیشی تک کے لیے پھیل بیچ دیا گیا۔

ٹمس الدین کو عزیزین بانی کی گرفتاری کا پتا چلا تو وہ بے چین ہو گیا۔ وہ ہمیش بدل کر قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی میں سوار ہوئی عزیزین بانی سے ملا اور پوچھنے لگا۔

”تم گرفتار کیوں ہوئیں۔ نکل جائیں۔ یہ تم نے کیا کیا۔“

”میرے سجن کو ساری عمر یہ گلہ بھاتا تھا کہ عزیزین نے جنگ آزادی کی سانجھ میں حصہ کیوں نہیں ڈالا۔“ عزیزین نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”تمہارا نام کونسا تاریخ میں لکھا جاتا تھا۔ کونسا تمہیں بہادری کا تحفا ملتا تھا۔ یقیناً تم مادی جاؤ گی۔ میں جانتا ہوں، جنگ اگر ہندوستانی سپاہی جیت بھی جائیں تو روایات کے مطابق بڑوں ہی کی بلے بلے ہوئی۔ تمہاری جیسی عورتوں کو کسی

کھاتے میں نہیں رکھا جائے گا۔ میری بانو اور تم اس جرم سے کر جاؤ۔ عزیزین! اپنی جان بچاؤ۔ بہت قیمتی ہوتی ہے یہ جان۔ جھانسی کی رانی، حضرت محل کا نام اس لیے زندہ رہ سکتا ہے کہ ان کی حیثیت بڑی ہے۔ اور تم..... تم تو ایک نری طوائف ہو۔“ ٹمس الدین نے دکھ بھرے لہجے میں مشورہ دیا۔

”ایک ہی تو بڑائی کی بندی میرے ماتھے پر لگے لگی ہے۔ اپنے کام سے کر کر یہ موقع بھی گنوا دوں۔ اپنے مقصد سے پیار کرنے والوں کو سچاں مشورہ تو ٹھیک سادو۔“ عزیزین نے اداس لہجے میں جواب دیا۔

”کوشش کرتا ہوں۔ اداس مت ہونا۔ میرا انتظار کرنا۔“ ٹمس الدین نے کہا تو سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے جیل لے گئے۔

اگلی پیشی پر ایک بار پھر جہولاک نے اپنی پیشکش کو دہرایا۔

”م..... عزیزین بانی۔ اپنے جرم بارے کیا کہتا ہے؟ تمہیں قبول ہے یا نہیں؟“

عزیزین کچھ دیر خاموش رہی تو وہ پھر بولا۔

”کہہ دو۔ ٹم نے یہ نہیں کیا۔ ہم چھوڑ دے گا، ہمیں خوبصورت لوگوں کو مارنے سے ڈر لگتا ہے۔“

”میں بزدل نہیں اور نہ ہی ڈر پوک۔ رحم کی جھپک مانگنے سے بہتر ہے کہ میں موت کو گلے لگا لوں۔ کم از کم مجھے آگے جا کے بھی مر شرمندگی تو نہ ہوگی۔ عزیزین نے یہ سب ہندوستان کی آزادی اور برطانوی حکومت کے خاتمے کے لیے کیا ہے۔ اگر زندہ رہی تو آئندہ بھی کروں گی۔ جب تک میرا ملک تمہارے تسلط سے آزاد نہیں ہو جاتا۔“ عزیزین بانی نے جذباتی انداز میں کہا تو جہولاک نے فائر بریکڈ کو حکم دیا اور عزیزین بانی کا کوئل بدن گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ اس کی لاش دوسرے سپاہیوں کے ساتھ ایک اندھے کنوئیں میں پھینک دی گئی۔ اس طرح ایک طوائف اپنے لہو سے مادر وطن کی مانگ بھر کر سرخرو ہو گئی مگر اس کا نام تاریخ کے اندھے کو نگے صفحات میں دب کر رہ گیا۔ کون اس نام سے گرد جھاڑ کر اسے اجالے گا یا اسے گمنامی کی دیک یونہی چاٹ جائے گی۔

ساختات

تاریخ فرشتہ..... محمد قاسم فرشتہ..... منتخب التواریخ..... عبدالقادر بدایونی..... بار بوسہ کے مشاہدات..... بار بوسہ..... اعجاز خسروی..... امیر خسرو..... تاریخ داؤدی..... خواند میر..... ہندوستان عہد وسطی میں..... کنور محمد اشرف..... سندھ ساگر..... اعتراف از حسن..... سرہامی تاریخ..... (1857ء) ڈاکٹر صولت ناگی..... امر آؤ جان ادا..... مرزا ہادی رسوا..... بازارسن کی شاعرات..... فردوس علی

ادھورا خواب

تنویر یاض

اللہ تعالیٰ نے نہ صرف مختلف صلاحیتوں کے حامل انسانوں کو دنیا میں اتارا ہے بلکہ مختلف طریقوں سے آگہی کے دروازے بھی کھول دیے۔ اسے بھی یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ اپنے خوابوں سے راہنمائی حاصل کرے مگر اس بار اس کے خوابوں کا خاکہ کچھ ادھورا رہ گیا لیکن... آگہی نے اس کی چھٹی حس کو پوری طرح بے دار کر دیا تھا۔

ناقابلِ یقین صورت حال اور بے معنی گمان کا دلچسپ احوال



بے ڈھنگی سی فراق پہن رکھی تھی۔ ہم تینوں یعنی مارٹھا، اوئیل اور میں اس چھوٹے سے دفتر میں موجود تھے۔ میں اور میرا پارٹنر اوئیل کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے جبکہ وہ ہمارے سامنے دونوں ہاتھ باندھے ہوئے کھڑی تھی۔ یہ 1957ء

”میرا نام مارٹھا ہے۔“ اس لڑکی نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر نو سال ہوگی۔ اس نے بڑے سائز کے گول شیشوں کا چشمہ لگا رکھا تھا جو میرے چشمے جتنا بڑا تھا اور تاریکی رنگ کی

کے اداس کی بات ہے۔ وہ ہنسنے کی سہ پہر تھی اور کمرے سے باہر سڑا کی تیز ہوائیں چلنے کی آواز کسی سیٹی کے مانند گونج رہی تھی۔

”کیا تم اسکاٹ لینڈ کے رہنے والے ہو؟“ مارٹھا نے اوئیل کے دیہاتی لہجے کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ اوئیل منہ بتاتے ہوئے بولا۔ ”آئرش۔ میرا تعلق آئر لینڈ سے ہے۔“

لڑکی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں آئر لینڈ کے بارے میں جانتی ہوں۔ وہاں سانپ نہیں ہوتے۔ یہ بات مجھے سزلا رن نے بتائی تھی۔ وہ دوسری جماعت میں میری ٹیچر تھی لیکن اس بات کو بہت عرصہ ہو گیا۔“

اوئیل مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں اتنی پرانی بات کیسے یاد آگئی؟“

”یہ صحیح ہے کہ وہ کبھی میری ٹیچر تھی لیکن اب وہ میری نظر میں مشتبہ ہوئی ہے۔“

”مشتبہ؟“ میں چونک پڑا۔ ”اس عمر میں تم لوگوں پر شک کرنے لگی ہو۔ یہ تو تمہارے گزریوں سے کھیلنے کے دن ہیں۔“

”مجھے گڑیاں پسند نہیں ہیں۔“ مارٹھا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”مجھے دراصل تین لوگوں پر شبہ ہے اور اسی لیے میں تمہارے پاس آئی ہوں مسٹر پبلنک..... کیونکہ اس علاقے میں تم ہی واحد سرخ رساں ہو۔“ پھر اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو جلدی سے بولی۔ ”میرا مطلب ہے تم دونوں۔“

”اور تمہیں سزلا رن پر شبہ کیوں ہوا؟“

”کیونکہ وہ میرے خواب میں آئی تھی۔“

”تمہارے خواب میں.....؟“

”ہاں اور میرے خواب عموماً سچے ہوتے ہیں۔“

میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے اپنے شریک کاری طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم اس بارے میں مسٹر اوئیل کو بتاؤ۔ اسے اس طرح کے عجیب خواب سننے کا بہت شوق ہے۔“

”اپنی بات جاری رکھو مارٹھا!“ میرے سامنے نے کہا۔ ”ہمیں اپنے خوابوں کے بارے میں بتاؤ۔“

پہلی بار لڑکی کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نظر آئی۔ اس نے کہنا شروع کر دیا۔ ”بعض اوقات میرے خوابوں میں چیزیں گمڈ ہو جاتی ہیں لیکن بعد میں پتا چلتا ہے کہ ان کا کیا مطلب تھا۔ مثلاً میں نے گزشتہ موسم گرما میں خواب دیکھا کہ ہماری بیلی ایک سورا سے لڑ رہی ہے جس کے جوتوں میں پیسے لگے ہوئے تھے۔ تم جانتے ہو کہ حقیقی زندگی میں کیا ہوا؟ وہ ایک حادثے کا شکار ہو گئی۔ اسے ایک موٹر سائیکل

نے کچل ڈالا۔“

اوئیل اپنی ڈاڑھی کھاتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہوگا۔“

اس وقت میرا دل چاہا کہ اس لڑکی کو دفتر سے نکال کر کسی قریبی آئس کریم پارلر کا راستہ دکھا دوں۔ بہر حال پرائیویٹ سرخ رساں اور بچوں کی آیا میں کچھ تو فرق ہوتا چاہیے لیکن اوئیل ابھی تک اس سے باتوں میں لگا ہوا تھا۔

”تم اپنے حالیہ خواب کے بارے میں کچھ کہہ رہی تھیں؟“

”میں نے یہ خواب گزشتہ رات دیکھا۔ میں فائینڈ ڈائم اسٹور میں تھی۔ وہی جہاں تمہاری منگیتر کام کرتی ہے مسٹر پبلنک۔“

منگیتر کا نام سن کر میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میرے علاوہ سزلا رن، بس واٹسن اور مسٹر اسٹوک بھی وہاں موجود تھے۔“

”ہنری اسٹوک.....“ میں نے پوچھا۔ ”یہ وہی شخص ہے نا جس کا کیمرا اسٹور ہے؟“

”ہاں، یہ وہی ہے اور بس واٹسن سینما میں کام کرتی ہے اور حیرت کی بات ہے کہ سب لوگوں کے چلے جانے کے بعد بھی وہ تھیمز میں بیٹھی قلمیں دیکھتی رہتی ہے۔ میں نے

خواب میں ان تینوں کو ایک ہی وقت میں اسٹور آتے دیکھا اور مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کوئی ایک خوفناک کام کرنے والا ہے۔“

”کون؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتی۔ اس لیے میری نظر میں تینوں ہی مشتبہ ہیں۔“

”تمہارا کہنا ہے کہ خواب کی طرح حقیقی زندگی میں بھی یہ تینوں اکٹھے نظر آئے تھے؟“ اوئیل نے کہا۔

”بالکل۔“ مارٹھا نے جواب دیا۔ ”میں نے دو دن پہلے ان تینوں کو اسٹور میں اکٹھے دیکھا تھا پھر یہ گزشتہ شب مجھے خواب میں نظر آئے اور اسی لیے میں سوچ رہی ہوں کہ

ان میں سے ایک کوئی بہت برا کام کرنے والا ہے۔“

”تم مجھے ترتیب وار بتاؤ۔“ اوئیل نے کہا۔ ”تم نے بتایا کہ دو دن پہلے اسٹور میں تھیں؟“

مارٹھا نے تاہم میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں۔ میں جمعرات کے روز اسکول سے چھٹی ہونے کے بعد وہاں گئی تھی اور کتابوں کے ریک کے پاس کھڑی ایک مزاحیہ کتاب پڑھ رہی تھی کہ وہ تینوں وہاں آئے۔ سب سے پہلے مسٹر

اسٹوک، اس کے کچھ دیر بعد بس واٹسن اور سزلا رن سب

یہ پہلے خواب کی طرح ڈر ڈرانا نہیں البتہ عجیب ضرور تھا۔“
میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”ٹھیک ہے۔ یہ
ایک عجیب خواب تھا لیکن مجھ سمیت بہت سے لوگ اس
طرح کے خواب دیکھتے ہیں۔ ابھی دو رات پہلے میں نے
خواب میں دیکھا کہ نائب صدر رکن، بل ہیلی کے ساتھ ڈرم
بجایا رہا ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں؟“

سے آخر میں آئی۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہ تینوں ایک ہی وقت میں وہاں موجود تھے۔ میں نے سسرالسن کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ مجھے بھی اپنی اچھی نہیں لگی۔ ان تینوں میں سے کوئی بھی زیادہ دیر وہاں نہیں رکھا۔ انہوں نے چند چیزیں خریدیں اور چلے گئے۔“

”تم یہ بتا سکتی ہو کہ انہوں نے کیا خریداری کی؟“

اوٹیل نے پوچھا۔

رکھ دو۔“

وہ دو قدم آگے بڑھی اور وہ رقم میرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ تمہاری فیس ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تم ان مشتبہ لوگوں میں سے اصل مجرم کو تلاش کرو۔“
میں نے ہنسنے ہوئے کہا۔ ”میں یہ رقم نہیں لوں گا۔“
”اگر یہ کافی نہیں تو میں مزید پیسوں کا انتظام کرنے کی کوشش کروں گی۔ اس کے لیے مجھے چھپ کر کہانیاں فروخت کرنا ہوں گی تاکہ میرے والد کو معلوم نہ ہو۔“
”تم بہت اچھی لڑکی ہو اور مجھے اپنے مقصد سے غلصہ بھی دکھائی دیتی ہو لیکن میں خوابوں کی تحقیقات نہیں کرتا۔ تم اپنے پیسے واپس لے لو۔“

اس نے انکار کرنے کے انداز میں اپنے دونوں بازو پینے پر باندھ لیے اور بولی۔ ”میں جانتی ہوں کہ تم میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے لیکن تمہیں ایسا کرنا چاہیے۔“
”میں یہ پیسے نہیں لوں گا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر وہ رقم واپس لے لی۔
اب اوٹیل کی باری تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ”میرا ساجھی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ یہ کوئی مناسب بات نہیں ہوگی کہ ہم تمہاری محنت سے کمائی ہوئی رقم لے لیں۔“

مارتھا اپنے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ ”شاید کوئی نیا سراغ رساں اس شہر میں آجائے اور وہ میرا کیس لے سکے۔“ یہ کہہ کر وہ مڑی اور دفتر سے چلی گئی۔
اس واقعے کے چند روز بعد یکم جنوری کی شب جارج موسکی نامی ایک شخص واٹر بری میں گرفتار ہوا جو یہاں سے تیس میل شمال مشرق میں واقع ہے۔ پولیس نے اس کے گھر سے باپ، بیٹک کی تاب، نارنج کے سیل اور جیبی گھڑیاں برآمد کیں۔ یہ تمام اشیاء کا خیر مواد کی تیاری میں استعمال ہوتی ہیں۔ درحقیقت وہ ایک قابلِ نفرت ہمار تھا جس نے گزشتہ سولہ سالوں کے دوران نیویارک میں تین درجن سے زیادہ بم دھماکے کیے تھے۔

انجی میں نے یہ خبر پڑھی ہی تھی کہ اوٹیل میرے پاس آ کر بولا۔ ”تمہیں یاد ہے کہ مارتھا نے اپنے دوسرے خواب میں کیسی آواز سنی تھی؟“
”اس میں کسی شخص کے بارے میں اشارہ تھا جو پانی میں پکڑا گیا۔“
”تم نے غور نہیں کیا کہ یہ شخص موسکی واٹر بری میں پکڑا گیا اور اس وقت اس نے پا جامہ پہن رکھا تھا۔“

”کیا تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ مارتھا نے اس بمبارکے پکڑے جانے کی پیشین گوئی کر دی تھی؟“
”میں اس سے بھی آگے کی بات کر رہا ہوں۔ اسے خواب میں پتا چل جاتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے۔“ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”یہ خبر پڑھنے کے بعد میں سوچ رہا ہوں کہ مارتھا نے دوسرے خواب کے بارے میں بھی کچھ معلومات ادھر ادھر سے حاصل کی جا سکتی۔“
”تمہارا اشارہ ان تین افراد کی جانب ہے جن پر مارتھا نے شب ظاہر کیا تھا؟“

”ہاں، مارتھا کو شب تھا کہ ان تینوں میں سے کوئی ایک مذموم حرکت کرنے والا ہے۔ میں گھوم پھر کر معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ شاید کوئی بات سامنے آجائے اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو۔“

”مجھے صرف معقولیت کی بنیاد پر اعتراض ہے۔ یاد کرو، مارتھا نے خود کہا تھا کہ اسے کہانیاں گھڑنا پسند ہے۔ وہ اس کام میں مہارت حاصل کر چکی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس نے اپنے خوابوں کے بارے میں جو کچھ کہا، وہ بھی ایک کہانی ہے۔ بہر حال اگر تم اپنا وقت ضائع کرنا چاہتے ہو تو میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“
”میں پہلے ہی اسے بتا چکا ہوں کہ اس معاملے کو دیکھ رہا ہوں۔“

”تم اس سے کب ملے تھے؟“
”میں نے جیسے ہی اخبار میں خبر پڑھی تو اس سے ملنے چلا گیا۔ اتفاق سے وہ مجھے اسکول کے باہر سڑک پر ہی مل گئی تھی۔“
”تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ مجھے بھی کوئی اعتراض ہو سکتا ہے؟“

اوٹیل نے میرے تمبر کے نو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اپنی تحقیقات شروع کر دینی چاہیے۔“
میں نے سرد دہری سے کہا۔ ”تمہیں کچھ لینا چاہیے کہ میں اس کا حصہ نہیں ہوں۔“
”یہ تو آنے والا وقت بتائے گا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

ٹھیک آدھ گھنٹہ بعد میں اس سڑک پر اوٹیل کا پچھا کر رہا تھا جو اسٹورک طرف جا رہی تھی۔
”میر کرو۔“ میں نے اسے آواز دیتے ہوئے کہا۔
”آتی جلدی کیا ہے؟“
ساتھ سال کی عمر میں بھی اس کی تیز رفتاری دیکھنے

”کسی کو اس بارے میں معلوم نہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”وہ ایک روز قہبے کے سرے پر واقع جنگلوں میں گیا تھا لیکن
 واپس نہیں آیا۔ اس کی تلاش میں جو پارٹی گئی، ان میں
 میرے والد بھی تھے۔ انہیں تین دن بعد اس کی لاش ایک
 پہاڑی کے نیچے ملی۔ کچھ دنوں بعد ہی اس کے بھائی ہنری
 نے کیمرا اسٹور کا انتظام سنبھال لیا۔“

اپنی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں
 مارسیا وائسن کو نہیں جانتی۔ وہ خوب صورت عورت سنیما میں
 کام کرتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ گزشتہ برس ہی قہبے میں
 آئی ہے۔ البتہ جین لارسن یہاں ہمیشہ سے ہے۔ وہ گرامر
 اسکول میں میری ٹیچر بھی تھی۔ وہ ہمیشہ سے ہی بد مزاج واقع
 ہوئی ہے۔“

”اور یہ تینوں افراد گزشتہ ہفتے یہاں آئے تھے؟“
 اونٹیل نے پوچھا۔ ”ایک ہی وقت میں۔ کیا ایسا ہی ہے؟“
 ”ہاں۔“ میرا خیال ہے کہ بدھ یا جمہرات کو آئے
 تھے۔“ اپنی نے جواب دیا۔
 ”ان میں سے ہر ایک نے کیا خریداری کی؟“

”مارسیا نے دفنی رسالے خریدے۔ وہ ہمیشہ یہاں
 سے یہی رسالے خریدتی ہے۔ سز لارن کا مجھے یاد نہیں۔
 البتہ ہنری اسٹوک نے جو خریدے، اسے بھلانا مشکل ہے۔ اس
 نے ستائیس ٹوائٹ ربرکپ خریدے جو صفائی کے کام میں
 آتے ہیں۔“

”ستائیس!“ میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں۔ اس نے ہمارا تمام اسٹاک خرید لیا۔“
 ”کیا تم نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنی بڑی تعداد میں
 یہ پپ کیوں خرید رہا ہے؟“

اپنی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”مجھے پوچھتے ہوئے
 ڈر لگا۔“ یہ کہہ کر وہ کاؤنٹر پر رکھی اشیائے سیٹھنے لگی۔ اچانک اس
 کی نظر سامنے والی کھڑکی پر گئی اور وہ پُر جوش آواز میں
 بولی۔ ”تم دونوں خوش قسمت ہو۔ سز لارن ابھی ابھی یہاں
 سے گزری ہے۔ اگر تم جلدی کر دو اسے پکڑ سکتے ہو۔“

”ہمیں ایسا کرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا
 لیکن اس سے پہلے ہی اونٹیل دروازے سے باہر چاچا تھا۔
 اپنی طنزیہ انداز میں بولی۔ ”بہتر ہوگا کہ تم بھی اپنے
 ساتھی کے پیچھے جاؤ۔“

اب میرا ہاں ورتنا بیکار تھا۔ میں بھی تیز قدم اٹھاتا
 ہوا سڑک پر آ گیا۔ میں نے سڑک کے پار اونٹیل کو ایک
 طویل قامت عورت کے ساتھ کھڑے ہوئے دیکھا۔ وہ

سے تعلق رکھتی تھی اور جب وہ کسی کیس کی تفتیش کے لیے نکلتا
 تو اس کے پیروں کو پر لگ جاتے۔ بہر حال میں اس تک پہنچ
 ہی گیا جب وہ اسٹور کا دروازہ کھول رہا تھا۔ اپنی حسب
 معمول کاؤنٹر پر موجود تھی اور بچوں کے جھوم میں گھری ہوئی
 تھی۔ ہمیں دیکھ کر اس نے گرم جوش مسکراہٹ سے کہا۔
 ”میں تمہاری کیا خدمت کر سکتی ہوں؟“

میں نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
 کہا۔ ”اسی سے پوچھو۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ یہاں کیوں
 آیا ہے۔“

اپنی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”یقیناً تم کسی کیس کے
 سلسلے میں آئے ہو۔ کیا تمہیں میری مدد کی ضرورت ہے؟“
 ”ہاں۔ تم ہمیں متعلقہ ڈیٹا فراہم کر سکتی ہو۔“
 ”واقعی۔“ میری نگہیں اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ”مجھے
 بتاؤ معاملہ کیا ہے؟“

تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد اونٹیل نے اسے وہ سب
 کچھ بتا دیا جو ہمیں مارتھا سے معلوم ہوا تھا۔
 اپنی نے سب کچھ سننے کے بعد افسردہ لہجے میں کہا۔
 ”بے چاری مارتھا۔“

”کیا تم اسے اچھی طرح جانتی ہو؟“ اونٹیل نے پوچھا۔
 ”اسی اسٹور سے جان پہچان ہوئی ہے۔ میں اسے
 کبھی کبھی کتابیں پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہوں۔ اس
 بے چاری نے بڑا اچھا وقت گزارا ہے۔ گزشتہ موسم گرما میں
 اس کی ماں مر گئی اور اس کا باپ..... اس کے بارے میں بھی
 میں نے کوئی اچھی بات نہیں سنی۔“
 ”وہ کتنا ہے یا آوارہ؟“ اونٹیل نے پوچھا۔

”سننے میں آیا ہے کہ وہ شراب اور عورتوں کا رسیا
 ہے۔ یہاں تک کہ بیوی کے مرنے کے بعد وہ کسی دندان
 ساز کی بیوی کے ساتھ وقت گزار رہا ہے۔“
 ”بہر حال تم ہمیں مارتھا کے مشتبہ افراد کے بارے
 میں بتاؤ۔“ میں نے کہا۔

”تم ہنری اسٹوک کو تو جانتے ہو۔“ اپنی بولی۔ ”وہ
 کیمرا اسٹور کا مالک ہے۔“
 ”ہاں۔ اس نے دس سال قبل بھائی جم کے مرنے
 کے بعد یہ دکان سنبھالی تھی۔“

”جم بہت کم عمر تھا جب اس کا انتقال ہوا۔“ اپنی بولی۔
 ”میرا خیال ہے کہ وہ اسی سال کا تھا۔“
 ”اسے کیا ہوا تھا؟“ اونٹیل نے پوچھا۔ اسے یہاں
 آئے تین سال سے بھی کم عرصہ ہوا تھا۔

فونو گراف استعمال نہیں کیا تھا۔ چنانچہ مجھے ایک نئی سوئی کی ضرورت تھی۔ وہی خریدنے گئی تھی۔ میری کچھ میں نہیں آتا کہ اس کہانی کا اس لڑکی کی پریشانی سے کیا حلق ہے؟“

”یہ کہہ کر وہ مڑی اور پاؤں پختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے بعد ہم ماریسا وائسن سے ملنے کے لیے مودی تھیٹر کی جانب روانہ ہوئے۔ مینی شوٹم ہوا تھا اور نو عمر تماشاخیوں کا جھوم فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر فلم پر تبصرے کر رہا تھا۔ ہم ان کے درمیان میں سے راستہ بناتے ہوئے لابی میں داخل ہوئے جہاں ایک نوجوان لڑکا بیڑاری سے فرش کی صفائی کر رہا تھا۔

”کیا اس ماریسا وائسن موجود ہیں؟“ اوٹیل نے پوچھا۔ اس لڑکے نے اپنا کام روک کر اسے دیکھا اور رکھائی سے بولا۔ ”وہ اندر ہال میں ہے۔“

ہم تھیٹر میں داخل ہوئے جہاں مکمل اندھیرا تھا۔ البتہ اسکرین پر ایک رنگین فلم چل رہی تھی اور ہال میں ماریسا کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ پچھلی قطار کے آخری کونے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میں نے اسے کم روشنی میں بھی پہچان لیا۔ ہم اس کے پاس گئے اور اوٹیل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”مس وائسن؟“

وہ عورت ہماری طرف گھومتے ہوئے بولی۔ ”ہاں۔“

”کیا ہم تھوڑی دیر بات کر سکتے ہیں؟ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں شاید تم ہماری مدد کر سکو۔“

”ہاں، کیوں نہیں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی پھر اس نے پروجیکٹر روم کے روشن دان کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”ٹھیک ہے جو تم اسے بند کر سکتے ہو۔“

”کیا میٹھی خواب بھی ختم نہیں ہوا؟“

”وہ تو پندرہ منٹ پہلے ختم ہو چکا ہے لیکن مجھے یہ روپوش رومی بہت پسند ہے۔ اس لیے میں نے جوئے سے کہا تھا کہ وہ یہ ریل دوبارہ چلائے۔ وہ ہمیشہ میری بات مانتا ہے۔“

اسکرین خالی ہو چکی تھی۔ ماریسا نے دیوار میں لگا ہوا سوچ آگیا تو ہال کی بتیاں روشن ہو گئیں۔

”اب بتاؤ۔ مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟“ اس نے ہم دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے کہا۔ اوٹیل نے ایک بار پھر مارا تھا اور اس کے خوابوں کے بارے میں بتانا شروع کیا لیکن اس نے ماریسا کو اپنی اور میری اصلیت سے آگاہ نہیں کیا۔

ماریسا نے غور سے اس کی بات سنی اور بولی۔ ”میں

تقریباً پچاس کے پیٹے میں تھی، میں بھی ان کے پاس چلا گیا۔ میں جانتا چاہ رہا تھا کہ اوٹیل اصل موضوع پر کس طرح آتا ہے۔

”ہم تمہاری ایک پرانی شاگرد کو جانتے ہیں۔ وہ تمہارے بارے میں بہت اچھی رائے رکھتی ہے۔“

”اوہ۔“

”حال ہی میں اس کی ماں کا انتقال ہو گیا جس کے بعد وہ بے چاری ایک برے دور سے گزر رہی ہے اور اکثر و بیشتر اسے ہنگامہ خیز خواب نظر آتے ہیں۔ میں اور لی اسے پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”کیا تم دونوں ماہر نفسیات ہو؟“ مسز لارسن نے پوچھا۔

”نہیں۔ ہم صرف اس کے دوست ہیں اور ہمیں اس کی حالت پر تشویش ہے۔“ اوٹیل نے کہا۔ ”کیونکہ تم بھی اس کے ایک خواب میں آئی ہو اس لیے ہم نے سوچا کہ تم سے بھی بات کر لی جائے۔“

”اور اس کا موضوع کیا ہوگا؟“

”یہ دیکھنا اچھی بات ہے۔“ اوٹیل بولا۔ ”شاید کوئی خاص موضوع نہ ہو لیکن ایک چھوٹی سی دوستانہ گفتگو جو بھی نقصان دہ نہیں ہوتی۔“

مسز لارسن اس جواب سے مطمئن نہیں ہوئی اور بولی۔ ”مارتا بہت ہی عجیب لڑکی تھی اور جہاں تک میرا مشاہدہ ہے، اب بھی اس میں کچھ زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔“

”ہاں۔ وہ خاصی منفرد ہے۔“ اوٹیل نے کہا۔ ”اور بلاشبہ اس کا دماغ امتیازی طریقے سے چیزوں کی تشریح کرتا ہے۔ اس نے گزشتہ ہفتے تمہیں کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ فائینڈ ڈائٹم اسٹور میں دیکھا تھا۔ کیا یہ پوچھنا بے جا مداخلت ہوگا کہ تم نے اس روز وہاں سے کیا خریداری کی؟“

”ہاں۔“ اس کے چہرے پر سختی آگئی۔ ”یہ سوال پوچھنے کا کیا مقصد ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ اسے ڈراؤنے خواب آتے ہیں لیکن اس سے کہو کہ وہ ان پر قابو پانے کی کوشش کرے۔ مجھے بھی بچپن میں ڈراؤنے خواب آتے تھے لیکن میں نے اپنی ماں کی ہدایت پر عمل کیا۔“

”تم جانتی ہو کہ اس کی ماں نہیں ہے جو اس کی راہنمائی کر سکے۔“

”ہاں۔“ اس نے حنفی سانس بھرتے ہوئے کہا۔

”میں نے اس روز فونو گراف کی سوئی اور چاکلیٹ خریدی تھی۔ دراصل میں اپنے شوہر کے پرانے ریکارڈ سنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے اس کے مرنے کے بعد بارہ سال سے

انداز میں پوچھا۔

جب اوٹیل نے اسے پوری بات بتائی تو وہ بولا۔
”میں کسی بار تھا تو نہیں جانتا۔“

”لیکن وہ چھپیں جانتی ہے۔“ اوٹیل نے کہا۔

”یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ میں اس قصبے کا معروف دکاندار ہوں۔ اس کے علاوہ سماجی تقریبات کا بھی انعقاد کرتا ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ کسی شادی کی تقریب میں آئی ہو جس کی میں نے تصویریں بنائی تھیں۔ بہر حال میں اس کے خوابوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ اسٹوک نے کہا۔ ”کیا تم سب اس لڑکی کے اطمینان کے لیے کر رہے ہو یا یہ کسی قسم کی کوئی تفتیش ہے؟ ویسے پرائیویٹ سراغ رساں اپنا وقت خوابوں پر ضائع نہیں کرتے۔“

”ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم نے اسٹور سے تین روز قبل کچھ خریداری کی تھی۔“ اوٹیل نے کہا۔ ”کچھ ٹوائلٹ کپ جن کی تعداد ستائیس تھی۔“

”صحیح ہے۔“ اسٹوک نے تصدیق کی۔ ”ان کے پاس مزید اسٹاک نہیں تھا۔“

”یہ تو بڑے شرم کی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ کہیں اس بارے میں تجسس ہوگا کہ میں نے وہ سب کیوں خرید لیے۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں چھپیں دکھاتا ہوں۔“

وہ ہمیں عقبی کمرے میں لے گیا جس کی تمام دیواروں پر غیر روایتی تصاویر آویزاں تھیں۔ وہاں ہم نے نو بیابان جڑوں اور فارغ تحصیل طلبہ کی تصاویر کے بجائے مختلف چیزوں مثلاً ٹیلی فون ڈائریکٹری، یونائی کا ڈھیر، کھلونے نما خرگوش اور ٹوائلٹ کپ کے ایک بڑے ٹیلے کی تصاویر دیکھیں۔

”اسے تم میری اختراع سمجھ لو۔“ اسٹوک مسرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”پلاسٹک کا بنا ہوا خرگوش کھلونا ہو سکتا ہے لیکن ستر پلاسٹک کے خرگوش۔“

”پاکل پن۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں۔ یہ ایک آرٹ ہے۔“

”یقیناً یہ بہت دلچسپ کام ہے مسٹر اسٹوک۔“ اوٹیل نے ڈیپوٹیک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ”چھپیں یہ کوشش کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟“

”فونو گرافر اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ ”شاید تین یا چار سال۔۔۔۔۔ میں نے جی کی بنائی ہوئی ٹائروں کے ڈھیر کی پرانی تصویریں دیکھی تھیں۔ اسی سے متاثر ہو کر مجھے بھی

ان خوابوں کے بارے میں تو کچھ نہیں جانتی لیکن اس لڑکی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ کچھ عجیب سی ہے۔ کئی مرتبہ وہ کٹ کی لائن میں کھڑے ہو کر مجھ سے احسانہ سوالات کرتی رہی ہے۔ مثلاً یہ کہ سیٹ ڈیزائنز کون ہے یا اس فلم میں کتنے ایکسٹرا اداکار ہیں۔“

اس نے لمحو بھر توقف کرنے کے بعد کہا۔ ”میں اس اسٹور میں مووی میگزین لینے گئی تھی۔ مجھے اشارے کے بارے میں پڑھنا اچھا لگتا ہے۔ سوچتی ہوں کہ کاش میں بھی ان جیسی بن جاؤں۔“

”چھپیں یاد ہے کہ اسٹور میں تم نے بار تھا کو دیکھا تھا؟“

”یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ شاید دیکھا ہو۔ دراصل میری توجہ میگزین پر تھی۔“

”اتنی دیر میں صفائی کرنے والے لڑکے کی نے اسے آواز دے کر بلایا تو وہ بولی۔“ ”ایک منٹ۔۔۔۔۔ میں آ رہی ہوں۔“

”اسی میگزین میں ہنفرے یوگا رٹ کے بارے میں بھی مضمون شائع ہوا تھا۔ وہ میرا درکار شے دار تھا۔ اس کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ اگر زندہ رہتا تو شاید ہالی وڈ میں میرا آڈیشن کروا دیتا۔“

”میں نے ایک بار پھر اسے آواز دی تو وہ مسکراتے ہوئے بولی۔“ ”شاید یہ لڑکا بھی مجھ پر فریفتہ ہو گیا ہے۔“

”میں نہیں سمجھتا کہ کئی اور جوئے جیسے لوگ تمہارے معیار کے ہیں۔“ اوٹیل نے کہا۔

”نہیں۔“ وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”میرا پوائے فرینڈ کوئی اور ہے اور وہ میرے معیار کا ہے۔“

میں نے آنکھیں کھما کر اسے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی تفصیل بتاتی، مکی ایک بار پھر اس کا نام لے کر چلا یا اور وہ منہ ہی منہ میں ہمیں خدا حافظ کہہ کر دروازے سے باہر چلی گئی۔ جب ہم دونوں لابی میں پہنچے تو وہ ہمیں نظر نہیں آئی۔ البتہ کئی سر جھکائے صفائی میں مصروف تھا۔

کیرا اسٹور وہاں سے صرف بائچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ اس دکان میں وہ سب کچھ تھا جس کی توقع کی جاسکتی ہے۔ دیواروں پر پورٹریٹ سائز کی تصاویر، شادی کے فونو اور چند قدرتی مناظر کی تصویریں آویزاں تھیں۔ شیشے کے دو کاؤنٹر جن میں کیرے اور فلمیں رکھی ہوئی تھیں اور ایک کونے میں دو کیرا اسٹینڈز رکھے ہوئے تھے۔ ایک پردے کے پیچھے سے ہنری اسٹوک برآمد ہوا۔ اس کی عمر پچیسالیں کے قریب تھی۔ جسم نرم ہے اور سر گھبرا ہوا تھا۔

”تمہیں کچھ چاہیے؟“ اس نے خالص پیشہ ورانہ

یہ شوق ہوا۔

”اوہ..... اب سمجھا۔“ اونٹیل نے کہا۔ ”تم تصویریں بنانے کے بعد ان ٹوائلٹ کپ کا کیا کرتے ہو؟“

”میں روبرو لالچہ کاٹ کر چھینک دیتا ہوں اور لکڑی کا دستہ آتش دان کی آگ روشن رکھنے کے کام آتا ہے۔“ اونٹیل نے پوچھا۔ ”کیا تم نے کبھی قدرت کی بنائی ہوئی چیزوں کا بھی مطالعہ کیا ہے مثلاً جانوروں کے پنجے یا پرندوں کے پروغیرہ وغیرہ؟“

”نہیں۔ میں انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کو ترجیح دیتا ہوں۔“ اسی لمحے بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی اور اسٹوک اپنی جگہ سے اچھلتے ہوئے بولا۔

”شاید کوئی کاہک آیا ہے۔“ اس نے تیزی سے پردہ ہٹایا اور باہر چلا گیا۔ ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے آ گئے۔ دفتر پہنچ کر میں نے اونٹیل سے کہا۔ ”اس بھاگ دوڑ کا کیا نتیجہ نکلا؟ محض وقت ہی ضائع ہوا۔“

”یہ کہنا قبل از وقت ہوگا۔“ اونٹیل بولا۔

”کیا واقعی؟“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”ہم نے کیا حاصل کیا؟“

”ایسے تین لوگوں سے میرا تعارف ہوا جن سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا۔ گوکہ یہ ملاقات مختصر تھی لیکن اس سے ہمیں ان کی دلچسپ شخصیت کی جھلکیاں نظر آئیں۔“

”یہ سب کچھ مبہم سا ہے۔“ میں نے اپنے چشمے کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری ملاقات ایک چڑچڑی اسکول ٹیچر، عجیب فوٹو گرافر اور ایک خوب صورت عورت سے ہوئی۔ ان تینوں کے درمیان صرف یہ تعلق بنا ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک ہی جگہ پر تھے اور وہاں سے انہوں نے کچھ خریداری بھی کی۔“

”جس میں وہ تین ٹوائلٹ کپ بھی شامل ہیں؟“

”ہاں۔ ماننا ہوں کہ یہ ایک عجیب بات ہے لیکن اسٹوک نے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ بہر حال تم نے اپنا مشن پورا کر لیا اور معلومات حاصل کر لیں۔ تم نے اس لڑکی سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ ان معلومات سے کوئی نتیجہ اخذ کرو گے تاہم کوئی حقیقی نقصان نہیں ہوا۔“

دروازے پر دستک ہوئی تو اونٹیل نے وال کلاک کی جانب دیکھا۔ ”چار بج گئے۔“ اس نے کہا۔ ”ہم نے اسے یہی وقت دیا تھا۔“

دروازہ کھلا اور مارتھا اندر داخل ہوئی۔ اس نے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر ہم دونوں کو باری باری

دیکھا اور بولی۔ ”کیا تم نے کیس دیکھا؟“

”ہاں۔ میں ان تینوں سے مل چکا ہوں۔“ اونٹیل نے کہا پھر اس نے تفصیل سے ان ملاقاتوں کا احوال بتایا۔ وہ غور سے سنتی رہی۔ درمیان میں اس نے ایک دوسرے تائیڈی انداز میں سر ہلایا پھر جذباتی انداز میں بولی۔

”تم نے اسے حل کر لیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے وہ چیزیں خریدیں جن کا موت سے تعلق بنتا ہے۔“

”رک جاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم نے وہ سب غور سے سنا جو مسٹر اونٹیل نے تمہیں بتایا؟ ہمیں کوئی مفید معلومات حاصل نہیں ہوئیں۔“

”لیکن تم معلوم کر چکے ہو۔“ وہ خود کلامی کے انداز میں بولی۔ ”پہلی بات مسٹر لارسن نے تمہیں بتایا کہ اس نے گراموفون ریکارڈ کی سوئی خریدی کیونکہ وہ اپنے مرے ہوئے شوہر کے ریکارڈ سننا چاہ رہی تھی۔ پھر تم نے کہا کہ مسٹر اسٹوک نے وہ ٹوائلٹ کپ اس لیے خریدے کیونکہ اس نے ان کی تصویریں بنانے کا خیال اپنے مرے ہوئے بھائی کی تصویریں دیکھ کر لیا تھا۔ تیسری بات تم نے یہ بھی کہ مس ڈائن نے میگزین اس لیے خریدا کہ اس میں اس کے مرحوم کزن ہنری بگاٹ کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا۔“

میں نے اپنا سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری بات نہیں سمجھ سکا۔“

”انہوں نے جو چیزیں بھی خریدیں، ان کا تعلق مرے ہوئے رشتے داروں سے ہے۔“ مارتھا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”اب ہمیں صرف مشتہ افراد کو دیکھنا ہے۔ مس ڈائن کو تو الگ کر دو۔ وہ اپنے کزن کو اس لیے قتل نہیں کر سکتی کیونکہ وہ اس کی پہنچ سے بہت دور ہالی ووڈ میں تھا۔ البتہ مسٹر لارسن اپنے شوہر کو قتل کر سکتی ہے۔ مسٹر اسٹوک کا بھائی کافی عرصہ پہلے مر گیا تھا اور کوئی نہیں جانتا کہ جنگل میں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ ممکن ہے کہ مرنے سے اس کے سر میں چوٹ نہ آئی ہو۔ میرا خیال ہے کہ یہ کام مسٹر اسٹوک کا ہی ہو۔“

اونٹیل اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ ”جب تم نے اپنا خواب بیان کیا تو کہا تھا کہ ان میں سے کوئی ایک مشتہ شخص کچھ غلط کام کرنے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن یہ نہیں کہا تھا کہ وہ پہلے ہی ایسا کر چکا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ مارتھا کے چہرے پر ایک سایہ سا ابرہا۔ ”میں الجھ رہی تھی۔“

اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک طویل

خواجه لقمان

قامت چوڑے کاندھوں والا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے ہاتھ میں پانا پکڑ رکھا تھا۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“ وہ گرجتے ہوئے بولا۔

”ڈیڈی؟“ مار تھا اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔ میں اور اوٹیل بھی اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ آنے والا غصے سے بولا۔

”میں نے ایک سوال پوچھا ہے۔“

”مجھے بھی تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اتنا بڑا پانا کیوں لے کر آئے ہو؟“

”میں ہارڈویئر کی دکان سے آ رہا ہوں۔“ وہ آدمی غراتے ہوئے بولا۔ ”میرا پرانا اوزار اٹوٹ گیا تھا لیکن اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ میری بات کا جواب دو۔“

اس بار جواب دینے کی ذمہ داری اوٹیل نے سنبھالی۔ ”ہم آپس میں مشاورت کر رہے ہیں۔ تم اسے معلومات کا تبادلہ بھی کہہ سکتے ہو۔“

”اس کا کیا مطلب ہے؟“ وہ شخص جس کا نام مور لے تھا، سینہ چڑا کر تے ہوئے بولا۔ ”مجھے کسی نے بتایا ہے کہ اس نے میری بیٹی کو اس عمارت میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ میں نے باہر لگے ہوئے سائن بورڈ دیکھے ان میں ایک درزی، ایک اسکول سیکریٹری اور.....“

”اور ایک پرائیویٹ سرائے رسالہ ایجنسی۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”یہ مت بھولو۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میری بیٹی یہاں کیا کر رہی ہے؟“

مار تھا نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور بولی۔

”ڈیڈی! میں نے ایک خواب دیکھا تھا اور میں ان لوگوں سے کہہ رہی تھی کہ اس سلسلے میں میری مدد کریں۔ بس اتنی سی بات ہے۔“

”یہ اتنی سی بات نہیں ہے لڑکی۔ یہ تمہارا ایک احقانہ خواب سننے کے عوض ایک بازو اور ایک ٹانگ کاٹ لیں گے۔ اچھا ہوا۔ تمہاری ماں زندہ نہیں ہے۔“

اوٹیل اس کے سامنے آتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ ہم تمہاری بیٹی سے کوئی فیس نہیں لے رہے بلکہ صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اس کی رہنمائی کر رہے ہیں۔“

”مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم مجھے بے وقوف مت سمجھو۔“

خواجه لقمان تھے تو اگرچہ غلام ابن غلام لیکن اللہ والے تھے۔ ہوس اور لالچ سے ان کی زندگی پاک تھی۔ آقا بھی ان کا صاحب نظر تھا اس لیے بظاہر تو وہ مالک تھا لیکن خواجه لقمان کے مقام و مرتبے سے واقف تھا۔ لقمان اپنا بھید ظاہر نہ کرنا چاہتے تھے۔ آقا اس قدر گرویدہ اور معتقد ہو گیا تھا کہ اپنا کھانا انہیں بھجواتا اور جو واپس بچ کر آتا وہ جمبوٹا کھانا خود کھاتا تھا۔ اگر کبھی لقمان کھانا واپس کر دیتے اور نہ کھاتے تو آقا بھی وہ کھانا نہیں کھاتا تھا۔ ایک مرتبہ خربوزہ تحفے میں آیا۔ مالک نے خادم کو بھیجا کہ جا کر لقمان کو بلاؤ۔ وہ تشریف لائے اور مالک کے سامنے بیٹھ گئے۔ مالک نے چھری سے خربوزہ کاٹا اور ایک قاش خواجه لقمان کو پیش کی۔ انہوں نے بہت شوق سے کھا تو مالک نے دوسری قاش دی پھر تیسری اور یوں 17 قاشیں خواجه لقمان نے کھالیں۔ جب ایک قاش باقی رہ گئی تو مالک نے کہا ”یہ قاش میں خود کھاؤں گا۔“ اس نے سوچا خربوزہ بہت میٹھا اور مزیدار تھا جو خواجه لقمان اس کی سترہ قاشیں مزہ لے کر کھا گئے۔ مالک نے وہ قاش منہ میں ڈالی تو وہ مرجوں سے زیادہ کڑوی تھی۔ اس نے زبان پر چھالے ڈال دیئے تھے۔ حیرت سے پوچھا۔

”لقمان! تم نے یہ زہر کی طرح کڑوا خربوزہ کیسے کھایا۔ کیا تمہیں اپنی جان سے ڈھنسی ہے کوئی عذر پیش کر کے خربوزہ کھانے سے معذرت کر دی ہوئی۔“

خواجه لقمان نے جواب دیا۔ ”میں نے آپ کے ہاتھ سے اس قدر کھایا ہے کہ مارے شرم کے جھک کے رہ گیا ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ کوئی کڑوی شے آپ کے ہاتھ سے کھانے کو ملے اور میں انکار کر دوں۔ آپ کے ہاتھ سے ملنے والے کڑوے خربوزے کو آپ کی محبت اور شفقت نے میٹھا کر دیا تھا۔“

سبق: اللہ والے آزمائشوں میں سرخرو ہوتے ہیں۔

اقتباس حکایات رومی اور سعدی

از ڈاکٹر تصدق حسین

میں نے خاموشی اختیار کرنا مناسب سمجھا لیکن جب اس نے یہ بات دوبارہ کہی تو میرے منہ سے نکل گیا۔ ”تم تو شکل سے ہی اجنبی لگتے ہو۔“

اس نے مجھے غصے سے دیکھا اور آگے بڑھ کر پانا میری جانب گھمایا۔ وہ غالباً میرے سر کا نشانہ لینا چاہ رہا تھا۔ اس وقت مجھے اپنے باپ کی نصیحت یاد آئی کہ جب کوئی تمہاری کھوپڑی پر حملہ کرے تو پیٹھ کر اسے لات مارو۔ میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ فرش پر گر پڑا اور اس کا پانا بھی ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اونٹل تیزی سے آگے بڑھا، اس نے جھک کر وہ اوزار اٹھایا اور اسے میری میز پر رکھ دیا۔ اب وہ مور لے کی بجائے سے دور تھا۔

مارتا خوفزدہ نظر آرہی تھی۔ اس کی زبان سے بس اتنا ہی نکلا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا ڈیڑی کہ یہ تم نے کیا ہے۔“

وہ چند لمبے فرش پر پڑا رہا پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”غصیک ہے، جب تک مجھے ڈاک سے کوئی بل موصول نہیں ہوتا مجھے اس کی پروا نہیں کہ یہ لڑکی کیا کرتی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے آخری بار اپنی بیٹی کو دیکھا اور بولا۔ ”اندھیرا ہونے سے پہلے گھر پہنچ جانا۔“ اس نے اپنا پانا اٹھایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ایک طویل خاموشی کے بعد مارتا نے گہری سانس لی اور بولی۔ ”یقیناً تم دونوں سوچ رہے ہو گے کہ میرے باپ کا رویہ دوستانہ نہیں تھا۔“

”ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔“

میری ماما ہمیشہ اس کے رویے کی شکایت کرتی تھیں لیکن میں ایسا نہیں سمجھتی۔

”مارتا، ہمیں بتاؤ۔“ میں نے کہا۔ ”تمہارے باپ نے تمہاری سہیلی پر ہاتھ اٹھایا یا.....؟“

”نہیں۔ اس نے مجھے کبھی نہیں مارا۔“ مارتا نے کہا۔ ”درحقیقت اس نے مجھے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ یہاں تک کہ کبھی سر پر بھی چھبکی نہیں دی۔ کم از کم اس نے مجھے مارا نہیں اور نہ ہی وہ لوگوں پر بڑے اوزاروں سے حملہ کرتا ہے۔“

”لیکن اس نے مجھ پر جو حملہ کیا، اسے تم کیا کہو گی؟“

اونٹل نے مارتا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تم نے خواب میں چاندی کا پتھر دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ

تمہارے باپ کے اسی اوزار کی علامت تھا۔“

مارتا بولی۔ ”میرے خواب میں وہ پتھر خون آلود تھا۔ کیا اس کا مطلب ہے کہ میرا باپ کسی کو اپنے اوزار سے قتل کرنے والا ہے؟“

میں نے ناک سکڑتے ہوئے کہا۔ ”اس نے ابھی ابھی مجھ پر اپنا پانا گھمایا تھا۔“

”ٹھیک ہے۔“ اونٹل نے کہا۔ ”لیکن ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ اس کا جواب بالکل مختلف ہوگا۔“

اس نے اپنی بات کی وضاحت کرنے کی زحمت نہیں کی۔ اس کے بجائے اپنا کوٹ اٹھایا اور دفتر سے باہر چلا گیا۔

مارتا بھی وقت ضائع کیے بغیر اس کے پیچھے چل دی۔ میں چند لمبے خاموش کھڑا رہا پھر میں بھی اس قافلے میں شامل ہو گیا۔ اونٹل اور مارتا بڑک پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ میں نے ان کی نگاہوں کا تعاقب کیا تو ایک بلاک کے فاصلے پر مور لے کھڑا ہوا نظر آیا جو سر کیٹ لگا رہا تھا۔

پھر ہم نے سڑک پر کسی گاڑی کے ٹائروں کے گھسنے کی آواز سنی۔ ایک سرمئی رنگ کی کریسلر کار تیزی سے مور لے کی طرف آرہی تھی۔ آخری لمبے میں اس نے خطرہ محسوس کیا اور تیزی سے ایک جانب ہٹ گیا۔ کار نے ایک خطرناک یوٹرن لیا۔ مور لے اب سڑک پر چت لینا ہوا تھا۔

کار ایک بار پھر اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ مور لے نے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن لگتا تھا کہ اس کی ٹانگ زخمی ہوئی تھی اور وہ اس کار سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکتا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مارتا کی چیخ نکل گئی۔

میں نے سڑک کی طرف دوڑ لگا دی اور اس سے پہلے کہ کار دوبارہ اس تک پہنچتی میں نے مور لے کو پوری قوت سے پکڑا اور ہم دونوں ہی فٹ پاتھ پر آن کرے۔

کار چند انچ کے فاصلے سے گزری اور ہمارے عقب میں دیوار سے ٹکرائی۔ پھر دھات کے چرچرانے اور شیشے ٹوٹنے کی آواز آئی۔ ڈرائیور کا دروازہ کھلا اور اس میں سے کوئی باہر آیا۔ میں نے لینے لینے برابر میں پڑا ہوا چشمہ اٹھا کر آنکھوں سے لگایا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی، وہ ماریا وائٹن تھی۔

ابھی میں اس جھکے سے سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ ماریا نے اچانک ہی مور لے پر چلانا شروع کر دیا۔ ”کوئی مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ کوئی جی نہیں۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری حرکات کا علم نہیں۔ تم اس دندان ساز کی بیوی کے

کا ایک
اہم نمبر

سرگزشت
ماہنامہ

بے وقت موت نمبر

ان افراد کی روداد جو ”بے وقت موت“ کا شکار ہوئے لیکن
اپنی مختصر سی زندگی میں انہوں نے قابلِ تقلید کام کیے

سرگزشت کا خاص نمبر

اہمیت کا حامل ہوتا ہے
لوگ محبلہ کرنا کر رکھتے ہیں

اگر آپ ایسی کسی شخصیت پر لکھنا چاہتے ہیں

تو پہلے آگاہ کر دیں تاکہ کوئی دوسرا اس

شخصیت پر لکھ رہا ہو تو اسے روک دیا جائے

اس کی کار کے تاروں کی آواز تھی۔ چاندی کا پنجرہ میرے ڈیڑی کا پانا تھا اور وہ بھی خون آلود ہو جاتا اگر وہ اپنی کار ان پر چڑھا دیتی۔“

”علامتی طور پر ایسا ہی ہے۔“ اونٹل بولا۔
 ”لیکن تم دونوں نے عین وقت پر اس کی کوشش ناکام بنادی۔ میں ہمیشہ تمہاری احسان مند رہوں گی۔“
 ”یاد کرو تمہاری ماں نے کیا کہا تھا؟“ اونٹل بولا۔
 ”تمہارے خواب خوب صورت تھے ہیں۔“

”ہاں۔ اس نے یہی کہا تھا۔“ وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی۔ ”اب مجھے گھر جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ڈیڑی بہت زیادہ چڑچڑے ہو رہے ہوں۔“

اس واقعے کے تین دن بعد مارتھا کا باپ مورلے دندان سازی کی بیوی کے ساتھ کہیں چلا گیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ دونوں میکسیکو کے کسی نامعلوم مقام کی طرف چلے گئے تھے۔ جب مارتھا اسکول سے واپس آئی تو گھر خالی پڑا ہوا تھا۔ اس کی نظریں پر رکھے ہوئے مورلے کے خط پر مبنی جس پر مختصر تحریر تھی۔

”میں قسمت آزمائے جا رہا ہوں۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنی خالہ کو بلا لو۔“

آئی ٹی نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ گوکہ باپ کے چلے جانے سے مارتھا کی زندگی میں ایک خلا تو ضرور پیدا ہوا لیکن خالہ نے اپنی محبت اور شفقت سے وہ کمی پوری کر دی۔ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد میری مگنیتر مجھے زبردستی اسکول کے کنکشن میں لے گئی۔ وہاں میں نے مارتھا کو اسٹیج پر دیکھا۔ اس نے بے ڈھنگی فرائک کے بجائے بے حد خوب صورت نیلے رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جس پر ستارے چمک رہے تھے۔ اس نے اپنے دو بازو پھیلائے اور گانا شروع کیا۔

”خوب صورت خواب میرا سراپا یہ ہیں۔“

اس کا اعتماد اور چہرے کی مسکراہٹ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ماں کے مرنے کے بعد باپ کی عدم توجہی سے بچوں کی شخصیت پر کتنے منفی اثرات رونما ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے مورلے کا جانا مارتھا کے حق میں اچھا ہی ہوا اور اس کی خالہ نے مالی کی کمی پوری کر دی لیکن کیا واقعی ایسا ہی ہے؟ اس کا صحیح جواب تو شاید مارتھا بھی نہ دے سکے۔ باپ کا خط پڑھ کر اس نے یہی سوچا ہوگا کہ مورلے کا اسے چھوڑ کر چلے جانا تو اس کے خواب میں شامل نہیں تھا۔

ساتھ جو گل کھلا رہے ہو، وہ میں جان گئی ہوں۔“ اس نے غصے سے منھیاں بھیچ لییں اور یوں لگا جیسے وہ مورلے کے چہرے کو نشانہ بنانے والی ہے۔

”بہت ہو چکا۔“ اونٹل ان دونوں کے درمیان آتے ہوئے بولا۔ ”تمہاری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔“

عین اسی وقت میں بھی آگے بڑھا اور ہم اسے بازوؤں سے پکڑ کر دور لے گئے۔ اس کے باوجود ماریا کی چیخ و پکار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ ہڈیانی کیفیت میں بولتی رہی۔ ”تم سو رکی اولاد، جھوٹے، مکار..... مجھ سے کہتے رہے کہ میں تمہاری محبوبہ ہوں، وہ نہیں۔ لیکن تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔“

اس کی جارحیت کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین نہیں تھا کہ ہم اسے زیادہ دیر تک مورلے سے دور رکھنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ خوش قسمتی سے وہاں موجود کسی شخص نے پولیس کو اطلاع دے دی اور چند ہی منٹ بعد وہ اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔ ان کے جانے کے بعد مورلے اپنی جگہ سے اٹھا۔ کچھ کہے بغیر اس نے اپنا پانا اٹھایا اور نکلڑا تا ہوا وہاں سے چل دیا۔

اس تمام کارروائی کے دوران میں مارتھا کو بالکل ہی بھول گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ اسی جگہ کھڑی ہوئی تھی جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا لیکن وہ سب کچھ دیکھ اور سن چکی تھی۔ اونٹل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ تمہیں یہ سب دیکھنا پڑا۔“

مارتھا نے اس کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”کیا میں وائسن یہ کہہ رہی تھی کہ میرے ڈیڑی کی بہت سی گرل فرینڈز ہیں اور ان میں سے ایک وہ بھی ہے؟“

”ہاں۔ میری بچی۔“ اونٹل نے قدرے تاسف سے کہا۔

”اسی لیے اس نے ڈیڑی پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی؟“

”ہاں۔“

”یہ سب کچھ دیا ہی ہے جو میں نے خواب میں دیکھا تھا۔“ مارتھا بولی۔

”وہ کیسے؟“ میں نے پوچھا۔

مارتھا نے اپنا چشمہ سیدھا کیا اور بولی۔ ”مس وائسن یہ وہ مشہور عورت ہے جو کوئی غلط کام کرنے والی تھی اور اس کا نشانہ میرا باپ تھا۔ میں نے خواب میں جو چیخ سنی، وہ



چوتھا درویش

منظر امام

داستانیں... پر دور کا نہ صرف حصہ رہی ہیں بلکہ عکاس بھی ہوتی ہیں۔ زیرِ نظر تحریر بھی کچھ ایسا ہی منظر نامہ پیش کر رہی ہے جس میں بڑی سلجھی ہوئی طبیعت کے لوگ انتہائی الجھے ہوئے حالات کا شکار اپنے اپنے مسائل کا غم منا رہے ہیں۔

دورِ ابتلا میں مبتلا چار درویشوں کا عجیب قصہ

نے قرض کی چھاؤں میں۔“ گویا ہوا درویش۔ اگرچہ ابھی بھی وہ روتے روتے بیزار کیے دے رہا تھا دوسروں کو۔
”بہت خوب۔“ گردن ہلائی ایک سینئر درویش نے۔
”اغلب ہے کہ تیری داستان میں حلتیں پوشیدہ ہوں گی۔“
”ہاں۔“ سانس لی اس رونے والے نے کہ اس کی سانس بھی بھرائی ہوئی تھیں۔ ”دوستو! میں ہوں ایسا کم عقل اور بد نصیب کہ نہ ہووے گا دوسرا کوئی ایسا کہ جس کے ساتھ ایسی افتاد گزری ہو۔“
”ہم تیری داستان سننے کے لیے ہمہ تن گوش ہیں۔“
کہا درویشوں نے۔

سر پہوڑائے ہوئے تھے سارے درویش اور جنگل میں ایسی خاموشی تھی کہ پتا بھی گرے تو شور برپا ہووے۔ ڈاڑھیاں بڑھ آئی تھیں ان درویشوں کی اور بال ہو گئے تھے ایسے جیسے افریقا کے جنگلات ہوں..... اور رات بھی مکنا نہیں لے رہی تھی گزرنے کا اور ایسے میں بلند کیا ایک درویش نے نعرہ ہوا اور لگا روئے کچھ اس انداز سے کہ اجنا کے دل بھی دہل جاویں۔
”اے بد نصیب اس طرح رو کر کیوں برباد کر رہا ہے اپنی انرجی۔“ کہا ایک درویش نے۔
”صاحبو! یاد رہی ہے مجھے وہ زندگی کہ جو سر کی میں

سسپینس ڈائجسٹ

سے اینٹھ لیے لاکھ روپے کہ پچاس جن میں سے دکاندار کو ادا کرنے تھے اور پہنچ گیا اپنی ریسمان شان کے ساتھ دکاندار کے پاس اور رکھ دیے اس کے سامنے پچاس ہزار کے نوٹ کہ جن کو دیکھ کر میرے ہاتھ جوئے لگا تھا۔
 ”اے نا بھارا! پھر اس کا کیا ہوا جس کا لاکھ لیا تھا؟“
 پوچھا ایک درویش نے۔

”اس کا لاکھ میں نے کسی اور سے لے کر اس کے حوالے کیا تھا۔“ بتایا اس نے۔

”لغت ہے جو ہم درویشوں کو خوش کر سکے۔ یہ تو ادھار لینے اور دینے کی کہانی تھی۔ اس میں کہاں ہے پوشیدہ دلچسپیاں؟“
 ”وہ دلچسپیاں تو اب شروع ہوئی ہیں بھائیو۔“ اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”اب میری اصل داستان اپنا آغاز چاہتی ہے۔ جب میں نے منصوبہ بنایا ایک بینک میں ڈاکا ڈالنے کا۔“

”کیا؟“ اب سب ہی درویش متوجہ ہو گئے تھے اس کی جانب۔ ”بینک میں ڈاکا؟“

”ہاں بھائیو! اور وہ بھی اس وقت جب تمام قرض خواہوں نے ایک دن مجھے گھیر لیا تھا۔ ساتھ ستر کی تعداد بھی ان کی اور یوں لگتا تھا میرے گھر کے باہر جیسے کوئی جلسہ برپا ہو رہا ہو۔ نہ جانے کیسی دبا چیلی تھی کہ سب کے سب ایک ساتھ قرض وصول کرنے آدھکے تھے۔ اب تم خود ہی سوچ لو کہ کیا حال ہو رہا ہوگا میرا۔ اس لیے میں نے ان سب کے سامنے ایک تقریر کی جس کا لب لباب یہ تھا کہ یہ دنیا فانی ہے اور کسی کو یہاں نہیں رہنا ہے۔ ہر ایک کو اپنا حساب دے کر جانا ہے۔ اس لیے میں بھی اپنا حساب دیے بغیر ہرگز نہ چھوڑوں گا اس دنیا کو کہ قیامت کا حساب اس سے سخت ہوگا اور نہ کام آوے گی کوئی سفارش کہ وہی روز آخر ہے لیکن نہ سنی کسی نے اور کرتے رہے تھا پھر میں نے مہلت لی ان سے ایک ہفتے کی کہ میں ایک ہفتے کے بعد سب کا حساب بے باق کر دوں گا کہ خوفِ خدا میرے دل میں ہے۔“

”کہاں سے ادا ہوتی یہ رقم؟“ سوال کیا کسی نے۔
 ”میرا ارادہ اس شہر خانہ خراب سے بھاگ جانے کا تھا۔“ بتایا درویش نے۔

”لغت ہے تجھ پر۔“ ملامت کرنے لگے درویش کہ تو نے بتا لگا یا درویشوں کے نام پر اور تصور کیا ادھار لے کر بھاگ جانے کا۔ درویشوں کی پوری روایت سے بغاوت کی ہے تو نے۔ درویش تو علامت ہوتے ہیں پاکیزگی اور اعلیٰ کردار

کے۔ اور تو ہے کہ اپنی اوجھی حرکتوں کو بیان کر رہا ہے۔
 ”صاحبو!“ کہا حکایت سنانے والے درویش نے۔
 ”ذرا یہ تو دیکھو کہ میری کہانی میں عنصر دلچسپی کا شامل ہونے لگا ہے یا نہیں۔ آگے اور بھی کئی مقامات آہ دفغان ملیں۔“
 ”اچھا چل، جاری رکھ اپنی کہانی۔“ حکم دیا ایک ایسے درویش نے کہ جوشا پید اہی درویش ہوا تھا۔

”تو ہوا یہ کہ میں بھاگ بھی نہیں پایا۔“ بتایا درویش نے۔ ”ان کم بختوں نے گمرانی شروع کر دادی میری۔ پھیل گئے میرے چاروں طرف۔ جہاں جاتا سائے کی طرح میرے ساتھ ہوتے۔ دودھ ریلوے اسٹیشن سے کھینچ کر واپس لے آئے۔ میرے عزیز و! بڑا ہی ٹھہر تھا میرے ساتھ کہ میں بھنس گیا تھابری طرح اور میری ساری ہوشیاری ہوا ہو گئی تھی۔ بھول گیا تھا اپنی ساری عقل مندی۔“

”اور میں اس الجھن میں ایک پارک میں جا کر بیٹھ گیا کہ جہاں کے گل بوئے اپنی بہاریں دکھا رہے تھے اور زندگی مسکرا رہی تھی۔ طوبرن شروع ہوا تھے اور ہنسنے کی طراوت آنکھوں کو سکون پہنچا رہی تھی لیکن اے دوستو! جب جیب میں پیسے ہوتے ہیں اس وقت یہ دنیا ہوتی ہے۔ اس وقت یہ کنکر بہہ رہا ہے۔ اس وقت یہ شبنم موٹی ہے۔ تو میری جیب تو خالی تھی۔ اگر وہ مجبورہ دلوا بھی سائے ہوئی میرے تو ہرگز توجہ نہ کرنا اس کی طرف۔ اتنے میں ایک مرد آوارہ و عیار صفت میرے پاس آکر بیٹھ گیا کہ زبان اس کی عجیب اور لہجہ اس کا غریب تھا۔۔۔۔۔ کیا بات ہے بھئی۔“ اس نے مجھ سے دریافت کیا۔ ”تھو بڑے پرہیزگار کیوں برکرا دیا ہے۔“
 ”میرے عزیز! پہلے تو یہ بتا کہ تھو بڑا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس پر اس نے بتایا کہ تھو بڑا چہرے کو کہتے ہیں اور یہ عوامی زبان ہے۔ میں سن کر بہت ملول ہوا کہ عوامی زبان بھی کیسی ہو گئی ہے پھر پوچھا اس مرد آوارہ نے۔ ”بھائی کچھ پریشانی دکھلا ہے۔ بتا میرے کو شاید کوئی کام آسکوں۔“

”اے عزیزو! ایسے میں ذرا سا ہمارا بھی بہت ہوا کرتا ہے۔ میں نے اس کو اپنا ہمدرد بنا اور سادگی اپنی ساری کہانی۔ جس پر وہ بہت دیر تک اس طرح ہنسا رہا جیسے اس کے سارے پر یک ناکارہ ہو گئے ہول۔ پھر چپ ہو کر بولا۔ ”اوسے، خانہ خراب! اگر ہم تیرے کو ایک راستہ بتا دے تو اپنا کام مکمل کیا ہوگا۔“

”میرے عزیز! پہلے راستہ تو بتا۔ تاکوئی صورت اس جہال سے نکل آئے گی۔“

اس پر اس نے بینک ڈسکٹ کا منصوبہ بتایا۔ میرا یہ حال تھا کہ اس بادر منصوبے کو سن کر خطا ہو گئے تھے میرے اوسان اور دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں دل کی پھر میں نے کہا۔ ”اے منٹوس صورت انسان۔ ایسا بھی نہیں ہووے گا۔ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔“

”تو پھر مارکا لوگوں سے۔“ کہا اس نے بڑی بے رحمی کے ساتھ۔ ”تیرے کو ایک ترکیب بتا رہا ہے تو تیرے خزانے نہیں ملتے۔“

”لیکن یہ تو بہت خطرناک کام ہے۔“

”آج کل بہت آسان ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اپنے بدن سے بم باندھ کر بینک میں گھس جا۔“

”اے عزیزو! اندازہ کر سکتے ہو میری حالت کا۔ جب اس نے دیا ہوگا مشورہ بم باندھ کر بینک میں گھس جانے کا۔ تم تو چیز ہی ایسی ہے کہ جس کے ذکر سے ہنڈے ہو جاتے ہیں ہاتھ پاؤں اور موت آ جاتی ہے نگاہوں کے سامنے۔ میں نے انکار کر دیا۔“

جس پر وہ ہنسنے لگا۔ ”میرے کو معلوم تھا خانہ خراب کہ تو بزدل انسان ہے۔ تو صرف رو سکتا ہے اور کچھ نہیں کر سکتا۔“

”بس میرے عزیزو! اس کا یہ کہنا تھا کہ میرے اعصاب کھول اٹھے۔ آپاؤ اجداد میں سے کسی نے نہ برداشت کیا ہوگا طعنہ بزدلی کا۔ کہ یہ ایک دھبا ہے میرے خاندان کے نام پر۔ لہذا تاؤ کھا کر میں فوراً تیار ہو گیا۔“

اتنا سنا کہ وہ درویش اپنی کہانی میں جیس پیدا کرنے کی غرض سے قصداً خاموش ہو گیا تھا۔ اس نے پیدا کر دی تھی اپنی کہانی میں ایک دلچسپی۔ اس لیے سب کے سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ لیکن اس نے چپ سادہ لی تھی۔ بالآخر پھٹ پڑا ایک درویش۔ ”اوتا بخارا! آگے کیوں نہیں بتاتا۔ تیرے جسم کو کیڑے کھائیں۔ خاموشی کیوں اختیار کر لی ہے تو نے۔ بتا آگے کیا ہوا؟“

مسکرایا وہ درویش ایسی مسکراہٹ جو فاقہ مانہ ہوا کرتی ہے۔ پھر گویا ہوا۔ ”بھائیو! میں نے مان لی اس بندے کی بات اور تیار ہو گیا بم باندھ کر بینک میں داخل ہونے کے لیے کہ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔ قرض خواہوں نے جان عذاب کر دی تھی میری اور خوشیاں پلٹ گئی تھیں میرے دروازے سے۔ پھر یہ ہوا کہ دو دونوں کی تربیت لینی پڑی مجھے۔“

”کس بات کی تربیت؟“

”یہی کہ باندھا جاتا ہے کس طرح بم کو اپنے جسم کے ساتھ اور کس طرح دھمکی دی جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور جب یہ مراحل طے ہو گئے تو ایک رات دھاوا بول دیا قرض خواہوں نے کہ تعداد جن کی ساتھ ستر کے قریب تھی اور وہ سب کے سب انتہائی کمینہ معنت لوگ تھے۔ لیکن اس وقت چونکہ میں کہ چکا تھا ارادہ بالکل پختہ اس لیے کہی غم نہ تھا مجھے اور میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہا۔ ”اے مرگی زدہ لوگو! خوش ہو جاؤ کہ کل صبح تمہارے لیے شادمانی اور کرامانی لی ہے۔ کیونکہ میں چکار ہا ہوں سب کے قرضے کہ بجھے آگے قیامت میں بھی جواب دینا ہے۔“

”اے مفلس انسان! کہاں سے لائے گا اتنے پیسے کہ ہم سب کو فارغ کر سکے۔“

”میرا اپنا معاملہ ہے۔ تم آگے بڑھ مت گنو۔“

”نہیں، ہم تو بیڑ بھی نہیں گئے کیونکہ تجھ پر کوئی بھروسہ نہیں رہا۔“ سب نے کہا۔

پھر میں نے بتا دیا اپنے اس منصوبے کے بارے میں کہ جس کا تعلق ایک بم سے تھا اور وہ بم باندھنا تھا مجھے اپنے بدن سے۔ حیران ہوئے وہ سب کے سب یہ سن کر۔ پھر گویا ہوا ان میں سے ایک گرگ باران دیدہ۔ ”ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ تو کدھر سے پیسے لاتا ہے۔ تو اپنے بدن سے توپ باندھتا ہے یا بم باندھتا ہے ہمیں تو اپنی رقم چاہیے۔“

سب نے تائید کی اس کی پھر ان میں سے ایک نے کہا۔ ”ہم بھی تیرے ساتھ ہی بینک چلیں گے۔“

”صاحبو! ہوش کے ناخن لو۔“ میں پریشان ہو گیا تھا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔ اب کیا میں پورا اجلاس لے کر بینک میں ڈاکا ڈالنے جاؤں گا؟“

”لیکن پھر انہوں نے خود کہا اور صلاح ہوئی کہ وہ اندر نہیں جائیں گے بلکہ باہر رہیں گے بینک سے اور جب میں بینک سے کامیاب اور شاد کام دولت لیے باہر آؤں گا تو سب کو وہیں تقسیم کر دوں گا۔ حق یہ تھا درویش۔“

”اب امتحان تھا اس موالی کا جس نے رائے دی تھی مجھے۔ اور بات کر لی تھی اپنے کمیشن کی اور بم لانے اور باندھنے کی ذمہ داری بھی اس کی تھی۔ اور جو ایسی زبان میں باتیں کرتا جو نہ سنی ہوں گی بھی میں نے۔ تو اے درویشو! رات دس بجے وہ لے آیا ایک چھوٹا سا بم کہ جو دیکھنے میں سیب کے موافق تھا لیکن چھپی ہوئی تھی اس میں ایسی جابجائی کہ جو تباہ کر دیتی اس بینک کو۔“

اس موقع پر ڈھل دیا ایک درویش نے۔ ”اے مرد



دوسرا حصہ

باغی

محمد طہمیر

ضد ہوا بغاوت... ہمیشہ غیر متوقع حالات اور نظریات کے خلاف جنم لیتی ہے۔ جہاں بے اصولی کا راج ہو وہاں بغاوت جنگ کرتی ہے اور جنگی صورت حال میں پھول نہیں بنتے بلکہ زخم لگتے ہیں... کبھی اپنوں کو اپنوں کے ہاتھوں اور کبھی دشمن کو دشمن کے ہاتھوں مگر... مشترکہ مفاد دشمن کو بھی دوست بنا کر خونی رشتوں میں دراڑیں ڈال دیتا ہے... جس طرح وہ باپ اور بیٹے ایک دوسرے کے مقابل اپنے حصے کا کردار ادا کر رہے تھے... وہ جو معاشرتی ناسوروں کا علاج کرنے نکلا تھا جب جانے پہچانے رستوں پر چلتے چلتے اپنے ہی پیروں کے آبلوں کو دیکھا تو روح تک زخمی ہو گئی اور پھر اندر کی وحشتوں نے اسے باغی بنا کر اپنوں کی نظروں میں ہی مجرم ٹھہرا دیا جبکہ دوسری جانب اس کا دل اس نازک اندام حسینہ کی ادائوں پر اس طرح آیا کہ اس کے کردار کی کالک اس کی گھنی زلفوں میں مدغم ہو کر رہ گئی مگر... کب تک... بھر وقت کا وارا ایسا چلا کہ ہر رنگ اپنی الگ شناخت کرا گیا۔

عشق کی جنوں خیزیوں میں پیار بھرے رشتوں کو روندنے والے ایک باغی کی کہتا



آشتی حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ بری طرح چونک گئی۔ ”تم... اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن کراہ کر رہ گئی۔ اس کے ہونٹ بھی زخمی تھے۔“

”بولنے کے لیے ساری عمر پڑی ہے لیکن میرے ہاتھ سے بنی دودھ ڈبل روٹی شاید تمہیں دوبارہ نڈل سکے۔“

میں نے شانوں سے پکڑ کر اسے بٹھایا اور پیچھے ایک ٹکیہ اور رکھ دیا۔ میرے ہاتھوں سے پیچھے کے ذریعے دودھ ڈبل روٹی کھاتے ہوئے وہ عجیب سے انداز سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ ناشا کروا دینے کے بعد میں نے اسے پین کھر گولیاں... دیں انجکشن لگایا اور بازو کی پٹی پھر سے بدل دی۔ اس کے بعد میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور واپس اس کے قریب آ بیٹھا۔

”میں جانتا ہوں تم اس وقت کس حیرانی سے گزر رہی ہو۔ مختصر طور پر اتنا بتا دیتا ہوں کہ تمہیں تمہارے دشمن اٹھا کر لے گئے تھے۔ کل شب میں تمہیں وہاں سے نکال لایا ہوں۔ کیوں نکالا...؟ اس کے جواب میں بس اتنا کہے دیتا ہوں کہ اگر تمہارے دشمنوں کو تمہاری جان چاہیے تو مجھے تمہاری زندگی چاہیے۔“

وہ بتا پلکیں جھپکاتے مجھے دیکھتی رہی۔ ”جانتی ہو مجھے تمہاری پوچھن کی کیوں چاہیے...؟ کیونکہ مجھے تمہیں... تمہاری امانت پوچھنی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم میرا لباس کیسے بدل گیا؟“ اس نے جھکی جھکی آنکھوں کے ساتھ تحیف آواز میں پوچھا۔ میں چند لمبے اسے دیکھتا رہا پھر اسے بتا دیا۔

”جس بندے کا یہ کمر ہے۔ اس کی بیوی نے تمہارا لباس بھی بدلا ہے۔ یہ اسی کا لباس ہے۔ ویسے وہ دونوں میاں بیوی اس گھر کے پاس میں ہی ایک اور گھر میں رہتے ہیں۔“

”تم... جانتے ہو۔ میرے دشمن کون لوگ ہیں۔ جن لوگوں نے میری یہ حالت کی ہے وہ... میں نے اس کی بات کاٹ دی۔“

”ہاں، میں جانتا ہوں اور میں تو ترین میں ہی جان گیا تھا۔ وہ کن کتنا کھا چوہری حشمت علی کا خاص بندہ ہے۔“

”اور تم...؟“

”میں... میں چوہری حشمت علی کا بیٹا ہوں۔ مجھے پیار سے وہ ”بافی پتر“ بلاتے ہیں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔

”خیر۔ ان باتوں کو چھوڑ دو۔ تم پر تو میرے کئی سوال ادھار ہیں۔ لیکن سوالات سے معاملہ صاف نہیں ہوگا۔ بہتر

ہے تم مجھے اپنی ساری کہانی سناؤ۔ شروع سے۔“ میری بات سن کر وہ پھر سے خاموش ہی ہو گئی۔

”کوئی بات نہیں۔ میں تم سے کسی بھی جواب کے عوض وہ سلوک نہیں کروں گا جو تمہارے دشمنوں نے کیا۔ جب تمہیں یقین ہو جائے کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں تب بتا دینا۔“ میں نے سر دھجے میں کہا۔

”مجھے تم پر اعتبار ہے۔ لیکن میرے جواب تمہیں تکلیف دیں گے۔“ اس نے کہا۔

”یہ بات میں پہلے سے ہی جانتا ہوں۔“ ایک توقف کے بعد اس نے اپنی کہانی شروع کی۔

”ہمارا گھر پاکپتن کے ایک چھوٹے سے محلے میں تھا ہم پانچ بھائی ہیں، بھائی کوئی نہیں ہے۔ باپ جسے نٹھی

حالت میں اپنی بیٹیوں کے نام تک یاد نہیں رہتے اور ماں جس کی کمر دوسروں کے گھروں میں جھاڑو دیتے دیتے کمان کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اس معاشرے میں ہر ناجائز کام برداشت کیا جاسکتا ہے لیکن غربت ایک ایسا جرم ہے جسے کوئی برداشت نہیں کرتا اور پھر اگر اس جرم میں حسن بھی شامل ہو جائے تو اس کی خیر نہیں رہتی۔ میری آپا انیسویں سب

سے بڑی اور ہم سب سے زیادہ خوبصورت تھیں۔ حالات نے چھوٹی عمر میں ہی انہیں ہماری دوسری ماں کا رتبہ دلادیا تھا۔ گھر میں سلاٹیاں کر کے انہوں نے ہم سب کو بڑی محنت سے پالا۔ خاص طور پر میں جو کہ سب سے چھوٹی تھی اور مجھے پڑھنے کا بھی بہت شوق تھا۔ انہوں نے مجھے تعلیم دلانے کا بیڑ اٹھایا اور میں کالج تک جا پہنچی۔ یہاں پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ تعلیمی درس گاہیں بھی منشیات جیسی لعنت سے محفوظ نہیں

ہیں۔ ایک پورا نیت ورک تھا جو اس کام میں ملوث تھا اور یہ سب جاننے کے باوجود کوئی ان کے خلاف نہیں جاسکتا تھا۔ فیصل کالج کا ایک ایسا طالب علم تھا جو کہ لڑائی جھگڑے میں پیش پیش رہتا تھا۔ وہ منشیات فروش میں بھی ملوث تھا لیکن اس میں ایک بہت اچھی بات تھی، وہ کالج کی لڑکیوں کا بہت احترام کرتا تھا۔ ہر ایک کے ساتھ ادب سے پیش آتا اور کسی بھی مسئلے کی صورت میں ان کی مدد کرتا۔ حالات نے مجھے بھی اس کی مدد لینے پر مجبور کر دیا۔ ایک رات ابانے اماں سے کہا

کہ بہت جلد ہمارے علاقے کا ایک بدمعاش آدمی ”جعفری“ آپا انیسویں کی برات لے کر آ رہا ہے۔ ہمارے لیے یہ خبر قیامت سے کم نہیں تھی لیکن ابابا کے بدھوش کانوں میں ہمارے رونے چلانے کی آوازیں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اگلے دن اماں نے محلے کے کچھ لوگوں کو اکٹھا کر کے مدد کی

کندھے سے لٹکے بیگ میں ڈال دیا۔ اس رات جعفری پہلی بار ہمارے گھر آیا۔ ہماری بھر کم سیاہ وچود سفید لٹھے میں تھل تھل کرتا ہوا چل رہا تھا۔ ناک تلے اتنی گھنی موچیں تھیں کہ ہونٹ نظر نہیں آ رہے تھے۔ اس کے ساتھ درجن بھر عورتیں تھیں۔ ابا ان کی راہ میں بچے جا رہے تھے۔ بنی سنواری عورتوں نے آپا نیمر کو زبردستی قریب بٹھا کر جانے کو نہی رسیں شروع کر دیں۔ اماں اور ہم سب ایک کونے میں کھڑے اپنی بے بسی کا تماشا دکھ رہے تھے۔

”تو ادھر آتی دور کیوں بیٹھا ہے۔ اپنی دوہٹی کے پاس آ کر بیٹھ۔ اور شکن کی انگوٹھی بھی نکال۔“ ایک بڑی عمر کی عورت نے جعفری سے کہا تو وہ موچوں کو ہل دیتا ہوا آپا کی طرف بڑھا اور یہی وہ لمحہ تھا جب آپا کا سکتہ ٹوٹ گیا۔ وہ تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے سر کی چادر اور گود میں رکھا سامان نیچے جا گرا۔ میں نے دیکھا ان کے ہاتھوں میں بھری کائے والی چھری تھی۔

”خبردار کوئی میرے قریب آیا تو جان سے مار دوں گی۔“ آپا چلا کر بولیں تو بڑھتے ہوئے جعفری کے قدم رک گئے۔ بڑی عمر والی عورت اٹھ کر چلی۔

”زبان سنجال کر بات کر کڑیے۔ اب تو ہماری ہونے والی۔ بہو ہے۔“ آپا کا بایاں ہاتھ حرکت میں آیا اور اس عورت کے منہ پر پڑنے والے ٹھنڈی گونج بہت دیر تک آتی رہی۔

”بند کرو یہ ڈراما اور دفع ہو جاؤ تم سب۔ میری مرضی کے خلاف مجھے کوئی نہیں لے جا سکتا۔“ وہ چلا رہی تھی۔ میں اسی لمحے جعفری نے آپا کا چھری والا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اس طرح مروڑا کہ چھری اس کے ہاتھ سے گر گئی۔

”سو جا تھا تجھے شرافت سے بیاہ کر لے جاؤں۔ پر لگتا ہے تجھے شرافت راس نہیں ہے۔ اب نہ نکاح ہوگا نہ برات آئے گی۔ تیری ڈولی ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ جائے گی۔“

جعفر دھاڑا۔ اماں گڑ گڑاتی ہوئی اس کے پاؤں میں جاگری۔ اس منظر کے بعد میری برداشت ختم ہو گئی۔ جانے کیسے میرے ہاتھوں میں موجود پتھول سیدھا ہوا۔ اور کیسے میں نے سیٹھی کیچ بٹاتے ہوئے نشانہ باندھا۔

”جعفری! تیری دلہن ادھر ہے۔ لے اے ساتھ لے جا۔“ میں نے بلند آواز میں کہتے ہوئے ٹریگر دبا دیا۔ جعفری میرے ہاتھ میں موجود پتھول دیکھ کر یوں ساکت ہوا کہ گولی لگنے تک بل نہ سکا۔ گولی کی آواز بہت بھیاںک تھی۔ جعفری

درخواست کی لیکن سبھی جعفری نامی اس بد معاش کے ڈر سے چپ چاپ واپس چلے گئے۔ نیمرہ آپا تو جیسے سکتے میں چلی گئی تھیں۔ ان کی نظریں ٹھٹھکی باندھے آسمان کو نکلتی رہیں۔ ہمیں پتلا چلا کر ابا نے نیمرہ آپا کو جوئے میں بار دیا تھا۔ میری پریشانی کو کالج میں میری بہترین دوست عارفہ نے محسوس کیا اور سب کچھ سن کر اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں فیصل سے بددلوں۔ میں اس کی بات سن کر حیران رہ گئی۔ لیکن وہ کہے جا رہی تھی۔

”جس طرح سانپ کے کانٹے کا علاج سانپ کا زہر ہی ہوتا ہے، ایسے ہی ان غنڈے بد معاش لوگوں کو صرف ان جیسے لوگ ہی روک سکتے ہیں۔ ویسے بھی بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ منع ہی کرے گا۔“

”میں اس کی بات مان گئی اور یوں میں نے فیصل سے مدد طلب کر لی۔ اس نے مجھ سے صرف ایک سوال کیا کہ برات کس تاریخ کو آئے گی۔ میں نے بتا دیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں بے فکر ہو جاؤں۔ جعفری سے وہ خود ہی منٹ لے گا۔ میں واپس تو آ گئی لیکن دل مطمئن نہیں تھا۔ اسی دوپہر کو میں نے اور اماں نے پلان بنایا کہ ہم سب رات کے اندھیرے میں اس علاقے کو چھوڑ کر کہیں دور چلے جائیں گے لیکن شام تک جعفری کے دو مشنڈے ہمارے دروازے کی چوکھٹ پر پہرے دار بن کر جم چکے تھے۔ ہماری تمام تردعاؤں کے باوجود دن گزرتے گئے۔ برات جھرات کو آتی تھی، صرف ایک دن قبل میں کالج میں پھر سے فیصل سے ملی۔ اس کے نسلی بھرے بول سن کر میں واپس چلی تو اس نے مجھے پکارا، میں چلی تو میری آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں۔ فیصل کے ہاتھ میں ایک سیاہ پتھول تھا۔

”اسے لے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ ضرورت پڑ جائے۔“

اس نے کہا۔

”میں اسے کیسے لے جاؤں۔ مجھے یہ چلانا نہیں آتا۔“

”جب سر پر پڑتی ہے تو یہ خود بخود چلے گئی ہے۔ ویسے بھی اسے چلانے کے لیے کوئی کورس نہیں کرنا پڑتا۔ ادھر دیکھو..... اسے پلوں دونوں ہاتھوں سے پکڑنا ہے۔ یہ سیٹھی کیچ بٹا دینا ہے اور پھر یہ ٹریگر دبا دینا ہے۔“ میں پریشانی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

”گھبراؤ نہیں۔ یہ میں صرف تسلی کے لیے دے رہا ہوں۔ ورنہ مجھے معلوم ہے کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں پہنچ جاؤں گا۔“ اس نے پتھول خود ہی میرے

مگر چکا تھا اور اس کے ساتھ کی کچھ عورتیں بھاگ گئیں اور کچھ اس کی لاش سے لپٹ کر بین کرنے لگیں۔

اماں اور ساری بہنیں مجھ سے لپٹ گئیں اور ہم کتنی ہی دیر اپنی قسمت کو روتے رہے۔ میرے کان پولیس گاڑی کے سائرن کا انتظار کر رہے تھے لیکن اچانک ہی حالات نے نیا موڑ لے لیا۔ فیصل اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ ایک گاڑی میں وہاں پہنچ گیا۔ صورت حال کا اندازہ ہوتے ہی اس نے مجھے اپنے ساتھ چلنے کو کہا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گی۔ لیکن فیصل اماں کو سمجھانے لگا، وہ کہہ رہا تھا کہ میرا پولیس کو گرفتاری دینا خطرے سے خالی نہیں۔ اماں نے مجھے سمجھا بھاکر اس کے ساتھ چلے جانے کو کہا۔ وہ مجھے گاڑی میں بٹھا کر ساہیوال کے پوش علاقے کے ایسے گھر میں لے آیا جہاں اس کی ایک آٹنی اور میری ہم عمر لڑکیاں رہ رہی تھیں۔ انہوں نے بڑی شفقت کے ساتھ مجھے سنبھالا۔ اگلے دن شام کو جا کر فیصل وہاں پہنچا تو مجھے حالات کا اندازہ ہوا۔ پولیس والے اماں اور بہنوں کو تھانے میں لے گئے تھے لیکن یہاں بھی فیصل نے مدد کی اور اپنے اثر رسوخ سے انہیں چھڑا لیا۔ اب پولیس میری تلاش میں تھی۔ دو دن بعد ہی فیصل نے مجھے بتایا کہ پولیس تک فیصل کا نام بھی پہنچ گیا ہے اس لیے میرا یہاں سے نکل جانا بہتر ہے۔ اس بار بھی اسی نے میری مدد کی۔ رات کے اندھیرے میں ایک وکیل کے ذریعے مجھے وہاں سے نکالا گیا۔ اب کی بار ایک طویل سفر نے مجھے بہادپور پہنچا دیا۔ اس کے بعد فیصل سے میرا رابطہ نہیں رہا۔ کچھ دنوں بعد مجھے بتایا گیا کہ فیصل کو پولیس نے شہبے میں گرفتار کر لیا ہے۔

”سنیلا سنٹ ٹاؤن کی جس کوٹھی میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا اس میں عورتوں کے حقوق کی ایک این جی او کا دفتر تھا جس کے مالک کا نام رانا ایوب تھا اور اس این جی او کے لیے کام کرنے والی بیشتر لڑکیاں یہیں رہائش پذیر تھیں۔ سارہ ان سب سے سینئر تھی۔ وہ میری بہت اچھی دوست بن گئی۔ سارہ مارشل آرٹ کی ماہر تھی۔ میں جتنے دن وہاں رہی اس نے مجھے بہت کچھ سکھایا۔ رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں اس نیٹ ورک کا ایک حصہ بن رہی ہوں جس کا تعلق نشیات فروشی سے ہے۔ این جی او تو صرف ایک پردہ ہے۔ لیکن ہمارا رابطہ صرف رانا صاحب سے ہی تھا۔ سارہ نے مجھے مارشل آرٹ ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ سکھایا تھا جیسے میک اپ کے ذریعے چہرہ بدل لینا اور ان

کے کام سے متعلق کوڈز وغیرہ۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھے اس گھناؤنے کام کے لیے تیار کر رہے ہیں لیکن میں نے جب تک انکار کرنا مناسب نہ سمجھا جب تک تربیت پوری نہ کر لی۔ میرا خیال تھا کہ اس ”نیم فوجی“ تربیت کے بعد میں سلیف ڈیفنس میں ماہر ہو جاؤں گی اور یہاں سے نکل جاؤں گی۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ ایک دن میری ملاقات رانا صاحب سے ہوئی۔ اس نے بتایا کہ پولیس نے جعفری قتل کیس میں سے میرا نام نکال دیا ہے۔ دوسری جانب رانا نے میری اماں اور بہنوں کو بھی اپنی تحویل میں لے کر کسی اور شہر منتقل کر دیا تھا اور اب اس کا کہنا تھا کہ میری زندگی اس کی مرہون منت ہے اور ایسے ہی گزرے گی جیسے وہ چاہے گا۔ اس نے میرے پرکاش کر میرا بچہ کھول دیا تھا میں آزاد ہو کر بھی اڑ نہیں سکتی تھی۔ اس کی بات ماننے کے علاوہ میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں تھا اس لیے میں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ کچھ عرصہ میں باقی لڑکیوں کے ساتھ کام کرتی رہی پھر میرا ٹرانسفر کر دیا گیا۔ میری ڈیوٹی مراد آباد میں لگادی گئی۔ یہاں پر میں معروف غیر ملکی چینل کی جانب سے ایک رپورٹر کے طور پر آتی تھی جو کہ سرحد پار کر کے آنے والے جانوروں کی فلم بندی کرتا ہے لیکن درحقیقت یہاں مجھے نشیات کی رقم وصول کرنے کا کام سونپا گیا۔“ وہ ایک لمبے کو خاموش ہوئی پھر ایک توقف کے بعد بتانے لگی۔

”جہیں معلوم ہے یا نہیں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ چودھری حشمت علی اسمگلنگ کا کام بھی کرتے ہیں کیونکہ ایک تو مراد آباد بارڈر ایریا ہے۔ لہذا یہاں اسمگلنگ کے کام میں زیادہ رکاوٹ پیش نہیں آتی، دوسری بات جو زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ یہاں ایک ایسا خفیہ راستہ ہے جو سرحد پار جاتا ہے۔ اس راستے کے بارے میں سوائے مخصوص لوگوں کے اور کوئی نہیں جانتا۔ اس راستے کے ذریعے بنا کسی رکاوٹ کے یہاں کا مال ادھر اور وہاں کا ادھر آتا رہتا ہے۔ ویسے بھی چودھری حشمت علی کے تعلقات دارالخلافہ سے اتنے قریبی ہیں کہ ان کے کسی غیر قانونی کام کو ”غیر قانونی“ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ تمہارے دونوں بھائی بھی اس کام کو پسند نہیں کرتے۔ اسی وجہ سے انہوں نے خود کو زمینوں تک محدود رکھا ہے۔ چودھری حشمت علی کو اس بات کی پروا نہیں ہے کیونکہ تمہارا کزن جواد ان کا دہانتا تھا بن کر ان کے ہر غیر قانونی کام کو اچھی طرح سنبھال رہا ہے۔ چودھری حشمت صرف قیمتی نوادرات کی اسمگلنگ ہی کرتا ہے۔ جو

صاحب کونشیات نہیں ملیں لیکن وہ ماکھے کی بات پر بھی اعتبار کرتے تھے۔ انہوں نے ماکھے کو حکم دیا کہ وہ اس معاملے کی تحقیق کرے اور اس تحقیق کے دوران ہی ماکھے کو مجھ پر شک ہو چکا تھا۔ میں نہیں جانتی کہ ماکھے کو مجھ پر کیسے شک ہوا لیکن اس نے میری خفیہ نگرانی ضرور کروانی شروع کر دی۔ اسی دوران ایک عجیب واقعہ ہوا۔ اپنی ناکوئیس نے ایک ریڈ میں ہمارے باس رانا صاحب کو گرفتار کر لیا تھا۔ کیونکہ ہمارا رابطہ صرف رانا صاحب کے ساتھ تھا۔ ان کے بگ باس کا کچھ پتا نہیں تھا اس لیے نیٹ ورک میں پھیل ہوئی اور میرے جیسے کئی لوگ ان کے کھلے سے نکل گئے۔ میں نے بھی خود کو آزاد تصور کیا لیکن اس ہنگامے میں ایک بات کی طرف کسی کی توجہ نہ تھی۔ ہماری ایک سپلائی کے عوض ملنے والے ہیرے اس شام کو کھینچ رہے تھے۔ میں نے اپنے طوطے پر ہی وہ ہیرے حاصل کیے اور پاکستان چلی گئی۔ مجھے اپنے گھر والوں کو ڈھونڈنا تھا۔ پاکستان میں، میں اپنی ایک دوست کے پاس ٹھہری تھی، جب مجھے وہاں ایک فون ریسرو ہوا۔ اس شخص کا کہنا تھا کہ وہ ہمارا بگ باس ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا باس صرف رانا تھا اس لیے میں اب آزاد ہوں تو جواب اس نے کہا کہ شک ہے، میں آزاد رہ سکتی ہوں لیکن بدلے میں، میں آخری کھپ کے ہیرے اسے دے دوں۔ میں نے اسے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ اگر میں ہیرے اس کے حوالے کر دوں تو وہ مجھے میرے گھر والوں کا پتا بتا سکتا ہے۔ میں سن رہی تھی اور پھر میں نے فوراً ہی اس سوچے کی ہائی بھی بھری۔

”اس نے مجھے پاکستان میں ہی ایک جگہ کا پتا دیتے ہوئے کہا کہ میں ہیرے لے کر وہاں پہنچوں۔ جب میں اس کے مطلوبہ مقام پر پہنچی تو میں نے پہلی بار بگ باس کو دیکھا اور اسے دیکھ کر میں حیران رہ گئی کیونکہ میں اسے پہلے سے اچھی طرح جانتی تھی۔ میں ہیروں کے عوض اپنے گھر والوں کا پتا جانتی تھی لیکن اس نے مجھے دھوکا دیتے ہوئے ہیرے جھیننے کی کوشش کی۔ وہ مجھے بولی بھالی سمجھ کر ہیرے ہتھیا لینے کی جستجو میں تھا کہ میں اسے دھوکا دے کر نکل گئی اور لاہور پہنچ گئی۔ وہاں میری ایک دوست ہاسٹل میں رہتی تھی۔ مجھے وہاں پہنچے دوسرا دن ہی ہوا تھا جب مجھے ایک اور فون ریسرو ہوا۔ میں بگ باس کی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ اس نے کہا کہ وہ ابھی بھی مجھ سے مصالحت کر سکتا ہے۔ اس بار میں نے اسے بتایا کہ مصالحت کیسے ہوگی۔ پلان کے مطابق بگ باس کی طرف سے ایک بندہ اکیلا مجھے ملے گا اور وہ مجھے

انڈیا کے راستے پوری دنیا میں کہیں بھی پہنچے جاسکتے ہیں۔ اس علاقے میں چودھری شمش علی کا اثر سرخون دیکھ کر عالمی مارکیٹ سے نشیات کے اسمگلروں نے چودھری شمش سے رابطے شروع کیے لیکن چودھری شمش علی نشیات کے بہت خلاف تھے۔ جب انہوں نے اس کام کی اجازت نہ دی تو ان لوگوں نے دوسرا راستہ نکال لیا۔ ان لوگوں نے چودھری شمش علی کے چند ساتھیوں کو اپنے ساتھ ملایا اور بڑی کامیابی سے اسمگلنگ کیے جانے والے نوادرات میں ہی نشیات کی ایک بھاری کھپ چھپا کر انڈیا بھیجنے میں کامیاب ہو گئے۔ چودھری شمش علی کو قطعی معلوم نہیں کہ ان کے نوادرات کی اسمگلنگ کی آڑ میں نشیات بھی اسمگل ہونے لگیں۔ یہ نشیات انہی مجسوں یا آرٹ کے پیروں کے اندر چھپا کر یا ان کے کارڈن میں رکھ کر بھیجی جاتی ہیں اور ان کی رقم علیحدہ سے موصول ہوجاتی۔ سیراکام نشیات کی رقم وصول کرتا تھا اور یہ طریقہ بہت عجیب تھا۔

”یہ بہت سربسز اور زرعی علاقہ ہے۔ لہذا یہاں جانور بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ میں مراد آباد میں غیر ملکی چیتوں کی ایک رپورٹ کے طور پر رہتی تھی جو بارڈر پار کر کے آنے والے جانوروں کی قلم بندی کرتا ہے لیکن درحقیقت میں نشیات کی کھپ کا معاوضہ وصول کرتی تھی جو کہ ہیروں کی شکل میں آتا تھا۔ جب یہاں سے نشیات انڈیا تک پہنچ جاتی تھیں فون کیا جاتا اور وقت مقررہ پر میں ان کے بتائے ہوئے علاقے میں پہنچ جاتی۔ وہ لوگ عموماً کسی ”بھیر“ کو استیصال کرتے تھے۔ اس بھیر کی معنی اون میں ہیروں کو چپکا دیا جاتا تھا اور اسے پاکستان کی طرف ہانک دیا جاتا تھا۔ اس بھیر پر ایک خاص چپ لگائی جاتی تھی۔ جو ایک اینٹنا نما آلے پر سگنل دے کر بھیر کی لوکیشن بتا دیا کرتی تھی۔ یہ آلہ مجھے پہلے ہی دے دیا گیا تھا۔ میں اس کی مدد سے بھیر کو تلاش کرتی اور اس سے ہیرے اور چپ حاصل کر لیتی۔ ہیرے ہمارے پاس کے پاس چلے جاتے اور چپ (chip) نشیات کی اگلی کھپ کے ساتھ ہی واپس انڈیا پہنچ جاتی لیکن پھر ایک دن ایسا واقعہ ہوا کہ نشیات کی اسمگلنگ کا بول بھال گیا۔ چودھری شمش علی کے خاص بندے ماکھے کو کسی طرح پتا چل گیا کہ نوادرات کی آڑ میں نشیات بھی بھیجی جا رہی ہیں۔ اس نے خیر چودھری کو بتائی اور چودھری شمش علی نے رات کو اس کو دام پر جھاپا مارا جہاں سپلائی کا مال رکھا گیا تھا لیکن ان کے وہاں پہنچنے سے قبل نشیات غائب ہو چکی تھیں۔ چودھری

میرے گھر والوں تک پہنچائے گا۔ اس کے بعد میں اسے وہ پتا بتاؤں گی جہاں میں نے ہیرے چھپا رکھے ہیں (کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ہیرے میرے ہیز کلب میں موجود تھے) چنانچہ میں نے میک اپ کے ذریعے خود کو بدلا اور لاہور سے کراچی جانے والی سپرا ایکسپریس میں سوار ہو گئی۔ مگر خرابی قسمت کہ نہ صرف ماکھا اینڈ بکٹنی وہاں میرے پیچھے لگ گئی بلکہ انہوں نے مجھے اس بہروپ میں پہچان لیا۔ ادھر گاڑی میں وہ آدمی تو مجھے نہ ملا البتہ تم مل گئے۔ میں نے ہیروں کو محفوظ کرنے کی خاطر انہیں تمہیں تھمایا اور خود وہاں سے نکل گئی۔ پھر اس کے بعد میں تم سے شاہ مراد کے مزار پر ملی لیکن جب تم نے بتایا کہ تم چودھری شمشت علی کے بیٹے ہو تو میں خوفزدہ ہو گئی اور وہاں سے بھاگ نکلی۔ ساری رات میں پریشان ہوتی رہی کہ میں نے اتنی بڑی غلطی کیوں کر دی کہ وہ ہیرے چودھری شمشت علی کے بیٹے کے سپرد ہی کر دیے لیکن پھر سوچا کہ تم کون سا اس معاملے سے واقف ہو لہذا اگلے دن میں پرانے رہٹ کی طرف روانہ ہوئی لیکن راستے میں ہی ماٹھے کے آدمیوں نے مجھے دیکھ لیا۔ میں پھر سے جان بچانے کے لیے بھاگی لیکن اس بار سمت نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ ان کی چلائی ہوئی ایک گولی میرے بازو میں لگی اور میں پکڑی گئی۔ باقی کے حالات تم جانتے ہو اور اب یہاں ہوں تمہارے سامنے۔“

اس نے بات ختم کر کے گہری گہری سانس لیتا شروع کر دیں۔ میں بالکل خاموش بیٹھا اس کی کہانی سن رہا۔ اس دوران کھڑکی سے آنے والی دھوپ پھیلنے لگی تھی۔ اس نے تمام کہانی اس انداز سے سنائی تھی کہ مجھے مزید سوالات کی ضرورت پیش نہیں آئی البتہ ایک اہم بات میں نے ضرور پوچھی۔

”تم نے بگ باس سے متعلق کہا ہے کہ تم اسے جانتی تھیں۔ کون تھا وہ؟“

”تھا نہیں وہ اب بھی ہے۔ بے شک منشیات کا معاملہ تو ختم ہو گیا ہے لیکن وہ ابھی تک یہیں موجود ضرور ہے۔ میں اس کا نام تو بتا سکتی ہوں مگر شاید تم یقین نہ کرو۔“

”اس بات کی فکر نہ کرو کہ میں کس بات پر یقین کروں اور کس بات پر نہیں۔ تم مجھے اس کا نام بتاؤ۔ میں ہر طرح کا انکشاف سہہ سکا ہوں۔“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ وہ کچھ دیر خاموش بیٹھی رہی پھر ایک دم سر اٹھا کر اس نے میری طرف دیکھا اور بولی۔

”اس کا نام نواب شبیر احمد ہے۔“ میں نے جو

انکشاف سہنے کا دعویٰ کیا تھا، وہ مجھے ٹوٹا ہوا محسوس ہوا۔ ایک جھٹکا سا میرے سارے بدن کو ہلا کر رکھ گیا۔ وہ جو نام لے رہی تھی اس کا میرے وہم و گمان میں بھی گزر نہ تھا۔

”تم سچ کہہ رہی ہو؟“

”ہاں۔ سچ یہ ہے کہ ایک عرصے تک مجھے خود بھی اس بارے میں علم نہیں تھا۔ وہ تو جب ہمارے نیٹ ورک کا شیرازہ بکھرا تب نواب نے مجھ سے رابطہ کر کے آخری سلائی کے ہیرے مانگے۔ تب مجھے نواب شبیر احمد کی اصلیت معلوم ہوئی۔“

”نواب صاحب ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ تو.....“

وہ تو.....“ میرے الفاظ ختم ہو رہے تھے کیونکہ میں بچپن سے انہیں جانتا تھا۔ وہ جدی پشتی خاندانی نواب تھے جن کے لیے ان کی انا اور عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ انہوں نے انگریزوں کی غلامی قبول کرنے کے بجائے اپنی ساری زمین اور نوابی چھوڑ دی تھی۔ ایسا شخص جس کے لیے عزت سے بڑھ کر کچھ نہ ہو، وہ ایسا کیوں کرے گا...؟ میں سوچ میں پڑ گیا۔

میں اس سے مزید سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن وہ ٹھک چکی تھی۔ خود میرا دماغ بھی گھن چکر بن چکا تھا۔ میں اسے آرام کا مشورہ دیتے ہوئے باہر صحن میں نکل آیا۔ کھلے میں آ کر میں خود کو سنبھالنے لگا۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ ہم ابھی تک بخت نگر کے اس چھوٹے سے گھر میں ہی تھے، جواد نے مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ گھر سے باہر نہ نکلوں اور میں نے اس ہدایت پر عمل بھی کیا تھا لیکن مجھے آشتی کے زخموں کی فکری میری فرسٹ ایڈ نے اسے وقتی طور پر تو تھوکتی دی تھی لیکن مکمل علاج ایک کوالیفائیڈ ڈاکٹر ہی کر سکتا تھا چنانچہ تین چار دن پہلے میں نے جواد کے ذریعے ہی ایک ڈاکٹر کو بلوایا تھا جس نے آشتی کے بازو پر لگے زخم کو ٹانگوں کی مدد سے سی دیا تھا اور اس کی تجویز کردہ ادویات سے وہ تیزی سے صحت یاب ہو رہی تھی۔ جواد مجھے ہر طرح سے اپ ڈیٹ کر رہا تھا جس سے مجھے صورت حال کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ڈیرے میں ہونے والے ہنگامے اور قاتلانہ کونا معلوم ڈاکٹروں کے کھاتے میں ڈلوادیا گیا تھا۔ البتہ میری اور آشتی کی تلاش جاری تھی۔

”میں معاملے کی تیک پہنچ گیا ہوں جودی۔ یہ سب کچھ کیا دھرا اس نواب کے بچے کا ہے۔ مجھے ابھی سے مل کر انہیں سب کچھ بتانا ہوگا۔“ میں نے جواد سے کہا۔

”اور تمہیں لگتا ہے کہ ماما جی تمہاری بات پر یقین

کر لیں گے؟ تم اس وقت ان کے لیے سب سے زیادہ بے اعتبار بندے ہو کا می۔ پہلے تم نے ماہی سے رشتہ توڑا۔ پھر ماہی کے دھلائی کر دی۔ اور پھر ان کی قید سے آشتی کو لے بھاگے۔ ان کے بندے زخمی ہو گئے اور تم کہتے ہو کہ تم انہیں بتاؤ گے تو وہ تمہاری بات کا یقین کر لیں گے۔؟“

”تو کیا کروں۔ اب کیا باقی کی عمر میں اس گھر میں چھپ کر گزاروں؟“ میں نے پتھلا کر کہا تو وہ کچھ سوچ کر بولا۔
”تمہیں بھائی شفیق سے بات کرنی چاہیے بلکہ ٹھہر دو تم نہیں، میں ان سے بات کروں گا۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے تو ہی بات کر لے۔ میری بات کا تو وہ بھی یقین نہیں کریں گے۔“ میں نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔

”میں اپنی جان بچانے کا شکریہ ادا کروں یا اس بات کی معافی مانگوں کہ میری وجہ سے تم ایسے حالات میں ٹھہر گئے ہو۔“ آشتی اٹھ کر باہر صحن میں ہی آ جھٹی تھی۔

”شکریہ ادا کر سکتی ہو لیکن ایک کپ چائے بنانے کے بعد۔۔۔ اور معافی مجھے دتوں کے لیے سنبھال لیتے ہیں۔“ وہ چائے بنا کر لے آئی۔ اس نے صغراں کا پرانا لیکن صاف لباس پہن رکھا تھا جو اسے کافی ڈھیلا تھا۔ سفید دھوپے کو گلے میں اوڑھ کر بالوں کو جوڑے میں باندھا ہوا تھا۔ پیشانی کا زخم ہلال کی شکل میں موجود تھا۔ لیکن یہ نشان اس کی خوبصورتی میں رکاوٹ نہیں تھا۔ چہرے کی زردی میں اب سرخی دوڑنے لگی تھی۔ کانچ جیسی آنکھوں کا سحر پھر سے عود کر آیا تھا۔

”غرض کرو تمہیں ہیرے مل جاتے ہیں۔ پھر اس کے بعد کیا کرو گی؟“

”مجھے ان ہیروں کا لالچ اپنے لیے نہیں ہے، میں ان کے ذریعے اپنی مار اور بہنوں کو معاشرے سے تحفظ دلوانا چاہتی ہوں، وہ تحفظ جو آج کل صرف پیسے والوں کو نصیب ہوتا ہے۔ بس ایک بار انہیں محفوظ کر جاؤں۔۔۔ پھر اپنے بارے میں سوچوں گی۔ میرے لیے تو زندگی کے سارے معانی ہی بدل چکے ہیں۔ میں ایک ایسی قیدی چڑیا بن گئی ہوں جس کا بچہ ہلاک ہو گیا۔ خواہش پرواز بھی ہے لیکن یہ بھی چاہتی ہوں کہ باہر ہوا میں کسی شکرے اور عقاب گھات لگائے بیٹھے ہیں۔ فیصلہ تو بس یہ کرنا ہے کہ ہجر کے کی سلاخوں میں دم توڑا جائے یا باہر کھلی ہوا میں۔“

”دنیا میں کوئی بھی انسان اتنی جلدی نہیں مرتا جتنی جلدی مایوس انسان مرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مایوس نہ

ہو کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ تم زندہ رہو۔“
”بہت کم لوگ ہیں جنہیں میری زندگی کی پروا ہے۔ لیکن میں یہ نہیں جانتی کہ تمہیں میرے زندہ رہنے سے کچھ کیوں ہے؟“

”شاید اس لیے کہ میں نے ابھی تمہاری امانت لوٹانی ہے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ ”اور اس کے علاوہ بھی ایک اور بات ہے۔“ وہ سوالیہ انداز میں میری جانب دیکھتی رہی۔
”تمہیں بچانے میں کچھ میرا اپنا مدد بھی تھا۔“
”کیا مطلب۔؟“ وہ حیران ہوئی۔

”کچھ سوالوں کے جواب ان سوالوں میں ہی پوشیدہ ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا لیکن اسی لمحے دروازے پر دنگ ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو وہاں شوکا اور صغراں تھے۔ صغراں آشتی کو لے کر اندر چلی گئی جبکہ میں اور شوکا صحن میں لگے لیکر تلے بیٹھ کر باتیں کرتے رہے۔ میں اس سے حالات کی نوعیت کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ دونوں عشا کے وقت وہاں چلے گئے۔

رات کے بارہ بجے والے تھے۔ آشتی کے سو جانے کے بعد میں صحن میں سگریٹ سلگانے کے لیے نکل آیا، جب مجھے علم نہیں تھا کہ صحن میں نکل آنا میرے لیے کتنا مفید ہوگا۔ دھب کی پہلی آواز پر میں چوکا۔ یقیناً کوئی دیوار پر سے کود کر اندر آیا تھا۔ میں چونک کر اندھیرے میں درخت سے ٹک لگا لگا کھڑا تھا اس لیے نظروں سے محفوظ تھا۔ انگلیوں میں دبے سگریٹ کو میں نے مٹی میں دب کر بھجا دیا۔ مجھ سے بائیں طرف چند گز کے فاصلے پر حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک ٹیکس دو آ دی تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک آ دی زمین پر ریٹکنا ہوا باہری دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ دروازہ کھول کر باہر موجود اپنے ساتھیوں کو اندر لانا چاہتا تھا۔ میری گن اندر ہی پڑی تھی لیکن میں خالی ہاتھ بھی انہیں سنبھال سکتا تھا لہذا خاموشی سے ان کی حرکت دیکھتا رہا۔ دروازے کی طرف رینگنے والا میری پہنچ میں آ چکا تھا۔ اب مجھے بھی ایکشن میں آ جانا چاہیے۔ سوچتے ہی میں اس پر کود پڑا۔ اس کے سر کے لیے بالوں کو گرفت میں لے کر میں نے درخت کی اوٹ میں اسے چھپا لیا اور یہ میرے لیے بہتر ثابت ہوا کیونکہ اس کے چپٹے ہی دوسرے سائے نے عین اسی جگہ پر اٹھل کا برسٹ مارا جہاں میں اس پر چھپنا تھا۔ میرا شکار نہتا تھا۔ میں نے اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کا سر کیکر کے کمر دورے اور سخت تنے سے اس زور سے ٹکرایا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔ گولیوں کی آواز سنانے میں دور تک مٹی

سائنس سٹی کی سی آواز نکالنا ہوا دوبارہ بحال ہو گیا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اس کا خون آلود جسم خود پر سے ہٹایا۔ کیونکہ میرے کان قدموں کی چاپ سن رہے تھے جو میری طرف ہی آرہے تھے۔ چھپا ہوا۔۔۔ آدی یقیناً مجھے ہٹ کرنے کے بعد یہ دیکھنے کے لیے آ رہا تھا کہ میں مر چکا ہوں یا نہیں۔ جیسے ہی وہ میرے قریب پہنچا، میں نے خود کو زوردار جھٹکے سے اٹھایا۔ پیرسہ پاکی لاش پر آواز کرتی ہوئی اس راکٹل برادر سے جا ٹکرائی۔ وہ دم سے زمین پر گر گیا۔ میں بھاگ کر اس کی طرف آیا اور جولات میں نے اس کی کپٹی پر ماری، اس میں میری ساری جھنجھلاہٹ اور نفرت شامل تھی۔ وہ ڈر کر ساست ہو گیا۔ اس کی گن اٹھا کر میں کمروں کی طرف بھاگا لیکن یہاں آتشیں اپنا کام دکھا چکی تھی۔ ایک آدی دلہیز پر ہی خون کے تالاب میں اوندھا لیٹا تھا جبکہ دو بندے آتشیں والے کمرے کے فرش پر خاک خائے ہوئے نظر آرہے تھے۔

”یہ دونوں کہاں سے آگئے؟“ میں نے پوچھا۔
”اس طرف کی کمزری توڑ کر۔“ میں فائرنگ کی آواز سے جاگی تو دیکھا دو مسلح آدی اندر داخل ہو چکے تھے لیکن انہوں نے مجھے گولیاں مارنے کے بجائے ساتھ چلنے کو کہا۔ اسی لمحے کوئی باہر سے بھاگتا ہوا اندر داخل ہونے لگا تو انہوں نے اس پر فائر کر دیا۔ میں سمجھی تم ہٹ ہو گئے ہو۔ یہ دونوں اس ضرور تھے لیکن بالکل ہی بودے نکلے۔ میری ایک ایک کلک کھا کر ہی بے ہوش ہو گئے۔ باہر تو بہت فائرنگ ہو رہی تھی۔ تم ٹھیک تو ہو؟“ وہ جلدی جلدی تفصیل بتاتے ہوئے میرا حال پوچھنے لگی۔

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔
”میں بہت زیادہ گھائل ہو چکا ہوں۔“
”اوہ۔۔۔ کیا ہوا؟ کوئی گولی تو نہیں لگ گئی؟“ اس کی نظریں مجھے ٹٹول رہی تھیں۔ اس کی میرے لیے پریشانی مجھے اچھی لگی۔

”ضروری تو نہیں کہ بندہ گولی سے ہی زخمی ہو۔“ میں نے شرارت سے کہا۔ وہ پہلے کچھ حیرانی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر منہ بنا کر بولی۔

”یہ مذاق کا کون سا وقت ہے؟“
”مذاق اور موت کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا۔

وہ دلہیز پر گرے آدی کو سیدھا کرتے ہوئے بولی۔
”یہ نواب شیر احمد کے ہی گرے ہیں۔“

تھی اور باہر موجود ان کے ساتھی بھی ایکشن میں آگئے۔ گھر کا باہری دروازہ اور کھڑکیاں زور زور سے بجنے لگیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ کمزور رکاوٹیں جلد ہی ٹوٹ جائیں گی مگر ابھی میری توجہ کا مرکز وہ دوسرا آدی تھا جس نے فائر کیا تھا۔ میں درخت کے اوپر چڑھ آیا اور تیزی سے ہوا میں پرواز کرتا ہوا ٹھیک اس دوسرے آدی کے اوپر جا کر۔ اس نے گھبرا کر پھر فائر کیا لیکن گولیاں بچی دیوار میں لگیں۔ میں نے اس کی گردن عقب سے جکڑ لی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ بھی بے ہوش ہو کر لہا لپٹ چکا تھا۔ اس کی گن میرے قبضے میں آگئی اور یہی وہ لمحہ تھا جب پہلے اندر سے آتش کی چیخ سنائی دی اور پھر باہری دروازہ ٹوٹ گیا۔ میں جو بھاگ کر اندر جانے والا تھا وہیں رک کر رہ گیا۔

کھلے دروازے سے تین چار آدی بھاگتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔ میں نے گن کو نیم دائرے میں گھماتے ہوئے دو برست مارے لیکن یہ خیال رکھا کہ گولیاں ان کی ٹانگوں کو ہی نشانہ بنائیں۔ دو بندے شکار ہو گئے اور باقی دو جان بچانے کے لیے دائیں بائیں بھاگے۔ مجھے آتش کی فکر تھی لیکن میں اب یہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ میں وقفے وقفے سے فائر کرتا رہا لیکن وہ کم بخت بالکل محفوظ پوزیشن میں تھا پھر ایک دو بار پھلانگ کر ایک آدی عین میرے اوپر آن گرا تو گن بھی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ آنے والا عقب سے مجھ سے لپٹ چکا تھا۔ اس نے میری گردن اپنے بازو کے کٹھے میں جکڑ لی اور اس کی ٹانگوں نے کر اس کی صورت میں کمر کو جکڑ لیا تھا، میرا سانس رکنے لگا۔ میں نے ہونٹ سمجھ کر اسے پھلی دیوار سے ٹکرایا۔ میں نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر کو پکڑنا چاہا لیکن میری ختم ہوئی قوت مدافعت کی وجہ سے میرے بازو ہوا میں بلند نہ ہو سکے۔ میری سانس تقریباً بند ہو چکی تھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ بالکل آخری لمحات میں جب مجھے اپنی موت کا یقین ہونے لگا بھی میں نے آخری رسک لینے کا فیصلہ کیا اور پھر اپنی بچی چھٹی ہمت مجتمع کر کے اٹھا اور مٹی کے اس ڈبیر کے عقب سے نکل کر صحن میں آ گیا۔ اس دوران یہ خیال رکھا کہ میرا چہرہ دیوار کی طرف ہی رہے۔ اس طرح میری پشت سے چھتاوہ آدی چھپے ہوئے شخص کے نشانے پر آ گیا۔ میری توقع کے عین مطابق اس طرف سے فائر ہوا اور مجھ سے جیسے تیسرے ہاتھ کے جسم میں اترتا چلا گیا۔ اس کو لگنے والے جھٹکے سے میں منہ کے بل گر گیا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ میرا کارہوا

”لیکن انہوں نے مجھے مارنے کی کوشش کیوں کی؟ کیا چودھری شمش علی نے اپنے بیٹے کے ڈسٹھ وارنٹ جاری کر دیے ہیں؟“ میں بڑبڑایا۔ چند لمحوں بعد ہی ہم اس گھر کو چھوڑ چکے تھے۔

☆☆☆

”یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔“ وہ ہلکتے خوردہ لہجے میں بولی تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ بلب کی زرد روشنی میں وہ بہت مایوس نظر آرہی تھی۔ کچھ دیر قبل جب ہم اس گھر سے انفراتقری میں نکلے تھے، تب پہلے میرا ارادہ شوکے کی طرف جانے کا ہی تھا لیکن آشتی نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے ہم پر حملہ کیا ہے، وہ شوکے سے واقف نہ ہوں۔ کیونکہ اس گھر کے بارے میں یا تو جواد کو پتا تھا یا پھر شوکے کو۔ میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا۔ ”ہمیں یہاں سے کچھ اور دور جانا ہوگا۔ قادر پور میں ہمیں پناہ مل سکتی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”وہاں کون ہوگا؟“

”حق نواز چاچا۔“ وہ نواب کے لیے کام ضرور کرتا ہے لیکن مجھے اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتا ہے۔ وہ اور اس کی بیوی ایک چھوٹے سے گھر میں اکیلے رہتے ہیں۔“ میرے پاس اس کی بات ماننے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم چار پانچ کلومیٹر پیدل چلنے کے بعد قادر پور میں ایسی جگہ پہنچے جہاں چند کمروں کے علاوہ دو درویشکھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ آشتی نے ایک پرانا لکڑی کا دروازہ بجائے کا تکلف کیا۔ تکلف اس لیے کہ بند دروازے کے اندر لگی کنڈی اتنی ڈھیلی تھی کہ میں دروازے کی درز میں ہاتھ ڈال کر اسے۔۔۔ بہ آسانی کھول سکتا تھا۔ آشتی کو دیکھ کر ادھر عرق نواز حیران رہ گیا اور جلدی جلدی پوچھنے لگا۔

”پتر! تو کہاں غائب ہوئی تھی اور اس وقت کہاں سے آرہی ہے؟ اور یہ پتی؟ تو ٹھیک تو ہے تاو یہ تیرے ساتھ کون ہے؟“

”تیری تو مت ای ماری گئی ہے نواز۔ اسے بیٹہ کر ساء تو لینے دے۔“ حق نواز کی شفیق چہرے والی بیوی آشتی کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئی۔ ہم بھی اس کے پیچھے اندر آ گئے۔ آشتی نے مختصر الفاظ میں حق نواز کو ساری باتیں بتلائیں۔

”اوہ تو یہ چودھری شمش کا پتر کا مران ہے جو ولایت پڑھنے گیا تھا۔“ وہ میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا اور پھر چونک گیا۔

”او پتر! یہ تیری فیض تو بولہاں ہو رہی ہے۔ کہیں

کوئی گولی تو نہیں لگ گئی؟“

”نہیں چاچا! گولی نہیں لگی۔ بس چھوٹی موٹی چوٹیں ہیں۔“ پر میرے اٹکار کے باوجود اس نے میری قمیض اترا کر جسم کو نپول کر دیکھا۔

”ہاجرہ! تو پانی گرم کر کے لے آ۔ چھوٹے چودھری جی! اتنی بھی چھوٹی چوٹیں نہیں ہیں۔“ میں خاموش رہا۔ دونوں نے زبردستی ہمیں کھلایا پلایا۔ میری گردن پھوڑے کے مانند دکھ رہی تھی۔ آشتی اور ہاجرہ ایک دوسرے کمرے میں چلی گئیں جبکہ حق نواز نے میرے لیے پیٹھک میں بستر لگا دیا۔ وہ اب میرے ساتھ بالکل کسی ملازم کی طرح پیش آ رہا تھا۔ میں سنگریٹ سلاک کر اس سوچ میں غرق تھا کہ جن لوگوں نے مجھ پر حملہ کیا انہیں یقیناً معلوم تھا کہ میں چودھری شمش علی کا بیٹا ہوں لیکن پھر بھی انہوں نے مجھے قتل کرنے کی پوری کوشش کی۔ اسی دوران ہلکی سی آواز کے ساتھ پیٹھک کا دروازہ کھلا اور آشتی اندر داخل ہوئی۔

”مجھے لگتا ہے تم درد کی وجہ سے سو نہیں پا رہے۔“ وہ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”تم بھی تو جاگ رہی ہو جبکہ تمہیں تو اب زیادہ درد بھی نہیں ہے۔“

”جسمانی تکلیف سے زیادہ ذہنی تکلیف ہے پھر نیند کیسے آئے گی۔ میں حیران ہوں کہ وہ لوگ نواب کے آڈی تھے لیکن انہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ تم چودھری شمش علی کے بیٹے ہو۔ اس کے باوجود انہوں نے تمہیں مارنے کی کوشش کیوں کی؟“

”میں ان کے ڈیرے میں ٹھس کر ان کے آدھ درجن آدمیوں کو زخمی کر کے تمہیں بچالایا ہوں۔ کیا اس کے بعد وہ مجھ پر پھولوں کی پتیان پھراور کریں گے؟“

”یہ سب میری وجہ سے ہو رہا ہے۔“ وہ ہلکتے خوردہ لہجے میں بولی۔ میں سنگریٹ کا دھواں اٹھاتا رہا۔

ایک نکت اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔ میں نے پہلی بار اسے بے خوف ہو کر غنڈوں کی دھلائی کرتے دیکھا تھا۔ وہ بڑے بڑا رانداڑ میں چلتی ٹرین کے دروازے سے چھت پر چڑھ گئی تھی پھر مزار پر بھی وہ اپنے دشمنوں کو جمل دینے میں کامیاب رہی تھی۔ بعد میں، میں نے اسے زخموں سے چور دیکھا اور آج میں پہلی بار اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ وہ جتنی بھی بہادر اور مضبوط نظر آنے کی کوشش کرے، اندر سے وہ ایک حساس اور نازک سی لڑکی

عین اسی وقت جو ادکی نظر بھی مجھ پر پڑ گئی۔ وہ تیر کی طرح میری جانب آیا اور میرا بازو پکڑ کر ایک جانب لے گیا۔
”تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمہیں پتا ہے کہ تمہیں تلاش کیا جا رہا ہے؟“

”پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ شو کے گھر پر حملہ نواب کے آدمیوں نے ہی کیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ایک توقف کے بعد وہ بولا۔ ”مجھے اس مسئلے کا پیشگی پتا نہیں تھا اس لیے اطلاع نہیں کر سکا۔ لیکن تم نے اچھا کیا جو آشتی کی بات مان کر حق نواز کے گھر چلے گئے۔“
”تم کیسے جانتے ہو کہ میں حق نواز کے گھر میں ٹھہرا ہوا ہوں۔“ میں چونک گیا۔

”تم مجھے ہو کہ ان حالات میں، میں نے تمہیں اکیلا چھوڑ دیا ہے؟ میں اگر تمہاری محل کر مدد نہیں کر سکتا تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ میں نے تمہارے لیے آنکھیں بند کر لی ہیں۔ شو کے گھر پر حملہ ہونے کے بعد تو میں اور بھی چوکنے لگا ہوں۔“

”تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں نے مجھے جان سے مارنے کی کوشش کی تھی؟ کیا چودھری حشمت علی کو اس بات کا علم ہے کہ ان کے دیرینہ دوست نے ان کے بیٹے کو مارنے کے لیے یہ حملہ کروایا تھا؟“ میں نے پوچھا۔

”ماما جی کو اس بات کا علم نہیں ہے۔ یہ سب نواب شبیر احمد اپنے طور پر کر رہا ہے اور تمہارے تعلقات تو پہلے ہی ماما جی سے اچھے نہیں ہیں اس لیے تم انہیں نواب کی اصلیت بتاؤ گے بھی تو وہ یقین نہیں کریں گے۔“

”وہاں دو بندے قتل ہو گئے ہیں اور کم از کم پانچ زخمی اور تم کہہ رہے ہو کہ میں خاموش رہوں۔ میں یہ سب کرنا نہیں چاہتا جو دی! قلم اٹھانے والی انگلیاں شریک نہیں دباتیں لیکن مجھے اسی طرح مجبور کیا جا تا رہا تو آگے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”دیکھ..... تو واپس جا۔ آشتی کے پاس رک۔ میں ہوں نا ادھر۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ مجھے بس نواب کے بارے میں چند جوت اکٹھے کر لینے دے بھائی پھر میں تجھے نہیں روکوں گا۔“ وہ کچھ دیر مجھے سمجھا تا رہا۔ اسی لمحے ایک ویٹیر کی طرف آیا۔

”کامران صاحب! آپ کو چودھری صاحب بلارہے ہیں۔“ ہم دونوں نے چونک کر دیکھا۔ اما جی اپنے چند مہالوں کے ساتھ کھڑے ہماری طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ ہاتھوں میں سنہری مشروب کے گلاس تھے۔ میں ان

ہی ہے۔ میں نے اس کی کلائیاں تھام کر ہاتھوں کو چہرے سے اٹھالیا۔ آنسوؤں سے تیز تر چہرے پر بے بسی پھیلی ہوئی تھی۔ انسان اس وقت روتا ہے جب وہ ہر معاملے میں بے بس ہو جاتا ہے۔ مجھے لگا وہ ہمت ہار رہی تھی۔

”تم کیوں روتی ہو آشتی۔ یہ دیکھو ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ کہیں رات کے اندھیرے میں تمہاری ماں تمہارے لیے دعا کر رہی ہوگی۔ تمہاری بہنیں ہل ہل تمہاری حفاظت کے لیے ہاتھ اٹھائے بیٹھی ہوں گی اور پھر میں بھی تو ہوں۔ بے شک میں تمہارا کوئی نہیں ہوں لیکن جب تک ہوں، تم پر کوئی آج نہیں آنے دوں گا۔ میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ تمہیں بچانے میں میرا اپنا مفاد بھی پنہاں تھا۔ پھر کیوں تم نہیں سمجھتی کہ اس فقرے کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔ کیوں تم محسوس نہیں کر رہی ہو کہ میں تم سے محبت کرنے لگا ہوں۔“

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ ”تم.....؟“ اس کے لب ہتھرا کر رہ گئے۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تم نہ تو اکیلی ہو اور نہ ہی کمزور۔ میں جانتا ہوں کہ تم کتنے مضبوط اعصاب کی مالک ہو اور اب تو میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ اس لیے مایوس ہونا چھوڑ دو۔ تم دیکھنا بہت جلد یہ ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ اس کے بعد جو زندگی شروع ہوگی وہاں محبت کی بھاریس ہوں گی۔ اتنی شدید محبت کہ تمہیں یہ دن بھی یاد بھی نہیں آئیں گے۔“ میں نے اسے اپنے قریب کیا تو اس نے اپنا سر میرے شانے پر ٹکا دیا۔ اسی لمحے میرے موہاں پر پیپ ہونے لگی۔ یہ ایک ریمائنڈ تھا۔
”چوبیس تاریخ، فارم ہاؤس پارٹی، کہانی کا آخری ٹکڑا۔“

☆☆☆

گیٹ سے اندر دوڑ کر پھیلی روش پر اس وقت ”بی ایم ڈبلیو“ سے لے کر ”آڈ ڈی“ تک اور ”لینڈ کروزر“ سے لے کر ”لیکسر“ تک ہر طرح کی مہنگی گاڑی موجود تھی۔ فارم ہاؤس کا وسیع و عریض میدان اس وقت روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ ڈنرسٹ میں لمبوس کئی افراد گھاس پر ٹولیوں کی صورت میں موجود تھے۔ سامنے ایچ بنایا گیا تھا اور وہاں ملک کے نامور غزل خواں اپنی آواز کے مرکب کھیر رہے تھے۔ ایک کونے میں باریبی کیڈ کا سیٹ اپ لگا ہوا تھا۔ ہرن بھونے جا رہے تھے۔ بکروں کی بھی تیار ہو رہی تھی اور ساتھ نکلے اور کباب بنائے جا رہے تھے۔ سفید لباس اور سرخ کپڑیاں پہنے ویٹرز، ترش اور شیریں مشروبات کے ساتھ کبابوں کے قہال اٹھائے گھوم رہے تھے۔ بھی مجھے جو اد نظر آ گیا اور

سب سے واقف تھا۔ ”یہ میرا سب سے چھوٹا پتر ہے، چودھری کا مران۔

لندن سے کرمانا لوجی کی ڈگری لے کر آیا ہے۔ بڑا جوش ہے اس کے خون میں۔ کہتا ہے اس نظام کو بدل دوں گا جو کئی

دروہوں (عرصے) سے اس ملک پر قائم ہے۔“ وہ مہمانوں سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

”جب ہم نے سروس جوائن کی تھی تو ہمارا خون بھی گرم تھا۔ پہاڑوں سے سرنگرانے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے لیکن جب سرنگرا یا تو لہو لہان ہو گئے۔ آج اسی پہاڑ کے

سامنے سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔“ تنہا خر سے بتلاتے ہوئے امجد صدیقی ڈپٹی انٹارنی جہل تھے۔

”آپ سب جو مرضی کہہ لیں قریبی صاحب۔ پر یہ میرا پتر وہی کرتا ہے جو اس کا دل کہتا ہے۔ کسی کی نہیں

ستارا ہم نے بھی اسے کھلی چھوٹ دے رکھی ہے کہ جا..... ”میں نے کہا تھا کہ اگر

صحافی ہی بنتا ہے تو لندن جا کے پڑھنے کی کیا ضرورت تھی اور پھر بجائے نوکری کرنے کے اپنا اخبار نکال لے یا اپنا پی وی

چینل کھول لے مگر یہ کسی کی نہیں ستارا۔“ میں ان کے الفاظوں میں چھاپڑ صاف محسوس کر رہا تھا۔

”چودھری صاحب ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تمہاری رپورٹس میں پڑھتا رہتا ہوں۔ خاص کر وہ رپورٹس جن میں تم

بڑے بڑے لوگوں کو اسکیٹلڈ لازڈ کرتے ہو۔ بالکل کسی بلیک میٹر کی طرح۔“ امجد صدیقی نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”معاف کیجیے گا سر! اسکیٹلڈ لازڈ کرنے اور جگہ کا پردہ چاک کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔“ میری بات سن کر وہ

سب ایک دم چپ سے ہو گئے۔ ”تم جس روز نامہ میں کام کرتے ہو، تمہاری جگہ پہلے

ایک پولیٹیکل انویسٹی گیٹر تھا..... کیا نام تھا اس کا؟“ وہ ہاتھے پر انگلی پھیرتے ہوئے کچھ سوچنے لگا۔

”سلیمان رحمانی۔“ میں نے ان کی مشکل حل کر دی۔ ”ہاں سلیمان۔ بہت اچھا صحافی ہے لیکن ہے کہاں،

آج کل نظر نہیں آ رہا؟“ ”وہ اسپورٹس میگزین کے ایڈیٹر بن گئے ہیں۔“ میں

نے کہا۔ ”وہ اسپورٹس۔ خوب، بہت خوب۔ تو تم کہاں جاؤ گے؟ میرا مطلب ہے ایسا ہی ہوتا ہے نا۔ جب کوئی بہت

زیادہ خطرناک رپورٹنگ کرنے لگتا ہے تو فیشن یا پھر اسپورٹس میگزین میں بھیج دیا جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”وہ اسپورٹس۔ خوب، بہت خوب۔ تو تم کہاں جاؤ گے؟ میرا مطلب ہے ایسا ہی ہوتا ہے نا۔ جب کوئی بہت

زیادہ خطرناک رپورٹنگ کرنے لگتا ہے تو فیشن یا پھر اسپورٹس میگزین میں بھیج دیا جاتا ہے۔“

”یہی تو مسئلہ ہے اس ملک کا۔ کوئی اچھا کام کرنے کی ٹھان لے تو ساری سرکار اس کے پیچھے پنجے جما کر پڑ جاتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہم اس طرح کی صحافت کو بلیک میٹنگ کہتے ہیں۔“ ممتاز ہاشمی صاحب نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”کہتے کو تو ہم بھی کر پٹ افسران کو“ غدار وطن“ کہہ سکتے ہیں۔“ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ہاشمی کا چہرہ ایک دم

سرخ ہو گیا۔ وہ کچھ بولنے ہی لگا تھا کہ سلیم قریبی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا۔ وہ منہ موڑ کر مشروب پینے لگا۔ اس ساری

بات چیت کے دوران ابابئی بالکل خاموش کھڑے تھے۔ انہوں نے ماحول خراب ہونے دیکھا تو فوراً قہقہہ لگایا۔

”میں نے کہا تھا نا۔ یہ میرا باغی پتر ہے۔“ ”کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم نے ہر اس شخص کو

باغی کہنا شروع کر دیا ہے جو کسی حسین جھوٹ کا پردہ چاک کر کے اس کے گندے بچ کو بے نقاب کرنے کی ہمت کرتا

ہے یا پھر اس کرپشن آلود سسٹم کا حصہ بننے سے انکاری ہو جاتا ہے۔ جو بھی یہاں رشوت، ذخیرہ اندوزی، قبضہ مافیا

اور غلط بات کے خلاف آواز اٹھانے کی ہمت کرتا ہے، ہم اسے باغی کہہ رہے ہیں اور مجھے اس سے کوئی فرق نہیں

پڑتا۔“ میں نے کہا۔ ”تو تمہیں لگتا ہے کہ تم اس ملک میں انقلاب لاسکتے

ہو؟“ طنزیہ آواز میں پوچھا گیا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ میں کرپشن کے خلاف آواز اٹھاؤں

گا تو لوگ میرا ساتھ دیں گے۔ آپ اسے انقلاب کہہ لیں یا بارش کا پہلا قطرہ۔“

”تمہاری ہر بات مفروضے سے شروع ہو کر مفروضے پر ختم ہو رہی ہے بگ بین۔“

”میں کسی مجوزے کی امید نہیں رکھتا لیکن یہ یقین ضرور رکھتا ہوں کہ اپنے حصے کا حق ادا کر کے بہت کچھ بدلا جاسکتا

ہے۔ میرا کام کسی کو سزا دلوانا نہیں۔ صرف غلط کام کرنے والوں کو عوام کے سامنے لانا ہے اور اس بات کا فیصلہ اگر اس

ملک کے یہ طاقتور لوگ نہیں کریں گے تو فیصلہ عوام کے ہاتھ میں آ جائے گا کیونکہ انقلاب کی پہلی نشانی یہی ہے کہ عوام کو

اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا اندازہ ہونے لگے۔“ میں نے سر دلچسپی میں کہا اور وہاں سے ہٹ گیا اور حویلی کی

طرف چلا آیا۔ خانوں میں جانے کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ سارے ملازم تو فارم ہاؤس میں مصروف تھے۔ میں بتیاں

بہترین تحریریں، لا جواب روداد اور
اعلیٰ داستاںیں پڑھنے والوں کے لیے
سرگزشت کا مطالعہ ضروری ہے

سرگزشت
ماہنامہ کراچی

شمارہ ستمبر 2017ء

کی جھلکیاں

مثنوی

اس شاعر کا زندگی نامہ
جس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا

روایت شکن

ان لوگوں کا تذکرہ جنہوں نے
علم کی شمع روشن کی

لیڈی کلر

اس اداکار کی حالاتِ زندگی
جوڑکیوں کا پسندیدہ بحث

پرائی کوکھ

ایسے قے مشرق میں رونما نہیں ہوتے ہیں

ان کے علاوہ

بھی بہت سی سچ بیانی، نا فاضل
فراموش واقعات، سچے قے

اور بھی بہت کچھ جسے آپ کو پڑھنا چاہیے
آپ پڑھنا چاہتے ہیں۔

جلا کر سیدھا ہال کے آخری حصے میں پہنچا۔ کہانی واقعی مکمل
ہو چکی تھی۔ نایاب اسٹوپے کا آخری حصہ نیشنل میوزیم سے
یہاں پہنچ چکا تھا۔ اب یہ آرٹ کا ایسا شاہکار بن چکا تھا جس کا
کوئی ثانی نہیں تھا لیکن جو بات اس خوبصورت ترین آرٹ
میں غامی کا باعث بن رہی تھی، وہ یہ کہ یہ لا جواب آرٹ ایک
وڈیرے کے تہ خانے میں پڑا تھا۔ میں نے اس کی بہت سی
تصویریں لیں اور باہر نکل آیا۔ میں بھر جاتی اور نازو سے
ملنے کے لیے گھر کے دوسرے پورشن کی طرف جانا چاہتا تھا
لیکن جب میں نے ایک مٹکی کھڑکی سے مایہ کو لان میں چھل
قدی کرتے دیکھا تو میں اس کے قریب چلا آیا۔

”کیسی ہو مائی؟“

”ٹھیک ہوں۔“ وہ بنا کسی تاثر کے بولی۔

”دیکھو مائی! اس دنیا میں سب کچھ سب کے لیے
نہیں ہوتا۔ اگر انسان صابر ہو جائے تو اللہ خوش ہو جاتا
ہے۔“

”وہ تمہیں لگتا ہے صبر کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا ایک
لفظ بول کر کسی رشتے کو ختم کر دینا؟“ اس کے سوال کا میرے
پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

”کیا وہ مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے؟“ اس نے
اچانک ایسا سوال کر دیا کہ میں چونک گیا۔
”کون؟ کس کی بات کر رہی ہو؟“

”وہی جس کا تھمہ تم نہیں بھولے تھے۔“
”نہیں مائی! وہ تم سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے
لیکن.....“ اس نے میری بات کاٹ دی۔

”اگر مگر لیکن کے بعد پہلے قعرے کی نفی ہو جاتی ہے۔
اس لیے میں تمہیں یہیں پر روک دیتی ہوں۔“ اس نے ہاتھ
اٹھا کر کہا اور پھر تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اندر چلی گئی۔
میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر میں بھی اندر اپنے کمرے کی
طرف چلا آیا۔

☆☆☆

”آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے۔“ میں
دفعہ چلا آیا۔ دڑے کمرے کی گیمبر خاموشی میں مزید اضافہ
ہوتا چلا گیا پھر چودھری شمس علی کی آواز کوئی۔

”تو قابل اعتبار نہیں رہا۔ میں تیری کسی بات کا اعتبار
نہیں کر سکتا۔ میں کیا اس کمرے میں کوئی بھی تیری بات کا
یقین کرنے والا نہیں ہے۔“ میں نے سب کی طرف باری
باری دیکھا۔ دڑے کمرے میں بھائی شفیق، عمران،
بھرجانی، نازو اور مائی کے ساتھ ساتھ نواب شبیر احمد بھی

موجود تھے۔ کچھ دیر قبل مجھے اچانک اطلاع ملی تھی کہ مجھے وڈے کمرے میں طلب کیا گیا ہے تو مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ یہاں یہ سب لوگ موجود ہوں گے۔

”تو نے نواب صاحب کے ڈیرے پر پکڑی بندوں کو زخمی کرنے کے بعد ایک خطرناک قیدی لڑکی کو بھگانے میں مدد کی۔ میں پوچھتا ہوں کیوں کیا تو نے ایسا؟“

”کیونکہ وہ..... اس حوالی کی ہوئے والی بہو ہے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ اس طرح کسی قید خانے میں رہے۔“

میری اس بات میں ایسا دھماکا تھا جس نے وڈے کمرے میں سناٹا طاری کر دیا۔ اباجی کے ہاتھ میں پکڑی جتنے کی تھیں وہیں دلی رہ گئی۔ مانی کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔

”کیا بکواس کر رہا ہے تو؟“ بھائی شفیق کی آواز نے خاموشی کو توڑا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے انہیں غصے میں دیکھا تھا۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اور یہ کوئی کچا فیصلہ نہیں ہے۔ میں نے بہت سوچے اور مجھے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے۔“ میں نے سکون سے کہا۔

”پھر بکواس پکواس کیے جا رہا ہے۔ یہاں بات اور ہو رہی تھی اور تو نے نیا تماشا کھڑا کر دیا ہے۔“ اب کی بار عمران بولا۔

”آپ کی نظر میں یہ تماشا ہو سکتا ہے لیکن یہ میری زندگی کی سب سے بڑی سچائی ہے۔“

”تو جانتا ہے وہ لڑکی کون ہے؟“ اباجی کی آواز گونجی۔ ”میں تو بہت اچھی طرح جانتا ہوں لیکن شاید آپ میں سے کوئی نہیں جانتا اور اگر کسی کو جاننے کا شوق ہو تو وہ آپ کے دوست جناب نواب شیر احمد سے پوچھ سکتا ہے۔“

”م..... میں؟ کیا مطلب؟ میں کیسے اس لڑکی کے بارے میں جان سکتا ہوں؟ سوائے اس کے کہ کچھ عرصہ قبل یہ اطلاعات ہی تھیں کہ وہ لڑکی ہمارے علاقے میں غیر قانونی کاموں میں ملوث ہے۔“ نواب صاحب چونک کر بولے تو میں مسکرا دیا۔

”ویسے یہ خوب کبھی آپ نے نواب صاحب کے..... غیر قانونی کام۔“ مطلب آپ جو بھی کریں وہ سب قانونی اور کوئی اور یہ سب کرے تو غیر قانونی۔ لگتا ہے مجھے تفصیل بتانا ہی پڑے گی۔ بہت عرصہ قبل جب منشیات فروشوں نے یہاں پر منشیات کی اسمگلنگ کی اجازت چاہی تھی تو اباجی نے انہیں انکار کر دیا تھا لیکن منشیات فروشوں نے اباجی کے انکار پر یہاں اسمگلنگ کا پلان ختم نہیں کیا، صرف تبدیل

کر لیا تھا۔ انہوں نے اباجی کا ایک ایسا بندہ اپنے ساتھ ملا لیا جو ان کی نوادرات کی اسمگلنگ کے ذریعے ہی بڑے خفیہ طریقے سے منشیات بھی اسمگل کرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ اس کام کے لیے انہوں نے اباجی کا بہت قریبی بندہ چنا اور اس بندے نے بھی رازدارانہ انداز میں نوادرات کے ڈبوں کے ذریعے ہی منشیات کی کھپ پڑوسی ملک بھجوانے کا کام کامیابی سے سرانجام دیا اور وہ آدی کوئی اور نہیں..... نواب شیر احمد خود ہیں۔“

”اپنی زبان کو لگا دو کامران۔“ نواب صاحب بھڑک اٹھے۔

”میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔ وہ لڑکی جس کا نام آشتی ہے، ہمارے علاقے میں منشیات کی اسمگلنگ میں ملوث ضرور رہی ہے لیکن اس سے یہ کام زبردستی کروایا گیا تھا اور اب جبکہ اس سے یہ کام کروانے والے نہیں رہے وہ واپس اپنی دنیا میں شرافت کی زندگی بسر کرنے جا رہی ہے تو یہ نواب صاحب اس کے راستے میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ صرف اس لیے کہ اس کے پاس منشیات کی آخری کھپ کا معاوضہ موجود ہے۔“ میری باتوں سے مجھے کمرے میں موجود ہر فرد کو ساپ سوکھ گیا تھا۔

”یہ..... یہ الزام ہے ہم پر۔ یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ نواب صاحب کی کانپنی ہوئی آواز گونجی۔

”عمران! تو کا کوئی اندر لے جا۔ مجھے لگتا ہے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔“ بھائی شفیق نے عمران سے کہا تو عمران بے اختیار میری طرف بڑھا۔

”رکو..... اسے کہنے دو۔“ اباجی کی گھبر آواز گونجی تو وڈے کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔

”کہہ دے کامران۔ آج سب کچھ کہہ دے کیونکہ آج کے بعد تو ہمارے سامنے کچھ بھی نہیں آئے گا۔“

”مجھے پتا تھا کہ آپ کبھی بھی اپنے بیٹے کی بات کا یقین نہیں کریں گے لیکن جو سچ ہے، وہ سچ ہے۔ آپ کی پناہ میں کھڑا یہ شخص..... یہ نواب آپ کی بنیادیں کھول کر

میں لگا ہے اور آپ کو یقین اس وقت آئے گا جب ایک دن آپ کے اعتماد کی عمارت ڈھس جائے گی۔ تب آپ کو میری بات کا اعتبار آئے گا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی ہوگی۔“ میں بھی کہتا رہا۔ اباجی ساٹ چہرے سے میری طرف دیکھتے رہے۔ میں انہیں نواب کے بارے میں وہ سب بتاتا رہا جو آشتی نے مجھے بتایا تھا۔ جب میں خاموش ہو اتوا انہوں نے پوچھا۔

درمیان ہونے والے اس مکالمے کا ہر لفظ بج پر مبنی تھا۔

”ٹھیک ہے۔“ پھر وہ سر ہلاتے ہوئے بولے۔

”اب تو جا۔ تیرے لیے اس حویلی اور میرے دل کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں۔“ آخری بات میں ان کا لہجہ دونوں کو ہو گیا تھا۔ میں نے سب کی طرف باری باری دیکھا۔ دڈی بھر جاتی کے چہرے پر ممتا کی تڑپ تھی۔ باقی سب چہرے جھکے ہوئے تھے۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے ہیز کپ اٹھایا اور کسی سے بھی ملے بغیر حویلی سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

وہ چھت پر کھڑی تھی۔ مغرب میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ آسمان پر ایک خوبصورت منظر تھا۔ پرندوں کے غول کے غول اپنے آشیانوں کی جانب جو پرواز تھے۔ نیچے صحن میں گلے ٹھیکل کی شاخوں میں سے ان نکلت چڑیوں کا شور اٹھ رہا تھا۔ آستی سینے پر بازو باندھے افق کی جانب دیکھے جا رہی تھی۔ ہلکی ہوائیں اس کے لمبے بالوں کو ہولے ہولے سلہار رہی تھیں۔ میرے قدموں کی چاپ سن کر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

”آستی۔“ میں نے اسے پکارا تو وہ مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔

”کیا تم اپنا نام تبدیل کرنا پسند کرو گی؟“ حیرانی کا ایک اپنا رنگ ہوتا ہے، آنکھوں سے ابھر کر سارے چہرے پر پھیلتا ہے۔ میں نے اس انوکھے منظر کا نظارہ آشتی کے چہرے پر دیکھا۔

”نام..... وہ کیوں؟“ وہ اُلجھ کر بولی۔

”کیونکہ ہر لڑکی کو ایک نہ ایک دن اپنا نام تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ اب باپ کا نام ساری عمر تو لڑکیوں کے نام کے ساتھ جڑا نہیں رہتا۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر تمہیں میرا نام اچھا لگے تو اپنے نام کے ساتھ شامل کر سکتی ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

اس کے نتیجے چہرے پر بکھرا حیرت کا رنگ حیا کے سرخ رنگ میں تبدیل ہوا اور پھر یک لخت ایک انجانے سے خوف سے زردی میں ڈھل گیا۔ اپنی مضطرب آنکھوں کی کیفیت چھپانے کے لیے اس نے اپنا رخ موڑ لیا۔

”کیا میں اس خاموشی کو ہاں سمجھوں؟“ میں نے پھر پوچھا۔

”ایسا نہیں ہو سکتا کامی۔ تم میرے بارے میں جاننے ہو۔ ہم دونوں کے بیچ چور سپاہی کا رشتہ ہے جو اس وقت صرف اور صرف ہمدردی کی دھند میں چھپا ہوا ہے۔“

”یہ سب تجھے اس لڑکی نے بتایا ہے جس کا نام آشتی ہے؟“

میں نے اثبات میں جواب دیا۔ ”ہاں۔“

”مرے گی وہ لڑکی۔ ایسی فسادن کو میں عبرت ناک

سزا دوں گا۔“ وہ بڑبڑاتے تو میں چلا اٹھا۔

”آخر آپ کو میری بات پر یقین کیوں نہیں ہے؟“

”شاید اس لیے کہ مجھے تیرے بارے میں سب پتا ہے۔“ اباجی نے رساں سے کہا اور پھر ایک توقف کے بعد بولے۔ ”مجھے پتا ہے کہ تو یہاں کیوں اور کس لیے آیا ہے۔ تجھے یہاں اپنے گھر کی محبت نہیں بلکہ حیرتی فرض شناسی پہنچ کر لائی ہے۔ تو یہاں اپنے اخبار کے لیے یہ رپورٹ تیار کرنے آیا ہے تاکہ تیرا باپ کتنا ظالم اور جابر چودھری ہے۔ وہ غیر قانونی کاموں میں ملوث ہے۔ چودھری حشمت اپنے مزارعوں سے غلاموں جیسا سلوک کرتا ہے۔ چودھری حشمت نے اپنی نجی جیلیں بنوا رکھی ہیں جن میں کئی بے گناہ لوگوں کو پابہ زنجیر رکھا گیا ہے۔ چودھری حشمت زنجیر اندوزی کرتا ہے، اس کا لنگ کرتا ہے، سرکاری افسروں کو کتھ پتلیوں کی طرح استعمال کرتا ہے۔ اس پنڈ میں پیٹھ کر سرکار کی کرسی کو ہلاتا ہے۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“ وہ ہلکی سے بولے۔

”کیا یہ سچ نہیں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”تو کیا جھٹکتا ہے تیری اس رپورٹ کے چھپنے کے بعد میری عزت داؤ پر لگ جائے گی؟ مجھے پرانگوارنی بھادی جائے گی کیا پھر عوام میرے خلاف لائٹ مارچ شروع کر دے گی؟ کیا ہوگا تیری اس رپورٹ کے شائع ہونے سے؟“ وہ دہاڑے۔

”شاید آپ وہ زمین داہل کرنے پر مجبور ہو جائیں جس پر آپ کا حق نہیں ہے۔ شاید آپ کی جیل سے وہ مظلوم آزاد ہو جائیں جو معمولی گناہوں کی بھینک سزا بھگت رہے ہیں۔ شاید کاغذ کے چند نوٹوں کے بدلے آپ اپنی تہذیب نام لکھتے کو بیچنے سے باز آ جائیں۔ شاید پہلی بار اس ملک میں کسی بڑے آدمی کا احتساب ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ بھی نہ ہو۔ میری اس رپورٹ کو کھڑے لائن لگا دیا جائے۔ الٹا مجھے کسی معاملے میں پھنسا دیا جائے۔ ہو سکتا ہے کہ مجھے روکنے کے لیے جان سے مار دینے سے بھی گریز نہ کیا جائے لیکن مجھے کسی نتیجے کی پروا نہیں ہے۔ میرے سامنے جو غلط ہوگا اسے میں سب کے سامنے لاؤں گا۔“ سبھی لنگ کھڑے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ شاید ان میں سے کسی کو بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ اباجی اور میرے

واپس لوں گا۔“ میں نے شرارتی انداز سے کہا تو اس نے مسکرا کر سر جھکا لیا۔ حیا کا سرخ رنگ اس کے چہرے پر اس طرح چھا گیا کہ میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ میں نے بے اختیار اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آں ہاں..... لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا۔“ وہ شوق سے بولی اور ہاتھ جھڑا کر سیزہیوں کی طرف دوڑتی چلی گئی۔ میں ایک طرف رہی کرسی پر ڈھیر ہو کر گر سا گیا۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ پھر چانک مجھے آشتی کی چیخ سنائی دی۔ اس کے فوراً بعد ایک فائر ہوا۔ میں سیزہیوں کی طرف بھاگا۔ اسی لمحے ایک آدی سیزہیاں پھلانگتا ہوا چھت پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کے سر کے بال پکڑ کر ایسا جھکا دیا کہ وہ اڑتا ہوا چھتی منڈیر سے لگرایا اور اسے توڑتا ہوا وہاں صحن میں گرنا چلا گیا۔ جیسے ہی میں سیزہیوں سے اتر اٹھو کر کھاکر لڑکھڑا گیا۔ میرے قدموں میں حق نواز اونڈھا پڑا ہوا تھا۔ خون کا سرخ تالاب اس کے گرد پھیلتا جا رہا تھا۔ میں پھٹی پھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ سبھی آشتی کی دوسری چیخ سنائی دی۔ یہ چیخ اندرونی کردوں سے آرہی تھی۔ میں لاش پھلانگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا اور سبھی میرے سر پر ایک قیامت سی ٹوٹ پڑی۔ میں سر پکڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھتا چلا گیا۔ دھندلی آنکھوں کے سامنے ایک آدی ہاتھ میں لوہے کا گول راڈ تھا۔ میرے گھڑا تھا۔ میں درد کی ناقابل برداشت لہروں کے آگے بے بس ہو گیا تھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مجھ پر دوسرا وار کیا۔ مجھے میری گردن پر پہاڑ سا ٹوٹا ہوا محسوس ہوا اور میں ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔ اس بے ہوشی میں ہر قسم کا احساس مفقود تھا لیکن پھر آہستہ آہستہ میری آنکھیں کھلنے لگیں۔ دماغ کا رابطہ وہیں سے شروع ہوا جہاں سے ختم ہوا تھا۔ گزرے واقعات یاد آتے ہی میں نے آنکھ کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گیا۔ میری گردن کے عقبی حصے اور سرے درد کی تیز لہریں اٹھ رہی تھیں۔ میں چکراتے سر کو سنبھالنے ہوئے کھڑا ہوا۔ بلب کی زرد روشنی میں ڈوبا کرا خالی تھا۔ میں باہر نکلا۔ سارا گھر خالی تھا۔ حتیٰ کہ حق نواز کی لاش بھی غائب تھی اور وہ زخمی بھی غائب تھا جسے میں نے نہت سے نیچے پٹا تھا۔ البتہ سیزہیوں کے پاس اور صحن میں خون کے آثار موجود تھے جنہیں مٹی جذب کر چکی تھی۔ گھر کے باہری دروازے کا پت کھلا ہوا تھا۔ میری رگ رگ میں خون کا فشار بلند ہونے لگا۔ کنپٹیوں پر دھمکی سی ہوری تھی جس میں ایک ہی نام گونج رہا تھا۔ ”آشتی!“

تین ہی دھند پھٹنے کی، کچھ باقی نہیں رہے گا۔ میں جرائم کی دنیا میں گردن تک دھنسی ہوئی ہوں۔ میرا کوئی مستقبل نہیں ہے۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ میں اس کے سامنے آ گیا۔

”میں تمہارا مستقبل ہوں آشتی۔ میری محبت کو ہر دوی کہہ کر اس کی توجہ مت کرو۔ میں تمہیں چودھری حشمت علی کی حویلی میں دہن کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”پلیز کامی! مجھے ایسے خواب مت دکھاؤ۔ جب یہ خواب ٹوٹیں گے تو بہت تکلیف ہوگی۔“ میں نے اس کے ہاتھوں کو تھام لیا۔

”یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ میں تمہیں نواب کے چنگل سے باہر نکالوں گا۔ موت کے جو سامنے تمہارے پیچھے ہیں، ان سب کو ہٹا دوں گا۔ تم اپنی زندگی بالکل نئے انداز سے شروع کرو گی۔“

”کامی! اگر ایسا ہو جاتا ہے جیسا کہ تم نے کہا تو میں اپنے آپ کو اس دنیا کی سب سے خوش قسمت لڑکی تصور کروں گی مگر.....“ میں نے اس کے لبوں پر ہاتھ رکھ کر بات کو روک دیا۔

”اگر مگر لیکن کے بعد پہلے فخرے کی نفی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے میں تمہیں سبیل پر روک دیتا ہوں۔“ اور ایسا کہتے ہوئے مجھے مائی یاد آ گئی۔

”میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”چلو اس لمحے کو یادگار بنانے کے لیے ایک کام کرتے ہیں۔ دینے میرے پاس جو کچھ ہے تمہیں پسند آئے گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اچانک اس کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلا دیا جس پر سفید ہیز کلپ رکھا ہوا تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے ساکت ہو گئی پھر لڑتے ہاتھوں سے اس نے کلپ کو اٹھایا اور کھول کر اس میں سے ہیرے نکال لیے۔ اس کی خوبصورت ہتھیلی پر چکا چوندرو شنیوں کی کریمیں جھلکا تھیں جس کا ٹکس اس کی کالج جیسی شفاف آنکھوں میں بھی جھلکانے لگا تھا۔

”امانت واپس ہو گئی۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ اس نے ہیرے واپس کلپ میں ڈال دیے۔

”تمہیں تمہارے کن کن احسانات کا بدلہ چکاؤں گی کامران۔“

”یہ تو میرا فرض تھا یا پھر..... ایسا تو ہونا ہی تھا۔ اگر تم سوچتی ہو کہ میں یہ سب کہوں گا تو سوری۔ ہاں ایک بات یاد رکھنا۔ جب وقت آئے گا میں ہر احسان کا بدلہ سود سمیت

گوداموں میں وہی گندم تھی جو تاج غریب کے پیٹ کے بجائے اسٹور میں رکھ دیا جائے۔ اس کا جلا دینا ہی بہتر ہوتا ہے اور وہ خطرناک قیدی بن گناہوں کی سزا بھگت رہے تھے، وہ خود بھی بھول چکے تھے۔“

”سچ کہہ رہا تھا عمران کہ تو پاگل ہو گیا ہے۔ دیکھ کامی! تو جو کر رہا ہے وہ بہت غلط ہے۔ تو ایسا کر میرے پاس آ جا اور شہر میں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”سب ٹھیک نہیں ہو سکتا مجاہی۔ جب تک میری آشتی مجھے نہیں مل جاتی، تب تک سب ٹھیک نہیں ہوگا اور جب تک وہ میری نظروں سے اوجھل رہے گی میری چودھری صاحب اور نواب صاحب سے کھلی جنگ جاری رہے گی۔“

میں نے سرد آواز میں کہا۔

”کامی! میری بات کا تو یقین کر۔ میں نے آج تک تجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ آشتی کے بارے میں نہ تو اباجی کو کچھ معلوم ہے اور نہ نواب صاحب کو۔ میں نے دونوں سے بات کی تھی اور وہ دونوں.....“ میں نے بات کاٹ دی۔

”آپ بہت بھولے ہیں یا پھر مجھے ایسا سمجھتے ہیں۔ جس دن میں نے دڑے کمرے میں آشتی کو اپنانے کی بات کی تھی بھی چودھری صاحب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اسے میری زندگی سے نکال دیں گے۔ میں جانتا ہوں آشتی کو انہوں نے ہی اغوا کیا ہوگا اور جب تک وہ مجھے نہیں مل جاتی، آپ کو میرا پاگل پن نظر آتا رہے گا۔“ میں نے کال کاٹ دی۔

آج ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ قادر پور میں حق نواز کے گھر ہونے والے واقعات کے بعد وہاں سے میں سیدھا مراد آباد چلی پہنچا۔ اباجی اور نواب صاحب نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا کہ انہوں نے آشتی کو اغوا کر دیا ہے۔ میں نے اپنے طور پر کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس بار جو ابھی میری کوئی مدد نہیں کر سکا۔ اباجی کا خاص کارندہ لکھا غائب تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آشتی کو لکھا ہی لے کر کہیں غائب ہوا ہے مگر جب چار پانچ دنوں تک میں ناکام ہی رہا تب میں نے اباجی اور نواب صاحب سے کھلی بغاوت کرتے ہوئے ان کے خفیہ و ظاہری اڈوں پر حملے شروع کر دیے۔ اباجی کے فارم ہاؤس والے گودام اور آج نواب صاحب کا یہ ڈیرہ میں اندر آتش کر کے اپنے اندر کی آگ انہیں دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ غصے میں میرے ہوش و حواس کھوئے جا رہے تھے۔ مجھے اس وقت کوئی سمجھا نہیں سکتا تھا جس کی وجہ سے میرا پاگل پن بڑھتا جا رہا تھا۔ میں یہاں کسی اور مقصد کے لیے آیا تھا لیکن میری محبت میرے

فرش پر دو آدی بے ہوش پڑے تھے۔ تیسرا میرے سامنے کھڑا تھا۔ کچھ دیر قبل اس کے ہاتھ میں ری پیٹری لکین اب وہ گن کرے کے ایک کونے میں پڑی تھی اور اس آدی کی حالت بگڑ چکی تھی۔ اس کی قمیص دھجیوں کی صورت میں بدن سے اتر چکی تھی۔ ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ ایک کان سے خون بہہ رہا تھا اور چہرہ میرے تھپڑوں کی وجہ سے سرخ ہو چکا تھا۔ میں نے ایک اور پھپڑا سے رسید کیا۔ وہ گھوم کر دیوار سے ٹکرایا اور اسے ماتھے پر سخت چوٹ لگی۔

”بتا..... وہ قیدی لڑکی کہاں ہے؟“ میں نے خوشخوار لہجے میں پوچھا۔

”میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ ایک ہفتے سے ادھر کوئی نہیں آیا۔ میں اپنی سرری ہوئی ماں کی قسم کھاتا ہوں۔ میں اس قیدی لڑکی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“ اس نے روتے ہوئے وہی جواب دیا جو وہ پہلے بھی دے چکا تھا۔ میں غصے سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر کہا۔

”تیسرے پاس دو منٹ ہیں۔ اپنے دونوں ساتھیوں کو اغوا اور دہشت ہو جا۔ اگر دو منٹ کے بعد تو مجھے اس علاقے میں نظر بھی آیا تو مار ڈالوں گا۔“ میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ اس نے میری بات پر تجزیے سے عمل کیا اور دونوں بے ہوش آدمیوں کو کھینچتا ہوا باہر نکل گیا۔ میں نے گھوم پھر کر ایک بار پھر ساری عمارت کا جائزہ لیا۔ یہ وہی ڈیرہ تھا جہاں آشتی کو پہلے قید کیا گیا تھا اور میں اسے نکال کر لے گیا تھا مگر اب یہ غالی تھا۔ باوجود اس کے کہ مجھے اندازہ تھا کہ وہ لوگ دوبارہ آشتی کو اسی جگہ رکھنے کی غلطی نہیں کر سکتے لیکن میں پھر بھی یہاں آ گیا تھا۔ اس عمارت کے ستاروں میں تمباکو کے ذخیرے تھے۔ یہاں مجھے پیٹرول کے چند کین بھی مل گئے تھے۔ میں نے اس عمارت کے اندرون اور بیرون کو پیٹرول میں نہلا کر آگ لگا دی اور خود بھڑکتے شعلوں کو دیکھتا ہوا ایک جانب چل دیا۔ اسی لمحے میرا موبائل واچریت ہونے لگا۔

”یہ کیا کرتے پھر رہے ہو تم کامی۔“ بھائی شفیق کی غصیلی آواز گونجی۔ ”میں نے سنا ہے تم نے فارم ہاؤس کے گوداموں میں آگ لگا دی ہے اور وہاں ستاروں میں قید خطرناک قیدی بھگا دیے ہیں؟“

”تم نے سنا نہیں تھا بھلا۔ جس کھیت سے وہاں کو میسر نہ ہو روزی، اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو۔ ان

آشتی کے بجائے میرے پیچھے پڑ جائیں گے۔ تم سمجھ لو میں آشتی کو بچانے کی خاطر اس کا جرم اپنے سر ڈال چکا ہوں۔“
 ”ہوں..... چل ٹھیک ہے، اپنا خیال رکھنا پھر بات ہوگی۔“ اعتدائی فغروں کے بعد کال ختم ہوگئی۔ میں بھوسے کے اس ڈھیر پر لیٹ گیا جو درختوں کے اس جھنڈ میں میرے لیے گرم بستر سے کم نہیں تھا۔

☆☆☆

میری آنکھیں کھلیں تو سرسری طرح چکرار ہاتھا۔ متلی کی سی کیفیت تھی لیکن چونکا دینے والی بات یہ تھی کہ میں ایک لوہے کی کرسی پر رسیوں سے بندھا ہوا بیٹھا تھا جس کے پائے زمین کے اندر تک دفن ہوئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد تھا میں رات کو بھوسے کے ڈھیر پر سویا ہوا تھا اور اب یہاں پر اس حالت میں کب پہنچا تھا، مجھے قطعی علم نہ تھا۔ اگر میں غلط نہیں تھا تو یہ سر درد اور متلی کی کیفیت اس بدنام زمانہ کلوروفام کے اثرات کا ہی دوسرا نام تھا۔ یعنی مجھے سوتے ہوئے ہی بے ہوش کیا گیا تھا اور یہاں لا کر باندھ دیا گیا۔ شاید بلکہ یقیناً میرا ٹرپ کارڈ کام کر گیا ہوگا۔ جیسے ہی نواب کو متلی ہیروں کا علم ہوا، اس نے مجھے اغوا کر لیا ہوگا۔ اسی لمحے کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر آنے والوں کو کچھ کمری طویل سانس خارج ہوگئی۔ آنے والے پانچ افراد تھے اور سبھی مسلح۔ انہوں نے کوئی بات نہیں کی، صرف کمرے کے مختلف حصوں میں جا کر ٹکڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے پلاسٹک کی کرسی اٹھائی ہوئی تھی۔ اس نے کرسی عین میرے سامنے کچھ فاصلے پر رکھ دی اور خود دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ کوئی آنے والا تھا یا شاید..... نواب صاحب ہی تشریف لانے والے ہوں۔ چند لمحوں بعد کوئی اندر داخل ہوا اور اسے دیکھ کر میں بت بنا رہ گیا۔ اگر کوئی مجھے یہ کہتا کہ قیامت آگئی ہے تو میں یقین کر لیتا لیکن اس منظر پر یقین کرنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میرے سامنے آشتی تھی۔ اس نے سرخ و سیاہ رنگ کے احتراج سے بنا لباس پہن رکھا تھا۔ ہلکے سے میک اپ نے اس کا روپ نکھار دیا تھا۔ سرخ ہونٹ مسکراہٹ کے سے انداز میں سمجھے ہوئے تھے۔ وہ ایک شاندار چال چلتی ہوئی میرے سامنے آ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور سرگرت سلگایا۔ ایک لبا سانس لے کر اس نے دھواں نکلنے کے بجائے میرے چہرے پر اگل دیا۔

”ہیلو کامران! کیسے ہو تم؟“ میں تنگ بیٹھا رہا۔ جواب دیتا بھی تو کیا۔ میرا دماغ تو جھگے کی رفتار سے گھوم

مقصد کے آگے اس طرح دیوار بنی تھی کہ میں باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ میں چلتا ہوا کافی دور نکل آیا۔ ان دنوں میرا کوئی ٹھکانا بھی نہیں تھا۔ حویلی میرے لیے ممنوع قرار دی جا چکی تھی۔ شو کے ارد حق نواز کے گھر بھی محفوظ نہیں تھے۔ میں آشتی کی تلاش میں تھا جب۔ موبائل پھر سے وائبرٹ کرنے لگا۔ اب کی بار جو ادھوا تھا۔

”کامی! کہاں غائب ہو تم؟ میں نے تمہیں ایک گھر کا پتا دیا تھا کہ وہاں رہ لو مگر تم گئے ہی نہیں۔“ وہ ناراضی بھرے انداز میں بولا۔

”مجھے کی بات کا ہوش نہیں جودی..... مجھے تو اپنی بھی خبر نہیں ہے۔“

”اوہ خدا یا! کای کیوں خود کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ ابھی ابھی مجھے نواب صاحب کے ڈیرے کے بارے میں اطلاع ملی تو میرا دھیان فوراً تمہاری طرف گیا۔“

”ایسی اطلاعات تمہیں ملتی رہیں گی جب تک مجھے آشتی نہیں مل جاتی۔ بتا دینا جو دھری حشمت علی اور نواب شبیر احمد کو۔“

”میں نے بہت کوشش کی لیکن آشتی کا پتا نہیں چل سکا۔ مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے اسے.....“ وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

”نہیں جودی! مجھے یقین ہے ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ نواب کو وہ ہیرے چاہئیں جو آشتی کے پاس تھے۔“

”لیکن تم نے بتایا تو تھا کہ تم نے وہ ہیرے آشتی کے حوالے کر دیے تھے۔ اب تک تو وہ نواب کے پاس پہنچ بھی گئے ہوں گے۔“ اس نے حیرانی سے کہا۔

”جانتا ہوں لیکن ایک بات کوئی نہیں جانتا۔ جو ہیرے میں نے آشتی کو دیے تھے، وہ نقلی تھے۔ اصلی ہیرے اب بھی میرے پاس ہیں۔“

”کیا؟“ وہ زور سے چلا یا۔ ”..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے نقلی ہیرے کہاں سے آگئے؟“

”اسے میرا ٹرپ کارڈ بھجو۔ وہ نقلی ہیرے میں نے کسی اور مقصد کے لیے منگوائے تھے لیکن پھر میں نے سوچا کہ اگر ہیرے نواب کے پاس چلے گئے تو وہ آشتی کو مارنے میں دیر نہیں لگاے گا۔ اسی لیے جو ہیرے میں نے شہر سے اپنے دیے تھے، وہ نقلی تھے۔ وہ نقلی ہیرے میں نے شہر سے اپنے ایک دوست کے ذریعے منگوائے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اگر انہوں نے بھی آشتی کو اغوا کر لیا تو نقلی ہیروں کی وجہ سے وہ اسے کم از کم جان سے نہیں ماریں گے بلکہ اس کے بعد وہ

رہا تھا۔

”شاید تم اپنی ”محبت“ کو بھول گئے۔ ارے مجھی میں آشتی ہوں..... تمہاری آشتی۔ وہی جس کی خاطر تم آسان سے تارے توڑ کر لانا چاہتے تھے۔“ وہ طنزیہ انداز میں کہے جا رہی تھی۔

”ارے مجھی کچھ بولو تو سہی۔ میں جانتی ہوں تمہارا ”سینس آف ہیومن“ کتنا اچھا ہے۔ میرے اس انداز پر کوئی خوبصورت سا جملہ کہو نا۔“ میں کیا کہتا کہ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں کچھ موجود میں ہوں بھی یا نہیں۔ میرے سامنے وہی آشتی ہے یا نہیں۔ میں کیا کہتا کہ حیرت کے مقام پر انتہا پر الفاظ مر جاتے ہیں۔

”لگتا ہے تمہیں بہت شاک لگا ہے مجھے دیکھ کر۔ ہاں لگنا بھی چاہیے۔ تمہیں کیا لگتا تھا، تمہیں دیکھ کر میرے دل کی دھڑکنیں رکنے لگتی تھیں؟ یا پھر تمہارے ڈائلاگ سن کر میرے کانوں میں دالٹن بجنے لگتے تھے؟ جانتے ہو جب تم نے پہلی بار مجھ سے اپنی اس ”محبت“ کا اظہار کیا تھا تو میں تمہارے کندھے پر سر رکھ کر کتنا روئی تھی۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ اگر میں ایسا نہ کرتی تو شاید قہقہہ لگا کر ہنس پڑتی۔ تم مرد بھی نا کمال کرتے ہو۔ کوئی لڑکی تم سے دو بیٹھے بول کیا بول دے، تم دیو اس بن کر اپنی زندگی تباہ کر لیتے ہو۔ اپنی مثال ہی لے لو۔ میرے خیال میں تم اچھے بھلے بھجھ دار انسان ہو لیکن میری جھوٹی کہانی پر جھٹ سے اعتبار کر لیا اور اپنے ہی باپ کے دشمن بن گئے۔ تم نے ثابت کر دیا کہ مرد جتنا بھی ذہین ہو بھی کبھی عورت کو نہیں سمجھ سکتا۔“ وہ ہنس رہی تھی۔ مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ میری سماعتوں میں ایک ہی بازگشت گونج رہی تھی۔

وہ سفاک لہجے میں بولی۔ ”اتنا تو تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ میں نے تمہیں صرف استعمال کیا تاکہ میں ہیروئن تک پہنچ سکوں جو میں نے غلطی سے تمہیں تھما دیے تھے۔ باقی بہت کچھ تمہیں بتانے کو رہ گیا ہے لیکن وہ بعد میں..... پہلے ہم کام کی بات کر لیں۔ ہاں تو مسز کامران! تم نے میری امانت میں خیانت کرتے ہوئے اصلی ہیرے اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں۔ وہ کہاں ہیں؟ تمہارے پاس اس سوال کا جواب دینے کے دو طریقے ہیں۔ یا تو فوراً بتا دو، ورنہ کچھ دیر بعد بتا دینا لیکن یہ یاد رکھنا کہ اس کچھ دیر میں تمہاری آنکھیں، تمہارے ہاتھ، تمہارے پیر اور کوئی دوسری چیزیں سلامت نہیں رہیں گی..... اور میں تم سے کوئی رعایت نہیں برتنے والی کیونکہ مجھے تمہاری زندگی سے کوئی

دبچپی نہیں ہے۔ اور نہ ہی میری پوری زندگی میں کوئی ایک بھی ایسا لمحہ آیا ہے جس میں، میں نے تم سے محبت کرنے کی غلطی کی ہو۔“ اس فقرے کے دوران ہی اس نے ایک تخت چلا ہوا سکرین میرے ہنرے ہوئے ہاتھ پر بچھا دیا۔ میں ہاتھ کی پشت پر ابھر آئے والے سرخ دائرے کو دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ مجھے درد کیوں نہیں ہو رہا؟ میری خاموشی پر اس کا بارہ چڑھتا گیا۔ وہ چلا کر کچھ بولی لیکن اب مجھے اس کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی کیونکہ میری آنکھوں کے سامنے ایک دھندلا سا منظر تھا اور میری سماعتوں میں اس منظر میں بولا جانے والا ایک فقرہ گردش کیے جا رہا تھا۔ ”یہ مت کہو کہ تم نے مجھی مجھ سے محبت نہیں کی کیونکہ اس بات سے مجھے درد ہوتا ہے۔“ میں بخوبی احواس بیٹھا رہا۔

پھر کسی نے میرے منہ پر زور سے تھپڑ مارا۔ اس کے بعد دوسرا اور تیسرا۔ کوئی کٹھن لڑکے کی طرح مجھ پر برسنے لگی۔ اس کے بعد اچانک میرا جسم جھنجھٹا اٹھا۔ مجھے لگا کہ جیسے روح جسم سے نکلنے والی ہی ہے مگر اس ساری کیفیت میں مجھے درد محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

”یہ مت کہو کہ تم نے مجھی مجھ سے محبت نہیں کی کیونکہ اس بات سے مجھے درد ہوتا ہے۔“ تب میں اسے مامی کی ایک جذباتی بات سمجھا تھا لیکن آج مجھے پتا چلا کہ جب کوئی یہ جملہ کہتا ہے تو واقعی درد ہوتا ہے۔ میرے ہوش و حواس پر اندھیرا چھا رہا تھا پھر اچانک ہی دھیر سا راپانی میرے منہ پر آگرا اور میں کھانتے ہوئے حال میں لوٹ آیا اور میں نے دیکھا کہ میرے سامنے ایک بندہ پلاسٹک کی ہائٹی لیے کھڑا تھا۔ میرا گیلیا جسم لہلہا رہا تھا۔ سر سے پہنے والا لہو میرے چہرے سے بہتا ہوا ٹھوڑی پر سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ جڑا بھی ٹوٹا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ منہ سے خون آلود رال بہہ رہی تھی اور میرا لباس تاروں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ میں حیران رہ گیا کہ اتنی خستہ حالت میں مجھی میں اپنے پورے ہوش میں کیسے ہوں؟ مجھے تو درد سے بے حال ہو جانا چاہیے تھا لیکن سچ تو یہ تھا کہ اس خمدوش حالت میں مجھی میں جو درد محسوس کر رہا تھا، وہ اس کے الفاظ کا درد تھا۔

”اصلی ہیرے کہاں ہیں کامران۔“ ایک چلاتی ہوئی آواز نے میرے حواس بحال کیے۔

”ہیرے..... اصلی ہیرے؟“ پھر مجھے یاد آ گیا کہ میں کہاں ہوں اور وہ مجھ سے کیا پوچھ رہی ہے۔

”ہاں..... تمہارے اصلی ہیرے میرے پاس ہی ہیں..... میرے پاس۔“

ہیروں کا کوئی مول نہیں ہے۔ اس دنیا میں کسی بھی چیز کا کوئی مول نہیں ہے۔ یہاں ہر رشتہ اور ہر جہز بہ اتنا بے وقعت ہے کہ ان کا کوئی مول ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ کوئی اور نہیں میرا یا، میرا کزن، میرا اپنا بہت ہی پیارا..... جو ادھا۔

”آجی نے تمہیں جو اپنی کہانی سنائی ہے، وہ کافی حد تک درست ہے۔ یہ سچ ہے کہ اس نے اپنی بہن کو بجاتے ہوئے ایک قتل کیا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ پھر وہ منشیات کے چنگل میں پھنس کر رانا ایوب تک پہنچ گئی تھی۔ ساری کہانی سچ ہے سوائے اس کی آخری باتوں کے جو کہ اس نے مجھ سے مشورہ کرنے کے بعد تبدیل کر دی تھیں۔ رانا ایوب کی گرفتاری کے بعد جب آجی میرے لے کر نکل رہی تھی تب بگ باس نے اسے ہیروں کے بدلے اس کے گھر والوں کا پتا بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ بگ باس اس سے پاپکتن کی ایک کوشی میں ملا تھا لیکن وہ نواب شیر احمد نہیں تھا..... میں تھا..... میں جو ادھم لیتی۔“ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑتی جا رہی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک انکشاف ہوتے جا رہے تھے۔ وہ بولتا رہا۔ ”اور وہاں بھی میری آجی سے پہلی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جس لڑکے نے کالج میں آجی کی مدد کی تھی، اس کا نام بھی فیصل نہیں تھا۔ وہ بھی میں تھا..... جو ادھم لیتی۔ سچ بات تو یہ ہے کہ ہم دونوں کالج میں ہی ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لیکن وہ محبت ابھی اقرار کے مرحلے سے دور تھی۔ میں اس وقت بھی اسی گینگ کا بگ باس تھا۔ آجی کے ہاتھوں جعفری کے قتل کے بعد میں نے ہی اسے بچایا اور پھر جب رانا ایوب کی گرفتاری نے میرے گینگ کا شیرازہ بکھیر دیا تو ایک بار پھر مجھے آجی کے سامنے آنا پڑا۔ یہ بہت بدل گئی تھی۔ کالج کی ڈرپوک اور سہمی ہوئی آجی کی جگہ میرے سامنے ایک دلیر اور نڈر لڑکی کھڑی تھی۔ یہ بھی مجھے اپنے بگ باس کے روپ میں دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ میں نے اسے صاف صاف بتا دیا کہ اسے یہاں بلانے کا مقصد اس سے صرف ہیرے حاصل کرنا نہیں تھا۔ میں نے اسے اس کے گھر والوں کا پتا بتا دیا اور پہلی بار اس سے محبت کا اقرار بھی کیا اور کہا کہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جواباً اس نے کہا کہ اسے ابھی تو اپنے گھر والوں کی فکر ہے، وہ کچھ دن سوچ کر میری بات کا جواب دے گی۔ یہ وہاں سے چلی گئی اور مجھے لگا کہ میں اب اس کے بتا ایک پل بھی نہیں رہ سکتا۔ کیا ہیرے اور کیسے مقاصد۔ سبھی محبت کی لہر میں بہہ گئے۔ آجی نے ایک جھٹے بعد مجھ سے رابطہ کیا اور خوشخبری سنائی کہ اس نے میری

”کہاں ہیں وہ؟ بتاؤ.....؟“ وہ مجھے جھنجھوڑ رہی تھی اور میں غائب دماغی سے دیکھتا جا رہا تھا۔ ان کا سچ جیسی شفاف آنکھوں میں جو میں دیکھنے کا خواہش مند تھا، وہاں ویسا کچھ بھی نہیں تھا..... صرف غصہ تھا..... نفرت بھر غصہ۔

”تم بتاؤ گے..... سب کچھ بتاؤ گے۔ اگر مجھے نہیں بتاؤ گے تو کسی اور کو تو ضرور بتا دو گے اور وہ “کوئی اور” بہت جلد یہاں آنے والا ہے۔“ اس نے سفاک لہجے میں کہا۔

”کوئی اور..... نواب شیر احمد؟“ میں نے بے اختیار پوچھا۔

”نواب شیر..... ہونہ۔“ وہ استہزاءیہ انداز میں بولی۔ ”شاید اب بھی تم اس اجتماع کی بات پر یقین کیے بیٹھے ہو جو میں نے تمہیں بتا سوچے سمجھے کبھی تھی۔ کمال کی بات ہے۔ کیسے سمجھا ہی ہو تم۔ تم تو بات کی تہ تک پہنچنے والے لوگ ہوتے ہو۔ بہر حال، تمہیں بتائے دیتی ہوں کہ نواب شیر کا منشیات اور ہیروں والے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں جس کے لیے کام کرتی ہوں، وہ بندہ کوئی اور ہے۔ اس سے مل کر تمہیں یقیناً خوش محسوس ہوگی کیونکہ وہ میرا شوہر بھی ہے۔“ یہ ایک اور دھماکا تھا۔

”کون ہے وہ؟“ میرا سانس دھچکنی کی طرح چل رہا تھا۔ کیا آجی کی اصلیت سے بڑا بھی کوئی راز فاش ہونے والا تھا؟ کیا میرا ریزہ ریزہ ہونے والا جدو کی اور دھماکا خیز انکشاف کا حمل ہو سکتا تھا؟ اسی وقت دروازے سے باہر کوریڈر میں بھاری قدموں کی آواز گونجی۔ میں چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بڑے اطمینان سے کمرے میں داخل ہوا۔ آجی تیزی سے اس کی طرف پکی۔

”اوہ ڈاؤن لگ! تم نے آجی دیر کیوں کر دی؟“ آجی نے اس کی گردن میں ہاتھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ آنے والے نے سر کو ترچھا کیا تو اس کی چمک دار اور مسکراتی ہوئی آنکھیں آجی کے سیاہ بالوں کے پیچھے سے مجھ پر جم گئیں۔ اس نے آجی سے آجی کی ہاتھوں کو پیچھے کیا اور میرے روبرو آکھڑا ہوا۔ سفید کاشن کے بے داغ سوٹ اور سیاہ پشاوری چپل پہنے وہ بڑا ڈشنگ لگ رہا تھا۔ میرے اندازوں کے سارے محل ایک لمحے میں چکنا چور ہوتے چلے گئے۔

”صرف ایک سوال کا جواب چاہیے۔ باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔“ اس نے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ سوال پوچھتا، میں نے خود کو سنبھالتے ہوئے جواب دے دیا۔

”اصلی ہیرے نازو کے پاس ہیں..... جو ادھا!“

سچ کہا تھا آجی نے۔ میں اسے دیکھتے ہی بتا دوں گا کہ ہیرے کہاں ہیں اور اب اسے دیکھتے ہی مجھے لگا کہ ان

بات مان لی ہے۔ دراصل در در بھٹکنے کے بعد اسے بھی کسی مضبوط سہارے کی تلاش تھی۔ ہماری شادی ”موسیٰ وال“ کے ایک کچے گھر میں ہوئی جہاں آشتی کی فیملی رہ رہی تھی۔ میں نے شادی کے بعد بھی آشتی کو وہیں رکھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ ماما جی (چودھری شمس علی) اسے کبھی قبول نہیں کریں گے۔“

اس نے سگریٹ کا لباس لے کر ایک چھوٹا سا توقف کیا اور بولا۔ ”جب میں ساہیوال میں بی کام کر رہا تھا تبھی ایک دن میری ملاقات ایک غیر ملکی ”ڈیوڈ گرین“ سے ہوئی۔ وہ نشیات کے ایک عامی ریکٹ کارکن تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی کھنی جانتی ہے کہ چودھری شمس علی کے خفیہ راستے کے ذریعے نشیات بھی اسمگل ہوں اور اس کام کے لیے اس نے مجھے پیشکش کی کہ میں خفیہ طور پر اگر یہ کام کر سکوں تو وہ مجھے لاکھوں روپے معاوضہ دیں گے۔ میں نے ان کی یہ پیشکش قبول کر لی تھی اور پھر بڑی جدوجہد کے بعد رانا ایوب جیسے ایک دوست کی مدد سے میں نے پورا نیٹ ورک تیار کر لیا تھا۔ ڈیوڈ ایڈ کھنی افغانستان سے نشیات پاکستان اسمگل کرتی تھی۔ اس کام کے لیے میں نے بڑی محنت کی اور ماما جی کے بڑے خاص خاص بندوں کو ہماری معاوضوں پر اپنے ساتھ ملا یا اور ماما جی کا خفیہ راستہ بھی استعمال کیا لیکن پھر رانا ایوب گرفتار ہوا اور میرا نیٹ ورک بکھر گیا مگر آشتی سے جڑ جانے کے بعد مجھے پتا چلا کہ میری آشتی میں اتنی صلاحیتیں ہیں کہ وہ ایسکی بہت کچھ کر سکتی ہے۔ یہ جانتی تھی کہ میں چودھری شمس علی کا بھانجا ضرور ہوں لیکن میرے پاس اپنی کوئی جاگیر یا بینک بیلنس نہیں ہے۔ ایک نئی زندگی شروع کرنے سے پہلے ہمیں بہت سارا پیسا چاہیے تھا۔ میں نے اور آشتی نے مل کر دوبارہ کام کا آغاز کیا اور آشتی نے ثابت کیا کہ وہ ایسکی بہت سی صلاحیتوں کی مالک ہے۔ یہ مارشل آرٹ کی ماہر تھی، میک اپ کے ذریعے اپنی شناخت چھپا لیتی تھی اور اداکاری تو اسے خوب آتی تھی۔“

”رانا ایوب کی گرفتاری کے بعد ڈیوڈ ایڈ کھنی ہمارا ساتھ چھوڑ چکی تھی اس لیے میں نے خود مختلف ممالک میں موجود اسمگلروں سے رابطے کئے اور اپنے طور پر کام شروع کر لیا۔ ہم نے نشیات کی پہلی کھیپ بڑی کامیابی سے بیچی اور اس کا معاوضہ بھی ہیروئن کی صورت میں ہمیں مل گیا۔ پہلی کھیپ سے ہمیں اندازہ ہوا کہ اس کام میں بہت زیادہ منافع مل سکتا ہے لیکن افسوس کہ ہمیں دوسری کھیپ بھیجنے کا موقع ہی

نہیں ملا۔ ایک دن ایک چھوٹی سی غلطی کے ذریعے ماما جی کے خاص آدمی ماکے کو علم ہو گیا کہ نوادرات کی آڑ میں نشیات بھی اسمگل ہو رہی ہیں اور اس کام میں آشتی ملوث ہے۔ مجھے فوراً آشتی کو منظر سے ہٹانا تھا لہذا میں نے وہ سارے ہیرے اس کے حوالے کیے اور اسے لاہور روانہ کر دیا۔ آشتی کو یہ ہیرے ہمارے ایک خاص آدمی کو پہنچانے تھے جس کا نام وسیم احمد تھا۔ وہ میرا پرانا دوست اور بہت بڑا سنا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ ہیرے بیچ کر ہمیں جو رقم ملے اس کے ذریعے ہم پاکستان سے باہر جانے کا بندوبست کر لیں لیکن افسوس ہی دن وسیم احمد کی جیورل شاپ پر ایک ڈلیٹی کے دوران اسے قتل کر دیا گیا۔ میں نے آشتی سے کہا کہ وہ ہیروئن کو کسی بینک لاکر میں محفوظ کر کے واپس مراد آباد آ جائے لیکن اسی دوران آشتی کو اندازہ ہوا کہ کوئی مسلسل اس کے تعاقب میں ہے۔ یہ ماکے کے آدمی ہی تھے اور انہوں نے آشتی کو اتنی مہلت ہی نہ دی کہ وہ ہیرے چھپا سکے۔ اسی بھانگم بھاگ میں آشتی نے واپس گاؤں آنے کا فیصلہ کر لیا لیکن وہ لوگ ٹرین میں بھی اس کے پیچھے لگ گئے۔ آشتی نے میک اپ کے ذریعے اپنا بہروپ بدل رکھا تھا لیکن... پھر بھی وہ ہیروئن سے متعلق پریشان تھی۔ اسی دوران مجھے تمہارا فون موصول ہوا کہ تم گاؤں آ رہے ہو۔ میں نے آشتی کو تمہارا حلیہ بتا کر کہا کہ اگر صورت حال زیادہ خراب ہو تو وہ ہیرے کسی بھانے سے تمہارے حوالے کر دے۔ میں نے آشتی کو نہیں بتایا تھا کہ تم کون ہو۔ بس اتنا تھا کہ تم اس کے ہیروئن کی محفل حفاظت کرو گے کیونکہ میں تمہاری فطرت اچھی طرح جانتا تھا اور آشتی نے ایسا ہی کیا۔“ میں خاموشی سے اس کی کہانی سن رہا تھا۔

”اس کے بعد ہم نے جعفرات کا بے مبری سے انتظار کیا کیونکہ جعفرات کو مزار پر تم نے ہماری امانت لوٹانی تھی لیکن مزار پر بھی ماکے کے آدمی پہنچ گئے تھے۔ وہیں آشتی کو تمہاری اصلیت معلوم ہوئی تو وہ گھبرا کر واپس میرے پاس آ گئی اور اس کی بات سن کر میں نے اسے تسلی دی کہ کامران تمہیں نہیں جانتا اس لیے تم اسے اسی طرح اجنبی بن کر لو اور ہیرے واپس لو۔ اس دوران میں خود بھی ایک رات تمہارے کمرے کی تلاشی لے چکا تھا لیکن مجھے وہ ہیرے کلپ نہیں ملا۔ لہذا تم سے کہے گئے وعدے کے مطابق آشتی پرانے رہت پر پہنچی لیکن ماکہ اس کے پیچھے وہاں بھی پہنچ گیا اور اس بار وہ پکڑ لیا گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب میں ماما جی کے ساتھ چھوٹا جھگڑا کر گیا ہوا تھا۔ ماکے نے آشتی کو

پیدا کی جاسکتی ہے۔“ اس نے بات ختم کرنے کے بعد یوں مسکرا کر میری طرف دیکھا جیسے مجھ سے اپنے کارناموں کی داد وصول کرنا چاہتا ہو۔

”تم نے ایسا کیوں کیا..... جواد؟“ میں نے تھکے سے لہجے میں کہا۔

”میں نے ایسا کیوں کیا؟ اچھا سوال ہے۔“ وہ اچانک ہی بے چین سا ہو گیا جیسے میں نے اس کی دقتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ کرسی سے اٹھ کر ٹپکنے لگا۔ ”تم نہیں سمجھ سکتے۔ کبھی نہیں سمجھ سکتے کہ میں نے ایسا کیوں کیا کیونکہ تم ایک آن بان اور شان والے چودھری کی اولاد ہو۔ تمہیں دنیا کی ہر نعمت پلیٹ میں رکھ کر پیش کی گئی ہے۔ سوئے کا بیج لے کر تم پیدا ہوئے اور آج تک وہ بیج سونے کا ہی رہا۔ پھر تم کیسے جان سکتے ہو کہ جو بندہ دوسروں کی چھٹکی ہوئی روٹی پر زندگی گزار رہا ہو، اس پر کیا بنتی ہے۔ تمہارا بینک بیلنس تو آج تک لاکھوں کے ہندسوں سے کم نہیں ہوا تو تم یہ کیسے سمجھ سکتے ہو کہ جب کوئی لونوں کی گڈی دیتے ہوئے کہتا ہے..... یہ لو اس مینے کا خرچ تو عزت نفس یہ کیا کڑ رتی ہے۔ کیا جاگیر میں میری ماں کا حصہ نہیں تھا؟ اور اس کے علاوہ میرے باپ کی جائیداد بھی تو تھی..... لیکن ان کے مرجانے کے بعد ماما جی نے اپنی بہن کی کفالت کا ڈراما مار جاتے ہوئے ایک طرف زمانے کو یہ بتایا کہ وہ اپنی بیوہ بہن اور سیتھ بھانجے سے کتنی محبت کرتے ہیں تو دوسری طرف بڑی خاموشی سے ہماری جاگیر کا حصہ بھی بٹپ کر گئے..... مگر تم یہ سب کچھ نہیں سمجھ سکتے کامی۔“ وہ رخ کبھ میں بولتا چلا گیا اور میں واقعی کچھ بھی نہیں سمجھ پایا۔

”جان! کیوں وقت برباد کر رہے ہو اس پر۔ ہمیں ہیرے تل چکے ہیں۔ ہمیں اب یہاں سے چلنا چاہیے۔“ اچانک آشتی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تو وہ آشتی کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

”تم ٹھیک کہتی ہو آشتی۔ ہمیں مزید وقت برباد نہیں کرنا چاہیے۔ اب ان باتوں سے کیا مطلب۔“

پھر وہ میری طرف مڑا۔ ”مجھے معاف کر دینا کامی۔ میں تمہارے معاملے میں مجبور ہوں۔ میں کبھی بھی ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن تمہاری قسمت تمہیں بار بار ہمارے آڑے لا رہی ہے۔ ہم یہاں سے دور جا رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ تمہاری وجہ سے ہمارا راز وقت سے پہلے ہی فاش ہو جائے۔ اس لیے تمہارا مرجانا ہی ہمارے لیے فائدہ مند ہے۔“ اس نے کولٹ پائل نکالتے ہوئے کہا۔ میں اتنا

کہاں چھپایا تھا، مجھے بالکل علم نہیں تھا مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ تم نے آشتی کو ڈھونڈ لیا اور اس سے پہلے کہ تم اسے آزاد کرواتے، ماما جی نے آشتی کو نواب شیر احمد کے حوالے کر دیا۔ اس وقت تک مجھے علم ہو چکا تھا کہ آشتی کو کہاں قید کیا گیا ہے اور میں اسے چھڑوانے کا منصوبہ ہی بنا رہا تھا کہ تم نے مجھ سے رابطہ کیا اور میں نے تمہیں استعمال کرنے کا سوچا لہذا میں نے آشتی کا پتا تمہیں بتا دیا اور تم نے تو کمال ہی کر دیا..... بالکل کسی فلمی ہیرو کی طرح حملہ کیا اور اسے بچالائے۔ اس کے بعد میں نے شو کے کو تمہاری مدد کے لیے بھیجا اور شو کے نے ہی آشتی کو ایک موبائل فون دیا جس سے آشتی نے چھپ کر مجھ سے رابطہ کیا۔ اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ تم اس کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہو۔ سچی میں نے ایک اور پلان بنایا اور آشتی سے کہا کہ وہ بھی تم سے محبت کا ڈھونگ رہ جائے۔ آشتی نے ایسا ہی کیا اور اس نے تمہیں اپنی مظلومیت کی ایسی داستان سنائی جسے سن کر تم آشتی کے حمایتی بن کر اپنے ہی باپ اور نواب صاحب کے دشمن بن گئے اور پھر اپنی محبت کے نئے میں چور ایک دم تن نے اسے ہیرے واپس کر دیے۔ آشتی چاہتی تھی کہ وہ فوراً واپس آ جائے لیکن میں اس پلان کو جاری رکھنا چاہتا تھا۔ اگر ایک طرف مجھے آشتی اور ہیروں کی فکر تھی تو دوسری طرف مجھے اس بات کی بھی خوشی تھی کہ چودھری شمشت علی کے بیٹے نے اس کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ اب مگر آشتی غلط ثابت ہو جاتی تو تمہاری بغاوت بھی دم توڑ جاتی اور میں ہرگز ایسا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا میں نے حق نواز کے گھر پر حملہ کر کے آشتی کو اغوا کرنے کا ڈراما کھیلا اور اس طرح کھیلا کہ تمہیں لگے کہ یہ سب کچھ نواب صاحب نے ہی کیا ہے۔ اس کے بعد تمہاری اور نواب کی کھلی جنگ ہوئی اور یہی ہوا۔ تم نے واقعی کمال کر دیا۔ نواب کے ڈیرے کے ساتھ ساتھ اپنے ہی باپ کے گوداموں کو بھی جلا ڈالا۔ مجھے بہت خوش ہوئی اگر یہ جنگ جاری رہتی لیکن مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ ہیرے تو قتل ہی تو میرے پاس اور کوئی چارہ نہیں رہا کہ میں تمہارے سامنے آ جاؤں۔ ویسے بھی اب مزید ڈراموں کی ضرورت نہیں رہی۔ تمہارے بتا دینے کے بعد ہیرے مجھے مل ہی چکے ہیں۔ اب میں اور آشتی ہیروں سمیت اس گاؤں سے بلکہ اس ملک سے ہی چلے جائیں گی۔ ہاں، ایک چھوٹا سا ڈراما یہ ضرور ہوگا کہ تمہاری موت کو یوں ظاہر کیا جائے جیسے کہ تمہیں نواب کے آدمیوں نے مارا ہے۔ اس طرح چودھری شمشت علی اور نواب کے درمیان بھی دوری

آ رہا تھا۔ پتا نہیں گولی جواد نے چلائی تھی یا آشتی نے..... یا پھر یہ ان کے کسی آدمی کی کن سے نکلی تھی۔ بس سچ اتنا تھا کہ اس پر میرا نام لکھا تھا۔ رد کی ناقابل برداشت لہر میرے سینے سے اٹھنے لگی۔ میں سختی سے دانت بھینچے اپنی چیخ کو روکتا رہا۔ حتیٰ کہ ہوش و حواس کی دنیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

محبت اس وقت شروع ہوتی ہے جب ہمیں اس کی بالکل بھی ضرورت نہیں ہوتی اور یہ اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب ہمیں اس کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگے۔ بالکل انسان کی زندگی کی طرح..... یوں اچانک شروع ہو جاتی ہے کہ ہمیں پتا ہی نہیں چلتا کہ کب ہم پیدا ہوئے اور کب بڑے ہو گئے اور یہ زندگی اس وقت اچانک ہی ختم ہو جاتی ہے جب ہم جینا سیکھ چکے ہوتے ہیں اور مزید جینے کی چاہ لے لے ہوتے ہیں۔ مجھے زندگی کی ضرورت نہیں رہی تھی، شاید اس لیے مجھے دوبارہ زندگی لوٹا دی گئی۔ گولی میرے دل میں گھسنے کے بجائے ٹیڑھے راستے پر جا چکی۔

میں ساہیوال کے ایک ہنگے ترین پرائیویٹ اسپتال کے کمرے میں تھا۔ یہاں بھائی شفیق اور عمران موجود تھے۔ میری حالت خطرے سے باہر ہو چکی تھی اور اب مجھے کمرے میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر اور نرسیں میرا مکمل خیال رکھ رہے تھے۔ جب سے میں ہوش میں آیا تھا، میں نے بولنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ دلوں بھائی خود ہی بولتے رہتے، میں بس ہوں ہاں میں جواب دیتا رہتا۔ انہی دلوں میں ایک دن عمران بھائی نے بتایا کہ وہ مجھ تک کیسے پہنچے۔ آشتی کا چچا کرتے ہوئے ماکھا اور اس کے آدمی عین اس وقت وہاں پہنچے جب مجھے گولی مارنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ انہوں نے اس عمارت پر دھوا دبول دیا۔ وہاں پندرہ منٹ شدید فائرنگ کے بعد جواد کے سارے آدمی مارے گئے جبکہ وہ خود آشتی سمیت نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ تب مانگے کو اندازہ نہیں تھا کہ اندر میں کس حال میں ہوں۔ جب وہ مجھ تک پہنچا تب تک میں گولی کا شکار ہو چکا تھا۔ مجھے شدید تشوہ کا نشانہ بھی بنایا گیا تھا۔ میری کبھی اور گھٹنے کا جوڑ متاثر ہوئے تھے۔ بجلی کا کرنٹ بھی لگا یا گیا تھا۔ مانگے نے فوراً مجھے مراد آباد کے اسپتال پہنچایا جہاں طبی امداد کے بعد مجھے شہر روانہ کر دیا گیا۔ اسی دوران میں وہ چودھری حشمت علی کو اطلاع دے چکا تھا۔ اس ساری افراتفری میں کسی کا دھیان جواد اور آشتی کی طرف نہ گیا اور وہ دلوں فرار ہو گئے۔ قدرت نے میرے ساتھ کیسا مکمل کھیل کھلا تھا کہ جن

پرسکون تھا کہ مجھے خود یہ جبرت ہو رہی تھی۔ حالانکہ جو میں دیکھ اور سن چکا تھا، مجھے کسی بھی وقت برین ٹیمبرج ہو سکتا تھا مگر جانے کیوں اس ”پہلی تکلیف“ کے بعد اب میں اتنا بے حس ہو چکا تھا کہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں اگلے چند منٹوں میں مرے والا ہوں، مجھے نہ تو خوف محسوس ہو رہا تھا اور نہ ہی زندگی کی تنہا باقی رہ گئی تھی۔ جسے دل میں جکھ دی جاتی ہے تو اسے یہ حق بھی دیا جاتا ہے کہ وہ اس گھروندے کے ساتھ من چاہا سلوک کرے۔ انسان اپنی ساری زندگی اسی کھوج میں لگا دیتا ہے کہ یہ دنیا کیا ہے؟ جب اس پر اس دنیا کی حقیقت آشکار ہو جاتی ہے، تب وہ مر جاتا ہے۔ مجھے بھی اب زندہ رہ کر کیا کرنا تھا۔ کہ میں دنیا کی حقیقت کو اس لمحے میں پہچان گیا تھا۔ میرے ماتھے سے بہنے والا خون میری پلکوں سے ہوتا ہوا آنکھوں میں گھس رہا تھا۔ مجھے اس وقت ساری دنیا خون میں نہائی ہوئی نظر آ رہی تھی..... اسی خون آشام منظر میں میں نے جواد کو دیکھا۔ اس نے پتول کا رخ میری جانب کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش نہیں تھی، چہرے پر ملال نہیں تھا۔ مجھے پتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے ٹریگر دبا دے گا لیکن میں اس کے ساتھ کھڑی آشتی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ دشمن جاں صرف ہونٹوں سے کہہ دیتی کہ ”کا مران مر جانا.....“ تو میں مر جاتا۔ جواد کی انگلی ٹریگر پر دباؤ بڑھانے لگی۔

”تو مجھے مارے گا جودی۔ اپنے سب سے اچھے دوست کو۔ اپنے بھائی کو؟ اتنا حوصلہ کہاں سے لے آیا ہے جگر؟“ میں نے ہنسی آواز میں کہا۔

”کاش تو اس معاملے میں نہ پڑتا اور مجھے یہ سب اس طرح نہ کرنا پڑتا لیکن میں مجبور ہوں کامی۔ میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ اگر تو بچ گیا تو چودھری حشمت علی کو سب کچھ پتا چل جائے گا۔ اس لیے تجھے مرنا ہی ہو گا میرے یار۔“ اس نے دھمی لہجے میں کہا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب اچانک باہر سے تیز فائرنگ کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یوں لگا جیسے پوری فوج نے اس گھر پر حملہ کر دیا ہو۔ ترتر اڑتی کی گھن گھرج میں کئی برسٹ کھڑکیوں کو ٹوڑتے ہوئے کمرے کی دیواروں میں بہوست ہونے لگے۔ کمرے میں موجود سبھی افراد اپنے آپ کو بچاتے ہوئے باہر کی طرف بھاگے۔ حتیٰ کہ کمرے کے وسط میں گری سے بندھا میں اکیلا رہ گیا۔ میں خود کو اس کرسی کی بندش سے چھڑانے لگا لیکن اسی لمحے کھلے دروازے کے باہر سے گولٹ پھل کا دھماکا ہوا۔ میں نے ایک تیز گرم صلاح کو اپنے جسم میں گھستے ہوئے محسوس کیا۔ دروازے سے باہر کوئی نظر نہیں

”میں تم سے معافی مانگتا چاہتا تھا لیکن میں ڈر گیا تھا کہ اگر تم نے مجھے معاف کر دیا تو.....“ میں رک گیا۔
 ”میں نے معاف کر دیا تو؟“ وہ سوالیہ انداز میں بولی۔
 ”تو کہیں یہ محبت کی ریت ہی نہ پڑ جائے۔ مجھ جیسوں کو معافی نہیں، سزا ملنی چاہیے۔“
 ”ایسی باتیں مت کرو۔“

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ ”تم سو گئے تھے اس لیے رات کی دو انہیں لی۔ ابھی دوں؟“ وہ خود ہی بولی۔
 ”آں..... نہیں۔ دوا سے مجھے پھر نیند آجائے گی اور میں مزید سونا نہیں چاہتا۔ تم مجھ سے باتیں کرو۔“ میں نے کہا۔ وہ میرا دل بھلائے کو باتیں کرتی رہی۔ کچھ بچپن کی یادیں، کچھ شرارتیں، کچھ ایسا وقت جب ہم بہت اچھے دوست تھے۔ وہ مجھے سناتی رہی۔ میں اس کی باتیں سناتا رہا۔ یہ وہ تھی جو بچپن میں میرے ساتھ کھیلا کرتی تھی۔ میں، وہ، نازد اور جواد ہم سب اکٹھے ہی پلے بڑھے تھے اور ہم چاروں کی طبیعت بھی ایک جیسی ہی تھی۔ ہر وقت شرارت، ہر وقت مذاق، ہر وقت کسی نہ کسی کو تنگ کرتے رہنا۔ جواد کی یاد میرے لیے بہت تکلیف دہ تھی۔

”ماہی! تم بہت اچھی ہو لیکن میں بہت برا ہوں۔“
 میں نے اچانک اس کو ٹوکتے ہوئے کہا۔
 ”نہیں۔ ہم دونوں بہت اچھے ہیں کامی۔“
 وہ تھکا جوتیت گیا۔

”اس وقت کو برا بھی تو میں نے ہی بنایا تھا۔ کاش ہماری زندگی ”ری وائسڈ“ ہو سکتی تو جانتی ہو میں کیا کرتا؟ میں زندگی کو بچپن میں ہی رکھتا۔ اپنے آپ کو..... نہیں..... ہم سب کو بھی بڑا ہونے ہی نہیں دیتا۔ کاش کہ میں تمہارے درد کا ازالہ کر سکتا۔“ وہ آہستہ سے اٹھ کر میرے قریب آئی اور ایک پھونک میرے چہرے پر مارتے ہوئے اس نے میری آنکھ کے گوشے سے ٹپکتے آنسو کو اپنی پور میں سمیٹ لیا۔

”سوجاؤ کامی! سوچیں تکلیف دیتی ہیں.....“
 سوجاؤ۔ ”وہ میری پیشانی کو اپنی نازک سی انگلیوں سے دبانے لگی۔ میں اس کے کس سے شرمندہ سا ہو کر سو گیا۔

ماہی میرے ساتھ ہی رہی۔ میری دوا میں، کھانا اور ایکسر سائز کی تمام ڈے داری اس نے خود ہی اپنے اوپر لے لی۔ عمران، مینا اور احسن..... ماہی کے ساتھ دل کر میری دل جوئی کرتے رہتے۔ روز صبح سے ہی سارے میرے کمرے میں اکٹھے ہو جاتے۔ بھی کیرم تو بھی لوڈ وہ بھی پہیلیاں تو بھی کسوٹی کا دور چلتا۔ ڈاکٹر دل نے ایک عجیب سی ایکسر سائز

لوگوں سے میں نے محبت کی تھی، انہوں نے ہی مجھ سے میری زندگی جھیننے کی کوشش کی اور جن سے میں نے نفرت کی تھی، انہوں نے میری زندگی بچالی۔ میں جب تک جاگتا رہتا کمرے کی اگلیوں کھڑکی کے شیشوں سے باہر خوبصورت پھولوں کو دیکھتا رہتا۔ جب یہ منظر دیکھ کر آنکھیں دیکھنے کی حد تک تھک جاتیں تو سو جاتا۔ دن گزرتے گئے اور مجھے اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا۔ جس دن میں حویلی پہنچا تو ساری حویلی میں چراغاں کیا گیا تھا۔ بڑے گیٹ سے رہائشی عمارت تک آتش بازی کی گئی۔ سب سے پہلے بھر جانی نے مجھے گلے لگایا اور کتنی ہی دیر روتی رہیں۔ میں نے انہیں چپ کرانے کی بھی کوشش نہیں کی۔ پھر نازد بڈائی آنکھوں سے سانے آئی۔ مجھے اوپر میرے کمرے کے بجائے نیچے ہی ایک کمرے میں بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ یہ کمرہ میرے لیے ہی سیٹ کیا گیا تھا۔ میرے بستر کے ارد گرد بھی گھروالے آن کھڑے ہوئے۔ عمران بھائی، نازد اور بھر جانی کو تفصیل سے بتا رہے تھے کہ مجھے دوا میں کیسے اور کب دینی ہیں۔ کھانے میں کیا اور کیا کھلانا ہے اور دوسری ہدایات وغیرہ تھیں۔ میں نے آنکھیں بند کیں اور سو گیا۔ پھر جس وقت آنکھیں کھلیں تو باہر رات ہو چکی تھی جبکہ کمرے میں ہلکے پادور کا ایک بلب روشن تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا بھی چوڑیوں کی ٹھٹھکنا ہٹ نے سناٹے کو توڑا۔ میں نے سر سمجھا کر دائیں جانب دیکھا۔ ایک لمبے کو مجھے لگا جیسے کوئی فرشتہ میرے داہنی جانب بیٹھا ہے لیکن وہ ماہی تھی۔ سفید براق لباس اور سفید جاب کے دیے ایک جائے نماز پر دعا کے لیے اپنے ہاتھ بلند کیے بیٹھی آسمان سے اتاری کسی پائیزہ مخلوق کے مانند ہی نظر آ رہی تھی۔ میری آہٹ یا کراس نے جلدی سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں کو چہرے پر پھیرتے ہوئے میری طرف آ گئی۔

”کچھ چاہیے کامران؟“ سفید جاب میں اس کا چہرہ دھک رہا تھا۔

”پانی۔“ میں نے آنکھیں موندتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا تو اس نے فوراً پانی کا گلاس بھرا اور ایک ہاتھ میری گردن کے عقب میں ڈال کر مجھے ذرا سا اٹھا کر پانی پلا دیا۔
 ”درد تو نہیں ہو رہا؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے کہا تو وہ قریب پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”کیسی ہو ماہی؟“ میں نے آنکھیں کھول کر اس کی جانب دیکھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ سر جھکا کر بولی۔

بتائی تھی۔ سینے کی ورزش کرنے کے لیے منہ سے غبارے پھلانے کا نسخہ تجویز کیا تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ سوائے میرے سبھی اسی شغل میں مصروف رہتے۔ کسی کا غبارہ دھماکے سے پھٹ جاتا تو کسی کے ہاتھوں سے چھوٹ کر شوں کی آواز کے ساتھ راکٹ کی طرح پرداز کر جاتا۔ ان کی کوششیں کامیاب رہتیں اور جب بھی میں کسی بات پر بے اختیار ہنس پڑتا، تب ان سب کے چہرے خوشی سے دھک اٹھتے۔

ان سارے لمحات میں میں نے ناز و کو بہت بدلا ہوا محسوس کیا۔ وہ شہر اور چٹائی سی لڑکی ایک دم خاموش اور سہمی سہمی نظر آنے لگی تھی۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کے بھائی کی سزا اسے دی جائے گی۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ کمرے میں مجھے کھانا دینے آئی تو میں نے اسے پاس بٹھالیا۔

”تمہیں کیا ہوا نازو۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم مسکراتا بالکل ہی بھول گئی ہو۔“

”نہیں تو۔۔۔ میں تو بس تمہارے لیے پریشان تھی۔“

وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

”پریشان تو سب ہیں لیکن تم تو خوفزدہ بھی ہو۔۔۔۔۔۔“

کیوں؟“ میں نے بخور اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کیا عمران بھائی نے کچھ کہا ہے تمہیں؟“ وہ بے اختیار لٹی میں سر ملانے لگی۔

”دیکھو۔۔۔۔۔۔ اگر کوئی ایسی بات ہے تو فوراً بتا دو۔ مجھے بھائی سے زیادہ بھائی عزیز ہے۔ تم جانتی ہو نا مجھے میں تو۔۔۔۔۔۔“

میں یکدم چپ ہو گیا کیونکہ وہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر رونے لگی تھی۔ میں کچھ دیر خاموش رہا پھر میں نے اس کے

ہاتھ چہرے پر سے ہٹا دیے۔

”بھائی نے۔۔۔۔۔۔ ایسا کیوں کیا کامی۔۔۔۔۔۔ وہ تو۔۔۔۔۔۔ وہ تو بہت اچھے تھے۔ وہ تو ہم سب سے زیادہ تمہارے قریب تھے۔ وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔“

”کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں ناز و جو اچھے انسان کو برا بنا دیتی ہیں۔ ویسے بھی جو ہونا تھا ہو چکا۔ اس سب میں تمہارا

تو کوئی قصور نہیں ہے پھر تم کیوں خوفزدہ ہو؟ تم صرف جو ادکی ہی نہیں میری بہن بھی تو ہو اور میں اپنی بہن کے چہرے پر

آنسو نہیں صرف اور صرف مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں۔

پلیز۔۔۔۔۔۔ میری خاطر ہی پریشان ہونا چھوڑو۔ مجھے وہی پرانی شرارتیں کرنے والی ناز و بھائی چاہیے۔۔۔۔۔۔ مجھی تم؟“ اس نے

آنسو پونچھتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اباجی اور نواب صاحب بھی آ جاتے اور ان کے

آتے ہی سارا شرارتی ٹولہ غائب ہو جاتا۔ اباجی بس روا جتی

انداز میں حال چال پوچھ لیتے۔ وہ ابھی تک مجھ سے ناراض

ہی تھے۔ نواب صاحب کے سامنے بھی میں شرمندہ ہی ہو کر رہ جاتا لیکن نواب صاحب نے میری ساری غلطیاں معاف کر دی تھیں اور یہ ان کا بڑا پرنسپل تھا ورنہ تو میں نے ان سے بہت بدگیزیاں کیں تھیں۔ محبت چیز ہی ایسی ہے۔ جب سارے فیصلے دل کے ہاتھ میں آ جاتے ہیں تو بندے کی عقل سلب ہو جاتی ہے۔

لیکن میری تمام تر کوششوں کے باوجود ایک چہرہ مجھ

سے بھلائے نہیں بھولتا تھا۔ اکثر بند آنکھوں سے بھی پانی ٹپک پڑتا۔ ایسی ہی ایک رات میری بند آنکھوں کے گوشے

چھجک رہے تھے جب کسی کے کونل سے لیوں نے میری آنکھوں کو چھوا اور اس کے ساتھ ہی آنسوؤں کے چند

قطرے میرے چہرے پر آ کرے۔ میں آنکھیں کھولنے

بغیر مائی کی خوشبو کو پہچان چکا تھا۔ اس شام وہ مجھے لان میں

لے آئی۔ سبزے کو دیکھ کر میری آنکھوں میں ٹھنڈک سی

بھر گئی۔ یہاں گلاب، پتیلی اور گیندے کی ملی جلی خوشبو پھیلی

ہوئی تھی۔ وہ میرا باپاں بازو داٹھا کر ورزش کر رہی تھی۔

میں نے کچھ دیر کوشش کی پھر اپنی تیز ہوتی سانسوں کو

سنھالنے کے لیے گھاس پر بیٹھ گیا۔ مائی گھاس پر دوڑا نو

ہو کر بیٹھ گئی اور پھر کتنی ہی دیر خود ہی بولتی رہی۔ میں بڑی

خاموشی سے اس کی بے لگان اور بے ریلٹی باتیں سن رہا۔

پتا نہیں وہ مجھے بھلا رہی تھی یا خود کہ۔

”اوہو۔۔۔۔۔۔ تمہاری دوا تو اندر ہی رہ گئی۔ میں ابھی

لائی ہوں۔“ ایک دم سے اسے خیال آیا تو وہ اٹھنے لگی مگر

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے پھر سے بٹھا دیا۔ ایک غبار سا

میرے ذہن پر چھا رہا تھا۔ کئی دنوں سے میں اس سے کچھ

کہنا چاہتا تھا لیکن ہر بار الفاظ لیوں پر آ کر دم توڑ دیتے تھے

مگر اب جانے کیوں اچانک ہی برداشت ختم ہو گئی۔

”مائی اتم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہی ہو؟ کیا تم

بھول گئیں کہ میں کون ہوں؟“

”تم اس طرح کی فضول باتیں کیوں سوچتے رہتے

ہو۔“ وہ ہاتھ چمڑاتے ہوئے بولی لیکن میری گرفت سخت

ہوتی جا رہی تھی۔

”نہیں چاہیے مجھے تمہاری ہمدردی۔ تم یہ کیوں نہیں

دیکھتیں کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں میں نے تمہیں ٹھہرا دیا تھا۔

اسی جگہ پر تم میرے ساتھ ایسا سلوک کیسے کر سکتی ہو۔“ میں

چلا یا۔ ”تم ازم مجھ پر چلاؤ تو سہی۔ مجھے ویسے ہی دھکارو

جیسے میں نے تمہیں دھکارا تھا۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتی۔“ وہ روپائی ہو رہی تھی۔

”اگر مجھ سے نفرت نہیں کر سکتیں تو یہ ہمدردی کا صوبہ رچانا بھی بند کرو۔ چلی جاؤ یہاں سے۔“ میں نے ہلکے جھنجھکے سے اس کا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ دیر ہی گم گم کھڑی اپنی کلائی کو مسلتی رہی پھر بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

رات کو میں نے نازو سے اس کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اپنے گھر چلی گئی۔

☆☆☆

اس کے بعد تین دن گزر چکے تھے، سبھی میرے قریب تھے لیکن ماہی کے جانے کے بعد یوں لگ رہا تھا جیسے وہ وقت کی رفتار کو ٹھہرا گئی ہو۔ کبھی کبھی ایک ایک منٹ گھنٹے پر ہماری لگتا۔ سارا دن ایک ہی جیسے مناظر دیکھ کر میری آنکھیں تھک سی گئی تھیں۔ نازو نے میری بیزاری محسوس کرتے ہوئے میرا لپٹا پٹ مجھے تھما دیا تھا۔ جیسے ہی میں نے اسے آن کیا، سامنے ہی میری ادھوری رپورٹ کی فائل نظر آئی۔ میں نے بے دلی سے بڑھا اور اسے ادھورا چھوڑتے ہوئے بند کر دیا۔ میرے ذہن میں مستقبل کے لیے کوئی لائحہ عمل باقی نہیں بچا تھا۔ باوجود شدید سلسلندی کے میں بستر پر ہی پڑا رہتا۔ کئی دنوں سے شیونیس کی مٹی اور نہ ہی نیا لباس پہنا تھا۔ یہ وہ لمحات تھے کہ میں خود کو بھلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسی ہی ایک شام میں چپ لے کر نکلا اور غائب دماغی سے ڈرائیونگ کرتا ہوا مراد آباد سے باہر نکل آیا۔ پہلے میں ہیڈ سلیما کی طرف آیا لیکن یہاں پر موسم اچھا ہونے کی وجہ سے خوب رونق تھی لیکن مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگا۔ پھر میرا رخ سایہ وال کی طرف ہو گیا مگر پانچپن میں داخل ہونے کے بعد میں بابا فرید کے مزار کی جانب آ گیا۔

فاتح خوانی کرنے کے بعد میں عقیقہ محن میں ایک دیوار سے ٹک لگا کر بیٹھ گیا۔ میری نظر سامنے پہاڑی پر بنے ہوئے چھوٹے گھروں پر مچی۔ میرے ارد گرد درش نہیں تھا۔ ایک سکون آئیز خاموشی سرسراہٹ آواز کے ساتھ میرے جسم لے اندر تک اتر رہی تھی۔ ایک طویل عرصے بعد میرے اندر کی ہچل خاموشی کی تہ میں چھپ رہی تھی۔ میں آنکھیں بند کر کے اس سکون کو محسوس کرنے لگا جب اچانک کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ چوہہ اور ڈھیر ساری مالا میں پہننے وہ رواجی سالنگ لگ رہا تھا جو کہ عموماً ایسے مزاروں پر پائے جاتے ہیں لیکن اس کی آنکھیں رواجی ہرگز نہیں تھیں۔ وہ مقناطیس کے مانند

وجہ خاموشی...

ایک دعوت میں چند دوستوں کے درمیان گانگی پر بحث چل نکلی۔ اس پر ایک صاحب نے کہا ”بھتی میں تو صرف غلام علی کو سنا ہوں۔“ دوسرے صاحب نے نور جہاں کی تعریف کی تو کسی نے مہدی حسن، احمد رشدی، مسعود رانا کے فن کو سراہا۔ میزبان جو دوران گفتگو خاموش بیٹھے تھے جب ان سے یہ سوال پوچھا گیا آپ سب سے زیادہ کسے سنتے ہیں؟ تو انہوں نے ٹھہرا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صاحب کچھ بولتے، ایک دم آواز آئی..... ”ارے سودا ملاتے ہو کہ نہیں، نہیں سننے کی عادت ہی ہو گئی ہے۔“

☆☆☆

کوٹاہی

انڈس کے بادشاہ عبدالرحمن ثانی سے ایک روزہ قضا ہو گیا۔ نیک نفس بادشاہ نے اپنی کوٹاہی کو چیف جسٹس امام یحییٰ کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے فتویٰ دیا۔ بادشاہ اس قصور کو کوٹاہی پر ساٹھ روزے رکھے۔ علا یوڑ کے ایک رکن نے امام صاحب کو کہا شریعت کی طرف سے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کا حکم بھی ہے، آپ نے بادشاہ کو یہ اجازت کیوں نہیں دی۔ امام یحییٰ نے بڑے غصے سے اسے دیکھا اور کہا۔ بادشاہ کے لیے ساٹھ آدمیوں کو کھانا کھانا کوئی سزا نہیں۔

☆☆☆

بخار

ایک مرتبہ ایک شاعر کو بہت تیز بخار چڑھ گیا جس کی شدت سے وہ بے ہوش ہو گئے۔ کچھ دیر بعد ہوش آیا۔ غصہ کی کیفیت میں پوچھنے لگے میں کہاں ہوں، کیا میں جنت میں آ گیا ہوں؟ پاس ہی ان کی زوجہ کھڑی تھیں۔ سمجھتے ان کا ہاتھ تمام کر بولیں۔ اللہ نہ کرے، کیا ہو گیا ہے آپ کو..... دیکھتے نہیں میں آپ کے ساتھ کھڑی ہوں۔

مرسلہ: دوزیر محمد خان۔ بھل ہزارہ

رہو گے۔“ میں جھنجھلا کر اٹھنے لگا تو اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔
 ”اچھا۔ بات سن جا میری۔ اس بار اصلی گیدڑ سنگھی
 ہے میرے پاس۔ لیٹا جا ہو گے؟“
 ”نہ تو مجھے تمہاری کوئی بات سننی ہے اور نہ کسی گیدڑ کی
 کہانی سننی ہے۔ چھوڑو میرا بازو۔۔۔۔۔“ میں اٹھنے کی کوشش
 کر رہا تھا لیکن اس کی گرفت بے حد سخت تھی۔
 ”گیدڑ سنگھی تو تجھے لے جانی ہی ہوگی۔ چاہے مفت
 میں لے جا۔ پر انکار مت کر۔“ اس کا عجیب سا امر اثر شروع
 ہو گیا۔

”کیا چڑ ہو تم۔۔۔۔۔ کیوں میرا دماغ خراب کرنے پر
 تلے ہوئے ہو؟“

”میں دماغوں کا اسپیشلسٹ ہوں۔ نیورو سرجری
 کروادوں گا۔ سانگی کا مسئلہ ہے تو وہ بھی ٹھیک کروادوں گا
 مگر گیدڑ سنگھی تو لے جانی ہوگی تجھے۔“ وہ ضدی بچوں کی
 طرح پیش آ رہا تھا اور میں اس کے منہ سے انگریزی کے
 الفاظ سن کر دوک رہ گیا اور خود کو ڈھیلا چھوڑ کر وہیں بیٹھ گیا۔
 ”اچھا لاؤ۔۔۔۔۔ کہاں ہے گیدڑ سنگھی؟“ میں نے
 پوچھا تو اس نے جلدی سے ایک پلوٹی مجھے تھادی۔ میں نے
 اسے کھولا چاہا تو اس نے روک دیا۔

”نہ نہ بالک۔۔۔۔۔ یہاں نہیں۔ یہاں بابائی کی جلائی
 شعاعیں پھر رہی ہیں۔ اس کا اثر زائل ہو جائے گا۔ گھر
 جا کے کھولنا۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ تو کیا اب میں جاؤں؟“ میں نے
 اکتا کر پوچھا۔

”بس آخری بات سنا جا۔“ پھر ایک توقف کے بعد
 وہ بولا۔ ”جب بندہ کسی نیک کام کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان کو
 بدبھمی ہو جاتی ہے۔ وہ خود تو لوٹے لے کر وائس روم میں
 جا بیٹھتا ہے لیکن اس کے شاگرد اس بندے کے پیچھے لگ
 جاتے ہیں اور پھر اسے ایسے کاموں میں الجھا دیتے ہیں کہ
 وہ بندہ اپنا نیک کام بھول جاتا ہے۔ اس طرح شیطان کی
 بدبھمی بھی دور ہو جاتی ہے۔ تو نے بھی شیطان کو بدبھمی
 کروانے کا پکا ارادہ کیا تھا لیکن افسوس اب خود ہی اسے
 چورن چٹا کر اس کی بدبھمی دور کر رہا ہے۔ سمجھ رہا ہے نا کہ
 میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ خوش
 ہو گیا۔ ”میری بعض باتیں میری اپنی سمجھ میں بھی نہیں
 آتیں۔ اس لیے میں تمہارے اور اپنے لیے اسے سلیس
 اردو میں بیان کیے دیتا ہوں۔“ اب کی بار وہ بولا تو بے حد
 سنجیدہ تھا۔

چپکا لینے والی چمک دار آنکھیں تھیں جن کو دیکھتے ہوئے
 ارادے کے باوجود بندہ نظر نہیں ہٹا سکتا تھا۔ پہلی نظر میں لگا
 میں نے اسے کہیں دیکھا ہے پھر اچانک بجلی سی کوندی اور
 مجھے یاد آ گیا کہ مراد آباد میں شاہ مراد کے مزار پر میں اس
 ملک سے اس وقت ملا تھا جب میں وہاں آٹھٹی کا انتظار کر رہا
 تھا۔ اس ملک نے مجھے ”گیدڑ سنگھی“ نامی کوئی شے کے
 بارے میں عجیب و غریب باتیں بتائی تھیں۔ اس کی آنکھوں
 میں میرے لیے شاماسالی تھی۔ ”کیسے ہو باؤ؟ بڑے عرصے
 بعد نظر آئے ہو۔“

”تمہیں یاد تھا میں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”نہیں۔۔۔۔۔ لیکن تیرے ماتھے کی روشنی یاد تھی جو تجھے
 دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔“ وہ میرے قریب ہی بیٹھ گیا
 اور اپنی لمبی الجھی ہوئی زلفوں میں انگلیاں جھنسا کر انہیں
 سنوارنے لگا۔

”اچھا۔ تو کیا وہ روشنی اب بھی نظر آتی ہے؟“ میں
 نے وقت ضائع کرنے کی نیت سے بحث شروع کر دی۔
 ”ہاں بالک! یہ سرکار کی دی ہوئی روشنی ہے۔ اس میں
 لؤ شید تک نہیں ہوتی۔ ایک بار جل جائے تو جلتی رہتی ہے۔“
 ”اس روشنی کا کیا فائدہ بابا۔۔۔۔۔ جو نظر ہی نہیں آتی۔“
 ”تجھے اس لیے نظر نہیں آتی کیونکہ تیرے لیے نہیں
 ہے۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تو میں حیران سا رہ گیا۔

”کیا مطلب؟ پھر کس کے لیے ہے؟“
 ”تجھے شاید بھول گیا ہے مگر مجھے یاد ہے کہ میں نے جو
 تجھ سے کہا تھا، قدرت تجھ سے بڑے کام لے سکتی ہے۔ بس
 تو اپنی راہ کھولی مت کر۔“

”بابائی! مجھ سے روایتی بابوں والی باتیں مت
 کریں۔ نہ تو مجھے آپ کے وجدان میں دلچسپی ہے اور نہ مجھے
 خود میں دلچسپی ہے۔“ میں نے پیراری سے کہا۔
 ”پھر کہے گا مجھے اس لڑکی سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی
 جو تجھے اس دن مزار کے عقب میں ملی تھی۔“ وہ میری
 آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

”ہاں۔ مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔“ میں نے
 غصے سے کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ میں حیران سا اسے
 دیکھنے لگا کہ ایسا کون سا لطیفہ سنا دیا ہے۔

”اگر یہ سچ ہے تو میں بھی سچا ہوں۔ میرا وجدان بھی
 سچا ہے۔“
 ”یہ تم کہاں کی ہانک رہے ہو۔ بات کیا ہو رہی تھی تم
 کیا کہہ رہے تھے اور اب۔۔۔۔۔ تم میرا دماغ خراب کر کے

جار ہے تھے، ایک دم سے بھاپ بن کر اڑ گئے۔ اس دہکتی آگ میں میرا سارا وجود جل گیا۔ کہتے ہیں آگ ہر شے کو پاک کر دیتی ہے۔ میرے اندر کی پراگندگی بھی صاف ہو گئی۔ میں وہی پرانا کامران چودھری بن گیا جس کا مقصد روایتی قسم کی محبت نہیں کچھ اور تھا۔

☆☆☆

وڈے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے میں ٹھیک کر رک گیا۔ اندر سے اباجی کی گرج دار آواز گونج رہی تھی۔ ”مجھے جواد چاہیے۔ زمین کھود کر نکال یا آسان پر جا کر ڈھونڈ۔ ایک بار وہ مجھے زندہ حالت میں اسی کمرے میں چاہیے باگھے۔“

”فکر نہ کر بس چودھری جی۔ بہت جلد ہم اس تک پہنچ جائیں گے۔“ ناکھنے کی آواز گونجی۔ ”وہ اس ملک سے نکلنے کی کوشش میں ہوگا۔ سارے انٹرپرائس پر تو میں نے بندے بخا دیے ہیں۔ غیر قانونی طریقے سے بھی نکلنے کی کوشش کرے گا تب بھی ہمیں اطلاع مل جائے گی۔ چھپ کر بیٹھے گا تو کتنی دیر بیٹھا رہے گا۔ میرے آدی کتوں کی طرح اس کی بوسکوت رہے ہیں۔“

”مجھ سے لمبا انتظار نہیں ہوتا۔ اس نمک حرام کو جلد سے جلد ڈھونڈ اور ساتھ میں وہ کڑی (لڑکی) بھی تھی۔ اسے بھی ذہن میں رکھ۔ ان دونوں کو میں نے عبرت کا نشان بنا کے رکھا ہے۔“ میں کمرے میں داخل ہوا تو خاموشی چھا گئی۔

”ہاں بھئی..... کیسی طبیعت ہے اب تیری؟“ اباجی نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”میں اب بالکل ٹھیک ہوں اور میں شہر واپس جانا چاہتا ہوں۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش رہے پھر مسکرا کر بولے۔

”ہاں تو ٹھیک ہے۔ جوان بندہ ہے۔ جوانی میں ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ بس بندے کا جکرا مضبوط ہونا چاہیے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا۔ اب آگے کی فکر کرنی چاہیے لیکن کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ تو اب یہیں رہ؟“

”شہر میں میرے کچھ کام ادھورے رہ گئے ہیں۔ انہیں پورا کرنا بہت ضروری ہے، اس کے بعد یہیں واپس آؤں گا۔“ میں نے کہا تو وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بڑبڑائے۔

”ادھورے کام؟“ پھر حقہ گزرتا تے ہوئے کہنے لگے۔ ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... کام ادھورے بھی نہیں چھوڑنے چاہئیں۔ تجھے جانا ہے تو جا لیکن گاڑی لے کر جانا

”تو نے کچھ ایچھے کاموں کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن حالات نے تجھے ایسی کہانی میں جھونک دیا جو تیرے معاملے سے ہٹ کر تھی۔ اب وہ کہانی تو نہیں رہی لیکن وہ مقصد ضرور کامیاب ہو گیا جس کی خاطر تجھے اس کہانی میں سیکنڈ ہیرو کا رول دیا گیا تھا۔ تو کہانی کے ساتھ ساتھ اپنے ارادوں اور منصوبوں سے بھی دور نکل گیا ہے۔ اپنی راہ کو ٹھنی کر رہا ہے۔ صراطِ مستقیم سے ہٹ گیا ہے۔ اب تو سمجھ گیا ہوگا کہ میں کیا بات کر رہا ہوں۔“

اس کے لہجے میں ایسی سنجیدگی تھی کہ میں سن ہو کر رہ گیا۔ ”مہمیں..... یہ سب کیسے پتا؟ مطلب تم تو.....“ مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کہوں۔ وہ فوراً پھر سے پٹری سے اتر گیا۔

”یہ سارا کمال گیدڑ شگھی کی سنگت کا ہے۔ اب سے یہ تمہارے ساتھ بھی رہے گی تو تم بھی ایسے کلف جانے لگو گے۔“ میں خاموشی سے اچھ میں پکڑی پھل کی سرخ پوٹی کو گھورتا رہا۔ حوصلی واپس آ کر اپنے کمرے میں تنہا بیٹھے ہی میں نے ملک کی دی ہوئی پوٹی کوئی تو اس میں گیدڑ شگھی نہیں تھی۔ بس ایک عام سا پتھر تھا۔ ایسا وہ پہلے بھی کرچکا تھا۔ ساتھ میں کاغذ کا ایک ٹکڑا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس پر ہنگی پھل کے ساتھ اردو میں لکھا تھا۔

”سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں جو تمام مخلوقات کا پروردگار ہے۔ بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔ انصاف کے دن کا حاکم ہے۔ اے پروردگار! ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہم کو سیدھے رستے پر چلا۔ ان لوگوں کے رستے پر جن پر تو اپنا فضل و کرم کرتا رہا۔ نہ کہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا اور مگرا ہوں کے۔ (الفتح)“

میرے ذہن میں سوچوں کا ایک بھونچال آ کر ظہر ہوا..... ”تو اپنی راہ کو ٹھنی کر رہا ہے۔ صراطِ مستقیم سے ہٹ گیا ہے۔ اپنے اردوں اور منصوبوں سے باہر نکل گیا ہے۔ تجھے بیکانے والے کامیاب رہے اور تو ناکام ہو رہا ہے۔ کامران چودھری! جو غلط نظام کے پہاڑوں سے ٹکرانے نکلا تھا۔ محبت کی ایک روایتی سی کہانی میں کسی بارے ہوئے ہیرو کے مانند کمرے میں چھپا بیٹھا ہے۔“

شدید غصے کی ایک لہر اٹھی اور میں اندر سے جھک کر رہ گیا۔ آہستگی کی ساری کہانی جو دھوکے سے شروع ہو کر دھوکے پر ختم ہوئی تھی، ایک دم سے جیسے سارے جذبات ہم ہو گئے۔ وہ سارے خیالات جو مجھے پریشان کیے

بلکہ رشید (ڈرائیور) کو بھی ساتھ لے جانا۔“

”نہیں، میں صرف گاڑی لے کر جاؤں گا اور آج شام کو ہی چلا جاؤں گا۔“ میں نے کہا اور کچھ لمحوں بعد باہر نکل آیا۔ رات تک میں لاہور میں اپنے ماڈل ٹاؤن والے گھر میں بیٹھ چکا تھا۔

چودھری حشمت علی کے غیر قانونی کاموں سے متعلق ایک فہرست میرے سامنے تھی۔ نوادرات کی اسمگلنگ کے علاوہ چودھری حشمت علی نے کئی ایک سرکاری زمین پر قبضہ کر رکھا تھا۔ افسران کی مدد سے جگل میں بیش قیمت گڈڑی کی چوری ہو رہی تھی۔ کروڑوں روپے کے بینک قرضوں سے معافی لے رکھی تھی اور کروڑوں روپے کا بیس ادا نہیں کیا گیا تھا۔ نجی جیلوں میں غریب مزارعے قید تھے۔ حکومتی سطح پر اربوں روپے کے ٹیکے اور اپنی مرضی کے ٹینڈرز اپنے دوستوں کو نواز رکھے تھے۔ اعلیٰ حکومتی عہدیداروں سے مل کر کئی طرح کی اجناس کو ذخیرہ کر کے مصنوعی قلت کے بعد مہنگے داموں فروخت کرنے کا سلسلہ جاری تھا اور ان کاموں میں چودھری حشمت علی اکیلے نہیں تھے، ان کے ساتھ کچھ ایسے طاقتور لوگ بھی تھے جو سرکاری و نیم سرکاری عہدوں پر برہمجان تھے۔ جو ان کے ہر غیر قانونی کام پر خاموش بیٹھے تھے اور اس خاموشی کے عوض انہوں نے ہماری تحائف وصول کیے تھے۔ ان لوگوں میں سے کچھ کے ساتھ تو میں فارم ہاؤس کی پارٹی میں مل بھی چکا تھا۔ لیکن درحقیقت یہ سب وہ کام تھے جن سے ہر آدمی آگاہ تھا۔ فیوڈل لارڈز اور بیوروکریسی وہ ستون ہیں جن کے سہارے حکومت کی جھٹ قائم ہوتی ہے۔ اس لیے ہر زمانے میں ان ستونوں کو مضبوط رکھنے کے لیے ان کے ہر غلط کام کی پردہ پوشی کی جاتی ہے تاکہ حکومت کے بیروڑ لگانے جا سکیں۔ چنانچہ جو کام چودھری حشمت علی سرکاری افسران کی مدد سے کیے جا رہے تھے، وہ قانون میں کوئی بڑا جرم نہیں تھا کیونکہ ایسے کاموں سے ہی تو ڈیروں کا نام بنتا ہے۔ اس لیے میری ساری توجہ کا مرکز چودھری حشمت علی کی نوادرات میں دیکھی تھی جنہیں وہ اسمگل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی میوزیم کا حصہ بھی بنارہے تھے۔ میں نے شہر میں اپنے دیرینہ دوست اور صحافی فیصل بٹ کو کال کی۔ فیصل صحافیوں کے اس گروہ میں سے تھا جو حکومت سے مراعات لے کر ان کی تعریفوں بھرے کالم اور فچر لکھتے رہتے ہیں لیکن اندرون خانہ دل وہ بہت اچھا دوست بھی تھا یہی وجہ تھی کہ ہمارے مزاج

اور نظریات میں بے پناہ فاصلہ ہونے کے باوجود ہم بہت اچھے دوست بھی تھے۔ میں نے فیصل سے کسی ماہر آٹا قدیمہ کے بارے میں پوچھا تو اس نے مجھے ڈاکٹر شہاب اقبال کا فون نمبر دیا۔ وہ اس فیلڈ میں ماہر سمجھے جاتے تھے۔ چنانچہ میں نے فوراً فون کر کے ان سے ملاقات وقت طے کیا۔ انہوں نے بتایا کہ آج شام کو کارڈ آئیوڈیم میں ان کا ایک پیکر ہے، میں اس کے فوراً ان سے مل سکتا ہوں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ وہ قدرے چھوٹے قد کے دبلے پتلے انسان تھے۔ سر کے سارے بال اور بھوس تک سفید ہو چکی تھیں لیکن آواز ان کی اب بھی قابل رشک حد تک گونج رہی تھی۔

”سر! میرا نام کامران ہے۔ بجائے گھما پھرا کے میرے آپ کو بالکل سچ اور صاف بات کروں گا کیونکہ مجھ میں ایک ہی بری عادت ہے کہ میں پیکر کے سامنے بھی جھوٹ بیٹھ بول سکتا۔ میں ایک صحافی ہوں اور ایک رپورٹر کے سلیا میں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔“

”رپورٹر..... کیسی مدد؟“ وہ چونکے۔

”سر! آپ آثار قدیمہ کے ماہر ہیں۔ میرے پاس چند نمونے ہیں۔ کیا آپ انہیں محض دیکھ کر یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ اصل ہیں یا نقلی؟“

”ہاں..... کیوں نہیں۔“ وہ حیرانی سے بولے۔

”لیکن یہ نمونے ہیں کہاں اور تمہیں کہاں سے ملے؟“

”نمونے میرے پاس نہیں ہیں بلکہ نیشنل میوزیم میں ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ میوزیم انتظامیہ نے اصل نمونے سچ کر وہاں نقلی نمونے رکھوائے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک بار وہاں جا کر اس بات کی تصدیق کریں کہ وہ واقعی نقلی ہیں یا نہیں۔“

”ادھ..... لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میرا مطلب ہے کہ پیکر منشری کی ذمہ داری آرٹ کی حفاظت کرنا ہے نہ کہ انہیں ختم کرنے کی کوشش کرنا۔ یہ کیسے ممکن ہے؟“

”سر! جس معاشرے میں ہم جی رہے ہیں..... وہاں سب کچھ ممکن ہے۔ ہم تو اپنا سارا ملک نظریوں کی حفاظت میں دے کر رات کو سکون سے سوتے رہتے ہیں۔ یہ تو پھر جس اسی تہذیب کی چوری ہے جو پہلے سے ہی ہم گشتہ ہے۔ پلیز سر! میں ان کرپٹ لوگوں کو بے نقاب کر رہا ہوں۔ مجھے آپ کی بس یہ چھوٹی سی مدد درکار ہے۔“

وہ عینک صاف کرتے ہوئے سوچ میں پڑ گئے پھر کہنے لگے۔ ”پرسوں ایک چینی وفد کے ہمراہ میں نیشنل

ہے؟ انگلیڈ میں، پیرس میں، پورے یورپ میں۔ وہ لوگ یہاں سے اسکل کیا گیا، بچا گیا، یا پھینکا گیا ایک ایک ہیں اکٹھا کرتے ہیں اور اپنے میوزیم میں سجاتے ہیں۔ پھر ہم جیسے لوگ ہزاروں روپے خرچ کر کے اسی ملک میں ان نوادرات کو دیکھنے جاتے ہیں اور اپنی آنکھیں خیرہ کرتے ہیں۔“ ریسٹورنٹ آ گیا۔ میں دروازے پر ہی رک گیا۔ ان کا بچہ بھی ختم ہو گیا۔

”اندر نہیں چلو گے؟“ وہ چونکے۔

”جی نہیں..... آپ مجھے صرف اتنا بتادیں کہ ان نقلی نوادرات کو اگر کسی لیبارٹری سے چیک کروا کر ان کی رپورٹ مطلوب ہو تو ایسی لیبارٹری کہاں ملے گی؟“

”اوہ..... لیکن پھر تو تمہیں انہیں یہاں سے اٹھا کر لیبارٹری لے جانا ہوگا..... اور یہ کیسے ہوگا؟“

”بالکل ایسے جیسے اصلی کی جگہ نقلی نے لی اور بالکل ایسے جیسے انہی ابھی ہم نے شوکیں کھلو کر انہیں ہاتھوں میں پکڑ کر دیکھا۔“

”صاحبزادے! تم کچھ اونچی اڑائیں نہیں بھر رہے؟“ انہوں نے عینک کے اوپر سے مجھے گھورا۔

”میری عادت ہے، میں وہاں تک ضرور جاتا ہوں جہاں تک میری پہنچ ہو۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے ایک کارڈ میری طرف بڑھا دیا۔

”ہوں..... یہ لوکارڈ۔“ میرا اشارہ کر رہے۔ یہ ان کے نقلی ہونے کا..... سرٹیفکیٹ بنوا سکتا ہے۔ یہ کسی تمہاری ہی طرح سر بھرا ہے۔“

میں انہیں سلام کر کے وہاں سے واپس گھر آ گیا۔ کارڈ پر خالد شریف کا نام درج تھا۔ میں نے اس سے فون پر بات کی پھر ہماری ملاقات ایک کیفے میں طے ہوئی جہاں میں نے اس سے چند باتیں کر کے اس کے مزاج کو سمجھا کیونکہ اب معاملہ نازک سے نازک تر ہوتا جا رہا تھا۔ میری ایک چھوٹی سی غلطی سے اگر یہ بات لیک ہو جاتی کہ میں فیصل میوزیم کے نقلی ہیں کا راز آشکار کرنے والا ہوں تو ہوسکتا ہے کہ وہ نہیں وہاں سے غائب ہی کر دیے جاتے۔ خالد ایک نوجوان لڑکا تھا۔ میرے معاملے میں اس نے بہت دلچسپی لی اور پھر ہم نے ایک منصوبہ بنایا اور پھر اپنے رسک پر خالد کے لیے ایک رات ہی کافی تھی۔ اگلی شام تک اس نے نقلی مجسموں کی رپورٹس تیار کر کے مجھے پہنچا دیں۔ اگلے چند ہفتوں تک میں اپنی فائل رپورٹ تیار کر چکا تھا۔

میوزیم کا یہی دورہ کرنے والا ہوں۔ اتفاق سے تم بروقت مجھ تک پہنچ گئے ہو تو میں وہاں دیکھ لوں گا۔ تم جاہو تو میرے ساتھ ہی چلا۔“ وہ راضی ہو گئے، یہ میرے لیے بڑی اہم بات تھی۔ میں وہاں سے واپس آ گیا اور پھر پرسوں میں ان کے ساتھ ہی فیصل میوزیم میں پہنچا۔

چینی وفد میں آٹھ لوگ شامل تھے جن میں تین پاکستانی تھے۔ جب ان سب کو ریفرنڈم کے لیے قریبی ریسٹورنٹ لے جایا گیا تھا تب میں ڈاکٹر شہاب کو لے کر واپس میوزیم میں پہنچا۔ میوزیم انچارج سے میری ایک دن پہلے ہی بات ہوئی تھی۔ ایک خاص رقم کے عوض وہ نوادرات الماریوں سے نکل کر چند سیکنڈ کے لیے ہمارے ہاتھ میں آ سکتے تھے۔

”میں نے شوکیں میں سے انہیں دیکھا ہے لیکن مجھے تو وہ ایک دم اصلی ہی معلوم ہو رہے تھے۔“ ڈاکٹر شہاب کہہ رہے تھے۔ جب ہم واپس ہال میں پہنچے تو انچارج بے تابی سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے شوکیں کھول دیے۔ ڈاکٹر شہاب اقبال نے ہاتھوں پر دستانے پہن لیے اور وہی اسٹوپا اٹھایا جو اس وقت حویلی کے تہ خانے میں موجود تھا لیکن ہاتھ لگتے ہی وہ چونک گئے۔ پھر انہوں نے اسے مخدب عد سے سے چیک کیا اور ہونٹ چباتے ہوئے بولے۔

”یہ واقعی نقلی ہے۔ پلاسٹر آف پیرس سے بنا ہوا۔ کمال کا ڈیپلیکٹ ہے۔ بظاہر دیکھنے سے معلوم ہی نہیں ہوتا۔“ وہ اگلی طرف بڑھے اور فاسٹنگ بدھا کا ہیڈ اٹھالیا۔

”یہ بھی نقلی ہے.....“ وہ پیشانی مسلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ ہمارا رخ اب واپس ریسٹورنٹ کی طرف تھا۔

”ساری دنیا میں لوگ اپنی پرانی تہذیب و ثقافت کی حفاظت میں جان دینے سے بھی گریز نہیں کرتے..... اور ایک ہم لوگ ہیں جو چند روپوں کے عوض اسنے ناپاب اور نادر تہذیبی ذخیروں کو بیچ دیتے ہیں۔“ وہ افسردگی سے بولے جا رہے تھے۔

”کیا نہیں ہے اس ملک میں۔ کیسی کیسی قیمتی عمارتیں ہیں۔ آثار قدیمہ ہے۔ گزرے دور کی نشانیاں ہیں۔ یقین کر تہذیب تمدن کا ایک سمندر ہے جس میں ہم آباد ہیں۔ دنیا میں آج تک ہڑپہ جیسا جدید شہر دریافت نہیں ہوسکا اور ہم نے کیا کیا کہ اس تہذیب سے مالا مال شہر کی اینٹیں نکال نکال کر کچے کچے مکانات بنالے۔ کیا کیا گنواؤں تمہیں اور کتنی بے دردی سے ہم یہ سب ضائع کر رہے ہیں۔ تمہیں پتا ہے یہ سب کچھ جو یہاں سے نکلتا ہے کہاں جا کر محفوظ ہوتا

رپورٹ کی کاپی اپنے اخبار کے ایڈیٹر برکت صدیقی صاحب کو بچوانے کے دو دن بعد ہی جب میں سو رہا تھا تو صدیقی صاحب کی کال آگئی۔ انہوں نے رپورٹ ابھی پڑھی تھی اور اتنے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ فوراً ہی مجھے فون کر دیا۔

”یہ کیا لکھ دیا ہے تم نے؟ میں تو سمجھا تھا کہ تم نے فیوڈل لارڈز کے حوالے سے عامی رپورٹ لکھی ہوگی لیکن تم نے تو اس ضمن میں اپنے باپ سمیت کئی بڑے بڑے لوگوں کو طوط کر دیا ہے اور یہ خفیہ رستے کا تذکرہ۔ یہ رپورٹ کم اور سنسنی خیز ناول زیادہ معلوم ہو رہا ہے۔ کہیں نیند میں تو یہ سب نہیں لکھ دیا؟“

”میں نے جو لکھا ہے وہ حرف بہ حرف سچ ہے اور میرے پاس اس کے مکمل ثبوت موجود ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہونہر ثبوت۔ تم جانتے ہو کہ اس ملک میں ثبوت کی کتنی اہمیت ہے؟ تمہاری رپورٹ شائع ہوتے ہی وہ لوگ ان نقلی نوادرات کو اصلی میں بدل دیں گے پھر یہ ثبوت تمہارے کسی کام نہیں آئیں گے۔“

”میرے پاس ثبوت بھی ہیں اور گواہ بھی۔ رہی بات نقل کو اصل میں تبدیل کرنے کی تو رپورٹ شائع ہونے سے قبل ہی میں سپریم کورٹ میں درخواست جمع کرواؤں گا کہ فوری طور پر میوزیم میں رکھے اسنو پا کو تحویل میں لیا جائے اور ان کا لیبارٹری ٹیسٹ کروایا جائے۔ رہی بات خفیہ رستے کی تو اس کی جگہ بدل تو نہیں جائے گی۔ وہ جہاں موجود ہے، وہیں رہے گا۔“

”یہ ساری باتیں اپنی جگہ درست لیکن اس بات پر بہت اونچی جگہ ہاتھ مار رہے ہو۔ دیکھو کامی! مجھے اپنے اخبارات کی فکر نہیں ہے۔ حکومت کیا کر لے گی؟ بس سرکاری اشتہارات دینا بند کر دے گی؟ سرکولیشن رکاوٹ دے گی؟ ہنگ عزت کے مقدمے کروا دے گی؟ میں یہ سب پہلے بھی برداشت کر چکا ہوں اور ایک بار پھر کروں گا لیکن یہ معاملہ بہت نازک ہے۔“

”آپ مجھے روکنے کی کوشش کر رہے ہیں یا خوفزدہ کرنے کی؟“

”نہیں..... میں تمہیں صرف آگاہ کر رہا ہوں کیونکہ جس ملک میں، میں اور تم رہتے ہیں، اس ملک میں قانون کو موم کی طرح موڑ کر اپنی من چاہی شکل میں بدل دیا جاتا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ لیکن بہر حال میں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ مجھے کچھ دن

درکار ہوں گے کہ میں اس رپورٹ کا ہر طرح سے جائزہ لے سکوں۔“

”یہ آپ کی مرضی ہے اور اگر اس ملک میں کسی بھی اخبار نے اسے شائع نہ کیا تو کیا کیا راستے بھی بند ہو جائیں گے؟ میرے پاس کئی اور ایسے پلیٹ فارم ہیں جہاں اس رپورٹ کو منظر عام پر لایا جاسکتا ہے۔ آپ شائع نہیں کریں گے تو کوئی اور ضرور کرے گا اور میں اسے شائع کروا کے ہی دم لوں گا۔“ میں نے قدرے ناراضی سے کہا۔

”ہوں..... تمہاری اس دھمکی سے مرعوب ہو کر میں جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہیں کروں گا۔ ٹھیک ہے کچھ دن سوچ بچار کر کے دیکھ لیتے ہیں۔“ انہوں نے کہا تو میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ نیم رضامند ہو گئے تھے۔

☆☆☆

رات آدمی سے زیادہ بیت چکی تھی اور نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اسی کی خشکی میں میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں کمرے سے باہر نکلا تو باہر گرمی تھی لیکن چھت پر ہوا محسوس ہو رہی تھی۔ میں چھت کی منڈ پر بیٹھ گیا۔ یہاں ایک سکون دینے والی خاموشی تھی جس میں کہیں دور سے کوئی ریڈیو بج رہا تھا لیکن میری محنت کم نہیں ہو رہی تھی۔ سوچوں کی یلغار نے مجھے ہر سمت سے گھیر رکھا تھا جس میں مایوسی کا عنصر سب سے زیادہ تھا۔

یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ میں اپنے ہی باپ کے خلاف ایسا کام کیسے کر سکتا ہوں جس سے ان کی بدنامی ہو۔ مجھے گاؤں میں رہ کر اس بات کا تو پتا چل ہی گیا تھا کہ ابا میری اس رپورٹ کے بارے میں جانتے ہیں اور پھر واپسی والے دن بھی وہ میرے ”ادھو رے کام“ کے لفظ پر چپ سے ہو گئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ میں کیا کرنے والا ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ میری اس حرکت سے ان کی کتنی بدنامی ہوگی۔ وہ سب جانتے تھے لیکن اس کے باوجود انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے یہ نہیں کہا کہ کامران ایسا مت کر۔ کیا انہیں یقین تھا کہ میری اس رپورٹ سے انہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا؟ یا انہیں لگ رہا تھا کہ شاید میں ایسا نہیں کروں گا..... اور میں؟ میں کیا کر رہا ہوں؟ اس معاملے کو میں نے اتنا سیریس لے لیا کہ میری رپورٹ کی زد میں کئی اور بڑے بڑے نام آ گئے۔ وہ لوگ کوئی عام لوگ نہیں تھے۔ میں جانتا تھا کہ انہیں چیئر کر میں کتنی مشکلات میں پھنس جاؤں گا۔

(جاری ہے)

میرے دادا نے خریدا تھا۔ علاقے میں مسلمانوں کی بہت زیادہ آبادی نہیں تھی مگر زمین دار خاندانوں کے مسلمانوں کے گھر تھے۔ میں وہاں اپنے تایا زاد بھائی کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم دونوں ہی سندھ مدرسے میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اب

پارسی لڑکیوں کو دیکھنے ہم لوگ ماما پارسی اسکول کے سامنے گھرے ہو جاتے تھے۔ میں اس وقت سندھ مدرسے میں پڑھتا تھا۔ دادو سے میرے والد نے مجھے کراچی پڑھنے بھیجا تھا۔ سو بھر بازار میں بھگوان داس بلڈنگ میں ایک فلیٹ

مکافات

ڈاکٹر شیر شاہ سید

الگ مذاہب یا جدا قوم ہونے کے باوجود عشق کا آفاقی جذبہ کسی بھی دل میں اپنی جڑیں مضبوط کر سکتا ہے اور... اتنا سا فلسفہ ان عقلمندوں کی سمجھ میں نہ آسکا جن کے نزدیک یہ سراسر یہ راہ روی تھی اور جو خود کو بہت بڑے راہنما سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ اور بات کہ بہت آخر میں رشتوں کی گمشدگی کا احساس انہیں خون کے آنسو رو لایا گیا۔

دوستوں کے روپ میں دشمنی

نبھانے والوں کا ماحبرا



باد وجود کہ یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا، ہم یہ عادت نہیں چھوڑ سکے تھے کہ لیکا ایک نیوٹن اس تصویر میں آگئی تھی۔

وہ عام سی پارسی لڑکی تھی۔ گول سا چہرہ جس پر بہت نمایاں دو چمکدار آنکھیں اور پتلی سی ناک۔ وہ اسکول سے نکلتی تھی، چاروں طرف نگاہ ڈالتی تھی اور سڑک کے کنارے دو اور لڑکیوں کے ساتھ کھڑی ہو جاتی تھی۔ ٹن ٹن کرتی ہوئی ٹرام جو سولجر بازار کو جارہی ہوئی تھی، اس پر وہ تینوں بیٹھ جایا کرتی تھیں۔

میں نے اسے پہلے دن سے ہی تاڑ لیا تھا..... اور لڑکے کا کہنا کرتے تھے، مجھے خیال نہیں ہے لیکن میں بڑی بے چینی کے ساتھ نیلوفر کے آنے کا انتظار کرتا تھا۔ اس وقت تو مجھے اس کا نام پتا نہیں تھا مگر میں نے دل ہی دل میں اس کا نام آنکھوں والی رکھ دیا تھا۔ یہ ایک طرفہ عشق خاموشی سے چلتا رہا اور آہستہ آہستہ وہ میرے حواس پر سوار ہوئی چلی گئی۔ نہ میرا دل پڑھائی میں لگتا تھا اور نہ کسی اور کام کا ج میں۔ اسکول بھی میں اسی لیے جاتا تھا کہ جب اسکول کی چمچی ہوگی تو ماپا پارسی اسکول کے سامنے آنکھوں والی کو دیکھوں گا۔

اس دن لائٹ ہاؤس سنہا اور سندھ جاگیردار ہوٹل کے سامنے ٹرام رک گئی تھی۔ ایک گھوڑا گاڑی میں گاڑی بان نے ایک زخمی گھوڑا جوتا ہوا تھا۔ نہ جانے کیا ہوا تھا کہ ٹرام کی پٹری کے ساتھ ہی وہ لیکا پک کر گیا۔ گھوڑے بان اور ٹرام کے ڈرائیور کی مدد سے وہ کھڑا ہوا ہی تھا کہ ایم سی کا ایک آدمی آگیا تھا جس نے زخمی گھوڑا چلانے پر گاڑی بان کا چالان کر دیا۔ جس کے بعد گھوڑا گاڑی کے مسافر تھر تھر کرتے ہوئے ٹرام میں سوار ہونے لگے۔ گاڑی بان نے گاڑی چلی میں کھڑی کی اور کراچی میونسپل کارپوریشن کے آدمی کے ساتھ گھوڑا لے کر جانوروں کے اسپتال کی طرف جانے لگا تھا۔ اس تمام کارروائی میں دس پندرہ منٹ لگ گئے ہوں مگر مجھے ایسا لگا تھا کہ آج کی تمام محنت پانی میں مل گئی اور وہ آنکھوں والی تو شاید چلی بھی گئی ہو۔

میں جب وہاں پہنچا تھا تو وہ اپنی جگہ پر کھڑی تھی جیسے میرا انتظار کر رہی ہو۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہریں دوڑ گئی۔ مجھے پہلی دفعہ ایسا لگا تھا کہ وہ بھی میرا انتظار کرتی ہے، اسے بھی احساس ہے کہ اس کے لیے کوئی کھڑا ہوتا ہے۔ وہ دن ایک خوب صورت دن ثابت ہوا تھا۔ جن لوگوں نے اسکول کی عمر میں محبت کی ہے وہی لوگ اس خوشی، اس اطمینان کا اعزاز کر سکتے ہیں۔ اس دن میں بے بات ہنسا اور بے وجہ مسکرایا تھا۔

میں نے اس دن اپنے کزن مراد کو بھی یہ بات بتائی۔ وہ

ہمارا آخری سال تھا۔ چمچی کی کھنٹی بیچتے ہی ہم لوگ چند دوسرے دوستوں کے ساتھ مل کر محمد علی ٹراموے کمپنی کی ٹرام پکڑ کر این بے دی اسکول کے سامنے اتر جاتے تھے۔ ٹراموے کمپنی کے زیادہ تر کنڈیکٹر ہمیں جان گئے تھے۔ کبھی وہ کلٹ کے پیسے مانگتے نہیں تھے اور جب مانگتے تھے تو ہم پیسے دے بھی دیا کرتے تھے۔ وہ زمانہ غنڈا گردی اور بد معاشری کا زمانہ نہیں تھا۔ کراچی میں قانون کی بڑی پاسداری تھی۔ ہر شہری کی بڑی عزت تھی۔ غریب ہو یا امیر، مسلمان ہو یا پارسی، عیسائی یا ہندو۔ قانون ایسے تھے کہ اب میں سوچتا ہوں کہ ایسا کیسے ممکن تھا مثلاً محمد علی ٹراموے کمپنی کے یہاں ٹرام گرمیوں کے زمانے میں ساڑھے پانچ بجے چلتی تھی۔ شہر کی خوب صورت صاف ستھری سڑکوں کے درمیان چار اور پانچ منزلوں والی بلڈنگوں سے ہوتی ہوئی کھانڈی کی طرف جاتی تھی مگر شہر کے قانون کے مطابق سات بجے سے پہلے ڈرائیور کو کھنٹی بجانے کی اجازت نہیں تھی۔ بلڈنگوں میں سوئے ہوئے شہریوں کا اتنا احترام ہوتا تھا، اب تو سڑکوں پر چلنے والے جاگتے ہوئے شہریوں پر دھواں، ہارن اور گائیوں کی بھرمار جس طرح سے ہوتی ہے وہ سب کو سہنا پڑتا ہے۔ شہر اب شہر نہیں، جنگل ہے جنگل۔

اس وقت کراچی میں فرنگی عورتوں کے علاوہ صرف پارسی لڑکیاں ہی اسکرٹ پہنتی تھیں۔ ماپا پارسی اسکول کی عمارت اتنی ہی شان دار تھی جتنی اب ہے۔ یہ لڑکیاں مسکراتی، چمکتی اور ہنستی ہوئی جب اسکول سے باہر آتی تھیں تو بندر روڈ پر ایک میلے کا سامان ہو جایا کرتا تھا۔ کچھ لڑکیاں گھوڑا گاڑیوں پر بیٹھ کر اپنے گھروں کو جاتی تھیں اور کچھ لڑکیاں ٹراموں پر سوار ہو جاتی تھیں۔ چند ایک لڑکیوں کے لیے گاڑیاں بھی کھڑی ہوتی تھیں۔

ہم لوگ این بے دی اسکول کے سامنے اتر کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے والی ڈیلیوری اے کی عمارت کے سامنے پہنچ جایا کرتے تھے، جہاں کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے گپ مارتے تھے اور کبھی کن آنکھوں سے، کبھی سراٹھا کر بالمشافہ اسکول کی ان لڑکیوں کو دیکھا کرتے تھے تو ڈوڑی دیر کے بعد جب ٹریفک کا مجمع صحت جاتا تھا تو صدر سے آنے والی پریڈی اسٹریٹ کو پار کرتے ہوئے ہم لوگ ملاز اسٹیمیا کی جانب چلے جایا کرتے تھے جہاں سے ٹرام پر بیٹھ کر اپنے اپنے گھروں کو چلے جانے کا ایک معمول سلاہن لیا تھا۔

یہ سارا کام ایک احساس جرم اور احساس شرمندگی کے ساتھ ہوتا تھا۔ کلاس کے چند اور لڑکوں کو ہمارے اس معمول کا پتا تھا اور وہ لوگ ہمیں بد معاشر سمجھا کرتے تھے۔ ہمارا بھی یہی خیال تھا کہ ہم لوگ کچھ اچھا نہیں کرتے مگر کتنی دفعہ سوچنے کے

ہوا آدی تھا۔ اس نے کہا کہ یار آنکھ پھولی اور دیکھنا داکھنا
لیکن یہ باضابطہ عشق نہیں چلے گا تم مسلمان ہو اور وہ پارسی
تہارا باپ، میرا باپ کبھی نہیں مانیں گے۔ ہم دونوں
طرادے اور دیر تک ہشتے رہے۔ میں نے کہا تھا یار ابھی تو اس
نے صرف دیکھا ہے، تم کس دنیا کی بات کر رہے ہو لیکن مجھے
اور سے پتا تھا کہ میں نے نیلوفر اور اپنے متعلق بے اندازہ،
بہت سارے خواب دیکھ ڈالے ہیں۔

اسکول چلتا رہا، ٹرام چلتی رہی۔ اس طرح سے ہم
دست ماما پارسی اسکول کے سامنے کھڑے ہو کر پارسی لڑکیوں کو
ٹٹتے رہے اور دل کی بے چینی دھیرے دھیرے بڑھتی رہی۔
ہمارے کلاس ٹیچر تھے ماسٹر غنی صاحب۔ ایک دن انہوں نے
مجھے اسٹاف روم میں بلایا۔ پرنسپل کے کمرے کے ساتھ ہی
کشادہ سا اسٹاف روم تھا۔ انہوں نے کہا، پڑھنے پر توجہ نہیں
دے رہا ہوں۔ وہ بہت شفقت استاد تھے، بہت مہربان۔ بہت
دل چاہا کہ دل کھول کر رکھ دوں ان کے سامنے۔ اگر وہ پارسی
نہ ہوتی تو شاید بتا ہی دیتا۔ سر جگدھارن کی بات سنی تھی اور ان
سے جھوٹا وعدہ کیا تھا کہ اب شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

مراد نے تسلی دی مگر مشورہ بھی دیا کہ اب یہ کھیل ختم کیا
جائے مگر کھیل ختم نہیں ہوا تھا۔ ایک رات پہلے ہی تو میں نے
نیلوفر کے نام خط لکھا تھا اور اسی روز میں لپک کر اس ٹرام پر چڑھ
گیا تھا جس پر نیلوفر بیٹھتی تھی۔ کاغذ والا بلڈنگ کے سامنے،
آگے جہاں وہ بیٹھی تھی، میں بالکل اسی کے پیچھے پہنچ گیا۔ اس
نے مجھے دیکھا، وہ اور اس کی سہیلی دونوں مسکرائے۔ بہت
کوششوں اور خواہش کے باوجود عطر سے لگا ہوا وہ لافانہ میں
اسے نہیں دے سکا تھا۔

چار پانچ دن ایسے ہی گزر گئے تھے۔ اس دن نہ جانے
کیا بات ہوئی کہ ٹرام بالکل خالی تھی۔ میں، مراد اور دو تین اور
آدی پیچھے کی طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نیلوفر کو دیکھ کر
مسکرایا۔ وہ بھی مسکرائی اور وہ مڑا ہوا لافانہ میں نے اس کے
ہیروں پر ڈال دیا اور اس نے مسکرا کر کچھ گہرا کر اسے اٹھایا۔
پھر خطوں کے تبادلے شروع ہو گئے۔ وہی دنیا جہاں کی
باتیں، جو محبت کرنے والے لکھتے ہیں۔

نیلوفر کے والد امیر نہیں تھے۔ وہ ایک پارسی وکیل کے
آفس میں سیکرٹری کا کام کرتے تھے اور پارسی کالونی کی ایک
بلڈنگ میں رہتے تھے۔ نیلوفر کی زندگی سادہ زندگی تھی مگر اس کا
مسن سادہ نہیں تھا۔ اس کا انداز پیچیدہ تھا، اس کی ادائیں قائل
تھیں۔ اس سے بات کرنے سے نکل، صرف خطوں کے تبادلے
سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ میرے لیے بنی بنائی گئی تھی۔ ہم دونوں

وقت کے ساتھ ساتھ محمد علی ٹراموے کمپنی کی ٹرام پر سفر کرتے
کرتے زندگی کے سفر میں ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔
پھر سب کچھ یکا یک ہو گیا تھا۔ کئی سال پرانا واقعہ مجھے تو
ایسا ہی لگتا ہے جیسے کل کا واقعہ ہو۔ رات دیکھی ہوئی کوئی فلم،
ابھی کسی کی سٹائی ہوئی کہانی۔ ہوا یہ کہ نہ جانے کیوں میں نے
یکا یک فیصلہ کر لیا کہ نیلوفر سے کورٹ میرج کر لیتا ہوں۔ یہی
سارے مسائل کا حل نظر آتا تھا۔ اسکول سے فارغ ہو کر میں
نے سوچا تھا کہ قانون پڑھوں گا مگر میرے والد کا خیال تھا کہ
مجھے پہلے بمبئی جا کر کچھ پڑھنا چاہیے۔ اس کے بعد چاہے میں
انگلینڈ چلا جاؤں۔ مجھے نہ بمبئی جانے کا شوق تھا اور نہ ہی انگلینڈ
جانے کی تمنا۔ میں تو کراچی میں رہنا چاہتا تھا۔ نیلوفر کے آس
پاس۔ جن دو دوستوں سے مشورہ کیا، پہلے تو ان کی سمجھ میں ہی
کچھ نہیں آیا مگر جب میں نے اپنی بات سمجھائی تو دونوں کا بھی
مشورہ تھا کہ اگر نیلوفر راضی ہے تو کورٹ میرج کرلو۔ مراد بھی
راضی ہو گیا اور طے یہ ہوا کہ میں نیلوفر سے بات کر کے اسے
اپنے فلیٹ میں لے آؤں گا پھر کراچی کے سول کورٹ میں سب
کچھ طے ہو جائے گا۔ چچن لال جو میرا بڑا گہرا یار تھا، اس نے
اپنے وکیل ماموں سے بات کی تھی۔ پہلے تو وہ سمجھانے لگ گئے
تھے مگر جب انہوں نے مجھ سے بات کر لی اور انہیں اس کا
اندازہ ہو گیا کہ میرے جد بے ہر طاقت سے زیادہ طاقتور ہیں تو
انہوں نے ہر قسم کی مدد کا وعدہ کر لیا مگر اس شرط کے ساتھ کہ
انہیں کسی بھی قسم کی کوئی رقم نہیں دی جائے گی۔

پھر سب کچھ پلان کے مطابق ہی ہوا تھا۔ نیلوفر میرے
ساتھ اس بلڈنگ کے فلیٹ میں چلی آئی اور دوسرے دن کی صبح
کا وقت عدالت میں مقرر بھی ہو گیا مگر اسی شام میرے والد بھی
نہ جانے کیسے پہنچ گئے۔ پھر مجھے جلد ہی پتا چل گیا کہ مراد نے
انہیں خبر کی تھی، پھر میں نے بھی بھی مراد سے بات نہیں کی تھی۔

وہ شام اور رات میری زندگی کی آخری رات ثابت
ہوئی تھی۔ میں کمرے میں نیلوفر اور مراد کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا
اور خوش تھا کہ معرکہ سر ہو چکا ہے اور کل صبح کے بعد سب کچھ
بدل جائے گا کہ اتنے میں دروازہ کھلا اور میرے والد، میرے
دو چچا اور ایک ماموں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔
انہوں نے نیلوفر سے کہا کہ دوسرے کمرے میں چلی جائے۔
اس کے بعد مجھے یاد ہے کہ انہوں نے سب کچھ کہا اور ایک وہ
تھپڑ تو میں آج تک نہیں بھولا ہوں، سالوں ان پانچ انگلیوں کی
جلن میرے گالوں پر ہوتی رہی ہے۔ میری ضد، میرا غصہ،
میری جھنجھوکا، میرا رونہا کسی کا بھی کچھ اثر نہیں ہوا تھا۔

مجھے میرے کمرے میں بند کر کے میرے دونوں چچا

پرنحوں کی وہ ملاقات نہ جانے کتنی طویل صدی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے سر تاپا کانپ گئی ہو۔ اس کی ڈبڈبی آنکھوں نے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اس نے بڑے زور سے اپنی بیٹی کو اٹھا کر سینے سے لگالیا۔ مجھے ہٹا لگ گیا تھا کہ اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔

وہ رات میری زندگی کی طویل ترین رات تھی۔ اس رات میں نے نیلوفر کو گھوما تھا، وہ رات میری کراچی کی آخری رات تھی پھر میں کراچی نہیں آیا۔ چالیس پینتالیس سال گزر گئے مگر میں کراچی نہیں گیا۔ میرا تھا ہی کیا کراچی میں۔

میں نے مزید نہیں پڑھا۔ شادی نہیں کی اور باپ کی زمینیں دیکھتا رہا۔ میرے باپ نے کئی کئی بار مجھ سے معافی مانگی تھی۔ میں نے اس تجویز کو تو معاف کر دیا تھا مگر نیلوفر سے میری جدائی کا جرم ناقابل معافی تھا۔ میرا بوڑھا باپ اس احساس گناہ کے ساتھ مر گیا لیکن میں نے اب اسے بھی معاف کر دیا ہے۔ مراد کو بھی معاف کر دیا ہے۔ اب تو مراد اور زیادہ قابل معافی ہو گیا ہے۔ اس حد تک کہ اسے تو مدد کی ضرورت ہے۔ پچھلے فسادات میں مراد کے بیٹے نواز بخش نے حیدر آباد سے ایک مہاجر لڑکی اغوا کر لی تھی۔ اسے محبت کا جھانسا دیا تھا پھر ایک رات اسے لے کر دادو چلا آیا تھا۔ جب مراد کو پتا چلا تو اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس کی زمینوں پر رہنے ہوئے مکان میں اس کی مرضی سے نواز اور اس کے دوست اس مہاجر لڑکی کی عزت کو پامال کرتے رہے۔ پھر وہ لڑکی بھاگ گئی اور بھاگتے بھاگتے، جھپٹے جھپٹے، وہ ریل کی پٹری تک پہنچ گئی، جہاں سے اس کی کئی ہوئی لاس ملی تھی۔

میں نے اس بیٹی کے ماں باپ کو دیکھا تھا۔ اخباروں میں ان کی تصویر بھیجی تھی۔ ان کے چہرے کا کرب، ان کی زندگی کا درد، ان کی آنکھوں کی چمک، زندہ رہنے کی لگن، وہ سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ موہن جو ڈرو پر بھی وہ سناٹا، وہ مردنی نہیں ہے جو اس بوڑھے کے چہرے پر تھی۔

مجھے پھر نیلوفر کی یاد آتی تھی۔ کراچی میرے سامنے آ گیا۔ جگوان داس بلڈنگ کا وہ فلیٹ۔ اس فلیٹ کے کمرے میں بیٹھی ہوئی نیلوفر۔ وہ ہندو دوست جس نے مجھے منع کیا تھا۔ وہی مراد اور اس کا باپ جو میرے باپ کے ساتھ آ کر مجھے دادو لے آئے تھے۔ یہ وہی کراچی تھا، جہاں میرے پرنکھوں نے ایک بیٹی کو بچایا تھا اور اب وہی کراچی ہے، جانے کیا ہو گیا ہے لوگوں کو۔ میں اپنے باپ کی قبر پر گیا تھا، ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تھی۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے مجھے نیلوفر مل گئی ہے۔

باہر بٹھا دیے گئے اور میرے والد میرے ماموں کے ساتھ چلے گئے۔ جب وہ دونوں نیلوفر کے گھر پہنچے تو وہاں کھرام چا ہوا تھا۔ نیلوفر کی دوست جینو نے بتا دیا تھا کہ نیلوفر کا سلسلہ کسی مسلمان سے چل رہا تھا اور وہ میرے ساتھ چلی گئی تھی۔ اسے میرے گھر کا تو پتا نہیں تھا، اسے جتنا پتا تھا اتنا ہی اس نے انہیں بتا دیا تھا۔ نیلوفر کے گھر پر نیلوفر کے باپ کے دوست موجود تھے اور دھننی طور پر باتیں ہو رہی تھیں کہ کس طرح سے اس مسئلہ کو حل کیا جائے۔ میرا باپ وہاں مجرم کی طرح گیا تھا۔ سر جھکا کر، آنکھیں نیچی کر کے میرے کیے پر معافی مانگنے کے لیے۔

رات کے اندھیرے میں میرے ماموں اور باپ کے ساتھ نیلوفر کا باپ اور کچھ رشتے دار آئے تھے۔ مجھ سے کچھ کہے بغیر، مجھ سے کچھ سنے بغیر، انہوں نے نیلوفر کو اس کے باپ کے حوالے کر دیا اور وہ لوگ خاموشی سے جگوان داس بلڈنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے دن ہی مجھے لے کر میرے گھر کا قافلہ دادو واپس آ گیا۔

نیلوفر میرے دل سے نکلتی نہیں تھی اور سب کچھ میری زندگی سے نکل گیا تھا۔ میرا مستقبل کا پڑھنا، زندگی کے سارے پلان۔ میرا غصہ آہستہ آہستہ مجھے کھا گیا تھا۔ پھر ایک دن مجھے پتا لگا کہ نیلوفر کی شادی کسی بہرام جی سے ہو گئی تھی پھر پاکستان بن گیا تھا اور تھوڑی سی دیر میں اتنا کچھ ہو گیا تھا کہ وقت کا احساس تک نہیں ہوا۔ چھ سال کے بعد میں پھر کراچی گیا تھا۔ کراچی بہت بدل گیا تھا۔ ہندوستان سے آئے ہوئے بے شمار مہاجرین نے کراچی کو بچھلادیا تھا۔ نئی نئی کالونیاں بن گئی تھیں۔ عجیب عجیب شکل کے لوگوں نے پان تھوک تھوک کر کراچی کی صاف تھری سڑکوں کو گندگی کا ڈھیر بنا دیا تھا۔

جہاں جانور پانی پیتے تھے، وہاں انسان نہا رہے تھے۔ چھ سال میں کراچی کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا اور کیسا ہو گیا تھا..... مگر میرا غم ویسا ہی تھا، میری بے قرار نگاہیں نیلوفر کو تلاش کر رہی تھیں۔

میں ماما پاری اسکول کے سامنے گھنٹوں کھڑا رہا اور بلڈنگ کو دیکھتا رہا۔ سڑکوں پر آوارگی کر تا رہا اور نیلوفر کے بارے میں سوچتا رہا۔ ٹرام پر بیٹھ کر سولہ بازار کے نہ جانے کتنے چکر کاٹے مگر وہ نہ ملی اور نہ ہی نظر آئی۔ دن ڈھلتے رہے۔ رات کا کیا ہے، رات تو گزر رہی جاتی ہے۔ سسکتی ہوئی۔ میں واپسی کا پروگرام بنا رہا تھا اور کینٹ انشیشن سے ٹرین کا ٹکٹ لے کر واپس آ رہا تھا کہ صدر میں پارسیوں کی عبادت گاہ سے اسے نکلنے دیکھا۔ وہی چہرہ، وہی قامت، وہی انداز مگر اس کے ساتھ ایک بچہ بھی تھا۔ میں پاگوں کی طرح دوڑتا ہوا اس تک پہنچا۔ سڑک

پڑی۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے باغ میں پھلیاں، جوادر
نٹاڑی بھی کاشت کی تاکہ ہماری سردیاں اچھی گزر جائیں۔
وہ میرے اسکول کے پڑے ایک منکر مشین پرستی تھی جو اتنی
پرانی تھی کہ رک رک کر چلتی اور ہر سلامتی پر جھٹکتی تھی۔

لوگ کہتے تھے کہ کسی زمانے میں میرا باپ بہت
اچھا کارگر تھا۔ شاید یہ بات سچ ہو لیکن مجھے صرف اتنا یاد ہے
کہ میں نے اسے غلے کے گودام میں بیڑ کے خالی ڈبوں کا
پھاڑ ہی بناتے دیکھا۔ وہ اپنا زیادہ وقت ریڈیو سننے یا
جنگلوں، بکھیوں اور پہاڑی نالوں پر شکار کرنے میں گزارتا۔

اس وقت میں پندرہ سال کا تھا اور ہم ایک کرائے
کے فارم ہاؤس میں رہا کرتے تھے جو رپورڈ کے بالکل
ساتھ واقع تھا۔ یہ اسی کی دہائی کے وسط کی بات ہے۔ اس
وقت ہماری ریاست کیخو کی میں حالات بہت ابتر تھے جس
دن صدر ریگن نے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ اس کے
دوسرے روز میرے باپ کو ہائیکنٹر کنٹرکشن کمپنی سے جواب
مل گیا۔ اس کے بعد اس نے بھی کوئی کام نہیں کیا۔ میری ماں
نے اسے سمجھایا، فٹیں کیں لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مجبوراً ماں
کو گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے ملازمت کرنا

بے صمیر

شمس عباس

کبھی کبھی انسانی قدم اچھائی کی طرف اٹھنے کے لیے برائی کا راستہ
اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے میں ان کی اصل حقیقت اور فطرت کو جاننا
بے حد مشکل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ اس نے کیا... جو تمام عمر اذیتوں
کا باعث بنا رہا اور آخر میں خود کو فنا کر کے اپنی نسل کو تباہی سے
بچا گیا۔ اگر تباہی کا راستہ دکھانے سے پہلے تباہ کن حالات کے بارے
میں سوچ لیا جائے تو شاید بچانے کی نوبت ہی نہ آئے۔

ایک قاتل اور غافل انسان کی اپنے خاندان کی نگہبانی کا عجیب انداز



اسے اس سے غرض نہیں تھی کہ شکار کا موسم ہے یا نہیں۔ جو بھی مل جائے وہی غنیمت ہے۔ خواہ وہ گھبرائی ہو یا خرگوش۔ اچھے دنوں میں اس نے ایک شاٹ گن اور ریفلکٹنگ رائفل خریدی تھی اور دونوں چیزیں اس کا قیمتی اثاثہ تھیں۔ ایک دفعہ میری ماں نے غلطی سے یہ کہہ دیا کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو فروخت کر دو تاکہ ہمارا کرسمس اچھی طرح گزر جائے۔ میرے باپ نے غصے میں آ کر اسے بالوں سے پکڑا اور اسے گھسیٹا ہوا عقبی دروازے تک لے گیا پھر اس نے دروازہ کھول کر اسے صحن میں دھکادیا اور بولا۔

”اس وقت واپس آنا جب تمہارا دماغ ٹھکانے آ جائے۔“ یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں کچھ کہنا ہے ڈیوی؟“

اس وقت میری زبان پر بہت سے الفاظ تھے لیکن میں جانتا تھا کہ بولنے کا انجام کیا ہوگا۔ وہ ایک کیم شیم غصہ تھا اور مار پیٹ اس کی فطرت میں شامل تھی۔ میں تو اس کا گھوٹا بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بیت نام کی جنگ میں خدمات انجام دے چکا تھا لیکن اس کے بارے میں بہت کم گفتگو کیا کرتا۔ اس کی باتیں آکھ کے نیچے ایک زخم کا نشان تھا جو جنگ میں نہیں بلکہ سانگن کے ایک بار میں لڑائی کے دوران اسے لگا تھا۔

میرا باپ وہاں کھڑا ہوا آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں سے غصہ جھلک رہا تھا۔ شاید وہ امید کر رہا ہوگا کہ میں کچھ بولوں۔ میں جانتا تھا کہ اسے میرا بہت خیال ہے۔ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ مجھے پانچ ڈالر دیے تاکہ میں اپنے دوست کے ساتھ فلم دیکھنے جا سکوں۔ جب میں چوتھی جماعت میں تھا تو مجھے فلو ہو گیا تھا۔ وہ ساری رات پاس بیٹھ کر میرے ماتھے پر گلیا کپڑا رکھتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ صرف اس لیے میرا خیال رکھتا ہے کیونکہ ہمارے درمیان ایک تعلق ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ اپنے.... پالتو کتے کی دیکھ بھال کیا کرتا تھا۔ چند برس قبل خادار تار بھلا گئے ہوئے اس کی ٹانگ زخمی ہو گئی تھی اور اس کے زخم میں انکیشن ہو گیا۔ میرے باپ نے اس کا علاج کرانے کی خاطر گھر سے پیسے چرائے جس سے ایک ہفتے کا راشن آ سکتا تھا۔ چند ماہ بعد وہ اس کتے کو گودام کے چبھے لے گیا اور اسے گولی مار دی کیونکہ اس کتے نے اسے اس وقت کاٹ لیا جب وہ ایک تازہ شکار کبے ہوئے ہرن کو کھینٹ کر لارہا تھا۔

اس نے کچن کاؤنٹر پر اپنی اگھلیوں سے طبلہ بجاتے

ہوئے کہا۔ ”ہاں بولو۔“

”نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میرے ذہن میں کوئی بات نہیں ہے۔“

وہ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ ابھی اس نے کھانا ختم ہی کیا تھا کہ میری ماں اندر داخل ہوئی۔ اس کے گالوں کو یوسہ دیا اور اپنا ٹھنڈا کھانا لے کر اس کے ساتھ لیونگ روم میں چلی گئی جبکہ وہ مقامی خبریں دیکھنے لگا۔ میرے لیے یہ منظر بہت تکلیف دہ تھا۔ میں نے قسم کھائی کہ اٹھارہ سال کی عمر کو پہنچنے ہی یہ گھر چھوڑ دوں گا۔ میں نے سوچا کہ فوج میں بھرتی ہو جاؤں گا یا فالت لے کر کیلی فورنیا چلا جاؤں گا۔ اس وقت میرے ذہن میں اپنی منزل کے بارے میں کوئی واضح تصور نہیں تھا، بس گھر چھوڑنے کی دھن سوار تھی۔

ہمارے مالک مکان کا نام مین ڈینیئل تھا۔ اس کی عمر غالباً ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ لمبے قد کا خوش شکل انسان تھا۔ وہ بہت وسیع جاندار کا مالک ہونے کے علاوہ گرین ویو میں سب سے بڑی انشورنس ایجنسی چلاتا تھا۔ اسے ورثے میں ایک درجن فارم اور سیکڑوں ایکڑ جنگلات سے بھری زمین ملی تھی جہاں سے حاصل ہونے والی کمزری اس کی کمائی کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ وہ بارہن کاؤنٹی کا امیر ترین آدمی ہے لیکن میرے باپ کا کہنا تھا کہ اس کی جیب ہمیشہ خالی ہوتی ہے۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ جب سے ڈینیئل نے جنگلات اور کھیتوں کا حساب کتاب اپنے ہاتھ میں لیا تھا اس سے پہلے ان دونوں کے درمیان کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مہینے میں ایک بار وہ اپنی نیلی لنکن کار میں سوار ہو کر ہمارے دروازے پر آتا اور انتظار کرتا کہ ہم اسے کرایہ دے دیں۔ اگر میری ماں آس پاس ہوتی تو ڈینیئل کی نظریں اسی کا طواف کرتی رہتیں۔ وہ تیس سال کی ایک خوش شکل عورت تھی۔ سیاہ بال، سبز آنکھیں اور پرکشش جسم جو کسی بھی راکو اپنی جانب متوجہ کر سکتا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ میرا باپ حسد یا غصہ کرنے کے بجائے اس پر فخر محسوس کرتا کہ اس کی بیوی میں مردوں کے لیے کشش ہے۔ پھر ایک روز یوں ہوا کہ ڈینیئل مقررہ وقت سے ڈیڑھ ہفتہ قبل ہی کرایہ لینے آ گیا۔

میں اور ڈیڈی عقبی پورچ میں پھلیاں صاف کر رہے تھے جو میرا باپ دریا سے پکڑ کر لایا تھا جب ڈینیئل نے اپنی گاڑی ہمارے مکان کے باہر کھڑی کی اور چلتا ہوا ہماری طرف آ گیا۔ میرے باپ نے نظریں اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ”کہو۔ کیسے آنا ہوا؟“

”گلتا ہے کہ آج تم نے کافی مچھلیاں پکڑی ہیں؟“
میرا باپ اس کی طرف چھری بڑھاتے ہوئے بولا۔
”کیا تم ان کی صفائی میں میری مدد کرنا چاہتے ہو؟“
”نہیں شکریہ۔“ ڈینیئل نے کہا۔

”ابھی کرایہ دینے میں تو وقت ہے۔“
”میں کرایہ لینے نہیں آیا۔“ ڈینیئل نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہوا ہے کہ کل تم نے میرے جنگل سے بڑی تعداد میں گھبریاں پکڑی ہیں۔“

”ہاں۔“ میرے باپ نے اپنی جیب سے کپڑا نکال کر اپنے ہاتھ صاف کیے اور بولا۔ ”میرے کیلنڈر کے مطابق یہ گھبریاں پکڑنے کا سیزن ہے۔“
”میں نے سنا ہے کہ تم نے دو مرتبہ مقررہ حد کی خلاف ورزی کی۔“

”شاید اس سے بھی کچھ زیادہ۔“ میرے باپ نے کہا۔ ”لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم نے گالف کھیلنا چھوڑ دیا ہے اور فالٹ وقت میں نگرانی شروع کر دی ہے۔“
ڈینیئل نے ناک کے ذریعے اپنی سانس خارج کی اور بولا۔ ”اس کی تشہیر بھی کی جا چکی ہے۔“

”ممکن ہے کہ میری نظر سے نہ گزری ہو۔“ میرے باپ نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں ان گھبریوں کی اتنی فکر کیوں ہے؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان جنگلوں میں لوگ عرصہ دراز سے شکار کھیل رہے ہیں۔“

ڈینیئل نے گہری سانس لی اور بولا۔ ”تم نے وہ ٹرارل دیکھے جو میں نے یہاں کھڑے کیے ہیں؟“

”ان کے بارے میں سنا ہے۔“ میرے باپ نے کہا۔ ”بہت جلد ان میں شکاریوں کے لیے مبین بنادیے جائیں گے۔“ ڈینیئل بولا۔ ”میں ایک نیا کاروبار شروع کر رہا ہوں۔“

اس کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا کہ ہاؤلنگ گرین، نوکس ول، ناش ول، ایوانس ول اور انڈیانا سے تعلق رکھنے والے لوگ شکار کے سیزن میں ایک کمین اور ہیں یا میں ایکرز میں کرائے پر حاصل کرنے کے لیے بڑی رقم دینے کے لیے تیار ہیں۔ وہ یہاں بشیر اور خرگوش کے شکار کے لیے آئیں گے لیکن سب سے زیادہ رش ہرن کے شکار کے سیزن پر ہوگا۔

”تم سمجھ رہے ہو کہ میں کیا کہہ رہا ہوں؟“ ڈینیئل نے کہا۔ ”وہ شکار کے حقوق کے عوض بھاری رقم دیں گے۔“

اس لیے یہ میرے مفاد میں ہے کہ سارا کھیل خوش اسلوبی سے آگے بڑھے۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگ میری زمین میں داخل ہو کر ہرنوں کو خوفزدہ کریں۔“

میرے ڈیڈی نے سگریٹ پھینکتے ہوئے کہا۔ ”تم اس بارے میں سنجیدہ ہو؟“
”ہاں۔“ ڈینیئل نے کہا۔ ”وہ فارم پر انٹیوٹ ملکیت ہیں اور اس کی تشہیر بھی ہو چکی ہے۔“ اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”کیونکہ تمہیں معلوم نہیں تھا، اس لیے اس بار میں تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر رہا۔“

ڈیڈی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہارے خیالات کی قدر کرتا ہوں۔ کیا ہو گے بیٹریا کافی؟“
”نہیں..... شکریہ۔“

”اتنی جلدی کیا ہے۔ ڈارلین آج چھٹی پر ہے۔ اس سے مل کر جانا۔“

ڈینیئل کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے اپنی نظریں جھکالیں جیسے کوئی بچہ چوری کرتا ہوا پکڑا جائے پھر ڈیڈی نے اس کے کندھے پر ہاتھ راتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے چھینٹ غائی کر رہا تھا۔“

چند روز تک ایسا لگا کہ میرے باپ نے اپنی کوششیں ترک کر دی ہیں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ اس کی وجہ ڈینیئل کا انتباہ نہیں بلکہ موسم کی تبدیلی تھی۔ خزاں کی آمد آدھی اور رات میں سردی کی وجہ سے کھل لینا پڑ رہا تھا۔ اس موسم میں مچھلیاں بھی وافر مقدار میں ملتی ہیں چنانچہ پانچ دنوں میں میرے باپ نے ڈیڑھ ساری مچھلیاں پکڑیں۔ ان میں ایک تو اتنی بڑی تھی کہ مجھے اس کو دونوں ہاتھوں سے اٹھانا پڑا۔ ہم نے ہر روز رات کے کھانے میں فرائیڈ فیش اور تیلے ہوئے آلو کھائے۔ اس کے باوجود بھی اتنی مچھلیاں بچ گئیں کہ ہم نے انہیں فریزر میں رکھ دیا۔

چھٹے روز بارش شروع ہو گئی۔ جب میں کچن میں آیا تو میرا باپ کچن میں بیٹھا کافی اور سگریٹ سے مشغول کر رہا تھا۔ وہ مجھے خوش نہیں لگا رہا تھا چنانچہ میں نے ایک سلاٹس اٹھایا تاکہ راستے میں اسے کھالوں۔ میں دروازے سے باہر جانے ہی والا تھا کہ اس نے انگلی سے مجھے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”مجھے اسکول کو دیر ہو رہی ہے۔“ میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

ماں انڈا مل رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”جلدی جاؤ۔ میرے پاس تمہیں چھوڑنے کے لیے وقت نہیں ہے۔“

ہے۔ ہم واقعی پاگل خانے میں رہ رہے ہیں۔

”جلدی سے ناشا کرو۔ تمہارے پاس صرف دو منٹ ہیں۔“ میرے باپ نے کہا۔ ”میں باہر بیٹھا ہوں۔“

مگرین دلو جاتے ہوئے اس نے راستے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں راستے میں مختلف مناظر دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ یہاں سے نکل کر مجھے کہاں جانا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ فلورڈ اچلا جاؤں۔ میں نے وہاں کے ساحلوں اور مگر مچھوں کے بارے میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ ویسے تو میں نے ہمیشہ نیو یارک یا شکاگو جیسے بڑے شہروں میں رہنے کا خواب دیکھا تھا۔ جہاں اونچی اونچی عمارتیں تھیں اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ آپ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ میں نے فلموں اور ٹیلی ویژن شوز میں کیلی فورنیا کے مناظر دیکھے تھے۔ وہ جگہ مجھے اچھی لگتی تھی۔

قبیلے کے مصافقات میں ایک اسٹور کے باہر اس نے اپنا ٹرک روکا اور مجھے چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ہاتھ میں بیڑ کے ڈبوں کا آدھا باکس اور گوشت کے بھنے ہوئے پارچوں کا ایک پیٹ تھا۔

اس نے مجھے ایک پارچہ پکڑاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں ناشا کرنے کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا۔“

چند میل جانے کے بعد اس نے ہینٹل گاڑو کے اسٹو خانے کے سامنے ٹرک روک دیا۔ وہاں چھٹی کے دنوں میں سستی اشیاء کا بازار لگتا تھا اور سال میں دو مرتبہ کشتی کے مقابلے ہوتے تھے۔ میری کچھ میں نہیں آیا کہ ہم کام والے دن یہاں کیوں آئے ہیں۔ پارکنگ لاث تقریباً گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی اور لوگوں کی ایک طویل قطار نظر آ رہی تھی۔ میرے باپ نے ایک مناسب جگہ پر ٹرک کھڑا کیا اور باکس میں سے بیڑ نکال کر پینے لگے۔

”ہم یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟“ بالآخر میں نے پوچھ ہی لیا۔

”میں قطار میں لگنے جا رہا ہوں اور تم یہاں بیٹھ کر مجھے دیکھو گے۔“

”کیوں؟“

”یہاں ہر مہینے کے آخری ہفتے کو حکومت کی طرف سے غریبوں میں کھانے پینے کی اشیاء مثلاً پنیر، خشک دودھ، جاول اور پھلیاں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح اپنا حصہ وصول کرنے آیا ہوں۔“

”اوہ۔“ میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ڈیڈی نے کہا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ کتابوں کا بیگ زمین پر رکھا اور بیٹھ گیا۔ میری ماں سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس کی بس نکل گئی تو تم اسے چھوڑ کر آؤ گے۔“

”آج یہ میرے ساتھ جائے گا۔“ ڈیڈی نے کہا۔ ”دیکھو واٹن! اگر تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے تو مت کرو۔ میں کروں گی۔ میں نہیں جانتی کہ کیسے اور کس طرح یا پھر اسے بھول جاؤ۔“

”یہ بات ذہن میں رکھو کہ ہم ہر وقت مچھلی نہیں کھا سکتے۔“

میری کچھ میں نہیں آیا کہ ان باتوں کا میرے اسکول جانے سے کیا تعلق ہے۔ میں نے بھی بہتر سمجھا کہ وہاں سے ہٹ جاؤں پھر میرے کانوں میں ڈیڈی کی آواز آئی۔

”میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ جاؤں گا، اب میں جا رہا ہوں اور ڈیڈی بھی میرے ساتھ جائے گا۔“

”واٹن۔“ میری ماں نے ٹھکی ہوئی آواز میں کہا۔ ”اسے اسکول جانے دو۔“

میرے باپ نے زور سے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ”میں تم سے آخری بار کہہ رہا ہوں کہ اس معاملے میں مت بولو۔“

”اوہ میرے خدا۔“ وہ بولی۔ ”لگتا ہے کہ میں کسی پاگل خانے میں رہ رہی ہوں۔ جو تمہارا دل چاہے وہ کرو۔ مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں۔“ وہ بولا۔

مجھے حیرت ہو رہی تھی کہ سب کچھ اتنی جلدی کیسے بدل گیا۔ صرف دو ہفتے پہلے ہی اسکول کے پرنسپل نے فون پر شکایت کی تھی کہ میں کلاس سے غیر حاضر رہتا ہوں، ٹیسٹوں میں ٹیل ہو رہا ہوں اور ٹیچرز سے بدزبانی کرتا ہوں۔ میری ماں نے کہا کہ اسے یہ سن کر ہاپوسی ہوئی اور مجھے ٹیلی ویژن دیکھنے کے بجائے پڑھنے میں دل لگانا چاہیے جبکہ باپ کا روٹل بہت شدید تھا۔ اس نے میرا ریکارڈ پلیئر توڑ دیا۔

ڈانٹ ڈپٹ کی اور مجھے اتنی زور سے دھکا دیا کہ میرا سر دیوار سے جا ٹکرایا۔ اگر ماں مداخلت نہ کرتی تو شاید وہ میرا گلا گھونٹ دیتا۔ ماں کی منت سماجت پر اس نے مجھے چھوڑ دیا تاہم یہ نتیجہ بھی کی کہ اگر آئندہ اسکول سے کوئی شکایت آئی تو وہ مجھے جان سے مار دے گا اور اب وہ مجھے اسکول جانے سے روک رہا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا لیکن میں یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہو گیا کہ ماں ٹھیک ہی کہتی

تھا جنہیں اس طرح کی قطار میں نہیں کھڑا ہونا پڑتا تھا۔
اگلی صبح میں بیدار ہوا تو میرا باپ میز پر بیٹھا بیڑا رہا
تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے شکاریوں والا
لباس پہن رکھا تھا اور اس کی شاٹ گن ایک کونے میں رکھی
ہوئی تھی۔

میری ماں اپنے لیے ایک کپ میں کافی لے کر آئی
اور اس کے سامنے بیٹھے ہوئے بولی۔ ”میں نہیں جانتی کہ تم
کیا سوچ رہے ہو؟“

”میں سوچ رہا تھا کہ تمہوڑا سا شکار کروں۔“

”اس کے باوجود کہ وہ تمہیں منع کر چکا ہے۔“

ڈیڈی نے بیڑ کا ڈایمیز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں وہاں
اس وقت سے شکار کر رہا ہوں جب میں ڈیوی کی عمر کا تھا۔“

”واٹن۔“ میری ماں نے اسے سمجھانے کے انداز
میں کہا۔ ”اگر اس نے ہمیں یہاں سے نکال دیا تو ہم کہاں
جائیں گے۔ ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں کہ کرائے پر
دوسری جگہ لے سکیں۔“

اس نے ریفریجریٹر سے ایک اور بیڑ کا ڈایا نکالا اور بولا۔
”اس کا کوئی نہ کوئی نتیجہ نکلے گا۔ چاہے وہ کچھ بھی ہو۔“

”اودہ میرے خدا۔“ میری ماں نے تیز لہجے میں کہا۔
”تمہارا کیا خیال ہے؟ ہم کسی غار میں رہیں گے..... کسی
میدان میں خیمہ لگائیں گے یا قصبے کے پل کے نیچے بستر لگا
ہوگا؟“

میں نے اپنی سانس روک لی اور اس لمحے کا انتظار
کرنے لگا جب وہ ماں پر ہاتھ اٹھائے یا اس کے بال پکڑ کر
کھینچنے لگیں اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ اس نے بیڑ کا ڈایا کھولا اور
قدرے پُر سکون آواز میں بولا۔ ”تم کچھ دیر آرام کرلو۔
رات تم کافی دیر سے گھرواؤں آئی تھیں۔“

میں جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے۔ جب ہم سامان
لے کر واپس آئے تو وہ گھر سے نکل رہی تھی۔ اس نے
میرے گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا کہ وہ دیر تک کام
کرے گی اور ایسا ہی ہوا۔ وہ نصف شب کے بعد واپس آئی
تھی۔ میں بستر پر لیٹا ہوا ان دونوں کی سرگوشیاں سن رہا تھا۔
دو گھنٹے بعد میں نے ایک کار کے رکنے اور دروازہ کھینچنے
کی آواز سنی۔ کوئی شخص غصے میں میرے باپ کا نام لے رہا
تھا۔ میں جلدی سے باہر آیا اور ان کے کمروں میں جھانک کر
دیکھا۔ ماں ابھی تک سو رہی تھی۔ جب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ
بین ڈینیئل میرے باپ پر ناراض ہو رہا تھا۔

”میں نہیں جانتا کہ تمہیں کس طرح سمجھاؤں۔“

’اب میں سمجھا کہ تم نے مجھے اسکول کیوں نہیں جانے دیا۔‘
اس نے بیڑ کا ڈایا گھونٹ لیا اور قطار کی طرف دیکھتے
ہوئے بولا۔ ”ان میں سے کچھ لوگ میرے ساتھ اسکول
میں پڑھا کرتے تھے لیکن ہم نے کبھی تعلیم میں دلچسپی نہیں لی
کیونکہ جانتے تھے کہ اسکول سے نکلنے کے بعد ہمیں کسی
غیر راتی کمپنی یا کان میں ہی محدود کرنا ہوگی۔ تم بچے شگ
اسکول جا کر وقت ضائع کرتے رہو لیکن چند سال بعد تمہیں
بھی اسی طرح ہنٹ راشن کے لیے قطار میں لگنا ہوگا۔“

میں نے سر ہلادیا کہ وہ مجھے اس کی بات پر یقین نہیں
تھا۔ اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں پیدا ہی احمق ہوں۔

تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اب
تم کلاس چھوڑنے یا ٹیسٹ میں ٹیل ہونے سے پہلے ضرور
سوچو گے اور مجھ سمیت ان لوگوں کو یاد کر دو گے جو خیرات
لینے کے لیے قطار میں کھڑے ہیں۔ اگر تم بالکل ہی احمق
نہیں ہو تو اپنی تعلیم مکمل کرو اور اس قصبے سے نکل جاؤ۔“

”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔
”تمہارا کیا خیال ہے کہ تمہیں وقفہ مل جائے گا۔ تم تو
اپنے نام کے بچے بھی سمجھ نہیں لکھ سکتے۔“

میرا چہرہ سرخ ہو گیا اور میں نے غصے سے کہا۔ ”میں
احق نہیں ہوں۔“

وہ ٹوک سے اترتے ہوئے بولا۔ ”پھر یہ حرکتیں چھوڑ دو۔“

وہ قطار کی طرف بڑھ گیا اور میں اپنی نشست پر بیٹھا
سوچتا رہا کہ اگر میرے کسی دوست کے والدین میں سے
کوئی یہاں سے گزرا اور اس نے ہمارا اثر کیا یہاں دیکھ لیا تو
یہ میرے لیے بڑے شرم کی بات ہوگی۔

ڈیڈہ کھنچے بعد وہ ایک بڑا گتے کا ڈایا لے کر واپس
آیا۔ اس میں پانچ پونڈ پنیر، چاول کے تین تھیلے، پھلیوں
کے تین پیٹ اور خشک دودھ کا ایک باکس شامل تھا۔ اس
نے لہجہ بھر کے لیے میری طرف دیکھا مگر میں اس سے نظریں
نہ ملا سکا لیکن میں نے اپنے آپ سے عہد کر لیا کہ ان
چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔ میرے ذہن میں ایک ہی
بات گونج رہی تھی کہ ہم فقیر ہیں۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے
کہ میری ماں سخت محنت کر کے کچھ پیسے کماتی ہے یا میرا
باپ جنگ میں شریک ہوا تھا۔ ہم صرف فقیر تھے جو قطار
میں لگ کر خیرات لیتے ہیں۔ اس وقت مجھے بین ڈینیئل،
اس کی کار، زمین اور بڑے سے مکان کا خیال آیا۔ میری
سمجھ میں نہیں آیا کہ اس سے امیر ہونے کی وجہ سے نفرت
کروں یا تعریف کہ وہ کاؤنٹی کے ان چند لوگوں میں سے

ڈیڑی نے کہا۔ ”میں کوئی وکیل نہیں ہوں لیکن اتنا جانتا ہوں کہ مجھے ان خرگوشوں کا شکار کرنے کا حق ہے جو میرے گھر کے پچھواڑے آجائیں۔“

”میں جانتا ہوں کہ تم خود سر اور مغرور ہو۔“ ڈینیئل نے کہا۔ ”اور اکثر ویسٹر جانتیں کرتے رہتے ہو لیکن میں تمہیں جھوٹا نہیں سمجھتا تھا۔ میرے تین آدمیوں نے تمہارے ٹرک کو سماسٹریس کرکے برج جانے والی سڑک پر کھڑے دیکھا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ وہ ساری زمین میری ملکیت ہے۔ تم اتنے ہوشیار نہیں ہو جتنا کہ اپنے آپ کو سمجھتے ہو۔“

”شاید۔“

”اس میں شاید کا کوئی سوال نہیں۔“ ڈینیئل نے کہا۔ ”اگر تم نے یہ حرکت کی ہے تو اس کا اقرار کر لو۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارے حالات ان دنوں ٹھیک نہیں ہیں۔“ ”یہاں سب ہی لوگوں کا گزارہ مشکل سے ہو رہا ہے۔“ ”مجھے دوسروں سے کوئی غرض نہیں۔ میں صرف تمہاری بات کر رہا ہوں۔ اگلی بار میں نصیحت کرنے آتا تھا۔ اب سمجھ کر رہا ہوں۔ اگلی بار میں تمہیں ناجائز شکار کرتے ہوئے دیکھا تو شریف کے ساتھ آؤں گا اور تمہیں بے دخلی کا نوٹس دے دوں گا۔ اگر تم کرایہ نامہ دیکھو تو تمہیں بے دخل کرنا میری صوابدید پر ہے۔ مجھے صرف دس دن کے نوٹس کے ساتھ تمہارا بقیہ کرایہ واپس کرنا ہوگا۔ تمہاری ایک بیوی اور بیٹا بھی ہے۔ لہذا ان کے بارے میں بھی سوچو اور انسان بن جاؤ۔“

وہ جانے کے لیے مڑا لیکن میرے باپ کے چلانے پر رک گیا۔ پھر وہ اپنی ٹیک اب پر گیا اور اس کے پچھلے حصے سے نصف درجن مردہ خرگوش نکال کر ڈینیئل کے قدموں میں ڈال دیے۔

”تم کہتے ہو کہ یہ تمہارے خرگوش ہیں۔ ٹھیک ہے۔ انہیں اپنے ساتھ لے جاؤ۔ میں بھی انہیں جنگل میں پھینکنے سے بچ جاؤں گا۔ کوئی اجتناب ہی ہوگا جو اس موسم میں خرگوش کھائے۔“ ڈینیئل کچھ دیر تک مردہ خرگوشوں کو دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”کیا تم سنجیدہ ہو؟“

”بالکل۔“ میرے باپ نے کہا۔ ”میں نے اس کا ایک ٹکڑا بھی منڈ میں نہیں رکھا۔“

”مجھ پر تم نے ان کا شکار کیوں کیا؟“ ”مجھی کبھی کچھ چیزوں کا شکار کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔“

”کتیا کی اولاد۔“ ڈینیئل نے دانت پیٹے ہوئے کہا۔ ڈیڑی نے ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے گالی مت دو۔ آئندہ کچھ کہا تو اچھا نہیں ہوگا۔“

ڈینیئل نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”بہتر ہوگا کہ تم اپنے آپ کو دیکھو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ چند مہینوں کے لیے جیل کی ہو اکھاٹی پڑ جائے۔“

یہ کہہ کر وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا اور بیٹھنے سے پہلے اس نے مڑ کر ڈیڑی سے کہا۔ ”میں نے جو کہا، وہ بالکل واضح ہے۔ میں تمہیں آخری وارنگ دے رہا ہوں۔“

ڈیڑی نے ایک مردہ خرگوش اٹھایا اور اس کی جانب پھینکتے ہوئے کہا۔ ”میں بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جنہیں مارنا ضروری ہو جاتا ہے۔“ لیکن اس سے پہلے ہی کار کا دروازہ بند ہو چکا تھا اور وہاں اس کی آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ڈیڑی کے کہے ہوئے الفاظ ہمیشہ میرے دماغ میں گونجتے رہے۔

مجھے امید تھی کہ آئندہ چند دنوں میں کچھ ہونے والا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ دوسرے روز ہی میرا باپ درجنوں خرگوش شکار کر کے ایک نیا بحران پیدا کر دے گا یا جب ڈینیئل کرایہ لینے آئے گا تو ان کے درمیان تلخ کلامی ہوگی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میرا باپ گھر میں بیٹھا بڑا تار اور اس نے اپنی بندوق الماری میں بند کر دی تھی۔ جب ڈینیئل کرایہ لینے آیا تو وہ پہلے ہی گری کے شراب خانے جا چکا تھا۔ اس دن میری ماں نیلے رنگ کی جینز اور آسانی ٹی شرٹ میں بہت خوب صورت نظر آ رہی تھی۔ ڈینیئل کے لیے اس کے چہرے پر سے نظریں ہٹانا مشکل ہو گیا۔ اس نے ڈیڑی سے تلخ کلامی پر میری ماں سے معذرت کی جس پر اس نے کہا کہ بعض اوقات وائن اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا اور یہ اس کا مخصوص انداز ہے لیکن اسے یقین ہے کہ آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔

اگلے چند ہفتوں تک ماں کا یہ معمول رہا کہ وہ دوپہر کو کام پر جاتی اور اس کی داپہی دوسرے دن صبح کو ہوتی۔ اس دوران صرف دو مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ وقت پر گھر آ گئی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہماری زندگی سے نکل گئی ہے۔ میں اور ڈیڑی اپنے لیے خود ہی کھانا بناتے اور گھر کی خاموشی کو ٹیبل ویژن کی آواز سے دور کرتے۔ تاہم ایک طرح سے ہمارے حالات بہتر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ میری ماں بہت زیادہ ”اور ٹائم“ کر رہی تھی جس کی وجہ سے آمدنی میں اضافہ

میرا سانس رکے لگا۔
 ”میں نے تم سے کہا تھا کہ جا کر سو جاؤ۔“ اس نے
 مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تم نے میری بات نہیں سنی۔“
 ”آگے بڑھو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے اور مارو تاکہ
 تمہیں سکون مل جائے۔“

اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اس کے لیے مجھے
 تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں۔“
 اسی وقت میری ماں کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ بیڈ
 روم کے دروازے میں کھڑی ہوئی کہہ رہی تھی۔
 ”میں مزید برداشت نہیں کر سکتی۔“ اس نے چلاتے
 ہوئے کہا۔ ”مجھ سے یہ سب نہیں دیکھا جاتا۔“

میرے باپ نے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے
 کہا۔ ”مجھے افسوس ہے ڈیوی! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔“
 چند گھنٹوں کے بعد میں اپنے کمرے سے باہر آیا تو دیکھا کہ
 ماں لباس تبدیل کر کے صوفے پر بیٹھی ہوئی کوئی رسالہ پڑھ
 رہی تھی جبکہ باپ بیڑ کا گلاس ہاتھ میں تھا سے ٹیلی ویژن پر
 فٹ بال کا بیچ دیکھ رہا تھا۔ اس رات ماں نے ہمارے لیے
 کھانا بنایا اور جب میں سونے کے لیے جانے لگا تو اس نے
 مجھے کچن میں بلا کر کہا۔

”مجھے افسوس ہے کہ وہ غصے میں آ گیا لیکن تم نے بھی
 غلط وقت پر مداخلت کی۔ حالات خراب تھے لیکن تمہیں
 پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ جلد ہی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
 مجھے یقین تھا کہ ہم میں سے کسی نے بھی اس کی بات
 پر یقین نہیں کیا اور اس کے بعد بھی سب کچھ ویسا ہی رہا۔
 میرے ذہن مندل ہو گئے تھے اور میں نے اسکول جانا
 شروع کر دیا تھا۔ میری ماں ہمیشہ کی طرح دیر سے گھر آتی۔
 باپ نشے میں دھت رہتا اور رات گئے سڑکوں پر آوارہ
 گردی کرتا رہتا۔

ایک روز میں سہ پہر کے وقت گھر میں بیٹھا ہوم ورک
 کر رہا تھا اور ماں رات کے کھانے کی تیاری کر رہی
 تھی کہ میرا باپ گھر میں داخل ہوا۔ وہ کافی خوش نظر آ رہا تھا۔
 وہ سیدھا فرنیچ کی طرف گیا اور اس میں سے ایک بیڑ کاٹن
 نکالتے ہوئے بولا۔

”جلدی سے تیار ہو جاؤ ڈیوی۔ مجھے تمہاری مدد کی
 ضرورت ہے۔“

”کیا بات ہے؟“ میری ماں نے پوچھا۔
 ”کوئی خاص بات نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”تم
 پریشان مت ہو۔“

ہو گیا تھا۔ ہمارے بل وقت پر ادا ہونے لگے اور گھر میں
 کھانے پینے کی اشیاء وافر مقدار میں موجود رہے لگیں۔ ایک
 دن میری ماں مجھے شاپنگ مال لے گئی اور مجھے دیکھی ہی
 جیکٹ دلوائی جو میرے گھروں کے پتے پہنچتے تھے۔
 تب مجھے یقین ہو گیا کہ ہماری زندگی میں تبدیلی آ گئی ہے۔

پھر ایک صبح میں نے رونے اور اپنے باپ کی ہلکی
 سرگوشیاں کرنے کی آواز سنی۔ ان کے کمرے کا دروازہ کھلا
 ہوا تھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ کچن میں بھی نہیں تھے اور
 لیونگ روم خالی پڑا ہوا تھا۔ میرے دباغ میں ایک ہی خیال
 سر اٹھانے لگا۔ اس بار اس نے میری ماں کو بہت بری طرح
 مارا ہے۔

”میں اسے قتل کر دوں گا۔“ میں نے سرگوشی میں کہا۔
 پھر مجھے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔ وہ ہاتھ روم سے
 نکل کر آئی تھی اور اس نے اپنے جسم کے گرد ایک بڑا سا تولیا
 لپیٹا ہوا تھا۔ وہ بستر پر آ کر بیٹھ گئی۔ ڈیوی نے اس کے گھٹنوں
 پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”میں یہ کام
 جاری نہیں رکھ سکتی۔ تمہیں نہیں معلوم کہ کڑک اسٹاپ پر کھڑے
 ہوئے کلرک اور ویزٹس مجھے کس طرح دیکھتے ہیں۔ میرے
 خدا، مجھے ڈیزل کی بو سے نفرت ہے۔ چاہے میں کتنی بار سر
 دھو لوں۔ میرے بالوں سے یہ بد بو نہیں جاتی۔“

”ٹھیک ہے۔“ میرے باپ نے کہا۔ ”بہت ہو چکا۔“
 پھر اسے میری موجودگی کا احساس ہوا، وہ مجھے گھورتے ہوئے
 بولا۔ ”جا کر سو جاؤ۔ یہاں سب ٹھیک ہے۔“
 ”تم نے میری ماں کے ساتھ کیا کیا ہے؟“ میں نے
 غصے سے کہا۔

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب تم یہاں سے جاؤ۔“
 مجھے اپنے الفاظ پر حیرت ہوئی جب میری زبان سے
 بے اختیار نکلا۔ ”کینیڈ۔“

انجی میں صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ
 اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا اور اس نے مجھے پکڑ کر زمین پر گرادیا۔
 ”میں تجھے مار ڈالوں گا۔“ میں نے چلاتے ہوئے کہا۔
 میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک زوردار
 لات رسید کر کے مجھے اس کا موقع نہیں دیا اور میں درد سے
 چلانے لگا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں
 اس سے معافی مانگتا اور التجا کرتا چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ
 دے لیکن بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے گردن سے پکڑا
 اور مجھے لیونگ روم میں دھکیل دیا۔ میں نے بھاگنے کی
 کوشش کی لیکن اس نے ایک بار پھر مجھے لات رسید کی اور

”میں نے تمہیں خبردار کیا تھا۔“ وہ بولا۔ ”اب میں چاہتا ہوں کہ تم میرا گھر خالی کر دو۔ مجھے چاہیے کہ سیزن کے بتیر ہرن کا شکار کر کے پر تمہاری رپورٹ کروں۔“

جب وہ وہاں جانے کے لیے مڑا تو میرے دل میں شدید خواہش ابھری کہ میرا باپ اس پر جھپٹ پڑے۔ اسے شو کریں اور لائیں مارے جیسا اس نے میرے ساتھ کیا تھا لیکن اس نے ٹرک کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈیٹیل تقریباً اپنی کار تک پہنچ چکا تھا جب میری ماں نے اس کا نام لے کر اسے پکارا۔

”مجھے افسوس ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں فیصلہ کر چکا ہوں۔“

”پھر بھی ہم اس معاملے پر بات تو کر سکتے ہیں۔“ میری ماں نے کہا۔

اس نے مجھ سے کہا کہ میں ٹرک میں اپنے باپ کے ساتھ بیٹھ جاؤں پھر وہ تیزی سے ڈیٹیل کی طرف پیکسی۔ اس کا ہاتھ پکڑا اور ایڑیاں اٹھا کر اس کے کان میں سرگوشیاں کرنے لگی۔ اس نے غور سے اس کی بات سنی اور پھر میرے ڈیڑی کی طرف دیکھنے لگا۔

”ڈیڑی! گاڑی میں بیٹھو۔“ میرے باپ نے کہا۔

”اب ہمیں چلنا چاہیے۔“ مسٹر ڈیٹیل تھوڑی دیر بعد تمہاری ماما کو گھر پہنچا دیا۔

میں پینچر سیٹ کی طرف چلا گیا لیکن گاڑی میں سوار نہیں ہوا۔ ماں نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ڈیٹیل کا ہاتھ اس کی کمر تک گیا اور اس نے ماں کو اپنی جانب پہنچایا۔ اب میری سمجھ میں ساری کہانی آ گئی۔ ماں کا ”ادور ٹائم“ پر جانا۔ نصف شب کے بعد گھر آنا، بیسوں کی بہتات وغیرہ۔ ڈیڑی نے میرا نام لے کر پکارا، وہ تھا کہ ہوا اور رکست خوردہ لگ رہا تھا۔ میرے داغ میں آنے صیاسی چلے گئیں اور منہ میں کڑواہٹ کھل گئی۔ یوں لگا جیسے سستی ہو رہی ہے۔ پھر اچانک ہی میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور میں پُر سکون ہو گیا۔

”مام!“ میں چلا یا۔ ”میں جانے سے پہلے تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔“

وہ ڈیٹیل کی طرف مڑی جیسے اس سے اجازت مانگ رہی ہو۔ میرے داغ میں باپ کے کہے ہوئے الفاظ کو نیچے لگے۔ ”مجھے کبھی کسی کو مارنے کی ضرورت پیش آ جاتی ہے۔“ میں نے انتظار کیا کہ وہ ایک تہائی فاصلہ طے کرے پھر میں نے گاڑی میں سے رائل نکالی۔ اس کا سینٹی کیچ ہٹایا اور اس کی نال کا رخ بین ڈیٹیل کے سینے کی

”پھر بھی معلوم تو ہو کہ تم اسے کہاں لے جا رہے ہو؟“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بتایا کہ وہ رپورڈز پر جا رہا تھا کہ اس کی نظر ایک ہرنی اور اس کے بچے پر پڑی جو کھیتوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ گاڑی میں کن موجود تھی۔

”یہ گوشت کس تک کے لیے کافی ہوگا۔“ اس نے کہا۔ ”لیکن وہ دونوں جنگل میں کافی اندر پڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں انہیں سمیٹ کر لانا ہوگا۔“

”ادو میرے خدا!“ میری ماں نے کہا۔ ”یہ تم نے کیا کر دیا داسن؟“

”کیا تم ہرن کا گوشت نہیں کھانا چاہتیں؟“ اس نے اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے ایک گہری سانس لی اور بولا۔

”سب ٹھیک ہے۔ کسی کو بھی اس بارے میں معلوم نہیں ہوگا۔“

میری ماں نے اپنی جیکٹ اٹھائی اور بولی۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ دو کے مقابلے میں تین زیادہ تیزی سے کام کر سکتے ہیں۔“

ایک ہرنی اور اس کا بچہ گرے ہوئے پتوں کے ڈھیر پر پڑے ہوئے تھے۔ میری ماں نے ہرنی کے کندھے پکڑے اور میں اس کا پچھلا حصہ باندھنے لگا۔ بھی میں نے دیکھا کہ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور وہاں پر خون جتنا شروع ہو گیا تھا۔ میرے باپ نے ہرن کے بچے کو اپنے کندھوں پر ڈالا اور ٹرک کی طرف چل دیا۔

”جلدی کرو ڈیڑی۔“ ماں نے کہا۔ ”میں یہاں سے جلد از جلد لٹکانا چاہتی ہوں۔ اس سے پہلے کہ کوئی ڈیٹیل کو فون کر دے۔“

ڈیڑی نے کہا کہ کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا۔ اس کا اشارہ پڑوسیوں اور ہم جیسے کرائے داروں کی جانب تھا جو جانتے تھے کہ کھانے کی میز پر رشتہ نہ ہو تو ان کیسے گزرتے ہیں۔ ہم پک اپ کے قریب پہنچنے والے تھے کہ ڈیٹیل کی کار ہماری گاڑی سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔ ہمارے ہاتھ سے ہرنی گر گئی لیکن میرا باپ چلتا رہا۔ پک اپ کے قریب پہنچ کر اس نے ہرن کے بچے کو پھیلے سے میں ڈالا اور اس وقت ڈیٹیل اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔

”میں نے تمہیں ایک موقع دیا تھا۔“

”مجھے اس سے کب انکار ہے۔“ میرے باپ نے اعتراف کیا اور ایک سگریٹ نکال لیا۔

”لیکن تمہارے پاس اب بھی بڑی تعداد میں ہرن موجود ہیں۔“

جانب کر لیا۔

اور ڈیڈی کے درمیان تلخ کلامی کی وجہ کوئی اور تو نہیں تھی۔ انہوں نے میرے باپ کو پھٹکڑی لگا کر ڈیڈی میں ڈال دیا۔ ایک ڈپٹی نے ہماری گاڑی سے ہرن کا بچہ اتار کر سڑک کے کنارے ڈال دیا اور ہرنی کے ساتھ ساتھ اسے بھی ان شکرلوں کے لیے چھوڑ دیا جو لہیت کے چاروں طرف مٹلارہے تھے۔

میرے باپ پر مقدمہ چلا اور اسے بیس سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ جس رات اسے ایڈی ویل منتقل کیا جا رہا تھا، میں نے اس سے ملنے کی کوشش کی لیکن اس نے انکار کر دیا اور اس کے بعد بھی اس کا بھی رویہ رہا۔ پانچ سال بعد دل کا دورہ پڑنے سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس وقت وہ جیل کے کینے ٹیریا میں کام کر رہا تھا۔

میری ماں زندہ ہے اور پارہنس کاؤنٹی میں ہی رہتی ہے۔ کچھ عرصہ تو وہ میرے باپ کو یاد کر کے روتی رہی پھر اس نے اپنا راستہ بدل لیا۔ جیل میں قید کے دوران اس نے ڈیڈی سے ملنا بخون کرنا اور خط لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ بین ڈسٹریل کے مرنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک اور مرد آ گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد دوسرا پھر تیسرا، یہاں تک کہ مجھے ان کی کتنی سے کوئی دیکھی نہ رہی۔ کبھی کبھی میں اسے وال مارٹ یا میکڈالڈز پر دیکھتا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر سر ہلا دیتے۔ اس سے زیادہ ہمارے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

ڈیڈی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ کچھ جاندار ایسے ہوتے ہیں، جنہیں مار دینا چاہیے۔ ان کا اشارہ جانوروں کی طرف تھا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کا اطلاق انسانوں پر بھی ہوتا ہے۔ جیسے میں نے ڈسٹریل کو مار دیا اور اب میرا دل چاہتا ہے کہ اپنی ماں کو بھی گولی مار دوں لیکن میں ڈیڈی کی طرح ساری زندگی جیل میں بسر نہیں کرنا چاہتا۔ اس وقت تو ڈیڈی نے میرا جرم اپنے سر لے کر نئی زندگی دے دی تھی، اب کون بجائے گا۔ مجھے یہ بات بہت دیر سے سمجھ آئی کہ میری ماں جو کچھ کر رہی تھی، اس میں ڈیڈی کی مرضی شامل تھی۔ ماں نے ڈسٹریل سے تعلقات استوار کیے تاکہ ہم ایک آسودہ زندگی بسر کر سکیں اور ڈیڈی خاموش تماشا بنے رہے اور ان کے جیل جانے کے بعد ماں نے یہی راستہ اختیار کیا۔ میری نظر میں دونوں ہی بے حس ہیں لیکن ڈیڈی کا جرم زیادہ سنگین ہے، جنہوں نے عیش و آرام کی خاطر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ کاش میں ان کی اولاد نہ ہوتا..... کاش میں نے کسی اور گھر میں جنم لیا ہوتا.....!

پہلا نشانہ خطا گیا۔ نہ وہ خوف کے مارے اپنی جگہ پر جم رہا تھا۔ دوسری بار میں نے اس کا نشانہ لیا اور ٹریگ کو آہستہ سے دبا یا جیسا کہ ڈیڈی نے مجھے سکھا تھا۔ گولی سیدھی اس کے گلے کے نیچے جا کر لگی اور خون کے چھینٹے اس کی کار پر پھیل گئے۔ یوں لگا جیسے دنیا ایک لمحے کے لیے رک گئی ہو۔ میرے کان بج رہے تھے اور دل کی دھڑکن تیز ہوئی تھی لیکن اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ سب کچھ معمول پر آ گیا۔ میں نے اپنے باپ کی آواز سنی جو میرا نام لے کر چلا رہا تھا۔ اس نے جھٹ کر میرے ہاتھ سے رائل لے لی اور اس کی نال کا رخ آسمان کی طرف کر کے ٹریگ رو دیا پھر اس نے رائل سڑک پر پھینک دی اور کاچتے ہاتھوں سے نیا سگریٹ سلگا لیا۔ جب شیرف کے ڈپٹی اور پولیس والے آئے تو میں اور میری ماں گاڑی میں بیٹھے ہوئے تھے اور باپ اس کی پشت سے ٹیک لگائے بیڑی رہا تھا۔

ایک پولیس والے نے چلاتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے۔“ میرے باپ نے کہا۔ ”میں نے بین ڈسٹریل کو قتل کر دیا ہے۔“

اس نے کم از کم چھ مرتبہ یہ بات دہرائی کہ شکار کے حقوق اور بد اخلاقی بے جا پر ڈسٹریل کے ساتھ اس کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ آج جب اس نے ہرنی اور اس کے بچے کو دیکھا تو وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا اور اس نے سوچا کہ اس شکار سے ان کی دوام کی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ وہ ان مردہ جانوروں کو لے جا رہا تھا کہ ڈسٹریل وہاں پہنچ گیا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ انہیں گھر سے بے دخل کرنے کی دھمکی دی بلکہ یہ بھی کہا کہ وہ اس واقعے کی اطلاع متعلقہ حکام کو دے گا۔ اس پر وہ مشتعل ہو گیا اور اس نے ڈسٹریل پر فائر کر دیا۔

ایک سراغ رساں نے اس سے پوچھا کہ میری ماں کے لباس پر خون کے چھینٹے کیسے آئے؟ میرا خیال تھا کہ میرا باپ اس سوال کا جواب نہیں دے سکے گا اور اس کا پورا بیان مشکوک سمجھا جائے گا لیکن ڈیڈی نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ جب اس نے گولی چلائی تو وہ ڈسٹریل کے پاس کھڑی اسے مٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ سراغ رساں اور اس کے ساتھ آئے ہوئے سپاہیوں نے میری ماں پر بھرپور نظر ڈالی اور اس کی خوب صورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور سراغ رساں یہ پوچھنے پر مجبور ہو گیا کہ ڈسٹریل

امیدوار

سرزا امجد بیگ

اکثر لوگ امید کو بھی زندگی کا دوسرا رخ قرار دیتے ہیں... اور دینا بھی چاہیے کیونکہ امید ہی گویا مردہ تن میں جان ڈالنے کا باعث بنتی ہے اس نے جسے زندگی کا ساتھی سمجھا وہ ساتھ نہ نیہا سکا مگر جو امیدوار تھے اس کی نظروں کی سمت بدلنے کا باعث بن بیٹھے اور وہ جو زندگی کے نام پر سوائیوں کا طوق گلے میں ڈالنے پر مجبور تھے کہ کسی کی نگاہ خاص کا مرکز بن گئی اور پھر برائے نام جیون ساتھی کے جیون کی ناٹو کچھ ایسے ڈبوئی کہ اسے سانس لینے کی مہلت تک نہ ملی کیونکہ... جب کوئی کسی کی امید اجاڑنے کا باعث بن جائے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے اپنے دل کی دنیا بھی جلد ہی ویران ہونے والی ہے اور یہ سچ ہے کہ لالچ سے بندھی ذلت کی زنجیر ہمیشہ اسے اپنے دامن میں قید رکھتی ہے۔ ایسے میں جب بے بسی اپنے عروج پر ہو اور بیگ صاحب جیسے مددگار کا ساتھ مل جائے تو کیوں نہ اس کی نیا پار لگ جائے۔

محبت کے مراحل پر ہے آسرا اور بے بس حسینہ کا عبرت

ناگ اجرا

وہ ایک بچہ بہ اور اس شام تھی۔ جیسا کہ میں نے بتایا، اس دن کلائش کی آمد نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس وقت آفس میں میرے علاوہ سیکریٹری ماہم موجود تھی۔ آفس بوائے نوید کو تھوڑی دیر پہلے میں نے چھٹی دے دی تھی۔ نوید کو رنگی میں رہتا تھا۔ اس کی والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، جیسی وہ آج جلدی چھٹی لے کر چلا گیا تھا۔ میں اور ماہم بھی آفس کو بند کرنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک دراز قامت شخص اندر داخل ہوا۔

”السلام علیکم وکیل صاحب۔“ اس نے بہ آواز بلند مخصوص سندھی لہجہ میں مجھے سلام کیا۔

میں نے اس کے سلام کا جواب دیا اور اپنی میز کی دوسری جانب بھی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”تشریف رکھیں۔“

وہ بیٹھ گیا۔ جب وہ میرے کمرے میں داخل ہوا تو قدرے جھک کر چل رہا تھا۔ غالباً اس کی کمر میں کوئی تکلیف تھی یا پھر اس جھکاؤ کا سبب اس کی دراز قامت تھی۔ میرے محتاط

زندگی دھوپ چھاؤں کا مرتع ہے۔ یہ دکھ سکھ سے عبارت ہے۔ انسان تا حیات کسی بھی صورت خوشی و غم سے دامن بچا سکتا ہے اور نہ ہی ان سے بچھا چھڑا سکتا ہے۔ یہ الگ بات کہ کسی کی زندگی میں دکھ کم اور سکھ زیادہ ہوتے ہیں جبکہ کسی کی زندگی میں سکھ کم اور دکھ زیادہ۔ یہی انسان کا نصیب ہے۔ ہمیں ہر حال میں اپنے نصیب پر صابر و شاکر رہ کر مالک تقدیر سے رحمت کا امیدوار رہنا چاہیے۔

آج سے لگ بھگ پینتیس سال پہلے ماہ مہمر کی ایک ٹھنڈی ٹھار شام میں اپنے آفس میں بیٹھا روزمرہ کے امور نمٹا رہا تھا۔ اس دن میرے آفس میں کلائنٹ کا رش نہیں تھا۔ ایک تو موسم سرما اپنے جوبن پر تھا، اوپر سے پچھلے دو دن سے جاری بارش نے موسم کی شدت میں کمی گنا اضافہ کر دیا تھا۔ کراچی میں سردیوں کا موسم برائے نام چند دن کے لیے آتا ہے یہ جتنے دن کے لیے بھی وارد ہوتا ہے، لوگ رنگ برنگے گرم اونٹنی کپڑے پہن کر بڑی گرم جوشی اور خوش دلی سے اس کا استقبال کرتے ہیں۔



اندازے کے مطابق، اس کا قد چھ فٹ سے تجاوز تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں رول کیا ہوا ایک اخبار بھی دیکھا تھا۔ کرسی پر بیٹھنے کے بعد اس نے مذکورہ اخبار کو اپنے سامنے میز پر رکھ دیا۔ وہ تنقیدی نگاہ سے میرے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے پیشورہ نہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”جی فرمائیں..... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

میرے سوال کا کوئی معقول جواب دینے کے بجائے اس نے پوچھا۔ ”ویکل صاحب! آج کچھ زیادہ ہی سردی نہیں ہو رہی؟“

”جی، ایسا ہی ہے۔“ میں نے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ ناظم آباد میں رہتے ہیں؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں استفسار کیا۔

”کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کہ میں کہاں رہتا ہوں؟“ میرے انداز میں بیزاری درآئی تھی۔

اس شخص نے گفتگو کا آغاز ایسے نامعقول طریقے سے کیا تھا کہ مجھے اس کی موجودی سے خاصی کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ مجھے کوئی جھگی اور کھکا ہوا بندہ لگا تھا حالانکہ اس نے معقول تراش کا لباس پہن رکھا تھا اور چہرے سے بھی تعلیم یافتہ نظر آتا تھا مگر اس کا طرز گفتگو جیسے والا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا، وہ میرے پاس کسی قانونی مدد کے حصول کے لیے نہ آیا ہو بلکہ میرا انٹرویو کرنے تشریف لایا ہو.....!

وہ مونے گلاز والے چشمے کے پیچھے سے متنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ”نہیں جناب! فرق پڑنے والی تو کوئی بات نہیں۔ میں نے آپ کو ناظم آباد میں دو تین بار دیکھا ہے، اس لیے پوچھا.....!“

”آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں دو تین مرتبہ کراچی کے کسی علاقے میں دیکھا جاؤں تو میری رہائش اسی علاقے میں ہوگی؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اکتاہٹ بھرے انداز میں پوچھا۔

”گلتا ہے، آپ ناراض ہو گئے ہیں.....!“ وہ اپنی چندیا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ ”مجھے پہلے اپنا تعارف کرانا چاہیے تھا۔ جناب! امیرانام آباد گھنٹہ ہے۔“

میرے سامنے تشریف فرما آفتاب گھنٹہ سرے ”فارغ البال“ ہو چکا تھا۔ بس کھوپڑی کے گرد ایک چمکی جھارسی بتاتی تھی کہ کبھی اس نگری میں بالوں کا نخلستان یعنی ”بالستان“ شادو آباد ہوا کرتا تھا۔ اس شخص نے اپنا نام بھی بڑا عجیب سا بتایا تھا جیسا کہ عموماً شاعروں اور ادیبوں کا ہوا کرتا

ہے۔ وہ بندہ خدا کہیں سے بھی مجھے گھنٹہ دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی آفتاب البتہ اس کے سر پر چند یا کسی آفتاب کے مانند ضرور چمک رہی تھی۔ اس کی عمر کا اندازہ میں نے چالیس کے آس پاس قائم کیا اور نہایت ہی ٹھہرے ہوئے لہجے میں اس کی تسلی کی خاطر کہا۔

”آفتاب صاحب! میں آپ سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ آپ بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“ ”دراصل میرا تعلق صحافت سے ہے۔“ اس نے بڑے فخر سے بتایا۔ ”لیکن اس وقت میں کسی اور کے کام سے آپ کے پاس آیا ہوں۔“

”اوه..... تو آپ جرنلسٹ ہیں۔“ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ کون سے اخبار سے منسلک ہیں؟“

”میں ایک فری لانس جرنلسٹ ہوں۔“ وہ ایک شان بے نیازی سے بولا۔ ”میں مختلف اخبارات کے لیے کام کرتا ہوں۔ جس کو میری ضرورت ہوتی ہے، مجھے بلایا ہے۔“

”آپ کی فیلڈ کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”مطلب، آپ کس قسم کی جرنلزم کرتے ہیں؟ آپ کا خصوصی شعبہ کون سا ہے؟“

”میں عموماً رپورٹس کا کام کرتا ہوں۔“ اس نے بتایا۔ ”میری تیار کردہ سنسنی خیز اسٹوریز آگ لگا دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ میں فیچر ز اور کالم وغیرہ بھی لکھتا ہوں۔“

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ میں نے زبردستی کی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر سجاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”آپ بتا رہے تھے کہ کسی کے کام سے آئے ہیں.....؟“

”سچی بات تو یہ ہے کہ آفتاب گھنٹہ سے مل کر مجھے قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت نے مجھ پر خاصا بیزار کن تاثر مرتب کیا تھا۔ صحافی برادری سے میرے دوستانہ مراسم تھے اور میں ایسے کئی صحافیوں کو جانتا تھا جن کی نکالی ہوئی اسٹوریز ملک کے طول و عرض میں واقعی آگ لگا دیتی تھیں۔ آفتاب گھنٹہ کا نام میں نے آج پہلی مرتبہ سنا تھا۔ یقیناً یہ کوئی جدید صحافی نہیں تھا۔“

”جی..... وہ ایک خاتون ہیں۔“ آفتاب گھنٹہ نے گہری سنجیدگی سے بتایا۔ ”اور کافی مشکل میں ہیں۔ میں چاہتا ہوں، آپ اس دکھاری کی قانونی مدد کریں۔ آپ کی فیس اور جو بھی عدالتی اخراجات ہوں گے، وہ میں ادا کروں گا۔“

میں نے رف پیڑ اور تین سنبالتے ہوئے کہا۔

”آپ اس خاتون کی پریشانی بیان کریں۔ اس کے بعد فیصلہ ہوگا کہ میں اس کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

میں جویریہ کی طرف سے عدالت میں خلع کا مقدمہ دائر کروں تو جویریہ کو یہ نفس نفس میرے پاس آنا ہوگا۔ بعض باتیں صرف جویریہ ہی سے ہوسکتی ہیں۔

”یہ وقت ضرورت میں جویریہ کو بھی آپ سے ملوانے لے آؤں گا۔“ وہ سرسری انداز میں بولا۔ ”آپ ذرا اس کیس کا پس منظر سنیں تو آپ کے لیے آسانی ہو جائے گی۔“

”ٹھیک ہے..... سنادیں۔“ میں نے بادل ناخواست کہا۔ وہ شروع ہو گیا۔ میں اس کی بیان کردہ کہانی کے اہم پوائنٹس نوٹ کرتا چلا گیا۔ آفتاب مختلف مختلف انداز میں مجھے یہ بتانے کی کوشش کرتا رہا کہ جویریہ کا شوہر بہت کم ظرف اور ظالم شخص ہے جس نے اپنی بیوی کو پچھلے ایک سال سے اپنے گھر سے بے دخل کر رکھا ہے اور بے چاری جویریہ اپنی بڑی بہن کے گھر میں ٹھہری ہوئی ہے۔ آفتاب کے خیال میں اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل تھا کہ جویریہ کو آزادی مل جائے۔ اس سلسلے میں اسے میری مدد درکار تھی۔

میں نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور اس کے خاموش ہونے پر اپنا ہڈ پینک کا ڈاڑھ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”اسے رکھ لیں اور اگلی بار جب مجھ سے ملاقات کا پروگرام ہو تو جویریہ کو بھی اپنے ساتھ لے آئیے گا۔“

اس نے چند لمحات تک ٹکٹ ٹکٹی ہوئی نظر سے مجھے دیکھا پھر اپنی جیب کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”آپ کی کیس.....“

”فیس کا ابھی وقت نہیں آیا۔“ میں نے قطع کلای کرتے ہوئے کہا۔ ”جب میں جویریہ سے ایک بھر پور ملاقات کر کے اپنا اطمینان کر لوں گا، تب آپ سے فیس بھی وصول کر لوں گا۔“

”تو کو یا میری باتوں سے آپ مطمئن نہیں ہوئے؟“ اس نے استفسار یہ انداز میں مجھے دیکھا اور جیب کی طرف بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روک کر بولا۔ ”کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ نے ابھی تک یہ کیس اپنے ہاتھ میں نہیں لیا؟“

”عملاً یہی بات درست ہے آفتاب صاحب۔“ میں نے بڑی رسیان سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”جب میں جویریہ سے تفصیلی ملاقات کر لوں گا اور بعض اہم قانونی کاغذات پر میں ان کے دستخط لے لوں گا تو زبانی حقائق کے مطابق، اس وقت یہ کیس میرے ہاتھ میں ہوگا۔ جیسی مجھے فیس وصول کرنے کا بھی حق ہوگا۔“

”اس خاتون کا نام جویریہ ہے۔“ وہ اپنے عذر سنا شیشوں والے چشمے کو درست کرتے ہوئے بتانے لگا۔

”جویریہ کے شوہر نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ ایک سال سے اپنی بہن کے گھر میں بیٹھی ہوئی ہے۔ میں چاہتا ہوں، جویریہ کو اس کیسے شخص سے نجات مل جائے۔“

”اوہ.....!“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا۔ ”گویا آپ جویریہ کو خلع دلوانا چاہتے ہیں؟“

”خلع ہو یا طلاق، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”بس کسی طرح جویریہ کو اس بد ذات سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔“

چھٹکارے والی بات اس نے دوسری بار کی تھی۔ میں نے وضاحت ضروری جانی اور کہا۔ ”خلع اور طلاق دو مختلف چیزیں ہیں آفتاب صاحب۔ خلع لینے والی خاتون کو اپنے بہت سارے حقوق سے مستبردار ہونا پڑتا ہے۔ آپ ایک پڑھے لکھے صحافی ہیں۔ میں بھلا آپ کو کیا سمجھاؤں گا.....“

”جی جی.....“ وہ بڑی سرعت سے سرکواشانی جنبش دیتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ سب اچھی طرح جانتا ہوں۔ جویریہ کے سکون کی خاطر نقصان اٹھایا جاسکتا ہے۔“

”آفتاب صاحب!“ میں نے پیڑ پر کلم چلاتے ہوئے آفتاب کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے سوال کیا۔ ”اس بد بخت کیسے کا نام کیا ہے؟“

وہ برا سامنے بتاتے ہوئے بولا۔ ”آصف!“

”آفتاب صاحب! کیا میں جان سکتا ہوں کہ جویریہ سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟“

میرے سوال پر وہ بدکا لہو بھر حذب رہنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ”آپ اسے ہمدردی کا رشتہ سمجھ لیں۔“

میرے تئیں یہ ایک انتہائی فضول اور وہامیات جواب تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس کا مطلب یہ ہوا کہ جویریہ آپ کی اور آپ جویریہ کے کچھ نہیں لگتے۔ آپ محض انسانیت کے ناتے اس دھمی عورت سے ہمدردی رکھتے ہیں اور اسے اس کے ظالم شوہر آصف سے نجات دلانا چاہتے ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا.....؟“

”جی..... آپ سولہ آنے درست کہہ رہے ہیں۔“ وہ تائیدی اعزاز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میرے نزدیک انسانیت کا رشتہ اس دنیا کا سب سے اہم اور مضبوط رشتہ ہے۔“

”بے شک! اس رشتے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن یہ قانونی معاملات ہیں۔ اگر آپ کی یہ خواہش ہے کہ

”سمجھ گیا.....!“ وہ دربارہ انداز میں گردن کو حرکت دیتے ہوئے بولا پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ان الفاظ میں اضافہ کیا۔ ”وکیل صاحب! آپ سے جلد ملاقات ہوگی۔“
 ”ان شاء اللہ!“ میں نے الوداعی مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

اس نے سرد مہری سے مجھ سے ہاتھ ملایا اور ”خدا حافظ“ کہہ کر میرے دفتر سے نکل گیا۔ اس کے رخصت ہوتے وقت میرے ذہن میں یہی تاثر تھا کہ وہ دوبارہ میرے دفتر کا رخ نہیں کرے گا۔ میں نے اس کی توقعات کے برعکس رویہ اختیار کر کے ایک لحاظ سے اسے خاصا یوں کیا تھا۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میرے پیسے کا تقاضا تھا۔ آفتاب گفتہ کا جو یہ نامی اس مظلومہ سے باقاعدہ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ میں اس کی فرمائش نما خواہش پر کسی ایسی عورت کا ایس نہیں لے سکتا تھا جسے میں جانتا تک نہیں تھا اور نہ ہی میں نے کبھی اسے دیکھا تھا۔ ”انسانیت کا نانا اور ہمدردی کا رشتہ“ اپنی جگہ مگر پرانے پھڑے میں ٹانگ پھنسانے کا مجھے بھی شوق نہیں تھا۔ میرا پیشہ کوئی ”مختل لطیفہ بازی“ یا ”نفرینی پروگرام“ نہیں تھا جو میں محض دل پشوری کے لیے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر آفتاب کی خواہش کی تکمیل میں لگ جاتا۔

”آفتاب گفتہ“ نامی اس کیریکٹر کے بارے میں، میں یہی سمجھتا تھا کہ جو یہ اس کی کوئی جاننے والی تھی۔ وہ جو یہ کو مصیبت زدہ سمجھتا تھا اور انسانی ہمدردی کے ناتے میرے توسط سے وہ جو یہ کو اس مصیبت سے نجات دلانا چاہتا تھا۔ اگر میں آفتاب کو ذاتی طور پر بھی جانتا ہوتا تو بھی میں جو یہ سے ملے بغیر یہ کیس بھی اپنے ہاتھ میں نہ لیتا۔ اصول، اصول ہوتا ہے اور یہ بھی ٹوٹا پسند نہیں کرتا۔ جو محض بھی اصول کو توڑتا ہے، اصول بہت جلد اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔

جیسا کہ میں نے بتایا، صحافی برادری میں کسی معتبر افراد سے میرے گہرے مراسم تھے۔ میں نے اس حلقے میں بعض صحافیوں سے آفتاب کا ذکر کر کے اس کے بارے میں سن گن لینے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ اکثر افراد سے نہیں جانتے تھے۔ ایک آدھ نے اس سے شناسائی ظاہر کی اور مجھے بتایا کہ وہ ایک چلتا پھرتا رسائی ممی ٹائپ صحافی تھا۔ بنیادی طور پر وہ مترجم تھا۔ وہ سندھی ادب سے مختلف چیزیں ترجمہ کر کے چھوٹے موٹے اخبارات کو دیتا رہتا تھا اور کبھی کبھار اس کے آریکل شائع بھی ہو جاتے تھے۔ اس سے زیادہ اس کی اور کوئی شناخت نہیں تھی۔ گویا وہ ایک بزرگ خدوم کا صحافی تھا!

☆☆☆

دو روز کے بعد آفتاب گفتہ ایک مرتبہ پھر میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اب کی بار وہ اکیلا نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خاتون بھی تھی جس نے اپنے پورے بدن کو ایک سیاہ چادر سے ڈھانپ رکھا تھا، صرف اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ درمیانے قد کا ٹھہ کی مالک ایک گوری جٹی اور خوب صورت عورت تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش میں ایک خاص نوعیت کا ٹیکھا پن پایا جاتا تھا جو اس کی دلکشی میں اضافہ کرتا تھا تاہم اس وقت وہ خاصی سنجیدہ اور فکر مند دکھائی دیتی تھی۔ اغلب امکان یہی تھا کہ وہ جو یہ ہے۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ پچیس اور تیس کے بیچ لگایا۔ بعد ازاں میرے یہ دونوں اندازے درست ثابت ہوئے۔ وہ جو یہ یہی تھی اور اس کی عمر پچیس سال تھی۔

ابتدائی رسمی علیک سلیک کے بعد میں نے جو یہ کو اپنے سوالات کی باڈ پر رکھ لیا اور پوچھا۔ ”آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟“

”لگ بھگ ڈیڑھ سال۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”مجھے پتا چلا ہے، پچھلے ایک سال سے آپ اپنی بڑی بہن کے گھر میں رہ رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ اپنے شوہر آصف کے ساتھ صرف چھ ماہ ہی رہی ہیں؟“

”جی..... یہی حقیقت ہے؟“
 ”آپ نے اپنے شوہر کا گھر خود چھوڑا تھا یا اس نے آپ کو نکال دیا تھا؟“ میں نے پھر سے ہونے لے جسے پوچھا۔
 ”آصف اپنی بہنوں کی منگی میں ہے۔ یوں سمجھیں کہ وہ ان کا متا بتا ہوا ہے۔“ جو یہ نے بتایا۔ ”قمر النساء اور خیر النساء مجھے پسند نہیں کرتی تھیں اس لیے وہ اپنے بھائی کے کان میرے خلاف بھرتی رہتی تھیں۔ ہمارے معاشرے میں دوسروں کو درغلانے والوں کی کمی نہیں۔ قمر النساء ایک پرائیویٹ بینک میں جاب کرتی ہے اور خیر النساء ایک سرکاری اسکول میں ٹیچر ہے۔ ان کی عمریں علی الترتیب اڑیس اور چالیس سال ہیں اور دونوں کی ابھی تک شادی نہیں ہوئی۔ سارے گھر کا نظام انہی دونوں عورتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ آصف ان سے چھوٹا ہے لہذا وہ آصف کو اپنے اشاروں پر نچاتی ہیں۔ وہ دونوں مجھ سے نفرت کرتی ہیں اس لیے انہوں نے میری طرف سے آصف کا دل بھی کھٹا کر دیا ہے۔ پہلے وہ مجھ سے اکھڑا کھڑا ہنسنے لگا، پھر ہمارے بیچ باقاعدہ لڑائی جھگڑا ہونے لگا اور ایک روز اس نے مجھ سے کہہ دیا کہ اسے میری ضرورت نہیں۔ میں

جہاں جی چاہے، دفع ہو جاؤں.....“

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔ میں نے استفسار کیا۔

”کیا آصف کے گھر میں کوئی بوڑھا بڑا نہیں ہے جو

اس بے ہودہ صورت حال کو ہینڈل کر سکتا؟“

”نہیں.....“ اس نے نفی میں گردن ہلائی اور بتایا۔

”آصف کے والدین کا کافی عرصے پہلے انتقال ہو گیا تھا۔

اس کے بعد سے یہی دونوں حرافہ گھر کا ہر فیصلہ کرتی ہیں۔

آصف ان کے سامنے ہمیشگی بی بن جاتا ہے اور اس کے منہ

سے ایک لفظ نہیں نکلتا۔ مجھ سے جب تک ان کنواری

بوڑھیوں کا ناروا سلوک برداشت ہوتا رہا، میں ہر ظلم و ستم

چپ چاپ سہتی رہی۔ میں اگر شکایت کرتی بھی تو کس سے؟

وہاں کوئی میری سننے والا نہیں تھا۔ آصف جسے کہ میرے

حقوق اور عزت کا تحفظ کرنا چاہیے تھا، وہ ان شیطان عورتوں

کا آلہ کار بن گیا تھا۔ انسان کی خودداری کی بڑی اہمیت

ہوتی ہے وکیل صاحب..... جب وہاں میری بے توقیری

بہت زیادہ بڑھ گئی اور آصف بھی فوج و شام مجھے دفع ہونے

کے لیے کہنے لگا تو میں باجی کے گھر آ گئی۔“

جویریہ ایک بڑھی گھسی اور مہذب عورت تھی۔ مجھے یہ

اندازہ لگانے میں کوئی دقت محسوس نہ ہوئی کہ وہ اپنی دونوں

دندلوں کے لیے دل میں بہت غبار رکھتی تھی۔ اس کے آخری

جملے کے جواب میں، میں نے پوچھا۔

”باجی کے گھر کیوں؟“

”تو پھر میں کہاں جاتی؟“ اس نے حیرت بھرے

لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”تمہارے والدین کہاں ہیں؟“

”وہ اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ وہ ایک افسردہ سی

سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ”امی کا تو دس سال پہلے

انتقال ہو گیا تھا اور ابو میری شادی کے ایک ماہ بعد اس دنیا

سے رخصت ہوئے ہیں۔ اب اس جہان میں میرا کوئی اپنا

ہے تو وہ باجی عارفہ ہی ہے۔“

پھر اس کی زبانی مجھے پتا چلا کہ عارفہ چھتیس سال کی

ایک مفلوج عورت تھی۔ دو سال پہلے اس پر فالج کا شدید

ایک ہوا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ وہ زندہ بچ گئی مگر ہمیشہ کے

لیے وہیل چیئر کی ہو کر گئی تھی۔ عارفہ کی شادی کو چودہ سال

کا عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کے تین بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور

ایک بیٹا۔ بڑی بیٹی ستاس سال کی، اس سے چھوٹی سنی آٹھ

سال کی تھی جبکہ ان کا اکلوتا بھائی فرحان محض پانچ سال کا

تھا۔ عارفہ کا شوہر شکیل احمد ایک بلدیاتی ادارے میں

ملازمت کرتا تھا۔ اس کی تنخواہ تو زیادہ نہیں تھی تاہم ان کا

گزارہ ہو رہا تھا۔ عارفہ کی معذوری نے گھر کے نظام کو درہم

برہم کر دیا تھا، خاص طور پر بچے بری طرح رُل گئے تھے

تاہم پچھلے ایک سال سے جویریہ کی موجودگی کے باعث یہ

گھر دوبارہ نارل انداز میں چلتے لگا۔

”کیا آصف سے آپ کی شادی کے لیے اس کی یہ

دونوں فتنہ پرور بہنیں راضی نہیں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ شادی ان کی مرضی ہی سے ہوئی تھی۔“ جویریہ

نے بتایا۔ ”ان دونوں نے ابو سے تمام معاملات طے کیے

تھے بلکہ جب جہیز کی بات ہو رہی تھی تو خیر النساء نے یہ تجویز

دی تھی کہ گھر میں فرنیچر اور استعمال کا دیگر سب سامان موجود

ہے لہذا اس سلسلے کا بجٹ بہ صورت کیش آصف کو دے دیں

تا کہ وہ اس رقم کو کسی سود مند اسکیم میں لگا سکے۔ ابو نے چپ

چاپ میں ہزار روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے تھے کہ میں

جس طرح چاہوں انہیں استعمال کر لوں۔“

”جب سب کچھ نارل انداز میں خوش اسلوبی سے انجام

پا گیا تھا تو پھر آصف کی بہنوں کو کیا ہوا؟“ میں نے جویریہ کی

طرف دیکھتے ہوئے انہیں زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”انہوں نے

اپنے بھائی کا گھر تباہ کرنے کے لیے یہ فساد کیوں چکایا؟“

”مجھے تو لگتا ہے، ان کی نیت شروع ہی سے ٹھیک نہیں

تھی۔“ وہ پُرسوج انداز میں بولی۔ ”ابو کی رقم پر ان کی نظر لگی

ہوئی تھی۔ ادھر ابو کی آنکھ بند ہوئی، ادھر ان دونوں شیطان

کی چیٹیوں نے پر پرزے نکال لیے اور ہاتھ دھو کر میرے

بچے پڑ گئیں۔ میں نے.....“

”ایک منٹ!“ میں اس کی بات پوری ہونے سے

پہلے ہی بول پڑا۔ ”آپ اپنے ابو کی کون سی رقم کا ذکر کر رہی

ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی تیس ہزار روپے جو جہیز کی مد میں انہوں نے

کیش وصول کیے تھے۔“ جویریہ نے بتایا۔

”کیا آپ کے ابو نے مذکورہ رقم خیر النساء یا قمر النساء

کے حوالے کی تھی؟“ میں نے استفسار کیا۔

”نہیں..... ابو نے وہ تیس ہزار روپے مجھے دیے

تھے۔“ جویریہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ”اور میں نے

یہ رقم آصف کے پاس رکھوا دی تھی۔ اس نے مجھ سے رقم

لے کر اپنے اکاؤنٹ میں ڈال دی تھی اور کہا تھا..... یہ

روپے میرے پاس تمہاری امانت کے طور پر رکھے ہیں۔

میں انہیں کسی کاروبار میں لگاؤں یا کچھ اور کروں، مجھے اس

سلسلے میں فائدہ ہوا نقصان، میں یہ تیس ہزار روپے چھپیں

”مغفل حق مہر وہ ہوتا ہے جو دو لہا کو فوراً ادا کرنا ہوتا ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”جبکہ موجد حق مہر کا مطلب یہ ہے کہ جب دلوں مانگے تو اس وقت دہلیا ادا کرے۔ موجد حق مہر کو عند الطلب بھی کہا جاتا ہے۔ کیا آصف نے شبِ عروس میں آپ کا حق مہر ادا کر دیا تھا؟“

”نہیں جناب۔“ اس نے جواب دیا۔
”تو پھر آپ کا حق مہر عند الطلب یعنی موجد ہو گا جو آپ کے مطالبے پر آصف کو ادا کرنا ہو گا۔ ویسے نکاح نامے پر یہ تمام تفصیل درج ہوتی ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوا کہ.....“ لاجانی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”حق مہر والے پچیس ہزار روپے بھی آصف پر واجب الادا ہیں..... زیورات اور نقد رقم والے پچاس ہزار کے علاوہ۔“

آفتاب گفتہ کافی دیر سے خاموش بیٹھا ہوا ہماری گفتگوں رہا تھا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو تو تعلقہ دینے والے انداز میں مجھ سے مستغفر ہوا۔

”وکیل صاحب! اگر ہم خلق کا مقدمہ دائر کریں تو پھر ہمیں حق مہر والی رقم سے تو دست کش ہونا پڑے گا۔ آپ نے یہی بتایا تھا نا.....؟“

”جی۔ میں نے ایسی ہی بات کی تھی۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر جویریہ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”اور اگر آصف اس بدھن کو توڑنے کے لیے آپ کو طلاق دیتا ہے تو پھر وہ حق مہر والی رقم ادا کرنے کے لیے پابند ہو گا۔ ویسے آپ کو کیا لگتا ہے، آصف نے اس حوالے سے کیا سوچ رکھا ہے؟“

”نیت کا حال تو خدا ہی جانتا ہے۔“ اس نے گول مول جواب دیا۔ ”میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا، وہ آخر چاہتا کیا ہے۔“

”میں بتاتا ہوں وکیل صاحب!“ آفتاب گفتہ ایک بار پھر ہمارے بیچ کود پڑا۔ ”میں یہ سمجھتا ہوں کہ آصف نے اگر جویریہ کو طلاق دیتا ہوتا تو اس معاملے کو وہ ایک سال تک لٹکائے نہ رکھتا۔ وہ پچیس ہزار بچانے کے لیے اس تنازع کو طول دے رہا ہے تاکہ یہ ننگ آصف کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکٹانے پر مجبور ہو جائے اور آپ یقین کریں وکیل صاحب، جویریہ اسی قسم کے حالات سے گزر رہی ہے لہذا ہمیں فوراً خلق کا مقدمہ دائر کر دینا چاہیے..... پچیس ہزار جا میں جنم میں!“

واپس کرنے کا پابند ہوں گا۔“
”مجھے تو یہ بندہ اپنی بہنوں سے بھی دو ہاتھ آگے کا کوئی شاطر لگتا ہے۔“ میں نے پرخیاں انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”تو کیا آصف نے تمہاری امانت لوٹادی تھی؟“
اس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
”نہیں وکیل صاحب۔“

میں نے ایک اہم سوال کیا۔ ”کیا تم لوگوں کی طرف سے کوئی زیور وغیرہ بھی بنایا گیا تھا؟“
”جی۔ ابو نے میرے لیے تیس ہزار روپے کے طلائی زیورات بنوائے تھے۔“ اس نے بتایا۔
”وہ زیورات کہاں ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”آصف کے گھر میں۔“

”اور آپ خالی ہاتھ وہاں سے چلی آئی تھیں؟“
”میرے دل میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔“ وہ بڑی مصمیت سے بولی۔ ”اس لیے میں نے اس حوالے سے کبھی سوچا ہی نہیں۔“

”تو اس کا مطلب یہ ہوا.....“ میں نے سختی خیز انداز میں کہا۔ ”آصف نے تمہارے لگ بھگ پچاس ہزار روپے دبا رکھے ہیں۔ تیس ہزار نقد رقم اور تیس ہزار کے طلائی زیورات.....!“

”میں سمجھتی ہوں، آصف اتنا بُرا بھی نہیں۔“ وہ معتدل انداز میں بولی۔ ”وہ اپنی بہنوں کے کھانے میں ہے۔ وہ سانس بھی ان کی مرضی ہی سے لیتا ہے۔“
جویریہ کی سادگی بہ الفاظ و دیگر حماقت پر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن میں نے اپنی فحش کا اعتراف کئے بغیر سختی خیز انداز میں کہا۔ ”کیا اس اچھے انسان نے پچھلے ایک سال میں آپ کو مٹانے یا واپس لے جانے کی کوئی کوشش کی؟“
اس نے کچھ بولنے کے بجائے نفی میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے کہا۔ ”ایسے اچھے آدمی کا تو اچار بھی نہیں ڈالنا چاہیے جو نامعقول بہنوں کی غیلوں پر چل کر اپنی ازدواجی زندگی کو برباد کر ڈالے۔ بہر حال، یہ دنیا ہے اور..... اس دنیا میں ہر قسم کے لوگ موجود ہیں۔“

جویریہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس ہلہول کر رہ گئی۔
”آپ کا حق مہر کتنا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔
اس نے بتایا۔ ”پچیس ہزار روپے۔“
”موجد یا مغل.....؟“
”یہ تو مجھے پتا نہیں جناب۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

یوم آزادی کی مناسبت سے خصوصی تحریریں لیے اگست 2017ء کا جشن آزادی نمبر



پاکینہ

ماہنامہ کراچی

شیریں حیدر اور رفعت سراج کے ماہرانہ قلم کی جولانیاں..... قسط دار ناول کی صورت

سحر ساجد نے من جاں بازم کا کیا دلنشین اختتام

سیما رضا ردا اپنے مٹی ناول..... ہم کو عبث بدنام کیا..... کو ایک دلکش انداز میں آگے بڑھاتے ہوئے

14 اگست کی مناسبت سے ناہید سلطانہ اختر، دردانہ نوشین خان،

منشا محسن علی اور نرمین سرہیو کی خصوصی تحریریں

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور اختر شجاعت کے روح پرور مضامین

نامور مزاح نگاروں کے شہ پاروں سے انتخاب..... فکاہیہ کالم کی صورت

وہ آنے بزم میں.....

نزہت اصغر سے مصنفہ عذرا آفتاب

کی بڑ لطف باتیں

اس کے علاوہ

طیبہ عنصر مغل، فرح بختو، غزالہ عزیز، باجرہ ریحان،

افشین جہاں آرا کی خوب صورت کہانیاں

دیباغہ میں بسنے والے اپنا یوم آزادی کیسے مناتے ہیں۔ یہ پڑھیے شانستہ زریں کے خصوصی سروے میں.....

اس کے ساتھ ساتھ سوکرن شاعری خوش ذائقہ پکوان قابل غور ترانے اور دلچسپ پانچ مستقل سلسلے صرف آپ کے ذوق کے لیے

اب میں سمجھا کہ آفتاب کلفت نے پہلی ملاقات میں مجھ سے یہ کیوں پوچھا تھا کہ..... کیا میں ناظم آباد میں رہتا ہوں؟ اس نے یقیناً مجھے اس علاقے میں کہیں دیکھا ہوگا۔ ان دنوں جب کاہرہ واقعہ ہے، میری رہائش ناظم آباد میں تھی۔

”میں نے آفتاب کو اس لیے دوسرے کمرے میں بھیجا ہے تاکہ میں آپ سے ذاتی نوعیت کی چند اہم باتیں کر سکوں۔“ میں نے جویرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ”ایسی باتیں جو آفتاب کی موجودگی میں کرنا میں مناسب نہیں سمجھتا اور آپ سے بھی یہی توقع کرتا ہوں کہ آپ بھی یہ گفتگو اپنے تئیں ہی رکھیں گی۔“

”آپ مطمئن ہو جائیں۔“ وہ بڑے مضبوط لہجے میں بولی۔ ”میں آپ کی توقع پر پوری اتروں گی۔“

”مکذ.....!“ میں نے ستائی نظر سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”مجھے آپ جیسی ذہین خاتون سے ایسے ہی اعتماد کی امید تھی۔“ لمبائی توقف کر کے میں نے گہری نگاہ سے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیا پھر سر سراتے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”آفتاب صاحب آپ کی ذات میں اتنی زیادہ دلچسپی کیوں لے رہے ہیں حالانکہ آپ سے ان کی کوئی رشتہ داری بھی نہیں ہے.....؟“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں وکیل صاحب!“ وہ بڑی رसान سے بولی۔ ”آفتاب صاحب سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ میں سمجھتی ہوں، وہ ایک بھلے انسان ہیں اور انسانی ہمدردی کے ناتے وہ میری مدد کرنا چاہتے ہیں۔“

”انسانی ہمدردی کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔“ میں نے بد دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اس نازک موقع پر کسی غیر متعلقہ شخص کے بجائے اگر آپ کی بہن اور بہنوئی بھلے انسانوں کا کردار ادا کرتے ہوئے انسانی ہمدردی کے پلیٹ فارم سے آپ کا معاملہ لے کر میرے پاس آتے تو سب کچھ کتنا سچل محسوس ہوتا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں.....؟“

”آپ کی سوچ غلط نہیں ہے وکیل صاحب مگر.....“ وہ بولتے بولتے رکی تو میں نے پوچھا۔ ”مگر کیا جویرہ صاحبہ؟“

”میں نے آپ کو بتایا ہے نا، عارفہ باجی پچھلے دو سال سے معذوری کی زندگی گزار رہی ہیں۔“ وہ دھمی لہجے میں بولی۔ ”یہ عدالتی بھاگ دوڑ ان کے بس میں کہاں ہے وکیل صاحب۔“

آفتاب کلفت کی باتوں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے جویرہ سے بھی زیادہ خلع کی جلدی تھی۔ اس سے ایک اور بات بھی مجھ میں آتی تھی کہ اس خلع کے ساتھ آفتاب کا کوئی مفاد جزا ہوا تھا۔ میں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر آفتاب ہمارے ساتھ بیٹھا رہا تو میں جویرہ سے رازداری والی کوئی بات نہیں کر سکوں گا۔ اسے کٹانے کے لیے میں نے جویرہ سے کہا۔

”یہ تو بہت ہی پیچیدہ صورت حال ہے۔ اس مشکل کا کوئی حل نکالنے کے لیے مجھے تنہائی میں آپ سے چند باتیں کرنا ہوں گی۔“ پھر میں نے آفتاب کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”اگر آپ چند منٹ کے لیے دوسرے کمرے یعنی انتظار گاہ میں چلے جائیں تو میرا بانی ہوگی۔“ وہ چپ چاپ اٹھا اور میرے پیچھے نکل گیا۔

”معذرت چاہتا ہوں۔“ آفتاب کے جانے کے بعد میں نے جویرہ سے کہا۔ ”ایک مخلص اور ہمدرد انسان کو میں نے اس اہم گفتگو سے باہر کر دیا۔ آپ اسے میرے پیٹے کی مجبوری یا تنہا سمجھ لیں۔ امید ہے، آپ مایوس نہیں کریں گی۔“

وہ بھیگی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی۔ ”کوئی بات نہیں وکیل صاحب۔ آپ اپنے کام کو زیادہ بہتر سمجھتے ہیں۔“

”ویسے یہ صاحب ہیں کون؟“ میں نے کریدنے والے انداز میں پوچھا۔

”کون صاحب.....؟“ وہ بے ساختہ بولی۔

موجودہ حالات نے اسے کافی الجھا رکھا تھا اسی لیے وہ میرے سوال پر دھیان نہیں دے پائی تھی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا تھا..... کون صاحب؟

میں نے جویرہ کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔

”ارے..... میں آفتاب صاحب کی بات کر رہا ہوں۔“

”اوہ اچھا.....“ وہ ایک بو بھل سانس خارج کرتے

بولی۔ ”مے ہمارے محلے ہی میں رہتے ہیں۔ یوں سمجھ لیں کہ ہمارے گھر کے سامنے والے گھر کا بالائی حصہ آفتاب صاحب نے کرائے پر لے رکھا ہے۔ ان کا تعلق اندرون سندھ کے علاقے لاڑکانہ سے ہے۔ یہ کسی اخبار میں کام کرتے ہیں۔“

پھر جویرہ نے یہ مجھے اپنی رہائش کی تفصیل سے بھی آگاہ کیا۔ وہ ناظم آباد کے علاقے میں ایک سوئیس گز کے ایک گھر میں رہتی تھی یعنی اپنے بہنوئی شکیل احمد کے گھر میں۔

کلائنٹ تصور کرتی ہیں؟“

”ظاہر ہے..... میں اپنے مسئلے کے لیے چل کر آپ کے پاس آئی ہوں تو اس کا یہی مطلب ہے کہ آپ میرے وکیل اور میں آپ کی کلائنٹ ہوں۔“ وہ انہیں زندہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں؟“

”میں سمجھتا ہوں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جویریہ صاحبہ! امراض کو اپنے ڈاکٹر سے اور موکل کو اپنے وکیل سے کوئی بات نہیں چھپانا چاہیے۔ اگر آپ کو مجھ پھر بھر دوسرے تو بتائیں کہ آپ کے دولہا بھائی شکیل احمد کی نیت میں کیا فتور آ گیا ہے..... اس امر کا اطمینان رکھیں کہ ہمارے درمیان ہونے والی یہ گفتگو کسی تیسرے شخص تک نہیں پہنچے گی۔“

”جی..... مجھے آپ پر اعتماد ہے۔“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں نے کہا۔“ پھر آپ مجھے شکیل احمد کی نیت کے فتور کے بارے میں بتائیں۔“

”وہ چاہتا ہے، میں خلع نہ لوں.....“ وہ اپنے بہنوئی کے لیے ”آپ، جناب“ سے نکل کر ”تم، تو“ کے انداز پر آتے ہوئے بولی۔

”تھوڑی وضاحت کریں، وہ ایسا کیوں چاہتا ہے؟“

”اگر میں نے خلع لے لی تو باجی دوبارہ میرا گھر بسانے کی کوشش میں لگ جائیں گی۔“ جویریہ نے بتایا۔

”شکیل کی خواہش ہے کہ میں اس کے گھر میں ہی پڑی رہوں۔“

”بڑی عجیب خواہش ہے اس کی۔“ میں نے بڑا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اگر آصف نے آپ کو طلاق دے دی تو اس صورت میں بھی تو عارفہ آپ کی دوسری شادی کے لیے تک و دو شروع کر دے گی اور آپ کو ایک دن اس گھر سے جانا پڑے گا۔ کیا شکیل آپ کی طلاق کے بھی خلاف ہے؟“

”جی..... ایسا ہی سمجھ لیں۔“ وہ متذبذب انداز میں بولی۔

”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی.....؟“ میں نے سوالیہ نظر سے جویریہ کی طرف دیکھا۔

اس نے اذیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ ”وہ چاہتا ہے، میں آصف کی بیوی بھی رہوں اور اس کے گھر میں بھی پڑی رہوں۔“

اس کی دلیل میں اچھا خاصا وزن تھا لیکن میں اتنی آسانی سے اس کا پچھا چھوڑنے والا نہیں تھا۔ آفتاب گفتہ، جویریہ کے حوالے سے ایک غیر متعلقہ شخص تھا۔ خلع والے معاملے میں اس کی دلچسپی اور سرگرمی سے تو میں بھی سمجھا تھا کہ وہ خود جویریہ کے چکر میں ہے اور اس کی کوشش ہے کہ جویریہ جلد از جلد آصف کے نکاح کی گرفت سے نکل آئے تاکہ اسے اپنا الویدھا کرنے میں آسانی حاصل ہو جائے۔ اگرچہ جویریہ کی کسی بات سے ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا لیکن آفتاب کے انداز سے مجھے اس کے عزائم ایسے ہی نظر آ رہے تھے تاہم شکیل احمد کی جسی بنا غیر جانب داری اور پراسرار خاموشی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ اسی روشنی میں، میں نے جویریہ سے پوچھ لیا۔

”آپ کی باجی کی مجبوری تو بڑی واضح نظر آ رہی ہے لیکن شکیل کیوں لاعلق بنا بیٹھا ہے۔ وہ آپ کا بہنوئی ہے۔ مشکل کی اس گھڑی میں تو اسے سب سے آگے ہونا چاہیے۔ اس کا رویہ میری سمجھ سے باہر ہے؟“

”دولہا بھائی بس ایسے ہی ہیں۔“ اس نے گول مول جواب دیا۔

”ایسے ہی ہیں..... کا کیا مطلب ہوا؟“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ”کیا اسے آپ کے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے؟ شکیل احمد تو سرکاری ملازم ہے۔ اس موقع پر تو اسے پیش پیش ہونا چاہیے تھا۔“

”میں آپ کی بات سے اختلاف نہیں کروں گی۔“ وہ جھل انداز میں بولی۔ ”مگر سچائی یہ ہے کہ دولہا بھائی کی نیت میں فتور آ گیا ہے۔“

جویریہ نے بڑی اہم بات کی تھی۔ میں اس کی طرف سے کسی ایسے ہی سنسنی خیز جواب کی توقع کر رہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں اور چہرے کے تاثرات سے بہ خوبی سمجھ چکا تھا کہ اگلنے کے لیے اس کے پاس بہت سا زہر یا زہریلا مواد موجود تھا۔ بس، اس زہر آلود خزانے میں ایک پن چھوونے کی دیر تھی پھر بہت سی کڑوی اور کسل کر کا رآمد معلومات نکل کر سامنے آ سکتی تھیں۔ میں نے اپنے الفاظ کی پن کو بڑے محتاط اور غیر محسوس انداز میں استعمال کرتے ہوئے پوچھا۔

”جویریہ! آپ مجھے کیا سمجھتی ہیں؟“

”آپ ایک وکیل ہیں۔“ اس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔

”ایک وکیل اپنے کلائنٹ کے رازوں کا امین ہوتا ہے۔“ میں نے دھیمے انداز میں کہا۔ ”کیا آپ خود کو میرا

سکتیں۔“ میں نے سانس ہموار کرنے کے لیے لمحاتی توقف کیا پھر ان الفاظ میں اپنی بات مکمل کر دی۔
”میرے سوال کا تعلق ٹھیکیں کے ارادے سے تھا۔

کیا وہ ایسا چاہتا ہے؟“
”نہیں.....“ اس نے پوری قطعیت سے نفی میں گردن جھکی اور درویش ڈوبی ہوئی آواز میں بولی۔ ”ٹھیکیں کا منصوبہ یہ ہے کہ میں قانوناً و شرعاً آصف کی بیوی رہوں اور عملاً عارفہ باجی کی جگہ لے کر اس کی ہوس کی تسکین کرتی رہوں۔“

بات کے اختتام پر جویریہ نے گردن جھکادی۔ میرے ذہن نے جیسا سوچا تھا، نتیجہ اس کے عین مطابق ہی نکلا تھا۔ میں سمجھ سکتا تھا کہ وہ اس وقت کس جذباتی صدمے سے گزر رہی ہوگی۔ بعض دکھ ایسے ہوتے ہیں کہ انسان اپنے دل کا غبار نکالنے کے بعد اور زیادہ دکھی ہو جاتا ہے۔ ان لمحات میں جویریہ بھی اذیت اور کرب کی ایسی ہی منازل سے گزر رہی تھی۔

اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی تو میں نے ہمدردی بھرے انداز میں پوچھا۔ ”کیا آپ کی باجی کو اس صورت حال کا علم ہے؟“

”نہیں!“ وہ سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولی۔ ”ٹھیکیں نے خاصے دھمکی آمیز انداز میں مجھ پر دامن کر دیا ہے کہ اگر میں نے اس بارے میں عارفہ باجی کو کچھ بتایا تو وہ صاف کر جائے گا۔ اس طرح سارا ملہ مجھ پر آگرے گا کہ میں اپنے فرشتہ صفت دولہا بھائی پر گھناؤنا الزام لگا رہی ہوں۔ ٹھیکیں نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر میں نے اس سلسلے میں اپنی زبان بند نہ رکھی تو وہ آصف کو میرے بارے میں بتائے گا کہ میں صبح و شام اسے دعوتِ گناہ دیتی رہتی ہوں۔ کوئی میری تردید کو تسلیم کرے گا اور نہ ہی مجھے صفائی کا موقع دیا جائے گا۔ میں بجھلے ایک سال سے اپنے گھر سے نکل کر میکے میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ سب مجھے ہی غلط سمجھیں گے۔“

”ایک طرح سے یہ آپ کا میکا ہی ہے، یہ الگ بات کہ یہاں آپ کی عزت کو میکے ایسا تحفظ حاصل نہیں ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سمجھتا ہوں، طلاق یا خلع سے بھی زیادہ اہم اور ضروری یہ ہے کہ آپ اس گھر سے نکل جائیں۔“

”میں بھی اسی نتیجے پر پہنچی ہوں۔“ وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولی پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔ ”ساری صورت حال آپ کے سامنے ہے۔

میرے کان کھڑے ہو گئے۔ جویریہ کی بات نے میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجادی تھی۔ ٹھیکیل احمد کی نیت کا نور بڑی وضاحت کے ساتھ میرے سامنے کھل گیا تھا تاہم میں نے جویریہ کے نازک جذبات کا خیال کرتے ہوئے ذرا ہاتھ ہلکا رکھا اور ایک امکان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”کہیں ایسا تو نہیں کہ ٹھیکیل احمد محض اس لیے آپ کو اپنے گھر میں رکھنے پر بہ ضد ہے کہ آپ کی شکل میں اسے مفت کی ایک نوکرائی میسر آگئی ہے جو اس کی مقبوض بیوی اور بچوں کا خیال رکھنے کے ساتھ ساتھ پورے گھر کے نظام کو بھی بڑے طریقے سلیقے سے چلا رہی ہے.....؟“

”پہلے میں بھی ایسا ہی سمجھتی تھی وکیل صاحب.....!“ وہ کرب ناک آواز میں بولی۔

میں نے کرید کا مکمل جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اور اب؟“

”اب میں ایسا نہیں سمجھتی۔“ وہ جی کڑا کر کے بچائی کو منظر عام پر لاتے ہوئے بولی۔ ”بجھلے ایک ماہ سے ٹھیکیل اشاروں و کنایوں میں مجھے یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہے کہ.....“

یہاں تک بولنے کے بعد وہ تھم گئی۔ یقیناً اس کے بیان میں آگے کوئی ایسا خطرناک موڑ تھا جہاں سے مڑنے کے لیے بڑی ہمت اور حوصلے کی ضرورت تھی۔ میں خنجر نگاہ سے یک نگاہ اسے دیکھتا چلا گیا۔ چند لمحات تک خاموش رہ کر وہ اپنے اندرون سے لڑتی رہی پھر مجھ پر کامل اعتماد کا ثبوت دیتے ہوئے مضبوط لہجے میں بولی۔

”ٹھیکیل کا کہنا ہے کہ بجھلے دو سال سے عارفہ اس کے کسی کام کی نہیں رہی۔ اگر میں اپنی باجی کی جگہ لے لوں تو وہ مجھے بہت خوش رکھے گا۔“

”مطلب..... وہ آپ سے شادی کرنا چاہتا ہے؟“ میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میری ٹھیکیل سے شادی کس طرح ہو سکتی ہے وکیل صاحب؟“ اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔ ”میں..... آصف کے نکاح میں ہوں اور ٹھیکیل خلع یا طلاق کے حق میں بھی نہیں ہے۔ ایک عورت دو مردوں کی بیوی کیسے بن کر رہ سکتی ہے.....؟“

”یہ نکتہ میرے ذہن میں ہے۔“ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ”اس کے علاوہ ایک اور نکتہ یہ بھی ہے کہ دو لڑکیاں نہیں شرعاً بہ یک وقت کسی ایک شخص کے نکاح میں نہیں رہ

آپ بتائیں، میں کیا کروں؟“
اس نے فیصلے کی گیند میری کورٹ میں پھینکی تو میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ”آپ کیا چاہتی ہیں..... خلع یا طلاق؟“
”نہ طلاق اور نہ ہی خلع۔“ وہ چٹائی لہجے میں بولی۔
میں نے استفسار یہ نظر سے اس کی جانب دیکھا اور کہا۔ ”پھر.....؟“

”میں چاہتی ہوں کہ میرا شوہر اور میرا گھر مجھے واپس مل جائے۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولی۔ ”زیورات، نقد رقم..... مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔“
”سو گریٹ.....“ میں نے توسیفی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جو یہ جی! آپ بہت ہی دانش مند خاتون ہیں۔ آپ کے فیصلے نے میرا دل خوش کر دیا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ آصف عزت و آبرو کے ساتھ آپ کو اپنے ساتھ لے جائے۔“
”میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گی۔“ وہ ممنونیت بھرے لہجے میں بولی۔
”لیکن اس کے لیے آپ مجھے تھوڑا وقت دیں گی۔“
میں نے اس کی بات کو سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”آصف کی ڈوریاں ہلانے والی دو بہنوں سے منٹنے کے لیے مجھے بڑی مضبوط پلاننگ کرنا پڑے گی۔ بہر حال، میں کوئی ایسی قانونی چال چلوں گا کہ میرے بہترے کے سامنے وہ لوگ بے بس ہو کر صلح کے لیے آمادہ ہو جائیں۔“

”آپ کو اندازاً کتنا وقت درکار ہوگا؟“ اس نے پُراشتیاق لہجے میں دریافت کیا۔ ”اپنے اس منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے؟“
میں نے جب سے اسے حوصلہ دلا یا تھا، اس کے لہجے میں باؤس کی جگہ اعتماد نے لے لی تھی۔ وہ خاصی مطمئن اور بے فکر دکھائی دینے لگی تھی۔
”زیادہ سے زیادہ ایک ماہ۔“ میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔ ”اندازاً ایک ماہ کے دوران میں آپ نے اپنی عائدہ باقی کے گھر میں بڑی احتیاط اور حفاظت کے ساتھ رہتے ہوئے گھیل احمد سے کوئی جھگڑا پھڑا نہیں کرنا۔ اگر وہ اپنی غلیظ خرافات کا دوبارہ اظہار کرے تو اس کو بھی تاثر دیتا ہے کہ آپ ابھی اس بارے میں سوچ رہی ہیں اور اچھی طرح غور و خوض کے بعد اسے جواب دیں گی۔ نہ صاف انکار کریں اور نہ ہی اقرار۔ اس غبیث شخص کو ”ہاں“ اور ”نہ“ کے سچ لٹکا کر رکھیں۔ یہ ساری

چیزیں بندی آپ کی عزت کی حفاظت کی خاطر ہے..... آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟“
”جی..... بہت اچھی طرح سمجھ رہی ہوں۔“ وہ محسوس لہجے میں بولی۔ ”آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ کی ہدایت پر من و عنان عمل کروں گی۔“
”دیری گڈ!“ میں نے تعریفی انداز میں کہا۔
”ایک اور بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے آپ کو.....!“
”کون سی بات وکیل صاحب؟“ اس نے پوچھا۔
”اگر آپ واقعی واپس اپنے گھر جانا چاہتی ہیں تو آفتاب کثافت سے تھوڑا فاصلہ رکھیں۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”یہ لاکھ بھلا انسان سب لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ بندہ آپ کے خلع کے حق میں اپنا پورا زور لگا رہا ہے۔ یہ آپ کو آصف کے نکاح سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔ اس نوعیت کی کوشش وہی شخص کر سکتا ہے جو خود اپنے کی مفاد میں ہو۔ ہو سکتا ہے، آپ کو میری یہ بات بری لگے لیکن میں نے جو محسوس کیا ہے وہ آپ کے گوش گزار کر دیا۔“
”آپ کی مہربانی جو آپ کو میرا اتنا خیال ہے۔“ وہ شکر گزاری کے تاثرات اپنے چہرے پر سجاتے ہوئے بولی۔ ”میں اس حوالے سے محتاط رہنے کی کوشش کروں گی۔“
جو یہ یہ کے ساتھ تمام اہم باتیں کرنے کے بعد میں نے اس سے آصف کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کیں پھر چند ہدایات کے بعد اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے دیتے ہوئے کہا۔
”اس کارڈ پر میرے آفس اور گھر دونوں کے نمبرز درج ہیں۔ دن کا پہلا حصہ میں عدالت میں گزارتا ہوں۔ صبح کے بعد میں اس آفس میں آجاتا ہوں۔ آپ جب بھی ملاقات کی ضرورت محسوس کریں، مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں اور اگر کوئی ایمر جنسی ہو تو گھر کے نمبر پر بھی فون کر سکتی ہیں۔ میں عموماً نصف شب کے بعد ہی سوتا ہوں۔“
”تھیک یو بیگ صاحب!“ اب کی بار وہ مجھے میرے نام سے مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ”میں جلد ہی آپ سے ملنے آؤں گی۔ آپ بھی میرا نمبر نوٹ کر لیں۔“
اس کے بعد جو یہ نے مجھے اپنا فون نمبر لکھوا دیا جو یقیناً اس کی عائدہ باقی کے گھر کا نمبر تھا۔ میں نے تسلی بخشی دے کر اسے رخصت کر دیا۔

آئندہ روز میں نے آصف کے نام ایک نوٹس رجسٹرڈ ڈاک سے بھجوا دیا۔ مذکورہ نوٹس کا متن مضمون یہ تھا۔
 ”میری موکلہ سمات جویریہ آصف تمہاری قانونی اور شرعی بیوی ہے اسی لیے اس کے نام کے ساتھ تمہارا نام جڑا ہوا ہے۔ از روئے قانون و شرع تم پر میری موکلہ کے من جملہ حقوق کی ادائیگی واجب ہے لیکن میری موکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ گزشتہ ایک سال سے تم نے اسے اپنے گھر سے نکال رکھا ہے۔ اس عرصے کے دوران میں نہ تو تم نے اس کے حقوق زوجیت ادا کیے ہیں اور نہ ہی اسے نان و نفقہ دیا ہے۔ علاوہ ازیں، مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ تم نے میری موکلہ کے طلائی زیورات مالیت تیس ہزار روپے اور نقد رقم مبلغ بیس ہزار روپے بھی اپنے پاس دبا رکھے ہیں۔ تمہارا یہ فعل اخلاقی اور شرعی اعتبار سے سراسر غیر قانونی ہے اور قابل مذمت یعنی قانونی زبان میں قابل تعزیر ہے چنانچہ اس نوٹس کے ذریعے تمہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ اس نوٹس کی وصولی کے بعد عرصہ دس یوم کے اندر تم اپنی منکوحہ سمات جویریہ آصف کو اپنے گھر میں آباد کرو ورنہ تمہارے خلاف بڑی سخت نوعیت کی قانونی چارہ جوئی کی جائے گی اور متذکرہ بالا پچاس ہزار روپے (نقد رقم + زیورات) کے علاوہ تمہیں درج ذیل مزید واجبات بھی ادا کرنا پڑیں گے۔۔۔۔۔

1- حق مہر مؤجل مبلغ پچیس ہزار روپے سکے رائج الوقت پاکستان۔

2- نان و نفقہ مبلغ اٹھارہ ہزار روپے بہ حساب پندرہ سو روپے ماہانہ۔

3- عدالتی ہرجہ و خرچہ۔“
 اس نوٹس میں بعض قانونی موٹو گافیاں بھی تھیں۔ ایسی ٹیکنیکل باتوں میں قارئین کی دلچسپی کا سامان موجود نہیں ہوتا بلکہ یہ الٹا کہانی پوچھنے والے کو بیزار کرتی ہیں لہذا میں ان کا ذکر حذف کرتے ہوئے آگے بڑھ رہا ہوں۔

نوٹس کی ترسیل کے ایک ہفتے بعد ایک مائل یہ فرہی بدن کا مالک دراز قامت شخص مجھ سے ملنے آیا۔ اس کے چہرے پر اچھی خاصی برہمی پائی جاتی تھی۔ اس کا رنگ گندی تھا مگر اس کی شخصیت میں صنف نازک کے لیے ایک خاص کشش پائی جاتی تھی۔ میں نے پیشہ ورنہ سکرابٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور بیٹھنے کے لیے کہا۔

وہ ایک کرسی پہنچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا پھر ایک لفافہ میری جانب بڑھاتے ہوئے غلطی آمیز انداز میں مستفسر ہوا۔ ”وکیل صاحب! یہ کارنامہ آپ نے انجام دیا

ہے؟“

میں نے اس کے ہاتھ میں اپنے آفس کے لفافے کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا تاہم انجان بننے ہوئے کہا۔ ”لگتا تو میرے ہی آفس کا ہے مگر اس سے میرے کسی کارنامے کا کیا تعلق واسطہ!۔۔۔۔۔!“

”تعلق واسطہ سب سمجھ میں آ جائے گا۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”اسے کھول کر دیکھیں۔ اپنے کارنامے سے آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔“

میں اس لفافے کو ہاتھ میں لیتے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ وہ نوٹس تھا جو ہفتہ بھر پہلے میں نے جویریہ کے شوہر آصف کے نام رجسٹرڈ ڈاک سے پوسٹ کروایا تھا۔ گویا، اس وقت آصف میرے سامنے موجود تھا۔

میں نے اس کی فرمائش پر مذکورہ لفافے کو کھولتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ”غالباً آپ آصف صاحب ہیں۔۔۔۔۔!“

”غالباً نہیں۔۔۔۔۔ یقیناً!“ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ ”میں وہی آصف ہوں جس کے نام آپ نے یہ نوٹس بھیجا ہے۔“

”یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔“ میں نے سلگانے والے انداز میں کہا۔

”وکیل صاحب! میں اس قسم کے مذاق کو پسند نہیں کرتا۔“ وہ مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”آپ بھی اس منہوں عورت کی باتوں میں آگئے اور مجھے یہ نوٹس بھیج ڈالا۔“

”آپ کس منہوں عورت کا تذکرہ کر رہے ہیں آصف صاحب۔“ میں نے انجان بن کر اسے مجھنے کی کوشش کی۔

میرا اصل ٹارگٹ یعنی جویریہ کا نامعلوم شوہر اس وقت میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں آصف کی نفیات اور مزاج کو سمجھنے کے لیے یہ سارا ناک کر رہا تھا۔

”میں اس عورت کی بات کر رہا ہوں جس کا نام جویریہ ہے۔“ وہ تپتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میری بیوی جویریہ جو آپ کی موکلہ بننے کی کوشش کر رہی ہے۔“

”اے بیٹنم جوان!“ میں نے اسے مردانگی کے بانس پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کبھی بات تو یہ کہ جویریہ میری موکلہ بننے کی کوشش نہیں کر رہی بلکہ وہ میری موکلہ بن چکی ہے۔ یہ نوٹس اس بات کا ثبوت ہے کہ میں جویریہ کا وکیل ہوں۔ دوسری بات یہ کہ میں نے یہ نوٹس بھیج کر آپ سے کوئی مذاق نہیں کیا۔ ہمارے بیچ مذاق والا کوئی حلق نہیں

میں یہ کیس چھوڑ دیں ورنہ آپ کوئی بہت بڑا نقصان اٹھالیں گے۔“

”یار..... ڈراؤ تو نہیں.....!“ میں نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

وہ بولا۔ ”میں سچ کہہ رہا ہوں وکیل صاحب۔“
”آپ مجھے جویریہ کی نحوست کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔“ میں نے آصف کو اصل موضوع کی طرف لاتے ہوئے کہا۔

وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ اس نے مجھے اپنی باتوں سے متاثر کر لیا ہے۔ اس کا ایسا سمجھنا میرے حق میں جاتا تھا کیونکہ میں اس کے ساتھ جو بیٹھ کر نے جا رہا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ چپ چاپ میری باتوں پر عمل کرتا جائے اور یہ اسی صورت ممکن تھا کہ وہ مجھ پر بھروسہ کرنے لگے۔

”کوئی ایک واقعہ ہو تو بتاؤں وکیل صاحب۔“ وہ بڑا سامنے بٹاتے ہوئے بولا۔ ”اس کی نحوست نے صرف چھ ماہ کے اندر ہمارے گھر کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ.....“ لچائی توقف کر کے اس نے پراسرار انداز میں مجھے دیکھا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا۔

”جویریہ نے میری بہنوں پر بندش کر دی ہے۔“

”اوہ..... ویری بیڈ!“ میں نے خوفزدہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”کیا جویریہ سخی وغیرہ بھی کرتی ہے؟“ میں نے تجسس بھرے لہجے میں پوچھا۔

”کوئی ایسا ویسا سخی وکیل صاحب۔“ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”اس بد بخت نے میری بہنوں کے لیے شادی کی بندش کی ہے۔ جب سے اس نے ہمارے گھر میں قدم رکھا ہے، میری بہنوں فرائض اور خیر النساء کے رشتے آئندہ ہو گئے ہیں اور آپ نے یہ تو سن ہی رکھا ہوگا کہ جادو ٹوٹا کرنے والوں کے ہاں اولاد نہیں ہوتی یا اگر ہوتی بھی ہے تو بیچے ایب نارمل پیدا ہوتے ہیں.....“

”ہاں، میں نے ایسا سنا تو ہے۔“ میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”کیا واقعی ایسا ہوتا بھی ہے؟“

”بالکل جناب! یہ حقیقت ہے۔“ وہ پُر دھڑک انداز میں بولا۔ ”آپ جویریہ ہی کو دیکھ لیں نا۔ یہ عورت چھ ماہ تک میرے ساتھ رہی، ہم ایک بیڈروم میں، ایک بیڈ پر سوتے رہے اور ہمارے درمیان ازدواجی تعلقات بھی عروج پر تھے مگر نتیجہ کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔ مجھے تو لگتا ہے،

ہے لہذا آپ اس ٹولس کو ایک کڑوی حقیقت سمجھیں اور یہ بات اپنے ذہن میں رکھیں کہ اگر آپ کی طرف سے خاطر خواہ تعاون کا مظاہرہ نہیں کیا گیا تو آپ کے خلاف واقعتاً قانونی کارروائی کی جائے گی اور آخری بات.....“

”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟“ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ بول پڑا۔

”میں آپ کو دھمکی نہیں دے رہا بلکہ سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں آصف صاحب۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے شائستہ انداز میں کہا۔ ”آپ مجھے کافی سمجھدار انسان دکھائی دیتے ہیں۔“ میں نے اسے مسکا لگایا۔ ”آپ کے مقابلے میں جویریہ مجھے عقل سے پیدل ایک ٹھکی ہوئی عورت لگی ہے لیکن وہ جو میں آپ سے آخری بات کہنے والا تھا، وہ جویریہ ہی کے بارے میں تھی.....“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”کون سی آخری بات؟“

میں نے آصف کی شان میں چند تعریفی کلمات ادا کیے تھے اور اس کے ساتھ ہی جویریہ کی ہلکی چٹکلی برائی بھی کی تھی۔ یہ میری ایک نفسیاتی اور سیاسی چال تھی جس کا آصف پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں بڑی حد تک اسے اپنے شیشے میں اتارنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے لہجے کی برہمی اور اکھڑ پن غائب ہو گیا تھا اور اس نے ”آخری بات“ کے حوالے سے بڑے مہذب انداز میں مجھ سے استفسار کیا تھا۔ میں یہی چاہتا بھی تھا کہ وہ میری بات کو تو جیسے سننے پر آمادہ ہو جائے۔

”تھوڑی دیر پہلے آپ نے جویریہ کے لیے ”منوس عورت“ کے الفاظ استعمال کیے تھے۔“ میں نے سراسر غلط بیانی کے توسط سے اسے آخری بات سے آگاہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ مجھے جویریہ کی نحوست کی کچھ تفصیل بتانا پسند کریں گے۔ دراصل، آپ کی بات نے مجھے چونکا دیا ہے۔“ میں ”سعد اور محسن“ اثرات پر بڑا پختہ یقین رکھتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس عورت کا کس لے کر میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں.....!“

اپنے مطلب کی بات ہر کسی کو اچھی لگتی ہے۔ میں اس وقت آصف کے دل کی زبان بول رہا تھا۔ وہ خوش ہو گیا اور خاصے دوستانہ انداز میں مجھے ہمدردی بھرا مشورہ دیتے ہوئے بولا۔

”وکیل صاحب! میں تو کہتا ہوں، آپ پہلی فرصت

کندے عملیات کے اثرات سے جویریہ بانجھ ہو چکی ہے۔
اس کی گود بھٹی ہری نہیں ہو سکے گی۔“

”اوہ.....!“ میں نے اپنے چہرے پر فکر مندی کو
سجائے ہوئے کہا۔ ”آپ نے تو بڑی اہم معلومات فراہم کی
ہیں۔ جویریہ تو بڑی خطرناک عورت ہے۔ میں اس سے
جان چھڑانے کی کوشش کروں گا.....“

آصف جیسا جاہل انسان میں نے اپنی پوری زندگی
میں نہیں دیکھا تھا۔ میرے خیال میں وہ تو ہم پرستی کا شکار
تھا۔ وہ جن بہنوں کے رشتوں میں رکاوٹ کا سبب جویریہ کو
بتا رہا تھا، میں ان سسرز کے کارناموں سے مکاحقہ آگاہ
ہو چکا تھا لہذا میرا ذہن جویریہ کے خلاف ہرگز نہیں سوچ
سکتا تھا۔ جویریہ نے تو محض چھ ماہ اس گھر میں گزارے تھے
قبل اس کے کہ وہ آصف کی عمر رسیدہ کنواری بہنوں کو جانتی
تک نہیں تھی اس کے باوجود بھی وہ دونوں پچھلے اڈنٹس
چالیس سال سے بن بیاہی بیٹھی تھیں۔ آصف کی جہالت کا
اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اگرچہ ماہ میں جویریہ امید
سے نہیں ہوتی تھی تو اس نے اپنی مفتی بہنوں کے ایما پر اس
بے جاری کو بانجھ بھی قرار دے دیا تھا۔ غضب خدا کا،
آصف کو اپنے بیان کے ایک ایک لفظ پر کامل یقین بھی تھا۔
ایسے لوگوں کو سمجھانے یا قائل کرنے میں محض وہی ضائع
ہوتا ہے لہذا میں نے بھی اس کی حماقت سے بھرپور
کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسی
مقصد کے پیش نظر میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں جلد از
جلد جویریہ سے بچھا چھڑانے کی کوشش کروں گا۔

وہ خوش ہو گیا۔ میری بات اسے بہت پسند آئی تھی۔
جوش میں آکر اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔
ترک میں، اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکل گئی جو
میرے لیے اس کیس میں ”ماسٹر کی“ کی حیثیت رکھتی تھی یعنی
ایسی چالیں جس کی مدد سے ہر تالا کھولا جاسکتا ہو.....!

”وکیل صاحب! آپ تو اس منحوس عورت سے اپنی
جان چھڑانے کے بارے میں ابھی سوچ ہی رہے ہیں۔“ وہ
انکشاف انگیز انداز میں بولا۔ ”اور مجھے قدرت نے یہ موقع
فراہم کر دیا ہے۔ اس حوالے سے میں بڑا اعلیٰ ثابت ہوا ہوں
اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ گولڈن چانس مجھے اس لیے ملا ہے کہ
میں ان دنوں جویریہ کی محبت سے دور ہوں۔“

اس کی بات سن کر میرے کان کھڑے ہو گئے لیکن
میں نے اپنی اندرونی کیفیت کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے
دیا اور قدرے آگے جھک کر دوستانہ انداز میں پوچھا۔

”کیسا گولڈن چانس آصف صاحب.....؟“
”ابھی یہ معاملہ راز میں ہے۔“ وہ جبریز ہوتے
ہوئے بولا۔ ”آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔“

”اس کا مطلب ہے، آپ مجھ پر اعتماد نہیں کر رہے
آصف صاحب!“ میں نے کھلی آمیز بکجہ میں کہا۔ ”میں
آپ کی خاطر جویریہ کو یہاں سے بھگانے اور اس منحوس
عورت سے اپنی جان چھڑانے کا فیصلہ کر چکا ہوں اور آپ
مجھے غیر سمجھ رہے ہیں.....؟“

”آپ ناراض نہ ہوں۔ میں بتاتا ہوں.....“ وہ
جلدی سے بولا۔

ایک بات کا مجھے یقین ہو گیا کہ وہ پوری طرح میرے
شیشے میں اتر چکا تھا۔ اگر میں اسی طرح اسے اعتماد میں لیے
رہتا تو اس کے دل کا ہر احوال یہ آسانی مجھ تک پہنچ سکتا تھا۔
مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ آصف ایک بے
وقوف، احمق، جاہل اور توہم پرست انسان تھا یا وہ کوئی
نامعقول، شاطر اور چالاک شخص تھا۔ میرا مطمحہ نظر صرف اتنا
سا تھا کہ مجھے اس کے اندر سے وہ امن مفید معلومات سے
بھرپور کھی نکالنا تھا اور میرا یہ مقصد انگلی ٹیز می کے بغیر بہ خوبی
پورا ہو رہا تھا۔

”اگر کوئی حرج ہے تو نہ بتائیں.....“ میں نے۔۔
یہ دستور ناراض بکجہ میں کہا۔ ”ہر انسان کی اپنی ایک
پرائیویسی ہوتی ہے۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ.....“
”اب غصہ محوک بھی دیں وکیل صاحب۔“ وہ میری
بات کو قطع کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ سے تو دوستی ہو گئی
ہے۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ وہ بات دراصل یہ ہے کہ.....
..... اس نے سانس ہموار کرنے کی غرض سے لمحائی توقف
کیا پھر اضافہ کرتے ہوئے بتانے لگا۔

”جویریہ کے جانے کے بعد سے میری دونوں بہنیں
میرے لیے کوئی اچھی سی لڑکی دیکھنے کی ہم میں لگی ہوئی تھیں
اور اتفاق سے انہیں ایک بہت شاندار رشتہ مل گیا ہے۔“
بات کے اختتام پر اس نے داد و طلب نظر سے مجھے دیکھا۔

”بھئی واہ..... مبارک ہو..... ماشاء اللہ.....“ میں
نے اس کی توقعات کی تسکین کی غرض سے داد و تحسین کے
ڈوگرے برساتے ہوئے کہا۔ ”آپ تو واقعی بہت خوش
قسمت ہیں آصف صاحب۔ لڑکی یقیناً اچھے خاندان سے
تعلق رکھتی ہوگی اور اس کا نام بھی باکمال ہوگا.....!“

آخری دو جملے میں نے اس کی زبان کو رواں کرنے
کے لیے بہ طور لبریکٹ استعمال کیے تھے۔ فرط جذبات

مونڈ کر اس کے گھر، جائیداد اور کاروبار پر قبضہ کرنے کا سوچ رہے تھے اس سے ان کی عیاری اور چالاکی صحت کی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے بھی آصف کو یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا کہ اس سے حاصل ہونے والی مطوعات کو میں اسی کے خلاف استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے اس کی پیڑھے ٹھونکتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

”آصف صاحب! مجھے تو آپ کی قسمت پر رشک محسوس ہو رہا ہے۔ میری دعا ہے کہ جلد از جلد آپ کے سر پر سہراج جائے!“

میں نے اس کی ترنا میں ہوا بھری تو وہ پھول گیا پھر متفکرانہ انداز میں بولا۔ ”اللہ آپ کی زبان مبارک کرے وکیل صاحب۔“

”آصف صاحب!“ میں نے بڑی اپنایت سے اسے مخاطب کیا پھر بڑی ہوشیاری سے اپنے مقصد کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ ایک نبی، خوشیوں سے بھرپور اور آسانکھوں سے مزین زندگی کی شروعات کرنے جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کنگے ہاتھوں اس نوٹس والے معاملے کو بھی شٹائی دیں۔“

اتنی دیر سے میں نوٹس کے ذکر کو پس پشت ڈال کر اس کے ساتھ اس کی مرضی کی باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اچانک نوٹس کی جانب اس کی توجہ مبذول کرانی تو وہ بدک کر بولا۔

”مثلا دوں..... سے آپ کی کیا مراد ہے؟“

”میرا مطلب ہے، جو یہ یہ کو تو آپ نے ویسے بھی نہیں رکھنا۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔۔۔۔۔

”خواجہ اس کی محبت سے آپ کا روٹی والا منصوبہ کھٹائی میں پڑ جائے گا لہذا اسے فارغ ہی گرو دیں تو اچھا ہے۔“

”کہتے تو آپ شیک ہی ہیں۔“ وہ معنی خیز انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”جو یہ یہ کو تو اس معاملے کی ہوا تک نہیں لگنا چاہیے لیکن میں اسے فارغ کیسے کروں؟“

”بھئی، سیدھی سی بات ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اس کے واجبات ادا کر دیں۔ جو یہ یہ ایک لاپٹی عورت ہے۔ وہ اسی میں خوش ہو جائے گی اور یہ معاملہ خود بہ خود ختم ہو جائے گا۔ ویسے بھی یہ کون سی اتنی بڑی رقم ہے۔ تیس ہزار کے طلائی زبورات، بیس ہزار نقد اور پچیس ہزار حق مہر ہے۔ اس کے علاوہ نان و نفقہ کے ذیل میں ایک سال کی رقم اٹھارہ ہزار روپے بنتی ہے۔ یہ کل ملا کر تیرانوے ہزار روپے ہو جاتے ہیں۔ آپ یہ اماؤنٹ

میں الفاظ اس کے منہ سے پھسلنے لگے۔

”اس کا نام روٹی ہے۔“ وہ بڑے فخر سے بتانے لگا۔ ”روٹی اپنے والدین..... بلکہ اپنے والد کی اکلوتی اولاد ہے۔ طویل عرصہ پہلے روٹی کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔“ پھر وہ ایک آنکھ دبا کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ”پیسے والی پارٹی ہے وکیل صاحب.....!“

یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ قبر النساء اور خیر النساء بڑی خود غرض اور مفاد پرست عورتیں تھیں لیکن ان کا یہ گھوڑے مافق چھوٹا بھائی بھی لالچ اور طمع میں پی ایچ ڈی کیے ہوئے تھا۔

”روٹی کے والد صاحب کا نام کیا ہے؟“ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے بہتی گنگا میں محض ہاتھ دھونے پر اکتفا کرنے کے بجائے غوطہ زن ہوتے ہوئے پوچھا۔

”اور ان کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟“

”روٹی کے والد صاحب بھائی بزنس میں ہیں۔“ اس نے خامے متفکرانہ انداز میں بتایا۔ ”سائنٹ ایریا میں ان کی گارمنٹس کی فیکٹری ہے جس کے ایک شعبے میں ایکسپورٹ معیار کی مینٹی لیڈر جیکٹس بھی تیار کی جاتی ہیں۔ صاحب صاحب کی عمر ستر کے آس پاس ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس عمر میں تو انسان کے پاس سہمان ادا کارہی کا رول ہوتا ہے۔“ وہ ذرا دیر کو کھڑک کے ذریعے انداز میں مسکرایا اور پھر دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں کو قینچی کے انداز میں چلاتے ہوئے بولا۔

”فائزیکٹر کی مرضی کہ وہ آنے والے سین میں اسے رکھے یا کٹ کر دے.....!“

اس نے ایک بار پھر انگلیوں کو قینچی کے مانند حرکت دیتے ہوئے مجھے یہ یاد کرانے کی کوشش کی کہ شادی سے پہلے والے سین میں اگر صمد بھائی موجود ہے تو اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ شادی کے بعد والے کسی سین میں بھی وہ نظر آئے۔ گویا آصف ابھی سے ”پانچوں انگلیاں مٹی میں اور سر کڑا ہی میں“ کی سوچے بیٹھا تھا۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ بفر زون کے علاقے میں صمد بھائی کا عالی شان بنگلا تھا جہاں وہ اپنی اکلوتی بیٹی روٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ روٹی فیکٹری کے معاملات کو بھی دیکھتی تھی۔ شادی کے بعد اسے بھی روٹی کے ساتھ مل کر فیکٹری کے انتظام کو سنبھالنا تھا۔۔۔۔۔

غیرہ وغیرہ!

آصف نے انتہائی قیمتی راز میرے سامنے اگل دیا تھا۔ اس کی بنا پر اسے اتنی کہا جاسکتا تھا لیکن دوسری جانب وہ اور اس کی کنواری بوڑھی بہنیں جس انداز میں صمد بھائی کو

جویریہ کو دینے کے لیے تیار ہو جائیں، میں اسے آفس میں بلا کر آپ لوگوں کا تعقیبہ کر دیتا ہوں۔ کیس کورٹ میں جائے بغیر ہی منٹ جائے گا۔۔۔۔۔ اللہ اللہ، خیر سلا!“

”تجویر تو آپ کی زبردست ہے۔“ وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ایک پرابلم ہے۔۔۔۔۔“

”کیسی پرابلم آصف صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

”اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا میرے بس کا کام نہیں ہے۔“ وہ اپنی مجبوری سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔ ”جویریہ سے میں نے جو بیس ہزار روپے لیے تھے، وہ میں نے ایک کاروبار میں لگائے تھے اور اس کاروبار میں مجھے نقصان ہو گیا۔ یعنی وہ بیس ہزار ڈوب گئے۔ جہاں تک طلائی زیورات کا معاملہ ہے تو وہ بھی میں نے جویریہ کے غیاب میں فروخت کر دیے ہیں۔ اس وقت میری مالی حیثیت ایسی نہیں ہے کہ میں جویریہ کو دس ہزار روپے بھی ادا کر سکوں۔“

میرے جی میں تو یہی آئی کہ ابھی انھوں، جو تاتاروں اور سائنس روک کر اس کیلئے انسان کے سر پر چھترول شروع کر دوں لیکن میرا یہ عمل بنے بنائے کھیل کا سوا ستیاناس مار دیتا لہذا میں نے ضبط کے دامن کو مضبوطی سے تھامے رکھا اور بڑی رسان کے ساتھ کہا۔

”آپ کہیں سے قرض ادھار نہیں پکڑ سکتے۔۔۔۔۔؟“

”تراٹوے ہزار کیا، میں تو آٹھ دس لاکھ بھی پکڑ سکتا ہوں۔“ وہ فخریہ انداز میں سینہ تان کر بولا۔ ”مگر ابھی یہ مناسب نہیں لگتا۔ صمد صاحب بھی کیا سوچیں گے کہ شادی ابھی ہوئی نہیں اور داماد جی نے فرمائشیں شروع کر دیں۔“

میں اس کی مکاری کو بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ گیا۔ وہ اپنے ہونے والے سرسرو چونا لگا کر جویریہ کے واجبات ادا کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کی بات کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں آصف صاحب۔ سسرالی رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ انسان کو اپنی خودداری پر کوئی سمجھوتا نہیں کرنا چاہیے۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے وکیل صاحب! آپ ماشاء اللہ کافی سمجھ دار انسان ہیں۔“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”ایک بات سچ سچ بتائیں گے؟“

”جی پوچھیں۔۔۔۔۔“ میں ہمتن گوش ہو گیا۔

”آپ میرے وکیل ہیں یا جویریہ کے؟“ اس نے پوچھا۔

”آپ سے ملاقات سے قبل میں جویریہ کا وکیل تھا۔“ میں نے اس کے اعتماد کو ہمدردی کا گھٹا لگا دیا تھا۔ ”لیکن اب میں آپ کا وکیل ہوں۔“

”آپ کا یہ فیصلہ خاصا دائش مندانہ ہے۔“ وہ مدبرانہ انداز میں بولا۔ ”میرے وکیل ہونے کے نا۔۔۔۔۔ آپ کو میرا ایک کام کرنا ہوگا۔“

”جی بتائیں۔۔۔۔۔ کون سا کام؟“

”کیا آپ کسی طرح جویریہ کو واجبات کے مطالبے سے دو تین ماہ تک روک سکتے ہیں؟“ اس نے بڑی ہوشیارگی سے کہا۔ ”جویریہ کو ہر صورت میں فارغ کرنا ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ کسی بد مزگی کے بغیر روپی سے میری شادی ہو جائے۔ اس کے بعد میرے پاس روپے میسے کی کوئی کمی نہیں رہے گی۔ تراٹوے ہزار کیا، میں کچھ زیادہ ہی اسے دے دوں گا۔ اس کا منہ ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے گا۔“

یہ بات بہ خوبی میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ جویریہ کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے ٹکالنے کا فیصلہ کر چکا تھا لیکن محض فنڈز کی کمی کے باعث وہ فی الحال اس معاملے کو طول دینا چاہتا تھا۔ جب اس نے کسی صورت جویریہ کو اپنی بیوی کی حیثیت سے رکھنا ہی نہیں تھا تو پھر مجھے اپنی مؤکلہ کے تحفظات کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنا تھا۔ میں نے ایک حتیٰ فیصلہ پر پہنچنے کے بعد اس کی تسلی کی خاطر کہہ دیا۔

”میرے لیے یہ بہت آسان کام ہے آصف صاحب۔ دو تین ماہ کیا، میں تو ایک لمبے عرصے تک جویریہ کو اپنے آفس کے چکر لگانے پر مجبور کر سکتا ہوں لیکن۔۔۔۔۔“

میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ اضطرابی لہجہ میں متفہم ہوا۔ ”لیکن کیا وکیل صاحب؟“

”میں چاہتا ہوں، آپ اس نوٹس کا جواب دے دیں۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”جواب۔۔۔۔۔!“ وہ انھیں زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”جواب کی کیا ضرورت ہے وکیل صاحب؟“

”ضرورت ہے، جیسی تو آپ سے کہہ رہا ہوں۔“ میں نے تاکیدی انداز میں کہا۔ ”یوں سمجھ لیں کہ یہ ایک طرح کی خانہ پُری ہے۔ ہمیں ریکارڈ کی درستی کے لیے اپنی فائلوں کا پیٹ بھرتا پڑتا ہے۔ آپ کے جواب سے میں جویریہ کو بھی مطمئن کر کے زیادہ عرصے تک ٹال سکتا ہوں۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میرا نوٹس ملتے ہی آپ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے اور آپ تراٹوے ہزار روپے کا انتظام کرنے کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔“

”جی پوچھیں۔۔۔۔۔“ میں ہمتن گوش ہو گیا۔

”آپ میرے وکیل ہیں یا جویریہ کے؟“ اس نے پوچھا۔

”جی پوچھیں۔۔۔۔۔“ میں ہمتن گوش ہو گیا۔

اس پر چڑیا بھاڑیں۔
”چڑیا بھاڑوں؟“ اس نے استفسار یہ نظر سے مجھے دیکھا۔
میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مطلب یہ کہ آپ دھتکہ کر دیں۔“
”ادہ.....!“ اس نے ایک اطمینان بھری گہری سانس خارج کی پھر جلدی سے میری بتائی ہوئی جگہ پر دھتکہ کر دیے اور بولا۔

”یہ آپ نے اچھا کیا کہ ٹولس کے جواب میں آپ نے کہیں بھی ایسا محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں روپی سے شادی کرنے والا ہوں۔“

کسی وقت آصف انتہائی احمق اور لوکا پشما نظر آتا تھا اور کبھی وہ بڑی عمارانہ باتیں کرتا تھا۔ بہر حال، مجھے اس کے اسی فطری یا جبلی یا طبعی تضاد سے فائدہ اٹھانا تھا۔ میں نے اسے خوش فہمی کے جھبے پر چڑھاتے ہوئے کہا۔

”آصف صاحب! جب میں آپ کا وکیل ہوں تو پھر آپ ہی کے مفادات کی نگرانی کروں گا نا..... جو یہ تو خواب و خیال میں بھی نہیں سوچ سکتی کہ آپ ایک شاندار زندگی کا آغاز کرنے والے ہیں.....!“

گٹھری لائف کے تصور سے اس کی باجھیں کھل گئیں۔ اس کی آنکھوں اور چہرے پر ایسے تاثرات نمودار ہوئے جیسے وہ روپی کی سنگت میں کیف و انبساط کی نگرانی کے دورے پر ہو۔ میں نے اس کی لذت سے بھرپور، سرور سے مپور و خیالی دنیا میں ذرا سا بھی خلل پیدا نہیں ہونے دیا اور اسے ساتھ لے جا کر ٹوٹری پبلک سے اس کے جواب میں تصدیقی مہر ثبت کروائی۔

”اب آپ مطمئن ہو کر گھر جائیں اور روپی سے شادی کی تیاریوں میں جت جائیں۔“ میں نے اس کا شانہ چھتہ پتاتے ہوئے کہا۔ ”سمجھ لیں کہ کام ہو گیا۔ میں اس جواب کے سہارے جو یہ ہے ٹال مٹول کا سلسلہ جاری رکھوں گا۔ وہ آپ کے کسی بھی معاملے میں مداخلت نہیں کرے گی۔ ویسے آپ کا شادی کا کب تک ارادہ ہے؟“

”یہ اس سال کا آخری مہینہ ہے۔“ وہ پُر جوش انداز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے، اس ماہ کے آخری ہفتے میں یا زیادہ سے زیادہ جنوری کے پہلے ہفتے میں روپی سے میرا نکاح ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔“ میں نے الوداعی مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی

یہ ایک رسمی سی کارروائی ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

میرے اطمینان دلانے پر وہ پرسکون ہو گیا پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”جواب میں کیا لکھنا ہوگا؟“
”آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ میں ہوں نا آپ کا وکیل۔“ میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”میں جواب کا مضمون تیار کر کے آپ کو پڑھوا دیتا ہوں۔ آپ اس پر دھتکہ کر دیجیے گا۔“

”جی ٹھیک ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

میں نے اس کیس کے پس منظر اور پیش منظر کو نگاہ میں رکھتے ہوئے ایک ایسا مضمون ٹائپ کر دیا یا جو بعد ازاں میری مڑکے کے لیے معاون اور مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ آصف کی جانب سے ٹولس کا جواب کچھ اس طرح تھا۔
”وکیل صاحب! آپ کا بھیجا ہوا ٹولس یہ تاریخ.....

دسمبر موصول ہوا۔ آپ کی مڑکے جو یہ یہ نے آپ سے غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ میں نے اسے گھر سے نہیں نکالا بلکہ یہ خود اپنی مرضی سے گئی ہے اور سارا زور بھی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ خیر، اس نے میرا کام آسان کر دیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو یہ یہ ابھی تک قانوناً اور شرعاً میری بیوی ہے لیکن وہ اس لائق نہیں کہ بیوی کی حیثیت سے میں اسے اپنے گھر میں رکھوں اور اس کا سب یہ ہے کہ جو یہ یہ گندے عملیات کرتی اور کراتی ہے۔ جب تک یہ میرے گھر میں رہی، ہمارے گھر کا نظام درہم برہم رہا۔ اس کے سفلی عملیات کی وجہ سے میری بہنوں کے رشتوں میں شدید نوعیت کی رکاوٹ پیدا ہوئی اور ایک خاص بات یہ کہ جو یہ یہ ہانچ بھی ہے۔ ایسی عورت کا میں کیا چارڈالوں گا جو میری نسل کو آگے نہ چلا سکے اور ہاں..... میں اس طرح کے ٹولس کی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ یہ میاں بیوی کا معاملہ ہے۔ آپ کو ہمارے بیچ نہیں آنا چاہیے۔ آپ نے سنا تو ہوگا..... جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی..... آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں پیسوں کے انتظام میں لگا ہوا ہوں۔ ان شاء اللہ! بہت جلد میں جو یہ یہ کا حساب چکاتا کروں گا..... آصف!“

وہ ٹولس کا جواب پڑھ کر خوش ہو گیا اور تعریفی انداز میں بولا۔ ”آپ نے بڑا زبردست مضمون بنایا ہے۔“

”میں تو ایسے ہی زبردست کام کرتا ہوں جناب۔“
میں نے قلم اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ

جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ان شاء اللہ..... اب آپ کی شادی کے بعد ہماری ملاقات ہوگی۔“

”ان شاء اللہ.....!“ وہ میرے ہاتھ کو پوری قوت سے دباتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز دھڑکنے سے کانپ رہی تھی۔ روٹی کے تصور نے اسے نہال کر رکھا تھا۔

میں نے یہ مشکل اس سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کہا۔ ”میری جانب سے آپ کو ایڈوائس میں ڈھیروں مبارک۔“

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر بٹوال نکالا پھر بٹوے کے اندر سے سو سو والے پانچ کراے نوٹ برآمد کر کے میرے ہاتھ میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ پانچ سو روپے میری طرف سے فیس رکھ لیں۔“

میں نے لکھی دیوی کی دستک کو نظر انداز کرنا مناسب نہ جانا اور وہ پانچ سو روپے اپنی جیب میں رکھ لیے۔ آصف میرا کلاسٹ نہیں تھا لیکن میں نے اس سے مغز ماری میں اپنا اچھا خاصا وقت صرف کیا تھا۔ اس سے فیس لینا تو میرا حق بنتا تھا۔ یہ پانچ سو روپے میری اصل فیس کا عشر عشر بھی نہیں تھے لیکن کسی نے بہت خوب کہا ہے..... کچھ بھی نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے!

☆☆☆

اس امر میں کسی شک و شبہ کی گنجائش تلاش نہیں کی جاسکتی تھی کہ آصف کے دل میں اور اس کے گھر میں جویریہ کے لیے شہید بھرجی جگہ نہیں تھی لہذا جویریہ کی اس سے جان چھڑانا ناگزیر ہو گیا تھا اور وہ بھی تمام واجبات کی وصولی کے ساتھ.....!

دوسری جانب مجھے اپنے تجربے کی روشنی میں آفتاب گلہت، جویریہ کا امیدوار دکھائی دیتا تھا اور اس کی اول و آخر یہی کوشش بلکہ یہی خواہش تھی کہ جلد از جلد جویریہ، آصف کے کراچ سے نکل آئے۔ خواتین، حضرات کی یہ نسبت کئی گنا زیادہ حساس ہوتی ہیں۔ میں یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ جو معاملہ میں دیکھ رہا تھا، وہ جویریہ نے محسوس نہ کیا ہو جبکہ آفتاب گلہت اس کا محلے دار، اس کا بڑا دوست بھی تھا۔ میں نے اس حوالے سے جب جویریہ کو ٹٹولنے کی کوشش کی تھی تو اس نے دو ٹوک انداز میں کہہ دیا تھا کہ اس کے دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے اور اگر آفتاب گلہت ایسا سوچ رہا ہے تو کسی مناسب موقع پر وہ اس کا ذہن صاف کر دے گی۔ میں جویریہ کے جواب سے یہ سوچ کر مطمئن ہو گیا تھا کہ اگر واقعتاً جویریہ بھی آفتاب کی ذات میں کوئی دلچسپی رکھتی ہے اور اسے معلوم ہے کہ آفتاب کے ذہن میں اس کے لیے کس

نوعیت کے جذبات ہیں اور..... جویریہ نے دانستہ یہ معاملات مجھ سے چھپانے کی کوشش کی ہے تو اس میں خرابی والی کوئی بات نہیں۔ یہ جویریہ کا حق ہے کہ وہ اپنی بہتری کے لیے جو بھی فیصلہ کرے، خاص طور پر ان حالات میں کہ مارکیٹ میں اس کا ایک اور امیدوار بھی موجود تھا۔ میرا اشارہ جویریہ کے بہنوئی کلیل احمد کی جانب ہے جو جویریہ کو گناہ کی آڑ میں مسلسل اپنی ہیوس کی بیعت چڑھائے رکھنا چاہتا تھا۔ یہ گھٹیا پن کی انتہا تھی۔ کلیل نے اپنی بیوی عارفہ کو کسی گھنٹی کی فروخت شدہ پروڈکٹ سمجھ رکھا تھا اور وہ اس چیز کے ناکارہ ہونے (قابل استعمال نہ رہنے) کی صورت میں ”بعد از فروخت سروس کی ضمانت“ والا وارنٹی کارڈ استعمال کرتے ہوئے گھنٹی سے مطالعہ کر رہا تھا کہ وہ اس کی سہولت اور اس کے مکرر جذبات کی تسکین کے لیے ریہیلیف منٹ کے طور پر جویریہ کو اس کی کھڑی میں دے دیں۔ یہ دنیا ہے۔ یہاں آپ کو ہر طرح کے لوگ ملیں گے۔ پاکیزہ کردار کے مالک مینارہ، نو بھجی اور غلامت سے تھری سوچ کے حامل کلیل احمد جیسے ناسور بھی.....!

میں نے آئندہ دو روز تک صدمہ بھائی اور اس کی بیٹی روٹی کے بارے میں اہم معلومات جمع کر لیں پھر جویریہ کو اپنے آفس بلا لیا۔ اب کی بار بھی آفتاب گلہت اس کے ہمراہ تھا۔ میں نے اپنی یکڑی مام سے کہا کہ وہ آفتاب گلہت کو انتظار گاہ میں بٹھائے اور جویریہ کو میرے پاس بھیج دے۔ تھوڑی دیر کے بعد جویریہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ رسی علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔ ”بگ صاحب! آج آپ کا موڈ آف لگ رہا ہے اور میں اس کا سبب بھی جانتی ہوں۔“

یہ سچ ہے کہ آفتاب گلہت کی آمد کا سن کر میری طبیعت مکدر ہو گئی تھی اور یقیناً جویریہ نے میرے چہرے سے جھلکتے ہوئے اس مکدر کو بڑی وضاحت کے ساتھ دیکھ اور سمجھ لیا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”جانتی ہیں..... بھرجی؟“ میرے لہجے میں شکایت پائی جاتی تھی۔

”آپ ٹینشن نہ لیں۔“ وہ خاصے خوشگوار لہجے میں بولی۔ ”میں بہت جلد آفتاب کی خوش فہمی دور کر دوں گی۔ ابھی اسے چلنے دیں۔ میں اکیلی جان کہاں کہاں خوار ہوں گی۔ بھاگ دوڑ کے کاموں کے لیے بھی تو کوئی چاہیے نا.....!“

میں نے کسی جرح یا اعتراض کی ضرورت محسوس نہ کی

کہا۔ ”ہم بروقت قانونی چارہ جوئی کر کے آصف کی دوسری شادی کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کر سکتے ہیں۔ آپ مجھے اپنا نکاح نامہ، طلاق نامہ، زبورات کی رسیدیں اور ان میں ہزار روپے کا کوئی ٹھوس ثبوت لا دیں جو آپ کے ابو نے جھپٹ کے سامان کی مد میں آپ کو دیے تھے اور آپ نے آصف کے حوالے کر دیے تھے۔“

”میں آپ کو نکاح نامہ اور اپنی زبورات کی رسیدیں دے سکتی ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولی۔ ”لیکن نقد میں ہزار والی رقم کا میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔“

”آپ نے بتایا تھا کہ آصف نے وہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں ڈال دی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”کیا آپ کو آصف کا اکاؤنٹ نمبر یاد ہے؟“

اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔
”بینک کا نام اور برانچ؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔

”یہ وہی بینک ہے جس میں آصف کی بہن قمر النساء کام کرتی ہے۔“ اس نے کہا پھر بینک کا نام بھی بتا دیا۔

”آپ کے نکاح کی تاریخ تو نکاح نامے سے پتا چل جائے گی۔“ میں نے کہا۔ ”کیا آپ کو یاد ہے کہ شادی کے کتنے دن بعد آصف نے وہ بیس ہزار کی رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائی تھی؟“

اس نے مجھے مذکورہ تاریخ بتادی جو شادی کے چند روز بعد کی تھی۔

میں نے کہا۔ ”اس سے کام چل جائے گا۔ میں آفتاب صاحب کو گاڑ کروں گا اور انہیں بینک بھیج کر ہم آصف کی اس ماہ کی اسٹیٹ منٹ ٹھکوالیں گے جب آصف نے مذکورہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائی تھی۔“

”جی.....“ آفتاب ہلکتے ٹھوکے لگتے ہوئے بولا۔

”اس کے علاوہ آپ نے ایک اور کام بھی کرنا ہے۔“ میں نے براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے آصف کی روزمرہ سرگرمیوں پر بھی نگاہ رکھنا ہے تاکہ جب وہ شادی کرے تو ہمیں فوراً پتا چل جائے۔“

”یہ تو خاصا مشکل کام ہے وکیل صاحب۔“ وہ جزبز ہوتے ہوئے بولا۔

”کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔“ میں نے اس کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ ”میں بیٹھا ہوں نا آپ کی راہنمائی کے لیے۔ وہ سب کچھ کہتے ہیں نا..... کو انے کسی سے پوچھا،

اور فراخ دلی سے کہا۔“ میں آپ کی بات سے مکمل اتفاق کرتا ہوں۔ بھگ دوڑ کا زبردست کام شروع ہونے والا ہے اور اس مقصد کے لیے آفتاب سے زیادہ کارآمد بندہ ہمیں کہیں نہیں ملے گا۔ ایسا کرتے ہیں، اسے بھی اندر بلا لیتے ہیں.....“ میں نے انٹرکام پر مامم کو ہدایت دی کہ وہ آفتاب کو میرے پاس بھیج دے پھر میں نے جویریہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب تو خوش ہیں نا.....!“

جواب دینے کے بجائے وہ کسمسا کر رہ گئی۔

جویریہ کے ذہن میں آفتاب ہلکتے کے لیے جو بھی تھا اس سے قطع نظر میں نے اچھی طرح یہ محسوس کر لیا تھا کہ وہ آفتاب کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھی لہذا مجھے جویریہ کی اس خواہش پر متعرض نہیں ہونا چاہیے تھا۔ جب آفتاب ہلکتے بھی اس میننگ میں شریک ہو چکا تو میں نے نہایت ہی مختصر اور جامع الفاظ میں انہیں تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

پوری بات سننے کے بعد جویریہ نے کہا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے۔ میری اجازت کے بغیر آصف دوسری شادی کیونکر کر سکتا ہے؟ میں نے اس قانون کے بارے میں سن رکھا ہے.....!“

”یقیناً ایسا قانون تو موجود ہے۔“ میں نے بڑی رسان سے کہا۔ ”لیکن یہ خاصا کمزور قانون ہے جو کسی بیوی کے حقوق کا تحفظ کرنے کے بجائے اس کے لیے مسائل کا انبار کھڑا کر دیتا ہے۔ جو مرد دوسری شادی کا اہل فیصلہ کر لیتا ہے، وہ پہلی بیوی سے اجازت حاصل کرنے کا محتاج نہیں ہوتا۔ اگر پہلی بیوی اس کی دوسری شادی کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کرے تو وہ اسے طلاق دے کر، اپنی راہ کو صاف کر کے دوسری شادی کر لیتا ہے۔“ لکائی تو وقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”ممکن ہے، آصف کی بہنوں نے صدمہ بھائی اور اس کی بیٹی روہی کو آصف کی پہلی شادی کے بارے میں بتایا ہی نہ ہو۔“

”لیکن اس بات کا پتا کیسے چلے گا؟“ جویریہ ٹھکر

آمبر اعزاز میں بولی۔

”یہ راز آفتاب صاحب کی مدد سے حاصل کیا جائے گا۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں انہیں سمجھا دوں گا کہ کرنا کیا ہے۔“ پھر میں نے جویریہ سے

تو کون؟ کسی نے کسی کو جواب دیا، میں خواجواہ!..... تو آفتاب صاحب! جو خواجواہ ہوتا ہے نا، اسے خواجواہ ہی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ ابھی تو آپ نے.....“ میں نے لحاظی توقف کر کے ان دونوں کے چہروں کو باری باری دیکھا پھر آفتاب سے کہا۔

”ابھی تو آپ نے ایک اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے روٹی کی فیکٹری اور گھر بھی جانا ہے اور روٹی کا انٹرویو کرنا ہے۔ روٹی کو بتایا جائے گا کہ آپ کا اخبار فیملی صنعت کاروں کے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کر رہا ہے اور اس کام کا آغاز روٹی صاحبہ سے کیا جا رہا ہے۔ وہ بہت خوش ہوگی اور پوز مار مار کر تصویریں بھی کھینچوائے گی۔ اس طرح آپ کو اس کے قریب ہونے کا موقع ملے گا اور آپ شادی کے حوالے سے سوال کرتے ہوئے روٹی کے منہ سے آف وی ریکارڈ بھی بہت کچھ اگلا سکتے ہیں۔ آپ تو ایک جید صحافی ہیں۔ یہ کام تو آپ کے بائیس ہاتھ کاٹھیل ہے..... ہے کہ نہیں؟“

”جی..... بالکل ہے.....“ وہ حذب انداز میں بولا۔
”بس تو پھر آپ کل ہی سے کمرکس کے کام پر لگ جائیں۔“ میں نے فیملی گن لہجے میں کہا۔ ”اس سفر میں آپ نے خود کو تنہا نہیں سمجھنا۔ میں ہر مرحلے پر شانہ بہ شانہ آپ کے ساتھ ہوں..... بلکہ دیکھیں، میں بھی آپ کے سامنے ہی کام کا آغاز کر رہا ہوں۔“

میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے صمد بھائی کی فیکٹری اور گھر دونوں جگہوں کے ٹیلی فون نمبرز حاصل کر لیے تھے۔ میں نے اپنی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ سے صمد بھائی کے پینکے کا نمبر ملایا کیونکہ میری معلومات کے مطابق، اس وقت تک وہ فیکٹری سے گھر پہنچ چکا کرتا تھا۔ تیسری گھنٹی پر میری کال ریسیو کر لی گئی پھر ایک ہماری بھر کم مردانہ آواز میری سماعت تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔
”ہیلو.....!“

”ہیلو..... کیا آپ صمد بھائی بول رہے ہیں؟“ میں نے کہا۔

”ہاں بھائی..... آپ کون؟“
”صمد بھائی! میں سردار علی بات کر رہا ہوں۔“ میں نے تبدیل شدہ آواز کے ساتھ کہا۔
”جی سردار بھائی!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”صمد بھائی! پیراڈائز مارکیٹ میں میری عروسی لمبوسات کی دکان ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ایک صاحب جو اپنا نام آصف بتاتے ہیں، اس وقت میری دکان کے اندر موجود ہیں۔ انہوں نے اپنی شادی کی شاپنگ کے لیے میری دکان سے بتاری سائیاں اور دیگر قیمتی لمبوسات خریدے ہیں۔ بلی کی ادائی کے لیے ان کے پاس نقد رقم کم پڑ گئی ہے۔ بٹا رہا ہے کہ اسے دس ہزار کا چیک دینا چاہتے ہیں۔ میں عموماً چیک نہیں لیتا ہوں لیکن آصف صاحب نے آپ کا حوالہ دیتے ہوئے مجھے بتایا ہے کہ آپ کی بیٹی روٹی سے ان کی شادی ہونے والی ہے۔ میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ پیراڈائز مارکیٹ میں آپ کی فیکٹری کی تیار کردہ گارمنٹس اور لیڈر جینٹلس بھی فروخت ہوتی ہیں۔ بس، اسی لیے میں نے آپ کو فون کیا ہے کہ آصف صاحب کا چیک لینے میں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے؟.....“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔
”مگر اس کے کہ وہ مجھ سے کوئی سوال کرتا، میں نے ”شکر یہ صمد بھائی“ کہہ کر ریسیور کر پڈل کر دیا۔

جو یہ نے حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھا اور بے یقینی سے بولی۔ ”بیگ صاحب! آپ اتنی صفائی سے کیسے جھوٹ بول لیتے ہیں؟“

”دیکھو! اس کے لیے یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔“ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”ہمارے پیٹے میں بعض اوقات سچ کی تلاش کے لیے بہت سے جھوٹوں کا سہارا لینا پڑتا ہے جیسا کہ ابھی ہوا ہے۔ میرے جھوٹ نے یہ سراغ لگایا کہ صمد بھائی کی بیٹی روٹی کی شادی واقعی آصف سے ہو رہی ہے۔“

”بہت خوب!“ وہ سراہنے والے انداز میں بولی۔
”اے کہتے ہیں، سفید جھوٹ۔“

”اگر سفید میں سے سین کو ہٹا کر اس کی جگہ سیم لگا دیا جائے تو یہ سفید جھوٹ ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”ویری ویری فائدہ مند جھوٹ.....!“

”ایک ہی بات ہے بیگ صاحب.....“ وہ خوشخوار..... انداز میں بولی۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ حزن و ملال کی اس دیوی کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کی کلیاں مچلی تھیں۔ اور ان کی آنکھوں میں امیدوں کے جتنو جاگ اٹھے تھے۔ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

”کل صبح ہی۔“ میں نے جواب دیا۔ ”حق زوجیت اور نان و نفقہ کا کس تو تیار رکھا ہے۔ اس میں مزید کچھ چیزوں کا اضافہ کر کے کل حوالہ عدالت کروں گا۔“ میری وضاحت کے بعد وہ مطمئن ہو گئی۔

☆☆☆

آئندہ روز میں نے عائلی قوانین بحریہ انیس سو اسیھ کے تحت عائلی عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔ بجلی کورٹ نے اگلے دن مدعا علیہ کو درخواست دعویٰ کی نقل کے ساتھ من جاری کر دیا۔ ساعت کی تاریخ دو ہفتے بعد کی رکھی گئی تھی۔ میں نے ایک ہوشیار بیوی کی بھی کہ درخواست دعویٰ میں آصف کی رہائش گاہ کا پتا، محمد بھائی کے پتکے واقع بغرون کا دیا تھا۔ اس کارگزاری کا مقدمہ یہ تھا کہ روٹی یا صبر بھائی کو بھی آصف کی پہلی شادی کا علم ہو جائے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ صبر بھائی جانتے بوجھتے ہوئے ایک شادی شدہ شخص سے اپنی بیٹی کی شادی کر دیتا جبکہ اس شادی کے ساتھ کروڑوں کے معاملات بھی جڑے ہوئے تھے۔ صبر بھائی ایک جہاں دیدہ شخص تھا۔ یقیناً آصف کی پہلی شادی کی بات اس سے چھپائی گئی ہوگی اور آصف کی فتنہ پرور سسٹمز اس نوعیت کی کارروائیوں میں خاصی مشاق تھیں۔

میں نے سمن کی تعمیل کرانے والے بلیف سے ملاقات کر کے ذاتی طور پر اس خواہش کا اظہار کیا۔ ”جناب! اس سمن کی تعمیل ایک خاص انداز سے کرانا ہے۔“

اس نے چونک کر میری جانب دیکھا اور پوچھا۔
”کون سے خاص انداز میں؟“

مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ کن اوقات میں روٹی اور آصف یہ یک وقت گھر میں موجود ہوتے ہیں۔ میں نے بلیف کو وہ اوقات نوٹ کر دانے کے بعد کہا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ ان اوقات میں مذکورہ ایڈریس پر جا کر اس سمن کی تعمیل کرا لیں۔“

”ہو جائے گا بیگ صاحب۔“ وہ فراخ دلی سے بولا پھر پوچھا۔ ”کوئی اور فرمائش؟“

”آپ متعلقہ ایڈریس پر جا کر پہلے روٹی کے بارے میں استفسار کریں گے۔“ میں نے اپنا منصوبہ اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ”جب روٹی گیٹ تک آجائے تو پھر آپ اس سے کہیں گے کہ اس کے شوہر آصف کے نام سمن آیا ہے۔ اس سے کہیں، وصول کر لے۔“

”آپ چاہتے ہیں کہ سمن کی وصولی کے وقت آصف کی بیوی اس کے برابر میں کھڑی ہو۔“ وہ معنی خیز نظر سے

”یہ اپنے آفتاب صاحب زبردست اسٹوری میکس ہیں۔ ان کی نکالی ہوئی اسٹوریز ٹک کے طول و عرض میں ٹھیکہ ڈال دیتی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ میں نے ان کے اسے جو کام لگائے ہیں اس میں سے یہ کیا ڈگ آؤٹ کرتے ہیں۔۔۔۔۔!“

”آپ فکر نہ کریں وکیل صاحب۔“ آفتاب گفتہ بڑے اعتماد سے بولا۔ ”میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا۔ میری کارکردگی سے یقیناً آپ خوش ہوں گے۔“

اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ آئندہ چند روز میں آفتاب گفتہ نے کافی مفید اور کارآمد معلومات مجھ تک پہنچائیں۔ مثال کے طور پر..... آصف کی ہونے والی بیوی روٹی کی عمر لگ بھگ پینتالیس سال تھی۔ وہ مولے نقوش اور سانولے رنگ کی ایک پست قامت و اجبی شکل و صورت کی مالک عورت تھی۔ اس کی شخصیت کی امتیازی ”خونی“ اس کا غیر معمولی وزن تھا۔ وہ ماشاء اللہ سکو گرام وزن کی مالک تھی۔ انہی من جملہ خصال کے باعث ابھی تک وہ کنواری بیٹی تھی۔ اب میری سمجھ میں آ گیا کہ قمر النساء اور خیر النساء کس بنا پر جویریہ سے نفرت کرتی تھیں۔ انہیں دراصل اپنے ہی کینڈے اور اناج گروپ کی بھائی ورکاری تھی۔!

آفتاب نے مجھے روٹی کی ایک دو تصاویر بھی دکھائی تھیں۔ اللہ کی بنائی ہوئی کسی بھی چیز کو حقیر جاننا یا اس کی برائی کرنا کسی انسان کو زیب نہیں دیتا۔ میں بس، اتنا کہوں گا کہ اگر روٹی کے ساتھ کروڑوں کی جائداد، کاروبار اور دولت و مال تھی نہ ہوتا تو شاید وہ زندگی بھر غیر منکوحہ ہی رہتی۔

چند روز بعد جویریہ اور آفتاب گفتہ مجھ سے ملنے آئے اور انہوں نے بتایا کہ آصف نے روٹی سے شادی کر لی ہے اور گھر داماد بن کر وہ صبر بھائی کے بغرون والے پتکے میں شفٹ ہو گیا ہے۔ گویا..... آصف کی رخصتی ہوئی تھی!

”اب کیا ہو گا بیگ صاحب؟“ جویریہ نے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا۔

”کچھ بھی نہیں ہو گا.....!“ میں نے پرسکون انداز میں کہا۔ ”میں تو اسی وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ میں اپنے ذرائع استعمال کر کے آصف اور روٹی کے نکاح کی تفصیلات معلوم کر لوں گا۔ اب آپ دونوں کو تمنا شاید دیکھنا ہے اور میرا عملی کام شروع ہوتا ہے۔“

”آپ میرا کس کب تک عدالت میں دائر کریں گے؟“ اس نے امید بھری نظر سے مجھے دیکھا۔

مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس کو اچھی طرح یہ بات معلوم ہو جائے کہ عدالت نے کس سلسلے میں اس کے شوہر کے نام یہ سمن بھیجا ہے؟“

”ایکریٹلٹی.....!“ میں نے توصیفی انداز میں بیلف کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں بالکل یہی چاہتا ہوں۔“

”میں نے سنا ہے.....“ وہ یفرزون کے علاقے میں مٹھائی کی ایک معروف دکان کا نام لے کر بولا۔

”وہاں کی مٹھائیاں بہت خوش ذائقہ، مزے دار اور معیاری ہوتی ہیں۔“

میں اس کی بات میں پوشیدہ رمز تک پہنچ گیا۔ ”ہاں، سنا تو میں نے بھی ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر اپنے بٹوے میں سے سو روپے والا ایک نوٹ نکال کر سمن کی تحویل کرانے والے بیلف کی جانب بڑھاتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”جب آپ آصف کو سمن دے کر فارغ ہو جائیں تو واپسی پر اپنے گھر والوں کے لیے مذکورہ سوٹ ہاؤس سے عمدہ قسم کی مٹھائی بھی لے جائیے گا۔“

وہ خوش ہو گیا اور میرا شکریہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

حقیقت ہے کہ زندگی کا ہر مسئلہ پیسے سے حل نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ زندگی کے تناوے فیصد مسائل دولت کے جادو سے حل ہو جاتے ہیں۔ کوئی اس فارمولے پر یقین کرے یا نہ کرے مگر زندگی کی سب سے بڑی حقیقت، سب سے بڑی سچائی یہی ہے جو کسی کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے سے بدل نہیں سکتی۔ ایسے افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے جو حثیت انداز فکر کے ساتھ ایک فیصد کی امید کے سہارے جی لیتے ہیں ورنہ انسانوں کا عمومی چلن تو یہی ہے کہ کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک!

بیلف نے ایک سو روپے کی چسکا راند قوت کے طفیل نہ صرف یہ کہ میری خواہش کے عین مطابق سمن کی تحویل کرائی بلکہ اگلے روز عدالت کے احاطے میں کھڑے ہو کر مجھے اس قانونی کارروائی کی روداد بھی سنائی۔ آپ کی تقریب طبع کے لیے خلاصہ بیان کرتا ہوں۔

بیلف کی طلی پر جب روٹی اس کے سامنے پہنچی اور اس نے یہ تصدیق کر لی کہ وہ ننگ سا تزعورت آصف کی بیوی روٹی ہی ہے تو اس نے روٹی سے کہا۔

”میڈم! آپ اپنے شوہر آصف کو بلا لیں۔“

”خیریت.....“ روٹی نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”آصف سے آپ کو کیا کام ہے؟“

”اس کے نام عدالت سے سمن آیا ہے۔“ بیلف نے بتایا۔

روٹی کا ماتھا ٹٹکا۔ ”کیسا سمن؟“

”آصف..... کی پہلی بیوی نے اس کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کر دیا ہے۔“

”پہلی بیوی!“ وہ بے یقینی سے بیلف کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ کیسا مذاق ہے؟“

”یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے۔“ بیلف نے اسے خوفزدہ کرتے ہوئے کہا۔ ”مذاق تو آصف نے آپ کے ساتھ کیا ہے۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں اس نے دولت کے لالچ میں آپ سے شادی کر لی اور وہ بھی خود کو کنوارا بتلا کر.....“

”یہ آپ کسی بکواس کر رہے ہیں؟“ روٹی ہنرک اٹھی۔

”میڈم! میں تو عدالت کا ادنیٰ سا کارندہ ہوں۔“

بیلف عاجزی سے بولا۔ ”اور اتنا جانتا ہوں کہ اگر آصف نے اس سمن کا کوئی مقول جواب نہ دیا تو اس کے بعد عدالت سے اس کے لیے وارنٹ جاری کیا جائے گا اور آپ کو اتنا تو پتا ہی ہوگا کہ وارنٹ کی صورت میں گرفتاری لازمی ہے۔“

”لائیں..... یہ سمن مجھے دیں۔“ روٹی نے جھنجھلاہٹ بھرے انداز میں اپنا ہاتھ بیلف کی جانب بڑھایا۔ ”میں دیکھتی ہوں، اس کے اندر کیا ہے!“

”سوری میڈم!“ بیلف نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”میں اپنی ذمہ داری کے سامنے مجبور ہوں۔ یہ سمن میں اسی شخص سے وصول کراؤں گا جس کے نام ہے۔ آپ پلزز آصف کو یہاں بلا لیں۔“

اسی لمحے جھگڑے کے اندر سے آصف کی آواز سنائی دی۔

”ہئی!“ وہ بڑے دلار سے اپنی نئی ٹوپی ڈھن کو پکارتے ہوئے بولا۔ ”آپ گیٹ پر کس سے بات کر رہی ہیں؟“

”آ کر خود ہی دیکھ لو۔“ وہ شپٹائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”عدالت سے کوئی صاحب تمہارے لیے ایوارڈ حسن کارکردگی لے کر آئے ہیں۔“

”ٹوہین..... پرائیڈ آف پرفارمنس؟“ وہ چپک کر بولا۔

”زیادہ انگلش بگھارنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ پھرے ہوئے انداز میں بولی۔ ”فوراً دھر آؤ۔“

آصف کو صورت حال کی یقینی کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا اسی لیے اس کے لہجے میں چپک شامل تھی۔ وہ کسی بے فکرے نوجوان کی طرح سیٹی بجاتے ہوئے گیٹ پر پہنچا تو بیلف کے استقبالیہ جملے نے اس کی مٹی کم کر دی۔

”آصف صاحب! جویریہ نے آپ کے خلاف

دوران میں آفتاب شگفتہ نے بھی ہاتھ پاؤں مار کر اس کیس کے حوالے سے کچھ مزید مفید معلومات مجھ تک پہنچادی تھیں۔

پہلی پیشی پر آصف نے اپنے وکیل کے ذریعے عدالت میں جواب دعویٰ داخل کر دیا۔ ”اپنے وکیل“ سے میری مراد ہرگز میں نہیں ہوں۔ میں تو اس کیس میں وکیل استغاثہ یعنی آصف کی حریف جویریہ کا وکیل تھا۔

اس روز عدالت کے برآمدے میں آصف سے میری سرسری سی ملاقات ہوئی۔ اس نے شکایتی نظر سے مجھے دیکھا اور جیسے ہوئے لہجے میں بولا۔

”وکیل صاحب! آپ تو بڑے کارگر لگے!“
”کیوں..... میں نے کیا کیا ہے؟“ میں انجان بن گیا۔

”آپ نے مجھے تباہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“ اس نے طنز بے لہجے میں کہا۔ ”مگر آپ کی سمن والی چال میرے حق میں چلی گئی۔ روٹی کو ایک نہ ایک دن تو میری پہلی شادی کا پتا چلنا ہی تھا۔ خیر..... میں نے اسے سیٹ کر لیا ہے۔“ لٹکانی توقف کے بعد اس نے کہا۔ ”آپ تو میرے وکیل تھے لیکن آج آپ میرے خلاف کھڑے ہیں حالانکہ میں نے آپ کی فیس بھی ادا کی تھی۔ یہ تو چینگ ہے نا.....!“

”اسے چینگ نہیں ٹیکس کہا جاتا ہے مسٹر آصف!“
میں نے حقیقت حال اس پر واضح کرتے ہوئے کہا۔ ”نمبر ایک، میں نے جویریہ کو آپ کے حق میں ہموار کرنے کی پوری کوشش کی مگر اس نے میری ایک نہیں مانی اور کیس گرنے پر یہ ضد رہی۔ میں سمن پوائنٹ پر تو اسے راضی کرنے سے رہا..... نمبر دو، میں نے آپ کو تباہ کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی البتہ میں ایک پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ مظلوم جویریہ کی ”آہ“ آپ کو عفریت تباہ و برباد کر ڈالے گی..... نمبر تین، آپ کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میری جانب سے دائر اس کیس نے ابتدائی مرحلے پر ہی آپ کی مشکل آسان کر دی۔ اگر کچھ عرصے کے بعد روٹی کو آپ کی دوسری شادی کا علم ہوتا تو پھر آپ کو اسے سیٹ کرنے کا موقع نہ ملتا بلکہ وہ آپ کو بری طرح آپ سیٹ کر دیتی..... نمبر چار، سمن والی چال میری نہیں تھی۔ یہ کارنامہ عدالت کا ہے۔ وہ عدالت جہاں اگلی پیشی پر آپ کو حاضر ہو کر میری جرح کا سامنا کرنا ہے..... نمبر پانچ، اب رہ گئی فیس کی بات تو..... آپ نے مجھے جو پانچ سو روپے دیے تھے، اس کے بدلے

عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ میں اس کا سمن لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔“

”لگ..... کون جویریہ.....“ آصف کے حواس پر گویا بجلی سی گری۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ ”تم.....“ لفظ جگہ پر..... آگئے ہو..... میں کسی جویریہ کو..... نہیں جانتا..... تم یہ سمن واپس لے جاؤ.....“ پھر وہ روٹی کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ”آؤ ہنسی! اندر چلتے ہیں۔ پتا نہیں، کیسے کیسے لوگ وقت برباد کرنے آ جاتے ہیں۔“

روٹی نے متعدد ہارس پاور کے ایک جھکے سے آصف کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا پھر غضب ناک نظر سے اپنے شوہر کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ادھر ہی روٹی اور غور سے سنو، عدالت سے آنے والا یہ بندہ کس عظیم کارنامے پر تمہیں.....“

”پرائیڈ آف پارفائمنس... دینے آیا ہے۔“
”میں آپ کی پہلی بیوی جویریہ کی بات کر رہا ہوں۔“ روٹی کی خوفناک چنگھاڑ کے اختتام پر بیلف نے سونے پہ سہاگہ کی عملی تفسیر بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”میرا اکام عدالت کے حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ جویریہ آپ کی بیوی ہے یا نہیں، اس بات کا فیصلہ کرنا جج کا کام ہے۔ آپ برائے مہربانی یہ سمن وصول کریں اور کسی وکیل کی وکالت میں مقررہ تاریخ پر عدالت میں حاضر ہو کر جواب دعویٰ داخل کر دیں۔“

بیلف نے مجھے بتایا کہ آصف ”نہ پائے رفتن، نہ جائے ماندن“ ایسی صورت حال میں گھر کر بدحواس ہو گیا تھا۔ اس نے آنا فانا میں رسید پر دستخط کر کے بیلف سے سمن والے کاغذات وصول کیے اور اپنی بیوی ڈیوٹی فیو برانڈ وائف کا ہاتھ پکڑ کر اسے بنگلے کے اندر لے گیا تھا۔

بیلف کی کارکردگی نے میرا مقصد پورا کر دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس رات صبح بھائی کے بنگلے کے کسی بیڈروم میں گھسنا کارن پڑنے والا تھا اور عین ممکن تھا کہ بغرز و ن میں واقع وہ بنگلا پورے کا پورا ہی میدان جنگ کا نقشہ پیش کرنے لگے۔ اب تو آپ بھی مان گئے ہوں گے کہ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے، یہ شرط یہ کہ آپ کو پیسے کے استعمال کا ڈھنگ آتا ہو..... سو روپے والے ایک نوٹ نے آصف کی نئی سسرال میں فساد کی چنگاری گرا کر اس کیس میں میری جیت کے امکانات کو رخشہ و تابندہ کر دیا تھا۔

اگلے دو روز میں، میں نے اپنے تعلقات استعمال کیے اور متعلقہ یونین کونسل کے دفتر سے آصف اور روٹی کے نکاح نامے کی کاپی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اسی

میں، میں نے آپ کو سروس بھی فراہم کی تھی۔“
 ”سروس..... مانی فٹ!“ وہ برہمی سے بولا۔ ”وہ جو
 آپ نے اپنی مرضی کا ٹولس کا جواب ٹائپ کر کے دیا تھا؟“
 ”میں نے وہی جواب لکھا جو آپ کے خیالات اور
 دعوؤں سے لگا کھاتا تھا۔“ میں نے روٹھے لہجے میں کہا۔
 ”اور وہی ساری باتیں وکیل صفائی نے جواب دعوئی میں بھی
 لکھی ہیں۔ اگر روٹی کو ”ہتی ہتی“ کہنے سے فرصت میسر
 آجائے تو جواب دعوئی کی اسٹڈی کر لیجئے گا۔“
 وہ معاندانہ انداز میں مجھے گھور کر رہ گیا۔

میں نے کہا۔ ”آپ نے یہ تو سنا ہی ہوگا کہ
 ”بھائی! اسنے میں اتنا ہی آتا ہے.....“ تو آصف
 صاحب! آپ کے ویسے ہوئے پانچ سو روپے میری فیس کا
 یا سنگ بھی نہیں ہیں۔ اگر آپ کو میری فیس کے بارے میں
 کچھ جانتا ہے تو کسی پٹے والے سے یا کسی اسٹیٹ فروش سے
 یا کسی وثیقہ نویس سے یا کسی نوٹری پبلک سے جا کر پوچھ لیں
 مگر پھر بھی بھائی بندی میں کہہ رہا ہوں.....“

میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کر کے اس کی
 آنکھوں میں جھانکا۔ وہ تھلاہٹ آمیز انداز میں متفکر
 ہوا۔ ”کیا.....؟“

”آپ کہیں تو میں وہ پانچ سو روپے آپ کو واپس
 کر دیتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

اس نے غصے سے پاؤں پٹنا اور غراہٹ بھرے
 انداز میں یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ ”میں آپ کو دیکھ
 لوں گا!“

”تو کیا اتنی دیر سے یہاں کھڑے مجھے سوکھ رہے
 تھے۔“ میں نے چوٹ کی۔ ”جو مجھے بعد میں دیکھنے کا فیصلہ
 سنا کر جا رہے ہیں.....؟“

اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میں اپنی گاڑی کی
 جانب بڑھ گیا۔ میں نے آج کیس کی ابتدا ہی میں آصف کو
 خاصا ہجوی ڈوز دے دیا تھا۔

☆☆☆

لگ بھگ ایک ماہ کے بعد کیس کی باقاعدہ سماعت
 شروع ہوئی۔ وکیل صفائی نے جواب دعوئی میں کم و بیش
 وہی باتیں لکھی تھیں جو میں نے اپنے ٹولس کے جواب میں
 آصف کی جانب سے ٹائپ کی تھیں۔ جواب دعوئی انیس
 بیس کے فرق سے میرے تیار کردہ جواب کا ”کاپی
 پیسٹ“ ورژن تھا۔

آصف نے اکیڈمی ڈائریکٹس (ملزموں والے کٹہرے)

میں کھڑے ہو کر سچ بولنے کا حلف اٹھایا پھر اپنا بیان ریکارڈ
 کر دیا۔ اس بیان کی جھلکیاں دوران سماعت میں میرے
 سوالات کے جوابات میں آپ کو گاہے بے گاہے دیکھنے کو ملتی
 رہیں گی۔

جج کی اجازت سے میں جرح کے لیے آصف والے
 کٹہرے کے قریب چلا گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے
 ہوئے اپنی جرح کا آغاز کر دیا۔

”آصف صاحب! آپ کی شادی کون سے سن میں
 ہوئی تھی؟“

”اکیاسی میں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور مہینہ
 جون کا تھا۔“

”جواب دعوئی اور آپ کے حلفیہ بیان کی روشنی
 میں بڑے واضح طور پر نظر آ رہا ہے کہ آپ کی بیوی
 سوری..... آپ کی زوجہ ادا ل مسات جو یہ لگ بھگ چھ
 ماہ تک آپ کے ساتھ رہی پھر یہ اپنے میکے چلی گئی۔ میں
 غلط تو نہیں کہہ رہا؟“

”نہیں..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”میری موکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ یہ کیس فائل
 ہونے سے پہلے وہ کم و بیش ایک سال سے اپنے میکے میں
 بیٹھی ہوئی تھی یعنی بیاسی کا پورا سال۔ آپ کو میری موکلہ
 کے اس بیان پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟“

”محکمگی اعتبار سے ”میکے“ کی ذمہ غلط ہے۔“ ملزم
 کے بجائے اس کے وکیل نے تقرر دیا۔ ”نفت کے مطابق
 ماں باپ یعنی والدین کا گھر میکا کہلاتا ہے جبکہ اس کیس کی
 مدی اپنی بہن کے گھر میں قیام پذیر ہے۔“

”میں آپ کے ”محکمگی اعتبار“ اور اس کی

”وضاحت“ کو سلام پیش کرتا ہوں میرے فاضل دوست!“

میں نے ڈیفنس کو ٹلر کو آڈے ہاتھوں لیا۔ ”اس کے ساتھ
 ہی میں آپ کے علم میں اضافے کی غرض سے یہ عرض بھی
 کروں گا کہ جن لڑکیوں کے ماں باپ اپنے خالق حقیقی سے
 جاملے ہوں اور ان خیم بچوں کا کوئی بھائی نہیں نہ ہو اور ان کا
 شوہر انہیں گھر سے بے گھر ہونے پر مجبور کر دے تو پھر بہن کا
 گھر ہی ان کا آخری ٹھکانا، ان کا میکا ہوتا ہے!“
 وکیل صفائی میرے اس ہلکے وار پر ٹھٹھلا کر رہ گیا مگر
 کچھ بولا نہیں۔ میں ملزم کی جانب متوجہ ہو گیا۔

”آصف صاحب! آپ نے میرے سوال کا جواب
 نہیں دیا؟“

”جی..... اس نے بیاسی کا پورا سال اپنی بہن عارفہ

شرعاً تو اپنی پہلی بیوی تسلیم کرتے ہیں مگر عملاً اسے بیوی کا مرتبہ حاصل نہیں ہے جیسا کہ آپ کی منکوحہ ثانی مسات رولہ کی یہ مقام حاصل ہے۔“ میں نے چنگی لینے والے انداز میں کہا۔

”جی..... جی ہاں.....“ وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

”آصف صاحب! آپ کے وکیل کی جانب سے دائر کیے گئے جواب دعویٰ میں اس بات کا ذکر ہے کہ میری مؤکلہ یعنی آپ کی پہلی بیوی جو یہ کہ آپ نے گھر سے نہیں نکالا بلکہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی۔“ میں نے جرح کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”کیا اس کم از کم ایک سال کے عرصے میں آپ نے اسے واپس لانے کی کوشش نہیں کی؟ اگر نہیں..... تو کیوں نہیں؟“

”وہ خود گئی تھی، اسے خود ہی واپس آنا چاہیے تھا۔“ وہ خاصی ہٹ دھرمی سے بولا۔ ”یہ مرد کی شان کے خلاف ہے کہ وہ عورت کی منت خواہش میں لگا رہے۔“

”تو آپ کی نظر میں یہ مرد کی شان ہے کہ اس کی عورت اسے چھوڑ کر چلی جائے.....“ میں نے اس کے احساس میں اپنے الفاظ کا نشتر چھپوتے ہوئے کہا۔ ”اس سے اس کی مردانگی کو کیس تو یوں کی سلامتی ملتی ہے۔“ کھائی توقف کر کے میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور سناتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”آصف صاحب! سیانے کہہ گئے ہیں کہ سواری اسی کی جس کے نیچے ہو، دولت اسی کی جس کی جیب میں ہو اور عورت اسی کی جس کے پہلو میں ہو..... آپ کس برتے پر میری مؤکلہ کا شوہر ہونے کے دعوے دار ہیں؟“

”یہ ضروری تو نہیں کہ میں کسی سیانے کے قول سے اتفاق کروں.....!“ وہ جاہلانہ انداز میں بولا۔

”بالکل ضروری نہیں اور میں اس اتفاق کے لیے آپ سے اصرار بھی نہیں کروں گا۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”آپ کو یاد ہو گا کہ اس کیس کے فائل ہونے سے کچھ عرصہ قبل میری مؤکلہ اور آپ کی پہلی بیوی جو یہ کہ جانب سے وادجیات کی ادائیگی کے ذیل میں آپ کو ایک نوٹس بھیجا گیا تھا جس کا آپ نے جواب دیا تھا.....!“

میں جب بھی جو یہ کہ کے لیے ”پہلی بیوی“ کے الفاظ استعمال کرتا تھا تو اس کا چہرہ مختصر ہو جاتا تھا اور وہ ہر اس فراری نظر سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا تھا۔ اب کی بار نوٹس کے ”جواب“ کے ذکر نے سونے پر سہاگا کا کام کیا تھا۔ اس نے کینہ تو زائد انداز میں مجھے گھورا اور برہمی سے بولا۔

”گھر میں گزارا ہے۔“ وہ برا سامنہ بتاتے ہوئے بولا۔
”اور ابھی تک وہیں بیٹھی ہوئی ہے۔“

”وہ اپنی مرضی سے وہاں بیٹھی ہوئی ہے یا آپ نے اسے وہاں بیٹھنے پر مجبور کر رکھا ہے؟“

”ایک ہی بات ہے۔“ وہ ہیزاری سے بولا۔

”ایک ہی بات نہیں ہے آصف صاحب.....!“ میں نے زور دے کر کہا۔ ”میری مؤکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کے اور آپ کی دو درجن سینئر سیزن سسٹرز VIRGIN SENIOR CITIZEN SISTERS کے رویے سے مجبور ہو کر وہ اپنی بہن کے گھر میں پناہ گزین ہوئی تھی۔ کیا آپ میری مؤکلہ کے اس دعوے کو جھٹلا سکتے ہیں کہ وہ تاحال آپ کی قانونی اور شرعی بیوی ہے اور آپ اس کے قانونی و شرعی شوہر؟“

”میاں بیوی کا رشتہ ایک ساتھ رہنے سے برقرار رہتا ہے۔“ وہ اپنے تئیں بہت دور دراز کی کوڑی لایا۔ ”جو عورت ایک سال سے زیادہ عرصے سے اپنے شوہر سے دور رہ رہی ہو، اس کا بیوی ہونا یا نہ ہونا ایک ہی بات ہے۔“

”سبحان اللہ..... ماشاء اللہ.....“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”آصف صاحب! آپ تو اپنی اس ایریلیٹیوی (IR-RELATIVITY) تھیوری آف سوشل رشتہ و پیوند سے سماجیات کی دنیا میں انقلاب برپا کر رہے ہیں۔ از روئے آپ کی تھیوری، جتنی بھی بیویوں کے شوہر رزق روزگار کی غرض سے ڈل ایسٹ، فار ایسٹ، یورپ اور امریکا گئے ہوئے ہیں اور کئی کئی سال تک انہیں گھر آنے کی چھٹی نہیں ملتی ان بے چاروں کا بیوی ہونا یا نہ ہونا ایک ہی بات ہے.....!“

آصف کے چہرے پر الجھن کے تاثرات نمودار ہوئے۔ یقیناً وہ میری بات کو سمجھ نہیں پایا تھا اس لیے ہونفانہ انداز میں بولا۔ ”آپ جو بھی سمجھ لیں.....!“

”بات میرے سمجھنے کی نہیں بلکہ آپ کے بتانے کی ہے۔“ میں نے قدرے سخت لہجہ میں کہا۔ ”اس عدالت کو بتائیں کہ میری مؤکلہ آپ کی بیوی ہے یا نہیں؟“

وہ میرے انداز کی سختی سے قدرے نرم پڑ گیا اور بولا۔ ”جو یہ شرعی لحاظ سے میری بیوی ہی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”اور قانونی اعتبار سے؟“

”جی..... قانونی اعتبار سے بھی ہے۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”لیکن عملاً وہ کچھ بھی نہیں ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میری مؤکلہ کو قانوناً

میری مڑکھ کو جاننے تھے؟“

”نہیں!“ وہ دونوں انداز میں بولا۔

”میری مڑکھ آپ کو کیا آپ کی بہنوں کو پہلے سے جانتی تھی؟“

”قطعی نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”آپ اس امر کی بھی تصدیق کرتے ہیں تاکہ میری مڑکھ صرف چھ ماہ تک آپ کے گھر میں رہی ہے؟“ میں نے استفسار کیا۔ ”جون ایکیا سی سے جنوری بیاسی تک!“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”آصف صاحب! معزز عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ جون ایکیا سی، یعنی آپ کی شادی، مطلب میری مڑکھ جویرہ کی آپ کے گھر آمد سے قبل آپ کی، بشیران کبیر قمر النساء، اینڈ خیر النساء کے کتنے رشتے آئے تھے؟“

”آپ کیا میری بہنوں کے پیچھے ہی پڑ گئے ہیں.....؟“ وہ سمجھلا ہٹ بھرے انداز میں بولا۔

”یہ آپ کی غلط فہمی ہے آصف صاحب! مجھے آپ کی بشیران سے کیا لینا دینا۔ میں تو اپنی مڑکھ کی سلفی قوت کو ناپنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ کو بتانا پڑے گا کہ میری مڑکھ اور اس کیس کی مدعی مسماہ جویرہ کی طرف سے کی جانے والی مبینہ نام نہاد بندش سے پہلے آپ کی آپاؤں یا باجیوں کے کتنے رشتے آئے تھے؟“

”رشتے تو آسائوں پر بستے ہیں۔“ وہ احمقانہ انداز میں بولا۔ ”خدا کی کاموں میں کسی کا کیا عمل دخل!“

وہ اپنی بے وقوفی میں اپنے ہی پاؤں پر کھلہاری مار بیٹھا تھا۔ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”شکریہ آصف صاحب!“

مدعا علی کی اس حماقت پر وکیل صفائی اپنا سر پیٹ کر رہ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، میں نے آصف کو خود سے پوچھتے پایا۔

”شکریہ کس بات کا وکیل صاحب؟“

”آصف صاحب! آپ نے نوٹس کے جواب میں لکھا تھا.....“ میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے ترش لہجے میں استفسار کیا۔ ”کہ آپ کی پہلی بیوی یعنی میری مڑکھ جویرہ باجھ ہے۔ آپ نے جویرہ کے لیے یہ الفاظ استعمال کیے تھے..... ایسی عورت کا میں کیا اچار دائوں گا جو میری نسل کو آگے نہ چلا سکے..... کیا آپ نے باجھ پن کے حوالے سے جویرہ کا کوئی میڈیکل چیک اپ کرایا تھا؟ اگر اس سلسلے میں ٹیسٹ وغیرہ ہوئے تھے تو کیا

”جی..... بڑی اچھی طرح یاد ہے وکیل صاحب!.....!“

میں نے مذکورہ جواب نوٹس، عرضی و دعوے کے ساتھ منسلک کر رکھا تھا تاکہ سندرہ لیے اور یہ وقت ضرورت کام آئے۔ میں نے یہ جواب موجودہ کیس کے تمام زاویوں اور تمام اضلاع کو ذہن میں رکھتے ہوئے تیار کیا تھا جسے استعمال کرنے کا موقع اب آیا تھا۔ زاویے اور اضلاع جو میری کی معروف اصطلاحات ہیں۔ ان کے ذکر سے ذہن کو الجھانے کی ضرورت نہیں!

”آصف صاحب!“ میں نے زنگ آلود کند چھری سے اس کے پوسٹ مارٹم کا آغاز کرتے ہوئے سمجھیر انداز میں کہا۔ ”آپ نے میرے نوٹس کے جواب میں لکھا تھا کہ آپ کی بیوی جویرہ یہ اس لائق نہیں کہ بیوی کی حیثیت سے آپ اسے اپنے گھر میں رکھیں اور اس کا سبب بیان کرتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا کہ میری مڑکھ سفلیات کی ماہر ہے۔ اس نے آپ کی درجن سینئر سٹیزن سسٹرز کے رشتوں پر بندش لگا دی ہے..... میں غلط تو نہیں کہہ رہا آصف صاحب؟“

”آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں وکیل صاحب!“ وہ کسی دانشور کے انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس میں تو کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔ لگتا ہے، آپ کا کبھی ایسے معاملات سے واسطہ نہیں پڑا.....!“

”آپ کے دم قدم سے واسطہ پڑ گیا ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”میری ریسرچ کے مطابق، آپ کی بڑی بہن خیر النساء انیس سو بیالیس میں اور ان سے چھوٹی بہن قمر النساء انیس سو چوالیس میں پیدا ہوئی تھیں۔ دونوں کی عمروں میں دو سال کا فرق ہے اور اس وقت قمر النساء اڑتیس جبکہ خیر النساء چالیس سال کی ہیں۔“

”آپ کی ریسرچ بالکل درست ہے۔“ وہ حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔

”اب آپ لگے ہاتھوں میری اس ریسرچ کی تصدیق کر دیں کہ آپ کی پہلی بیوی یعنی میری مڑکھ جویرہ جون ایکیا سی میں بیاہ کر آپ کے گھر آئی تھیں؟“

”اس میں ریسرچ والی کوئی بات ہے۔“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”یہ تاریخ تو نکاح نامے میں درج ہے۔“

”ریسرچ والی بات بال سے زیادہ باریک ہے آصف صاحب..... اسی لیے آپ کی باجھی سے زیادہ موٹی عقل کو دکھائی نہیں دے رہی۔“ میں نے اس کے طنز کے جواب میں ترشی سے کہا۔ ”یہ بتائیں، کیا آپ شادی سے پہلے

”جناب عالی! میرے فاضل دوست غیر ضروری بحث میں الجھ کر عدالت کا قیمتی وقت برباد کر رہے ہیں۔ انہیں ایسے تاخیری حربوں سے روکا جائے۔“

”بیگ صاحب!“ جج نے ڈیفنس کونسلر کی درخواست کو اہمیت دیتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ ”کیا آپ اس بانجھ پن کے ذکر کو اعتنا سے ہم کنار کر سکتے ہیں؟“

”یور آئرا معزز عدالت کا حکم سر آٹھوں پر۔“ میں نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اس تذکرے سے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ مدعا علیہ ایک تو ہم پرست شخص ہے اور اس نے اپنے جاہلانہ خیالات کو بنیاد بنا کر میری مؤکلہ کو بانجھ قرار دے کر اپنے گھر سے باہر نکال رکھا ہے جو کہ سراسر ظلم اور جہالت ہے۔ اگر میری مؤکلہ واقعتاً سفلی علم کی ماہر ہوتی اور وہ بندش کے ذریعے کی کارشرد آئے سے روکنے کی قدرت رکھتی تو وہ اپنے کسی زبردست سفلی عمل سے مدعا علیہ کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا چکی ہوتی اور جہاں تک بانجھ پن کا تعلق ہے تو اگر یہ میری مؤکلہ کے ہاتھ میں ہوتا تو خاندانی منصوبہ بندی کا محکمہ منہ مائگی خواہ پرلاکھوں روپے ادا کر کے اسے اپنے پاس رکھ لیتا اور کہتا..... بی بی! ایک جگہ آرام سے بیٹھ کر اپنا سفلی علم استعمال کرو اور ملک بھر کی بیویوں کو اپنی بندش سے بانجھ بنا دو.....!“

جج نے میری وضاحت کو سنائی نظر سے دیکھا اور غصہ ہوئے لمحے میں کہا۔ ”بیگ صاحب! جیڑ پر ویڈ۔“

میں دوبارہ آصف کی جانب متوجہ ہو گیا اور سخت لہجے میں استفسار کیا۔ ”تمہارا یہ دعویٰ ہے اور تم نے میرے نوٹس کے جواب میں بھی لکھا تھا کہ تم نے میری مؤکلہ یعنی اپنی پہلی بیوی مسات جویرہ کو گھر سے نہیں نکالا بلکہ وہ خود اپنی مرضی سے گئی تھی اور جاتے ہوئے اپنا سارا زیور بھی ساتھ لے گئی تھی۔ کیا تم ابھی تک اس بیان پر قائم ہو؟“

”جی، یہی حقیقت ہے اور میں اس پر قائم ہوں۔“ وہ کمال ڈھٹائی سے بولا۔

میں نے اپنی فائل میں سے جویرہ کی فراہم کردہ طلائی زیورات کی رسید کی نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! یہ زیور سن ایکسی ماہ مارچ میں میری مؤکلہ کے والد نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے خریدے تھے۔ اس وقت اس زیور کی قیمت لگ بھگ تیس ہزار روپے تھی۔ جب مدعی کو مدعا علیہ نے جنوری بیاسی میں اپنے گھر سے نکال باہر کیا تو یہ زیورات مدعا علیہ کے گھر پر ہی رہ گئے تھے جنہیں

آپ ان کی رپورٹس وغیرہ پیش کر سکتے ہیں؟“

”ایسا کوئی چیک اپ نہیں ہوا تھا.....“ وہ کمزوری آواز میں بولا۔

”تو آپ نے یہ جاہلانہ فتویٰ نکالوجی کی روشنی میں جاری کیا تھا؟“

”انسان کا تجربہ بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔“ اس نے کہا۔

”سبحان اللہ!“ میں نے جھکے لیے میں کہا۔ ”معزز عدالت اس گراں قدر انسانی تجربے سے بہرہ مند ہونے کی مشتاق ہے آصف صاحب..... جس کے بل بوتے پر آپ نے میری مؤکلہ یعنی اپنی زوجہ اول کو بانجھ قرار دے دیا تھا؟“

”وہ چھ ماہ تک میرے ساتھ رہی مگر امید سے نہ ہو سکی۔“ وہ پے در پے حماقت کی منازل طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ ”اس کے بانجھ پن کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے؟“

”ماشاء اللہ..... آپ نے خاصا غصوں ثبوت فراہم کیا ہے۔“ میں نے گھور کر آصف کی طرف دیکھا پھر ”آپ“ سے تم پر آتے ہوئے کہا۔ ”میں اس فارمولے کو آپ کی فیملی پر آزمایا رہا ہوں۔ اب چنتا نہیں.....“ لمحائی توقف کر کے میں نے فاتحانہ نظر سے دیکھ مخالف کو دیکھا پھر آصف کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

”تمہارے والدین کی شادی انیس سو چالیس میں ہوئی۔ تمہارے وضع کردہ تجرباتی فارمولے کی رو سے تمہاری والدہ دو سال تک بانجھ تھیں پھر ایک میگزے کے تحت انیس سو بیالیس میں خیر النساء پیدا ہوئیں تو تمہاری والدہ کا بانجھ پن ختم ہو گیا لیکن بد قسمتی سے ایک بار پھر وہ دو سال کے لیے بانجھ ہو گئیں کیونکہ قمر النساء، خیر النساء کے دو سال بعد انیس سو چالیس میں پیدا ہوئی تھیں۔ بانجھ پن اور زرخیزی کا یہ سلسلہ ہمیں پرکار نہیں بلکہ اب کی بار تمہاری والدہ ماجدہ کو بانجھ پن کا آٹھ سال کا دورہ پڑا پھر انیس سو باون میں تم اس دنیا میں تشریف لائے اور اب تم تیس سال کے ہو چکے ہو۔ تمہاری والدہ صاحبہ تمہارے تجرباتی فارمولے کے مطابق، اپنے دامن پر ہے بانجھ پن کا داغ دھو تے دھو تے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔ میری مؤکلہ بے چاری توکل کی بیٹی ہے۔ تم اور تمہاری علامہ بنیں اس معصوم کا کیا حشر کرنے کا ارادہ رکھتے ہو.....؟“

اس نامعقول انسان کے پاس میرے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ وہ خجالت آمیز انداز میں نگلیں جھانکنے لگا تو وکیل صفائی حق فیس ادا کرتے ہوئے اس کی مدد کو لگا۔

مدعا علیہ نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ماہ اگست بیاسی میں اسٹار جیولرز کو فروخت کر دیا تھا۔

”آپ کے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے اسٹار جیولرز کو وہ زیور بیچ دیا ہے؟“ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی آصف نے چیخ سے مشابہ آواز میں پوچھا۔

”تمہارا مطلب ہے، میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے قدم بہ قدم اپنی منزل کی سمت بڑھتا چلا گیا۔

”ایک دم جھوٹ.....!“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولا۔

”اور وہ کیوں کے لیے جھوٹ بولنا کون سا مشکل کام ہے۔“

”مسٹر آصف! آپ غیر متعلقہ تبصروں سے گریز کریں۔“ جج نے سرزنش کرنے والے انداز میں کہا۔ ”آپ سے جو پوچھا جا رہا ہے، اس کا ٹوڈی پوائنٹ جواب دیں۔“

”اوکے سر!“ وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”آپ کے پاس ایسا کوئی ثبوت موجود نہیں جس کی بنا پر آپ ثابت کر سکیں کہ میں نے وہ زیورات اسٹار جیولرز کو فروخت کیے تھے۔“ آصف نے میری جانب دیکھتے ہوئے فاتحانہ انداز میں کہا۔

میں نے اس کی شررگ کو اپنے الفاظ کا تختہ مٹق بناتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے تو پھر تم ہی کوئی ایسا ثبوت فراہم کر دو کہ وہ زیورات تم نے اسٹار جیولرز کو بیچے تھے۔“

”میں آپ کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے کلیم عثماني صاحب کو بہ طور گواہ عدالت میں پیش کر سکتا ہوں۔“ وہ حقارت بھری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

”یہ کلیم عثماني صاحب کون ذات شریف ہیں؟“ جج نے چونک کر آصف سے استفسار کیا۔

”سر! یہ زیب جیولرز کے مالک ہیں۔“ اس نے بتایا۔

”کلیم عثماني کا زیر ساعت کیس سے کیا تعلق ہے؟“

جج نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”آپ انہیں بہ طور گواہ کیوں پیش کرنا چاہتے ہیں؟“

”کلیم عثماني صاحب کی شہادت سے وکیل استغشا کا یہ دعویٰ جھوٹا ثابت ہو جائے گا کہ میں نے وہ زیورات اسٹار جیولرز کو فروخت کیے ہیں۔“ آصف نے جواب دیا۔

”تو دراصل تم معزز عدالت کو یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم نے میری مؤکلہ اور اپنی زوجہ اول مسات جویریہ کے

زیورات زیب جیولرز کو فروخت کیے تھے؟“ میں نے اسے سوچنے کی مہلت دے بغیر جارحانہ انداز میں پوچھا۔

”اب آئی نابات آپ کی سمجھ میں.....!“ وہ مکروہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”آپ کا جھوٹ میں۔“

بھری عدالت میں کھول دیا ہے۔“

”مجھے جھوٹا ثابت کرنے کا بہت بہت شکر ہے۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑا۔ ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”یور آنر! پوائنٹ از ٹو بی نوئیڈ..... مدعا علیہ نے معزز عدالت کے روبرو بڑے فخر سے اس امر کا اقرار کیا ہے کہ اس نے گزشتہ سال کے ماہ اگست میں میری مؤکلہ کا زیو مالیت تیس ہزار روپے زیب جیولرز کے مالک کلیم عثماني سے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ واضح رہے کہ یہ وہی طلای زیور جس کے بارے میں مدعا علیہ کا دعویٰ ہے کہ میری مؤکلہ اس کے گھر سے جاتے وقت یہ زیور اپنے ساتھ لے گئی تھی۔“

”تم کیا کہتے ہو؟“ جج نے تصدیق طلب نظر سے ”آصف کو گھورا۔“ مذکورہ زیور تم نے فروخت کیا تھا یا مدعی اپنے ساتھ لے گئی تھی.....!“

”وہ سر..... مجھے سے غلطی..... ہوگئی.....“ وہ جج سے استفسار بربری طرح کر بڑا گیا۔ ”مجھے معاف کر دیں سر.....“

جج غصے سے بولا۔ ”کس بات کی غلطی..... زیورات فروخت کرنے کی یا غلط بیانی کرنے کی؟“

وہ خجالت بھرے انداز میں بولا۔ ”دونوں کی سر۔“ جج نے اپنے سامنے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات پر کچھ نوٹ کیا پھر دیوار گیر کلاک پر نگاہ ڈالنے کے بعد مجھ سے مستفسر ہوا۔

”بیک صاحب! آپ کو کچھ اور پوچھنا ہے؟“

عدالت کا مقررہ وقت ختم ہونے میں پندرہ بیس منٹ باقی تھے۔ میری اب تک کی جرح نے آصف کا پتا پانا کر دیا تھا۔ وہ اندر سے خزاں رسیدہ ہے کے مانند کانپ رہا تھا۔ بس، اب مجھے اس کی دروغ گوئی اور ظلم و زیادتی کے ثبوت میں آخری کیل ٹھونکنا تھی۔

”بس، ایک اہم پہلو سے چند سوال جناب عالی!“

میں نے جج کی جانب دیکھتے ہوئے مودبانہ انداز میں کہا پھر آصف کو اپنے سوالات کے نشانے پر رکھ لیا۔

”کیا یہ درست ہے کہ تم نیو چالی کے علاقے میں کسی امپورٹر کے پاس ملازم ہو۔“ میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔ ”وہاں سے تمہیں ایک ہزار روپے تنخواہ ملتی ہے؟“

”ہاں۔ یہ درست ہے۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

”اس کے علاوہ تم چھوٹی موٹی بروکری بھی کرتے

رہتے ہو جس سے ماہانہ کم و بیش تنخواہ کے برابر تمہاری آمدنی ہو جاتی ہے؟“

”جی..... ایسا ہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔
”اس کے علاوہ تمہاری کہیں سے کوئی اور آمدنی ہے؟“

”بالکل نہیں!“ وہ پوری قطعیت کے ساتھ بولا۔
”کیا تمہارا اکاؤنٹ اس بینک میں ہے؟“

سوال کے اختتام پر میں نے اس کے بینک اور برانچ کا نام دہرایا۔

اس نے سرکوشاٹ میں حرکت دینے پر اکتفا کیا۔

”تمہاری باجی قمر النساء بھی تو اسی بینک میں جاب کرتی ہیں؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”جی..... آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا پھر جیسے ہوئے انداز میں اضافہ کیا۔ ”لگتا ہے، آپ

نے ہماری فیملی پر اچھی خاصی ریسرچ کر رکھی ہے!“
”کوئی ایسی ویکی ریسرچ.....“ میں نے آنکھیں

پھیلاتے ہوئے کہا۔ ”یوں سمجھیں کہ یہ کیس پکڑنے کے بعد میں نے تمہاری فیملی پر اپنی اچھی ڈی کر لیا ہے اور میری مؤکلہ

بھی تاحال تمہاری فیملی ہی کا ایک فرد ہے۔“
میں نے ذومعنی انداز میں جملہ ادھر ادھر چھوڑا تو وہ

اضطرابی لہجے میں متستر ہوا۔ ”تو پھر.....؟“
”تو پھر یہ کہ.....“ میں نے انتہائی سادگی سے کہا۔

”میری مؤکلہ نے مجھے بتایا ہے کہ شادی کے چند روز بعد اس نے آپ کو بیس ہزار روپے دیے تھے۔ یہ وہ رقم ہے جو میری

مؤکلہ کے والد مرحوم نے ہمہتری خریداری کی مدد میں دی تھی کیونکہ آپ کی دونوں درجن سینئر سٹیزن سسرز کا بھی مطالبہ

تھا۔ آپ نے بیس ہزار روپے کی یہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں ڈال دی ہے۔ میں نے اپنے ذرائع استعمال کر کے آپ کی

شادی والے مہینے کی بینک اسٹیٹ منٹ حاصل کر لی ہے۔ اگر آپ اس رقم سے انکار کریں گے تو بری طرح پھنس

جائیں گے کیونکہ میں یہ اسٹیٹ منٹ جج صاحب کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ اس لیے..... جو بھی بولو، بہت سوچ

سمجھ کر بولنا.....!“
پھر میں نے مذکورہ بینک اسٹیٹ منٹ اپنی فائل میں

سے نکال کر کچ کی میز پر سجادی۔ آصف نے چند لمحے تذبذب میں رہنے کے بعد بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”میں بھلا جھوٹ کیوں بولوں گا..... ہاں، وہ بیس ہزار روپے میں نے اپنے اکاؤنٹ میں ڈیپازٹ کرائے تھے۔“

”یہ بیس ہزار روپے میری مؤکلہ کے والد صاحب نے فرنیچر وغیرہ کی خریداری کے لیے دیے تھے۔“ میں نے

اپنی جرح کے سلسلے کو سمجھتے ہوئے کہا۔ ”معزز عدالت یہ جانتا

چاہتی ہے کہ تم نے مذکورہ رقم سے کون کون سی چیز خریدی تھی۔ عدالت ان اشیا کی خریداری کی رسیدیں دیکھنے سے

بھی گہری دلچسپی رکھتی ہے.....!“
”یہ بہت پرانی بات ہے۔“ وہ بوکھلاہٹ آمیز انداز میں

بولا۔ ”اتنے عرصے تک کون رسیدیں سنبھال کر رکھتا ہے.....!“
وہ غیر محسوس طور پر میرے پھیلانے ہوئے جال میں

پھنستا چلا جا رہا تھا۔ میں نے عام سے لہجے میں کہا۔
”رسیدوں کو کوئی مارو۔ تم صرف ان چیزوں کے نام ہی

بتا دو۔ تمہارے جواب سے عدالت کی تسلی ہو جائے گی۔“
اس دوران میں غالباً اسے اپنی حماقت کا احساس

ہو گیا تھا۔ وہ اپنی غلطی کو نبھاتے ہوئے جلدی سے بولا۔
”جب میری بہنوں نے جو یہ کہنے کے باپ سے کہہ دیا

تھا کہ ہمارے گھر میں استعمال کی ہر ضروری چیز موجود ہے تو پھر کیا پائل کتنے نے مجھے کاٹھا تھا کہ میں بیس ہزار کا فرنیچر اور

دیگر سامان لاکر گھر میں بھر دیتا.....؟“
”یہ تو اس پائل کتنے سے پوچھنا پڑے گا کہ اس نے

تمہیں کاٹھا تھا یا نہیں، بشرط یہ کہ وہ ابھی تک یہ قید حیات ہو۔“ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تمہاری ٹیٹس بھری

وضاحت سے میں یہی سمجھا ہوں کہ اپنی دو عدد درجن سینئر سٹیزن سسرز کی خوشنودی کی خاطر تم نے بیس ہزار کی اس

رقم سے کسی قسم کی خریداری نہیں کی تھی!“
میں نے اس کہانی میں آصف کی بہنوں قمر النساء اور

خیر النساء کے لیے متحدہ بار ”درجن سینئر سٹیزن سسرز“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ

خواتین اپنی عمر عریزی کی ساتھ سیڑھیاں پھلانگ چکی تھیں یا یہ کہ مجھے ان سے کوئی ذاتی بیز تھا..... قطعاً ایسی کوئی بات نہیں

تھی۔ ان دونوں بہنوں کے جو کچھ میں علم میں آئے تھے، ان کی روشنی اور فیوض و برکات کے طفیل ایک دن

انہوں نے درجن سینئر سٹیزن بن جانا تھا۔ جس طرح ہم عید کی چھٹیاں پڑتے ہی اپنے... کو لیکڑ کوٹھلی عید مبارک کہہ دیتے

ہیں، اسی طور میں نے قمر النساء اینڈ خیر النساء کو ایڈوانس میں ”درجن سینئر سٹیزن سسرز“ کے اعزاز سے نواز کر کسی حد تک

”فیل الموڈی، فیل الاڈی“ کا تقاضا پورا کر دیا تھا۔
آصف نے میرے سوال کے جواب میں کہا۔ ”جی

بالکل ایسا ہی ہے۔“

”کیا ابھی تک وہ بیس ہزار روپے تمہارے اکاؤنٹ میں پڑے ہوئے ہیں؟“
 ”نہیں.....“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔
 ”میں نے پوچھا۔“ پھر تم نے اس رقم کا کیا کیا؟“
 ”میں نے وہ بیس ہزار ایک کاروبار میں انویسٹ کیے تھے۔“ اس نے میری توقع اور معلومات کے مطابق جواب دیا۔ ”اس کاروبار میں نقصان ہو گیا اور..... میری رقم ڈوب گئی۔“

”اوہ..... بہت افسوس ہوا یہ سن کر۔“ میں نے مصنوعی ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ نے اس مالی نقصان کے بارے میں میری مقلد کو بتایا تھا؟“
 ”نہیں..... نہیں!“ اس نے جواب دیا۔
 ”کیوں؟“

”قبل اس کے کہ آصف میرے ”کیوں“ کا جواب دیتا، عدالت کا وقت ختم ہو گیا۔ میں نے جج سے درخواست کی۔“
 ”جناب عالی! چونکہ میری جرح ابھی مکمل نہیں ہوئی اور عدالتی کارروائی بھی اپنے عروج پر ہے اس لیے معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ کوئی نئی تاریخ دے دی جائے۔“
 جج نے میری درخواست کو جائز اور معقول جانے ہوئے دو روز بعد کی تاریخ دے کر عدالت برخاست کرنے کا اعلان کر دیا۔

”دی کورٹ از ایڈ جرنل.....!“
 اگلی پیشی سے پہلے جویریہ مجھ سے ملنے میرے آفس آئی۔ ٹن ٹنابا جی یعنی آفتاب گلشنہ بھی گزشتہ سے پوسٹ کی طرح اس کے ہمراہ تھا۔ جویریہ نے مجھے بتایا کہ آصف نے کسی تھرڈ پارٹی کے ذریعے معاملات کو ختم کرانے کا پیغام بھیجا ہے۔
 ”معاملات کو ختم کرانے یا سیمٹل کرانے کا پیغام؟“
 میں نے پوچھا۔

”کچھ بھی سمجھ لیں۔“ اس نے کہا۔ ”تھرڈ پارٹی نے کہا ہے کہ اگر میں یہ کیس واپس لے لوں تو وہ مجھے بیس سے چالیس ہزار تک دیے کو تیار ہے۔“
 ”پھر آپ نے تھرڈ پارٹی کو کیا جواب دیا ہے؟“
 ”میں نے کہا ہے کہ سوچ کر بتاؤں گی۔“

”یہ آپ نے بڑا مناسب جواب دیا ہے۔“ میں نے سانس لی انداز میں کہا۔ ”آصف بڑی مکاری سے کام لے رہا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اونٹ پہاڑ کے نیچے آچکا ہے۔ اگر فیصلہ عدالت سے ہوتا ہے تو اسے ترانوے ہزار کے علاوہ عدالتی

ہرجہ و مرجہ بھی ادا کرنا پڑے گا اور وہ بیس چالیس ہزار میں جان چھڑانے کی سوچ رہا ہے۔ وہ تھرڈ، فورٹھ یا ففٹھ پارٹی کے ذریعے کوئی بھی پیغام بھجوئے، آپ نے اس کی باتوں میں نہیں آنا۔ یہ کیس وہ مکمل طور پر ہمارا چکا ہے۔ آئندہ پیشی پر ہمارے حق میں فیصلہ ہو جائے گا۔“
 ”ان شاء اللہ.....!“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔
 میں نے تسلی بخشی دے کر اسے رخصت کر دیا۔

☆☆☆

منظر اسی عدالت کا تھا اور طرہوں والے کنکریٹ میں آصف کھڑا تھا۔ آج وہ خاصا نروس دکھائی دے رہا تھا۔ پچھلی پیشی پر میں نے اپنے سوالات کے کاسٹک سوڈے سے اس کے مزاج کی خوب دھلائی کی تھی۔ استری کرنا باقی رہ گیا تھا۔ میں جرح کی پٹی ہوئی استری لے کر اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کی پریگ شروع کر دی۔

”تم نے میری مقلد کو اپنے کاروباری نقصان کے بارے میں کیوں نہیں بتایا تھا؟“ میں نے جارحانہ انداز میں پوچھا۔
 ”میں نے جویریہ سے یہ بات اس خیال سے چھپائی تھی کہ اسے دکھ ہوگا۔“ وہ ٹھوکر نکل کر بولا۔
 ”ویری گڈ..... گویا تمہیں انسانی جذبات کا اتنا زیادہ خیال ہے۔“ میں نے چوٹ کرنے والے انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”یہ سرمایہ کاری تم نے کس مہینے میں کی تھی؟“
 ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ ”جولائی میں۔“
 ”جولائی! کیا سی میں؟“ میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔ ”یعنی تمہاری شادی کے ایک ماہ بعد؟“
 ”جی.....“ اس نے سرکوا ثباتی جنبش دی۔

”یہ وہی بیس ہزار روپے تھے نا جو میری مقلد نے شادی کے چند روز بعد تمہیں دیے تھے اور تم نے اپنے اکاؤنٹ میں ڈیپازٹ کر دیے تھے؟“
 ”جی..... بالکل وہی تھے۔“

میں نے اپنی فائل کے اندر سے چند کاغذات نکال کر جج کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”جناب عالی! میں نے پہلے مدعا علیہ کی جون اکیاسی کی بینک اسٹیٹ منٹ آپ کی خدمت میں پیش کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ مدعا علیہ نے بیس ہزار روپے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرائے تھے۔ اب میں جولائی اکیاسی یا اپریل بیاسی تک کے بینک اسٹیٹ منٹ آپ کی نذر کر رہا ہوں جو اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ مذکورہ بیس ہزار روپے جون اکیاسی سے اپریل

”میں اس شخص کا نام بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔
 ”یہ کیا بے ہودگی ہے۔“ سچ نے رہی سے کہا۔ ”کیا ضروری ہے اور کیا غیر ضروری، یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔ تم اس شخص کا نام بتاؤ۔“
 ”سر..... اس وقت..... مجھے وہ نام..... یاد نہیں آ رہا۔“ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”دکیل صاحب تو..... خواجہ بال کی کھال نکال..... رہے ہیں۔“

”تم مجھے جاننے نہیں ہو۔ ضرورت پڑنے پر تو میں خواجہ کھال کے بال بھی نکال سکتا ہوں۔“ میں نے سفاکی سے کہا پھر روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے دلائل کا سلسلہ شروع کر دیا۔

”جناب عالی! مدعا علیہ دروغ گو درجہ اول ہے۔ اس کے متعدد جھوٹ معزز عدالت کے ریکارڈ پر آچکے ہیں لہذا کسی بھی صورت اس کی کسی بھی بات کو لائق اعتبار نہیں سمجھا جاسکتا کیونکہ دروغ گو ہونے کے ساتھ ہی یہ دھوکے باز بھی ہے۔“ لکھائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر دکیل صفائی اور مدعا علیہ پر ایک اچھٹی سی نگاہ ڈال کر دوبارہ جج کی طرف متوجہ ہو گیا اور اپنے دلائل کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”پورا آزمائشیں بیوی کا رشتہ بہت نازک ہوتا ہے۔ اس میں دھوکا نہیں کرنا چاہیے۔ دھوکا ازدواجی زندگی کی خوشگواہی کے لیے زہر ہلا مل کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے دھوکے اور جھوٹ کو قابلِ مذمت سمجھا جاتا ہے..... اور مدعا علیہ نے قدم قدم پر اپنی بیوی کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میری مؤکلہ کو اس بات کا دکھ نہیں کہ شوہر اس کا تیس ہزار کا زور پوچ کر کھا گیا یا وہ اس کے دیے ہوئے نقد میں ہزار گھول کر لی گیا..... میری مؤکلہ کو اصل غم اس بات کا ہے کہ اس کے شوہر نے اسے گھر سے نکال کر ایک مالدار بوزمعی عورت سے شادی کر لی جس کا نام روہی ہے اور جو ایک سانولی، موٹے نقوش کی مالک بیٹھائیں سالہ خاتون ہے۔ پست قامت اور وزن صرف سو کلو گرام۔ یہ شادی حال ہی میں ماہ جنوری میں انجام پائی ہے۔ روہی صاحبہ کے ساتھ ایک ہی خوبی بڑی ہوئی ہے کہ وہ ایک کروڑ پتی صنعت کار کی اکلوتی بیٹی اور اکلوتی وارث ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ مدعا علیہ نے اپنی پہلی شادی کو چھپا کر خود کو کنوارا ظاہر کر کے روہی سے شادی کی ہے جبکہ.....“

میں نے چند لمحات کے لیے توقف کیا پھر مسلم عائلی قوانین کی کتاب کھولتے ہوئے کہا۔ ”جناب عالی! عائلی

بیاسی تک مدعا علیہ کے اکاؤنٹ میں موجود ہے تھے مگر اپریل کی فلاح تاریخ کو یہ رقم بہ ذریعہ چیک نمبر..... نکلوائی گئی جبکہ مدعا علیہ کا یہ دعویٰ ہے کہ اس نے مذکورہ رقم جولائی کی ایسی میں ڈرا کر کے کسی کاروبار میں لگائی تھی اور وہ کاروبار بیٹھ گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مدعا علیہ کے بیس ہزار بھی ڈوب گئے تھے۔ گو یا مدعا علیہ نے ایک بار پھر معزز عدالت کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش کی ہے۔“ پھر میں نے روئے سخن آصف کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”تم نے یہ جھوٹ کیوں بولا؟“
 ”ہو سکتا ہے..... یہ بینک اسٹیٹ منٹ ہی..... غلط ہوں۔“ اس نے فرار کی راہ تلاش کرتے ہوئے کہا۔

”ایک منٹ کے لیے میں مان لیتا ہوں کہ یہ بینک اسٹیٹ منٹ غلط ہیں اور تم درست ہو اگرچہ یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ ان اسٹیٹ منٹ کے کورنگ بیج پر ڈسے دار بینک آفیسر کے دستخط بھی موجود ہیں۔ خیر..... تم ہی سچے، باقی ساری دنیا جھوٹی۔“ میں نے لمحہ بھر کے لیے رگ کر حاضرین عدالت کی طرف دیکھا پھر دوبارہ آصف کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

”اب تم معزز عدالت کو یہ بتاؤ کہ اپریل بیاسی مورخہ..... کو تم نے نیوکراچی میں جو پلاٹ خریدا تھا، اس کی ڈاؤن میسٹ مبلغ میں ہزار روپے تم نے کہاں سے کی تھی؟ اس میسٹ کی رسید پر جو تاریخ درج ہے، وہ چیک ڈرا کرنے کے دو دن بعد کی ہے۔ اگر بینک اسٹیٹ منٹ غلط ہیں تو پھر تمہیں یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ یہ بیس ہزار روپے تمہارے پاس کہاں سے آئے تھے۔ اب یہ نہیں کہہ دینا کہ تم نے نیوکراچی میں کوئی پلاٹ نہیں خریدا۔“ میں نے اپنی فائل کو تھپتھپاتے ہوئے اضافہ کیا۔ اس ثبوت کے حوالے سے میں نے کوئی غلط بیانی نہیں کی تھی۔ آفتاب گفتی کی ”مخت“ کاغذی صورت میں واقعتاً میری فائل میں موجود تھی۔ اگر آصف کوئی تین پانچ کر تا تو میں مذکورہ کاغذات جج کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ ”اس خریداری کا ثبوت ثبوت ہے میرے پاس.....“

”انسان کسی سے غرض ادھار بھی تو لے سکتا ہے۔“ اس نے خود کو بچانے کی آخری کوشش کی۔

”ہاں..... انسان ایسا کر سکتا ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس صورت میں انسان کو اس شخص کا نام اچھی طرح یاد ہوتا ہے جس سے اس نے ادھار اٹھایا ہو۔ تم معزز عدالت کو یہ بتانے کے پابند ہو کہ وہ بیس ہزار روپے تم نے کس سے غرض لیے تھے؟“

توانین کی دفعہ مذکور میں لکھا ہے کہ کوئی بھی شخص کسی پہلے سے کی ہوئی شادی کی موجودی میں اسوائے ثالثی کونسل کی پیشگی تحریری اجازت کے، دوسری شادی نہیں کرے گا۔ دوسری شادی کے لیے پہلی بیوی یا پہلی بیویوں کی رضامندی ضروری ہے۔۔۔۔۔ پھر میں نے جج کی توجہ اس دفعہ کی جانب مبذول کرائی جس میں مذکورہ عالمی قانون کی خلاف ورزی کرنے والے مرد کے لیے سزا کا ذکر تھا۔

”جناب عالی! عالمی قوانین کی کتاب میں واضح طور پر لکھا ہے کہ جو بھی شخص ثالثی کونسل کی تحریری اجازت کے بغیر دوسری شادی کرے گا، وہ نمبر ایک۔۔۔۔۔ حتیٰ مہر کی رقم فوری طور پر پہلی بیوی یا پہلی بیویوں کو ادا کرے گا۔ چاہے حق مہر موصول ہو یا منجمل۔ اگر یہ رقم شوہر خود ادا نہیں کرے گا تو اس صورت میں یہ رقم قانوناً یہ طور مال گزاری وصول کی جائے گی۔ نمبر دو۔۔۔۔۔ پہلی بیوی یا پہلی بیویوں کی شکایت پر، سزا یا بی کی صورت میں ملزم شوہر کو قید محض ہو سکتی ہے جس کی مدت ایک سال تک ہو سکتی ہے یا جرمانہ ہوگا جو پانچ ہزار تک ہو سکتا ہے یا ملزم یہ ایک وقت دونوں سزاؤں کا مستوجب بھی ہو سکتا ہے۔“ میں نے ایک مہرجہ پھر رک کر وکیل صفائی اور مدعا علیہ پر تنقیدی نظر ڈالی۔

دونوں کو سانپ سوگتہ گیا تھا۔ گویا ان کے تہرے ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ میں نے دوبارہ روئے سخن جج کی جانب موڑتے ہوئے کہا۔

”جناب عالی! معزز عدالت سے میری استدعا ہے کہ میری موکلہ کو حق مہر کے پچیس ہزار، نقدی ہوئی رقم بیس ہزار، زیورات کی فروخت سے حاصل ہونے والے تیس ہزار اور کم از کم ایک سال کا نان و نفقہ اٹھارہ ہزار، بہ حساب پندرہ سو روپے ماہوار۔۔۔۔۔ کل ملا کر تانوے ہزار روپے فی الفور دلوائے جائیں تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہو سکیں۔۔۔۔۔ دیش آل پور آرن۔“

جج نے عینی نظر سے آصف کو دیکھا اور حکم دیا۔ ”تم عرصہ سات یوم کے اندر اپنی منکوحہ اول کے تمام واجبات مبلغ تانوے ہزار روپے ادا کر دو ورنہ تمہارے خلاف سخت نوعیت کی قانونی چارہ جوئی کی جائے گی اور تم عدالت کے کمرے سے سیدھے جیل جاؤ گے۔“

اس کے بعد جج نے ایک ہفتے کی تاریخ دے دی۔

☆☆☆

اگلے روز جویریہ میرے آفس میں بیٹھی تھی۔ اس روز حسن اتفاق سے آفتاب کھنڈہ اس کے ہمراہ نہیں آیا تھا۔

جویریہ کو میں نے پہلی مرتبہ اتنا خوش دیکھا تھا۔ میں نے اس کی مسرت کو دو آئینہ کرتے ہوئے کہا۔

”آئندہ پیشی پر تمام واجبات تو آپ کو مل جائیں گے۔ اس کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے؟“

”میں سمجھی نہیں۔۔۔۔۔“ وہ پلکیں جپک کر بولی۔

”مطلب یہ کہ واجبات کی وصولی کے بعد آپ کو آصف کی منکوحہ حیثیت سے زندگی گزارنا ہے یا۔۔۔۔۔؟“ میں نے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ”بیگ صاحب! اگر مجھے اس شخص کے ساتھ زندگی گزارنا ہوتی تو پھر یہ سارا کھٹ راگ پھیلانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ جانتے ہیں، مجھے دولت کا لالچ نہیں ہے۔ جب تک آصف کا کردہ چہرہ مجھ پر آشکار نہیں ہوا تھا، میں ہر ظلم زیادتی سینے کے باوجود بھی واہس اپنی سسرال جانے کی بات کر رہی تھی مگر اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آصف نے مجھے مسترد کر کے اس مولیٰ بھیجیں سے شادی کی ہے تو اس کے ساتھ ہی خوش رہے۔ آپ اگلی پیشی پر خلع کا کیس دائر کر دیں۔“

”آپ ٹھیک کہتی ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ ”اس مسئلہ کا واحد حل یہی ہے۔“

اسی لمحے میری سیکرٹری نے انٹرکام پر بتایا۔ ”سرا! کوئی روہی صاحبہ آپ سے ملنے آئی ہیں۔“

”ٹھیک ہے، انہیں اندر بھیج دیں۔“ میں نے سرسری انداز میں کہا پھر جویریہ کی جانب دیکھتے ہوئے اضافہ کیا۔

”آپ کی سوتن روہی تشریف لائی ہیں۔“

”وہ یہاں کیا لینے آئی ہے؟“ وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولی۔

روہی کی آمد پر مجھے بھی قدیمے حیرت ہوئی تھی لیکن میں نے اپنے اندر وہی جذبات کو چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ جویریہ کے سوال کے جواب میں، میں نے کہا۔

”یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کیا لینے آئی ہے۔ اسے اندر آنے دیں، اسی سے پوچھتے ہیں۔“

”میں جاتی ہوں۔“ جویریہ ہانپا پرس سنبھالتے ہوئے بولی۔

”بیٹھی رہیں!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

”آج تک آپ نے روہی کو اور روہی نے آپ کو نہیں دیکھا لہذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں آپ کے سامنے

ہی اس سے بات کروں گا۔“

اگلے ہی لمحے روہی میرے جیمبر میں داخل ہوئی پھر وہ جویریہ کو ہاں ہٹھے دیکھ کر شگ گئی اور معذرت خواہانہ انداز

والے رشتے کی عمارت بھی ایک جھوٹ پر ہی رکھی ہے۔ جو شخص ازدواجی زندگی کا آغاز ہی دروغ گوئی سے کرے، آنے والے مستقبل میں اس سے بھلائی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی لہذا میں نے اور ڈیڈی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ آصف جیسے کم ظرف اور لالچی شخص سے فوراً چھٹکارا حاصل کر لیا جائے۔ میں ڈیڈی کی رضامندی ہی سے خلع کا کیس فائل کرانے آپ کے پاس آئی ہوں لیکن آپ فکر نہ کریں، میں آپ کی مولا کا نقصان نہیں ہونے دوں گی۔“

”کیسا نقصان؟“ میں نے سوالیہ نظر سے روٹی کی طرف دیکھا۔ ”میں تو پہلے ہی جویریہ کی طرف سے خلع کا کیس دائر کرنے کا بندوبست کر چکا ہوں۔ وہ بھی آصف کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہے۔“

”یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔“ وہ اپنے بیٹل قیمت بیور لیڈر بیگ کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”اس کینے کی یہی سزا ہے کہ دردر کی ٹھوکریں کھاتا رہے اور کوئی اسے منہ نہ لگائے۔“ لالچی توقف کر کے اس نے سانس ہموار کی پھر اپنے بیگ کو کھول کر اس کے اندر سے ایک چیک بک برآمد کرتے ہوئے بولی۔ ”میرا اشارہ آپ کی مولا کے مالی نقصان کی جانب تھا۔ آصف جیسا پھر شخص آپ کی مولا کے واجبات ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتا لہذا آپ اسے کچھ عرصے کے لیے جیل کی ہوا کھانے دیں۔ اس کی بیہوشی کو اگر ضرورت ہوگی تو اس کی رہائی کے لیے چارہ جوئی کرتی رہیں گی۔“ پھر وہ ایک کیش کا چیک میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”یہ چیک آپ اپنی مولا کو دے دیجئے گا۔ میں نے قانونی ہرجے خرچہ بھی شامل کر کے پورے ایک لاکھ کا چیک بنا دیا ہے تاکہ اس نیک دل خاتون کا کوئی نقصان نہ ہو۔“

میں ہکا بکا اپنے سامنے بیٹھی بیوی ڈیڈی کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ کہا جاتا ہے، دنیا سے ابھی انسانیت ختم نہیں ہوئی۔ جی ہاں، یہ انسانیت روٹی جیسے مالی طرف انسانوں ہی کے دم قدم سے قائم و دائم ہے۔ مجھے ندامت کا احساس بھی ہوا کہ میں نے دوران جرح میں اس عظیم عورت کے لیے نازیبا الفاظ کا استعمال کیا تھا۔ میں نے روٹی کے ہاتھ سے چیک لینے کے بجائے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ یہ چیک بد دست خود میری مولا کو دیں گی تو مجھے بد خوشی ہوگی۔“

”میں آپ کی مولا کو کہاں ڈھونڈتی پھروں گی وکیل صاحب۔“ وہ گہری تنجیدگی سے بولی۔ ”آپ ہی رکھ لیں۔“

”ڈھونڈنے والے کو تو خدا بھی مل جاتا ہے۔“ میں نے

میں بولی۔ ”وکیل صاحب! آپ بڑی ہیں۔ شاید میں غلط وقت پر آگئی ہوں۔“

”اب آہی گئی ہیں تو تعریف رکھیں۔“ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ ”یہ میری ایک کولیک ہیں۔ ان کی موجودگی میں بات ہو سکتی ہے۔ آپ فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ پھر میں نے جویریہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اضافہ کیا۔ ”یہ میری عزیزہ بھی ہیں اس لیے آپ اطمینان رکھیں۔“

وہ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”وکیل صاحب! آپ نے عدالتی کارروائی کے دوران میں میرا تعارف کراتے ہوئے جج کے سامنے میری شخصیت اور خال و خد کا جو شاندار نقشہ کھینچا تھا، اس کے بعد تو مجھے ہرگز آپ کے آفس کا رخ نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن میں بہت حقیقت پسند ہوں۔ آپ نے میری عزت افزائی کرتے ہوئے کسی دروغ گوئی یا مبالغہ آرائی سے کام نہیں لیا تھا اس لیے میں آپ سے ذرا بھی خفا نہیں ہوں چنانچہ اپنے کام کے لیے میں سدھی آپ ہی کے پاس آئی ہوں۔ آپ ایک قابل اور سچے وکیل ہیں۔“

اس دوران میں روٹی نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر جویریہ کی طرف نہیں دیکھا تھا جس سے یہ بات پایہ تکمیل کو پہنچ گئی کہ روٹی، جویریہ کی صورت آشنا نہیں تھی۔ میں نے روٹی کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ میں تو آپ کے شوہر کے کیس میں وکیل استغاثہ ہوں یعنی..... آپ لوگوں کا مخالف وکیل!“

”آپ جس لالچی شخص کی وجہ سے اس کیس میں وکیل مخالف ہیں، میں نے اس بد ذات کو اپنے گھر سے نکال دیا ہے۔“ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ بولی۔ ”اب آپ اسے میری زندگی سے دفع کرنے کے لیے کوئی خطرناک دفعہ لگا کر میری جانب سے خلع کا کیس دائر کر دیں۔ میں اسی مقدمے سے آپ کے پاس آئی ہوں۔“

میں نے اور جویریہ نے یک بہ یک بے یقینی سے روٹی کی طرف دیکھا۔ میں نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ”اس ہنگامی انقلابی کارروائی کا سبب پوچھ سکتا ہوں؟“

”ڈیڈی کو جب صورت حال کا علم ہوا تو ان کی طبیعت خراب ہوگئی۔“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بتانے لگی۔

”میں اس عمر میں ڈیڈی کو دھکی نہیں دیکھ سکتی۔ آصف نے اپنی پہلی بیوی کو سنگین دھوکا دیا ہے اور مجھ سے استوار ہونے

معنی خیر انداز میں کہا۔ ”آپ ذرا نظر گھما کر تو دیکھیں.....“
 روہی نے بے ساختہ گردن گھما کر دیکھا تو جویریہ سے
 آنکھیں چار ہو گئیں۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
 ”نئی از جویریہ.....!“
 روہی ابھمن زدہ نظر سے کبھی مجھے اور کبھی جویریہ کو
 تنکے لگی پھر مجھ سے متفسر ہوئی۔ ”مگر آپ نے تو کہا تھا کہ
 یہ آپ کی کوئی کو لگ ہیں آپ نے ان کے لیے
 ”عزیزہ“ کا لفظ بھی استعمال کیا تھا۔“

”میں اپنے ہر کلائٹ کو بہت عزیز رکھتا ہوں۔“ میں نے
 روہی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”آج سے آپ بھی
 میری عزیزہ ہی ہیں کیونکہ میں نے آپ کا کس لیے کا فیصلہ کر لیا
 ہے اور وہ بھی..... ایک لاکھ کے ایڈوانس فیس چیک کے
 ساتھ۔“ آخری جملہ میں نے مذاق کے انداز میں ادا کیا تھا۔
 ”یہ چیک میری چھوٹی بہن جویریہ کے لیے ہے۔“
 روہی نے کہا۔ ”آپ کی فیس میں الگ سے دوں گی۔“
 اپنے لیے روہی کی زبان سے ”چھوٹی بہن“ کے
 الفاظ سن کر جویریہ نے آب دیدہ ہو گئی۔ روہی نے اٹھ کر
 جویریہ کو گلے سے لگا لیا۔ ان کے ملن کا یہ منظر بڑا جذباتی اور
 روح پرور تھا۔ میں دھڑکی سے انہیں دیکھتا چلا گیا۔

شرعاً دوستی بہت کم وقت کی ایک مرد کے نکاح
 میں نہیں رہ سکتیں۔ جویریہ اور روہی سبکی بہنیں نہیں تھیں لیکن
 زبان سے قائم ہونے والے اس رشتے نے انہیں سبکی بہنوں
 سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب کر دیا تھا۔ وہ کسی بھی
 صورت آصف کی منکوحہ رہنے کو تیار نہیں تھیں۔ لہذا میں نے
 ایک ماہ کے اندر ان دونوں کو عدالتی کارروائی کے نتیجے میں
 ایک لاپٹی اور دھوکے باز شخص کے بندھن سے آزاد کرادیا۔
 یہ ظاہر یہ کیس بہنیں پر ختم ہو جاتا ہے لیکن لگ بھگ
 چار ماہ کے بعد پتا چلا کہ اس کیس کا ڈراپ سین ابھی باقی
 تھا۔ ایک روز میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ادویہ عمر کا
 ایک شخص مجھ سے ملنے آیا۔ میں نے حسب عادت پیشہ ورانہ
 متکراہت کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور کہا۔

”جی فرمائیں! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“
 ”سائیں! آپ نے ہماری جتنی خدمت کردی، ہم اس کا
 احسان زندگی بھر نہیں چکا سکتے۔ ہم آپ کو مزید کوئی زحمت نہیں
 دے سکتے۔ بس، آپ ہماری ایک خواہش پوری کر دیں۔“
 اس شخص کے جواب نے مجھے گہری سوچ میں مبتلا کر دیا
 اور باوجود کوشش کے بھی مجھے یاد نہ آ سکا کہ میں نے اسے کہاں
 دیکھا ہے۔ بالآخر میں نے ابھمن زدہ لہجے میں کہا۔

”میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔ بتائیں، میں آپ کی
 کون سی خواہش پوری کروں؟“
 ”آئندہ مجھے کو میری شادی ہے۔“ وہ معنی خیر انداز
 میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ”سائیں! آپ کو ہماری خوشی کی
 خاطر اس شادی میں شرکت کرنا ہوگی۔ آپ نے پہچانا اس
 لیے نہیں کہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔ میرا نام مظہر جوکیو
 ہے میں گورنمنٹ ملازم ہوں۔“

”مظہر جوکیو.....!“ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنی
 یادداشت پر زور دینے کی کوشش کی مگر میں مظہر جوکیو کو اپنے
 حافظے میں کہیں تلاش نہ کر پایا۔

وہ ایک شادی کارڈ میری جانب بڑھاتے ہوئے
 بولا۔ ”سائیں! اس کارڈ میں آپ دہن کے نام پر غور کریں
 تو سب یاد آ جائے گا۔“

میں نے کارڈ کھول کر دیکھا تو چونک اٹھا۔ میرے
 سامنے بیٹھے ہوئے مظہر جوکیو کی شادی جویریہ سے ہو رہی
 تھی۔ میں نے نظراٹھا کر مظہر جوکیو کی طرف دیکھا اور حیرت
 بھرے لہجے میں کہا۔

”اچھا..... تو یہ بات ہے!“
 مظہر جوکیو کی زبانی مجھے جو تفصیل معلوم ہوئی اس
 کے مطابق، یہ بندہ جویریہ کے سامنے والے گھر میں رہتا
 تھا اور آفتاب شگفتہ اسی کا کرارے دار تھا۔ آفتاب اسی کے
 ایما پر جویریہ والے کیس میں سرگرمی دکھا رہا تھا۔ مظہر
 جوکیو کو جویریہ کے حالات کا علم تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ
 اس کے بہنوئی ٹھیکل احمد کا کیا ارادہ ہے۔ مظہر جوکیو نے
 جویریہ کو اس دلدل سے نکال کر اپنانے کا فیصلہ کیا اور
 آفتاب کے ذریعے کوشش شروع کر دی۔ جویریہ،
 آفتاب پر بھروسہ کرتی تھی اور جب اسے آصف کی شادی
 کا پتا چلا تو اس نے اپنے حالات کی روشنی میں مظہر جوکیو
 کے حق میں فیصلہ سنایا۔ جویریہ نے دانستہ مجھ سے یہ
 بات چھپائی تھی اور مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں تھا۔ یہ اس
 کا انتہائی ذاتی معاملہ تھا۔

”سائیں! میں آپ کی شادی میں شرکت کرنے کی
 پوری کوشش کروں گا۔“ اس کی کٹھن توجہ سے سننے کے بعد
 میں نے کہا۔ ”اللہ آپ کی اس نیکی کو قبول فرمائے.....!“
 وہ میرا شکر یہ ادا کر کے رخصت ہو گیا۔

اور میں کافی دیر تک جویریہ کے اصلی اور سچے
 امیدوار کے بارے میں سوچتا رہا۔

(تحریر: حسام بٹ)

ڈپٹری کی عمارتوں کے ساتھ ساتھ چند دکانیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ بریفنگ دینے والے صاحب نے معزز مہمانوں کو بتایا کہ ایک دکان ناٹی کے لیے مختص کی گئی ہے۔ وزیر اعظم نے فوراً ٹوک دیا اور فرمایا۔ ”ناٹی نہیں ’مجام‘ کہو۔“

سیلاب سے بری طرح متاثر ہوئے گاؤں کے سارے ہی مٹی کے گھر دندے بہہ گئے تھے۔ وزیر اعلیٰ کی اپیل پر ملک کی ایک غیر شخصیت نے متاثرین کے لیے نیا ڈال وینج تعمیر کروایا۔ پختہ مکانات کے علاوہ پرائمری اسکول اور

یہ ایک ایسے بازار کی منظر کشی تھی جہاں دن ویرانوں کی زد میں تھے اور راتیں ہنگاموں کی قید میں گزرا کرتی تھیں مگر یہ فلسفہ اسے بہت دیر بعد سمجھ آیا کہ اس بازارِ حسن میں حسن کے سونے اپنے اوقاتِ مقررہ پر طے ہوا کرتے تھے اور... ابھی اس کا وقت نہیں آیا تھا، اس کے باوجود جب اس نے ایک لمبی چھلانگ لگائی تو اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ در آئی لیکن چلن کی خیر ہو گئی۔ کیونکہ کسی کی دعا اور نگران آنکھوں نے اسے ہستی میں گرنے سے بچالیا تھا۔

بازارِ حسن

محمد الیاس

کم عمری کی سنسنی خیز محبتوں کے شکار دوستوں کا احوال



میرے بچپن کے دوست حاجی منزل احمد کی پسندیدہ سیاسی جماعت چونکہ برسرِ اقتدار تھی، ہم دونوں دوست اکٹھے بیٹھے بی وی پر کارروائی دیکھ رہے تھے۔ میں نے دوست کو پھینٹتے ہوئے کہا۔ ”یار حاجی! تمہارے محبوب لیڈر نے آج ذات پات کی لعنت کا خاتمہ کر دیا ہے۔ ایسا فارمولا وضع کیا ہے کہ پیشے کے حوالے سے اب ہمارا کوئی ہم وطن ہے تو قیصر نہیں ہوگا۔ نائی کو صرف حجام بول دینے سے اس کی قدر و منزلت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا ہے۔“

حاجی حسبِ معمول مجھ سے اچھے بڑا اور بولا۔ ”تم میری پارٹی کی مخالفت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ میرا قائد کتنی ہی اچھی بات کیوں نہ کرے، تم نے ہر صورت میں تنقید کرنی ہوتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”خدا کے بندے! خاکروب کو سو لپہ کہہ لینے سے ذہن نہیں بدلتے۔ معاشرے کی سوچ بدلنا اور ذہنی تربیت کرنا ضروری ہے۔ نئی نسل کو شروع سے ہی نصاب میں پڑھایا جائے کہ ہر پیشہ قابلِ تکریم ہے۔ اگر نائی نہ ہوتا تو تیرے قائد سمیت ہم سب مرد جنگلی بھوت بنے ہوتے۔ ہمارے چہروں پر صرف آنکھیں دکھائی دیتیں۔ بولتے ہوئے جھاڑی کا ہر حصہ حرکت کرتا ہوا دکھائی دیتا۔ کھانے کے وقت تیرا لیڈر، تم اور میں ایک ہاتھ سے جھاڑی مٹاتے اور دوسرے ہاتھ سے منہ میں نوالہ ٹھونسنے۔ یعنی نائی نے ہمیں کم از کم ظاہرِ آئندہ بنا ڈالا ہے۔ خواہ اندر سے ویسے ہی کیوں نہ ہوں، جیسے موجودہ دور کے بیشتر سیاسی قائدین ہیں۔“

میرے دوست کا پارہ چڑھنے لگا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ”اسی طرح اگر خاکروب نہ ہوتے تو ذرا تصور کرو کہ ہر طرف بد صورتی پھیلی ہوتی۔ گویا یہ بیٹھے زندگی کو خوبصورتی عطا کرتے ہیں۔ لہذا ان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں عزت دینی چاہیے۔“

”اب تم سوشلزم کا پرچار شروع کر دو۔“ حاجی نے ٹوک دیا لیکن میں بولتا گیا۔

”یاد کرو، وہ طالب... علی کا زمانہ۔ ہمارے استاد عاصی صاحب، جو ہر روز رگڑ کر گلیں شیو کرتے اور بڑی نفاست سے پینٹ شرٹ پہنتے تھے۔ ہم سڑک سے پار چلنے کے دوسری طرف کھلے میدان میں کھیلے جایا کرتے تھے۔ ہماری زبان سے ”چکلا“ کا لفظ سن کر عاصی صاحب نے پیار سے سمجھایا تھا۔ نہ بچو! چکلا برا لفظ ہے۔ ایسا نہیں بولتے۔ اول تو تم لوگوں کو ادھر جانا ہی نہیں چاہیے۔ لیکن کھیل کود کے لیے کھلی جگہ اسی طرف ہے۔ اس آبادی کا ذکر کرنا ضروری ہو

جائے تو ”بازارِ حسن“ کہہ لیا کرو اور تمام لڑکے اس کے اندر سے گزرنے کے بجائے اوپر سے چکر کاٹ کر جایا کریں۔“

میں نے حیران ہو کر عاصی صاحب سے کہا تھا۔ ”ماسٹر صاحب! وہاں نہ تو ڈھنگ کا بازار ہے اور نہ حسن۔ پہلے پہل مجھے چکلا کہتے ہوئے ابجھن ہوتی تھی۔ کیونکہ چکلا تین سے گھروں میں روٹی پکائی جاتی ہے اور اب بازارِ حسن! انہوں نے مجھے ہلکی سی چت لگا کر کہا تھا۔

”گلدھانہ ہوتو۔۔۔۔۔“

بچپن میں ہم ہر وہ کھیل کھیلتے جس پر پیسے خرچ ہونے کا امکان نہ ہوتا۔ پتھر کرم ہمارا پسندیدہ کھیل ہوا کرتا تھا۔ اس کے لیے ٹھیکریاں، ہم خود کس کس گول کیا کرتے اور گیند کسی لاڈلے لڑکے کی ماں بنا دیا کرتی۔ کپڑے کی کتروں کو خوب بھیجنے کر کسی موٹے مضبوط گف کپڑے کی تھیلی میں، یوں کس کے سی دیا جاتا کہ اس کا سائز اور شکل کرکٹ کی بال کی طرح ہو جاتی۔ اس گھریلو ساختہ گیند کا دیسی نام کھیو تھا۔ اس کی جاذبیت دیر پا نہ ہوتی۔ صدا احتیاط کے باوجود کھیو بازارِ حسن کی گندی نالی میں جا کر گرنی مخالف ٹیم کا کھلاڑی اسے نالی سے نکالتا اور ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پتھر کرم کرنے والے کو پوری توانائی اور ممکنہ مہارت سے نشانہ بنا ڈالتا۔ کھیو کی ضرب پڑنے پر پتھک کی آواز کے ساتھ گندے پانی کے چھینٹے بھی اڑتے مگر اس وقت چونکہ ہارجیت کا معرکہ پڑا ہوا لہذا کسی کو پروانہ ہوتی کر لیا ہی نہیں، بدن بھی ناپاک ہو گیا ہے۔ ستم بالائے ستم کہ کھیو کی چوٹ بھی بڑے زور کی لگتی۔

میرے والد صاحب محلے میں ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کے پیش امام تھے۔ ڈیڑھ اینٹ کی اس اعتبار سے کہ پگڈنڈی نما تنگ گلی کے اختتام پر لگا کسی آب کے قدرتی نالے کے کنارے پر بنی ہوئی تھی۔ نالا اب قدرتی کے بجائے سیوریج کے نظام کا اسی طرح حصہ بن چکا تھا، جس طرح کی پاک سرزمین پر حکومش قائم ہو رہی تھیں۔ چھوٹی سی مسجد جذبہ ایمانی کی حرارت کے زیر اثر سرکاری زمین پر بنائی گئی تھی۔ اس میں اباجی حضور کا عملی کروار کم تھا۔ چونکہ مسجد، ملحقہ گلیوں کے رہائشی.... بزرگوں کی مخلصانہ کاوشوں کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔ ہماری ماہانہ آمدنی بھی مسجد کی کچھ داماں کے حساب سے ہی تنگ تھی۔

منزل کے والد صاحب، غلہ منڈی اور تانگا اسٹینڈ کے درمیانی تجارتی علاقے کے ایک احاطے میں گھوڑوں کو غسل لگایا کرتے تھے۔ ہم دونوں ہی دوستوں کے والد سخت مزاج تھے۔ میرے اباجی صرف اس وجہ سے سرزنش کیا کرتے کہ میں کھیل کود میں مصروف رہ کر کوئی نہ کوئی نماز قضا کر دیتا تھا۔

مزل کا معاملہ دوسرا تھا۔ اس کے ابا جی کا حلقہ احباب چونکہ کوچوانوں پر مشتمل تھا اور کام کی نوعیت ایسی تھی کہ دن بھر میں زیادہ وقت بھٹی دیتی رہتی، جس میں لوہا تپانا اور مارنا کوفہ، معمول کی زندگی کا لازمی جزو تھا۔ جس روز چاچا اجمل کی لڑائی کسی سے نہ ہوتی، وہ بیٹے کی پٹائی کر کے اپنا گونا پور کر لیتا۔

قوی کھیل ہاکی اور کرکٹ کی مقبولیت بھی کم تھی۔ جن دنوں ان کھیلوں میں سے کسی کا بھی تین الاوقائی سطح پر میچ ہو رہا ہوتا، ہم اس کے جنون میں مبتلا ہو جاتے۔ اس کے لیے ہمیں ایک اور طرز کی گیند تیار کرنا پڑتی۔ مزل اپنے ابا کی درکشاپ سے، تانگے کے پیچ پر چڑھائی جانے والی ربڑ کا ٹکڑا لے آتا۔ ہماری ٹولی کا ایک لڑکا فرحت قدر سے نرم مزاج کا تھا۔

فرحت کے والد صاحب، ایک کھوکھنا دکان میں چوڑے کی چہل بنایا کرتے تھے۔ تانگے کے پیچ والے ربڑ کا ٹکڑا، ہم ان کے پاس لے جاتے اور وہ بڑی خوش دلی سے تیز دھار آلات کے ذریعے اسے کاٹ چھیل کر گول کر دیتے۔ اسی گول ربڑ پر کسی لڑکے کے گھر میں تھمکیاں لپیٹ کر آزمودہ طریقہ کار کے مطابق کھینچو بنایا جاتا۔ کرکٹ کھیلنے کے لیے کسی لڑکے کے پاس ملتا تھا۔ مزل کے گھر میں کپڑے دھونے والا

بھاری ڈنڈا، بیلے کی طرح آگے سے چپٹا تھا اور پکڑنے کے لیے موٹھ بنی ہوئی تھی۔ کرکٹ کھیلنے کے لیے اس سے بہتر کوئی شے ہمیں دستیاب نہ تھی۔ جسے مزل اکثر نظر بچا کر لے آتا لیکن کئی بار ایسا اتفاق ہوا کہ اس کی والدہ محترمہ نے اپنے مجازی خدا کے کپڑے دھونے ہوتے تھے۔ غالباً انہوں نے کپڑوں کو کوٹ پیٹ کر دل میں دبا ہوا غیظ و غضب نکالنا ہوتا تھا، لہذا ڈنڈا غائب پا کر گھر سر پر اٹھا لیتیں۔ چاچا اجمل کو خبر ہونے پر ایک اور طرح کی مصیبت کھڑی ہو جاتی۔

گویا مزل کو اللہ میاں نے کھوڑے سے زیادہ قوت برداشت دے رکھی تھی کہ مغلقات کے ساتھ ساتھ جسمانی سزا بھی برداشت کر لیا کرتا۔

ڈنڈے سے محروم رہ جانے کی صورت میں ہم تختی سے بھی کرکٹ کھیل لیا کرتے لیکن اس جنون کے نتیجے میں ایسے سانحات بھی رونما ہوئے کہ کسی لڑکے کی تختی لمبائی کے رخ درمیان میں سے دو پائین کٹاڑے ہو گئی۔ حائرہ لڑکا چشم تصور سے اپنے گھر کے اندرونی ماحول کا جائزہ لیتا اور پھر آبدیدہ ہو کر سامنے لڑکوں سے مشورہ کرنے لگتا کہ مقامی اسٹیشن سے کراچی کی ریل گاڑی کس وقت چوتھی ہے اور مزید یہ کہ بغیر ٹکٹ سفر کرتے ہوئے پکڑے جانے والے کم عمر لڑکے کے ساتھ ریلوے والے کیا سلوک کرتے ہیں۔ ایسے میں کوئی ہمارا لڑکا جس کو اپنے والدین

پر قدرے اعتماد ہوتا اور مالی حالت بھی زیادہ دگرگوں نہ ہوتی، وہ اپنی ذاتی تختی دے کر مکمل سامنے کا سدباب کر دیتا۔ یوں ایک سانس بھی بچھڑ جانے کا خدشہ لگتا تھا۔

ماسٹر عاصی صاحب نے جس مختصر سی بستی کو بازار حسن کا نام دینے کی ہدایت کی تھی، ہم شرفاء کے محلے کی شمالی نسل سے گزرنے والی شہر کی اہم سڑک کے پار آباد تھے۔ شرفاء اس لیے کہ ہمارے سبھی بزرگ بشمول چاچا اجمل پورے وثوق اور اعتماد سے خود کو شریف کہا کرتے تھے۔ خصوصاً امراء کے رہائشی علاقوں اور بازار حسن کو ایک برابر گردانے۔ بازار حسن میں چند درجن گھر ہی تھے۔ اس بستی کو درمیان میں سے ایک خاصی کھلی گلی، شرفا غریباں اور دوسری شمال جنوبی گزر کر چار بڑے حصوں میں تقسیم کرتی تھی۔ کم و بیش سارے ہی مکانات معیار کے اعتبار سے تیسرے درجے کے تھے۔ ان سب کے گلی یا گلیاں میں کھلنے والے کمرے نسبتاً بہتر انداز میں سجے ہوئے نظر آتے۔ ان کی دیواروں پر تجزیہ گلابی یا فیروز کی رنگ ڈال کر قلعی کی ہوتی۔ پردوں کے علاوہ معمولی فرنیچر اور سجاوٹ کا سامان بھی نظر آتا تھا۔

ماسٹر صاحب کی ہدایت کے برخلاف ہم شمال جنوبی گزرنے والے بازار سے آیا جایا کرتے، چونکہ اس میں دکانیں تھیں اور نسبتاً رونق بھی ہوا کرتی۔ کئی ماسی خواتین سے ہم نے ملیک سلیک سے ذرا اوپر درجے کے تعلقات قائم کر لیے تھے۔ اپنا کھیل کا سامان انہی میں سے کسی کے پاس چھوڑ کر آ جاتے، جو ڈنڈوں اور کھینچو پر مشتمل ہوتا۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ گھر سے اسکول کے لیے آئے لیکن نیت پھر کئی تو بے کسی ماسی کے پاس امانت چھوڑ دیے اور آوارہ گردی پر نکل گئے۔ عین چھٹی کے قریب پلٹ آتے، نیسے اٹھاتے اور گھر میں بوجھ قدموں سے یوں داخل ہوتے، گویا پڑھ پڑھ کر مت ماری گئی ہو۔ مغرب کی اذان ہوتے ہی میں ساتھیوں کو کھیل چھوڑ کر مسجد کی طرف سرپٹ دوڑ پڑتا۔ بھلے لباس پر کہیں کھینچو کی جھمک کا ٹھپا ہی کیوں نہ لگا ہوتا، میں والد صاحب کی مار کے خوف سے نماز پڑھ لیتا تھا۔

شروع میں یہ سوچ کر میرا دماغ پھر جایا کرتا کہ بازار حسن میں سودا کیسے بیچا جاتا ہے۔ ذہن میں چاچا شوکت سے موازنہ کرنے لگتا، جس نے دکان میں کتابیں اور اسٹیشنری کا سامان ڈال رکھا تھا۔ اسی طرح چناب کریانا اسٹور و جنرل مرچنٹ والے بشیر حسین کی طرف دھیان چلا جاتا کہ دکان انواع و اقسام کے سودے سے بھری پڑی ہے۔ جبکہ دن کی روشنی میں بازار حسن کی روئیں ماند پڑی ہوتیں۔ ٹھکی ہاری بیزار

بوڑھی اور ادھیڑ عمر عورتیں ہی دکھائی دیتیں۔ رفتہ رفتہ ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا گیا اور جان گئے کہ اس بازار میں تیزی رات کے اوقات میں آتی ہے اور کس طرح کالین دین ہوتا ہے۔ ماسی نما آرزوہ صورت خواتین دور روپے پر بھی صبر کر کے لیتی ہیں لیکن معیار پر سمجھوتا نہ کرنے والوں کو کم از کم پانچ روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں۔ پہلی پہلی بار انکشاف ہونے پر کہ اس بازار میں سودا کیسے بکاتا ہے، ہمارے روکنے کھڑے ہو گئے۔ فوری خیال آیا کہ قبر الہی سے کہیں زمین پھٹ نہ جائے اور ہم اس میں دھنسن جائیں، لہذا بھاگ چلیں۔

خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے لیے میں اور منزل عشا کے بعد گھروالوں کو محل دے کر نکل آئے تو بازار چمکتا ہوا دکھ لیا۔ دروازوں کے پردے ہٹا کر کرسی بچھائے، نسبتاً کم عمر لڑکیاں اور جوان عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہر ایک نے اچھا لباس پہن کر خوب بناؤ سنگھار کر رکھا تھا۔ ہمیں پوچس پارٹی نے دیکھ لیا اور بید لہراتے ہوئے ڈرا دم کا کچھ بھگایا۔ اس رات میں تدریجاً بستر پر کمروش بدلتا رہا اور یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ بازار میں جو بھی کاروبار ہو رہا ہے، وہ بہر حال ٹھیک نہیں۔ چوراہے سے آگے بازار کے آخری باغیں ہاتھ نین مکان چھوڑ کر جس گھر میں ہم بوقت ضرورت اپنا سامان یا بستے رکھا کرتے تھے، اس کے دروازے میں بیٹھی سبھی سبھی سنوری بھوری آنکھوں والی کوری گلابی قدرے موٹی مکر دراز قدم عمر لڑکی کو دیکھ کر بلا خوف و تردید کہا جاسکتا تھا کہ ماسر عاصی صاحب نے اسے بجا طور پر بازار میں کہا ہے۔ وہ مجھے روشن آنکھوں سے دیکھتے ہوئے مسکراتی تھی۔

ہم سمجھ گئے کہ دن کو اس لڑکی کی ماں سے بات چیت ہوا کرتی ہے جسے ہم موٹی ماسی کہتے ہیں۔ وہ بھی اسی طرح گوری اونچی مگرموٹی کچھ زیادہ ہی تھی۔ کوکہ اردو روانی سے نہیں بولتی لیکن مطلب کی ہر بات بآسانی کر لیتی تھی۔

یوں بھی اس بازار میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والی ادھیڑ عمر اور بوڑھی عورتوں سے ہماری بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ سب سے زیادہ خوش اخلاق اور ہمارے ساتھ محبت سے پیش آنے والی وہی موٹی عورت تھی جو میرے ساتھی لڑکوں کی طرح مجھے مولوی کہہ کر پکارتی۔

موٹی ماسی کے ساتھ ہماری دوستی گہری ہوتی تھی۔ خصوصاً میں اور منزل اس کے لیے اپنی بساط کے مطابق چھوٹے موٹے تحفے بھی لانے لگے، جس کی خاطر ہمیں چوری چکاری کا آغاز اپنے گھر سے ہی کرنا پڑا۔ اس اثنا میں وہ مکمل زمین کسی نے خرید لی جہاں ہم کھیلا کرتے تھے۔ چاروں

طرف خاردار تار لگا کر اس میں ہمارا داخلہ نامکن بنا دیا گیا لہذا ہماری ٹیم ٹوٹ گئی۔ ہر آنے والے دن کو میں اور منزل پڑھائی میں مزید تالافق ہوتے چلے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم دونوں کو احساس ہونے لگا کہ ہم جوان ہو چکے ہیں یا پھر انیس بیس کا فرق ہی رہ گیا ہے۔ چونکہ ہم گھوم بھگرے موٹی ماسی کی بیٹی کے حسن اور سراپا پر گفتگو کرنے لگ جاتے۔ میری طرح منزل کو بھی وہ لڑکی چندا تک بارخواب میں نظر آتی تھی۔

ہم نے آپس میں سر جوڑ کر مشورہ کیا۔ اس نے باپ کی ورکشاپ میں بڑی باریک بینی سے جائزہ لیا۔ کئی روز سے ایک نیا نوپلا شاندار تانگا کھڑا تھا جس کا مالک گھوڑا خریدنے کے لیے کسی دور دراز مقام پر گیا ہوا تھا۔ منزل نے باپ کی غیر موجودگی میں تانگے کے خاک دانوں پر نصب پیتل کی لائٹنیں، کھٹی اور چند آرائشی پترے اتار لیے۔ میں نے گھر میں بڑی تانے کی جاکر چرائی جو عرصہ دراز سے کبھی استعمال نہ ہوئی تھی۔ پیتل گلی سے ہمیں کل ترپین روپے کی خطرہ رقم وصول ہوئی، جس کی حفاظت کے پیش نظر آدھے آدھے نقلی میبوں میں دونوں نے ڈال لیے اور جیمیں شلوار کے نیچے میں پھنسا لیں۔

انجانے جوش اور سنسنی سے میرا جسم تھرانے لگ گیا۔ منزل کی بھی کچھ ایسی ہی حالت تھی۔ اس کے بدن کا سارا خون چہرے میں سمٹ آیا تھا۔ ہم نے پچھلی ملاقات میں موٹی ماسی سے جب گول مول بات کی تو وہ مکمل کر فٹ پڑی۔ ہم دونوں کو ایک ساتھ بازوؤں میں بھر کر پہلوؤں سے لگا لیا۔ یوں لگا جیسے ہم قوم کے پہاڑ میں دفن ہو رہے ہیں۔ کہنے لگی۔ ”جوان ہو گئے ہو تو شر ماؤ مت۔ ہماری بیٹی رشتی جیسی لڑکی کوئی نہیں۔ یہاں وہ تماش بین لوگ کیا بولتے ہیں..... سب نکلے والی بیٹھی ہیں مگر رشتی کم سے کم بچھیں روپے میں..... اپنی خوشی سے کوئی زیادہ بھی دے دیتا ہے۔ روزی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ زیادہ کالا لٹچ نہیں ہے۔ ہمارے پاس دل والا اور پیسے والا آتا ہے۔“

اسکول سے چھٹی ہونے میں ایک ٹھنڈی تھکاک ہم موٹی ماسی کے پاس پہنچ گئے۔ پچاس روپے دیتے ہوئے کہا، ہم رات کو گھر سے باہر نہیں رہ سکتے اس لیے دن دن میں ہی مہربانی کر دیں۔ وہ ایک پلیٹ میں ہمارے لیے برنی لے آئی اور بولی۔ ”یہ اپنے بڑے ہونے کی مٹھائی کھاؤ۔ ویسے تو تم کو مٹھائی لے کے آنا چاہیے تھی۔ خیر ہے کوئی بات نہیں۔ جب تم بہت چھوٹے تھے، تب سے میری اور تمہاری دوستی ہے۔ اس لیے تم کو کھلا کر خوشی ہوگی۔ رشتی ابھی سو رہی ہے۔ اس کو بے آرام نہیں کر سکتی۔ صبح ناشتا کرنے کے بعد سوئی تھی۔ تم کل دن کو جس وقت مرضی ہوا جانا۔“

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ



ماہِ مہاجر کے
شمارے کی دل
فریب کہانیاں

اولین صفحات

جینکے کے ساحلوں میں سیاحت
کے شوقین اور حیرم کے متوالوں کا سنگین
ملاپ۔ جس سے بھرپور ایڈنچر

انگاریے

دشمنوں کے شکنجے میں آہنی اعصاب کے مالک جیمپٹن
کا امتحان۔ محبت اور جنگ کی فضا میں آگے بڑھتا
ظاہر جاوید مغل کے یادگار سلسلے کی ایک اور کڑی

آوارہ گرد

چلچلاتی دھوپ میں ہر دم ایک نئی مصیبت
سے برسرِ پیکار نوجوان کی سرگزشت.....
عبدالرب بھٹی کی سلسلے وار کہانی

سرورق کے رنگ

روبینہ رشید اور سید شکیل کاظمی
کی سرورق پر سنسنی خیز کہانیاں

ان کے علاوہ

مظہر امام، تنویر، باض، سلیمان انور،
امرشد بیگ، جمال دستی، تمکین مرزا
اور عکس فاطمہ کی طبع زاد وتر جمہ کہانیاں

چینی تکتہ چینی

آپ کے تبصرے... مشورے... تجاویز...
ڈکیتیں... اور نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

ہم دونوں دل میں انوکھی تمنائیں لیے واپس آ گئے۔
میں جوں ہی بستہ اٹھائے تھے تھکے قدموں سے گھر میں داخل
ہوا، اباجی نے رسامیری کمر کے گرد ڈال کر مجھے برآمدے کے
ستون کے ساتھ کمر کے باندھ دیا اور سوئی سے پنڈلیوں اور
رانوں پر پے در پے وار کرنے لگے۔ امی اور میرے بہن
بھائی کمرے میں چلے گئے۔ میری چیخ و پکار سن کر انہوں نے
دروازہ کھینچ لیا۔ گلی کے لوگ گھر کے باہر جمع ہو گئے۔ بار بار
دستک دی اور ٹھنکی بجائی مگر اباجی اپنے مشن پر کاربند رہے۔
جلدی میں بے ہوش ہو گیا تھا۔

اسکول سے ہمارے کروتوتوں کا ریکارڈ کھل گیا۔
میرے اور مزمل سمیت چار اور لڑکوں کے نام بھی خارج ہو چکے
تھے۔ اباجی نے غصے اور کھٹنے بجا کر تانگوں کے ایک ایک انچ
پر پورے ایمانی جذبے سے چھڑی کے وار کیے تھے۔ اب
وہاں مزید گنجائش نہ رہی تھی۔ حفظہ مقدم کے طور پر دن بھر
میں آتے جاتے چلے بہانے ایک آدھ جھانپڑ رسید کر
جاتے۔ میں ریڑھی پر بھجک مارتے والے اپاہجوں کی طرح
رات دن چار پانی پر کٹائیں کھولے بیٹھا رہتا۔ گھریلو ٹونگوں
سے علاج معالجہ جاری رہا جس کے نتیجے میں چلنے پھرنے کے
قابل ہو گیا۔ اللہ کا کرم ہی ہوا کہ اباجی اور چاچا اجمل ایک
دوسرے کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ وہ تو والدین کی نٹائی،
تانبے کی گاگر کو اپنی جگہ سے غائب یا کر اباجی فوراً اسکول جا
پہنچتے تھے، جہاں سے معلوم ہوا کہ بیٹا لٹریچر غیر حاضر رہتا ہے۔
دوسری جانب مزمل، میرے برعکس خوش قسمت رہا۔ چاچا
اجمل کو خشک بھی نہ گزرا کہ یہ بیٹے کی کارستانی ہو سکتی ہے۔ اس
نے باور کر لیا کہ کسی بازاری اپنے نے احاطے کی دیوار چھاند کر
تا گئے کی قیمتی چیزیں اتاری ہیں اور جب مالک نے واپسی پر
تائگے کو گردوغبار سے محفوظ رکھنے کی غرض سے ڈالا ہوا کپڑا بٹایا
تو سامان چوری ہونے کا پتا چلا۔

مزمل نے دوسری بڑی اور اہم خوش قسمتی بقلم خود اپنے
کھاتے میں یوں لکھ لی کہ گھر والے جوں ہی سوئے، وہ چپکے
سے نکل گیا۔ موٹی ماسی کے ہاں سحری تک رہا۔ بقول اس کے،
جان جو کھوں میں ڈال کر حاصل کی گئی اپنے حصے کی رقم کا
بہترین نعم البدل حسن و خوبی سے وصول کیا اور واپس آ کر
شریف لڑکوں کی طرح اپنے بستر پر سو گیا۔ میری عارضی
معذوری کو عذر بنا کر اس نے اگلے روز کوکشن کر دیسی کہ
میرے ادا کردہ پیشگی معاوضے سے بھی استفادہ کر لے لیکن
موٹی ماسی نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ مولوی کی امانت
ہمارے پاس پڑی ہے، وہ جب بھی آیا، اس سے فائدہ

اٹھانے کا حق صرف اسے ہی ہے۔

میں سوچتے ہوئے دل حسرت و یاس اور حسد کے جذبات سے بھر جاتا کہ ظالم انسان اگر جہنم میں ڈال بھی دیا گیا تو اس کے نامہ اعمال میں ایک خوبصورت گناہ کا اندراج ہوا ہوگا۔ جبکہ انسان خطا کا پتلا ہے، لہذا العید اذ قیاس نہیں کہ میں کسی انتہائی بھونڈے بے ہودہ اور بے لذت گناہ کی یاداش میں دھریا جاؤں۔

انہی دنوں حکومتی اقدامات کا غلط فہم بلند ہوا کہ شہر میں قائم تمام کے تمام بازار حسن بند کر دینے کے سخت احکامات جاری ہوئے ہیں۔ اخبارات کی سرخیوں میں انہیں فاشی کے اڈے قرار دیا جا رہا تھا جس کے رد عمل میں شعبہ صحافت کے خلاف میرے دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ عاصی صاحب نے بھی اس حکومتی اقدام پر اپنی ہی طرز کا تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ بہت برا ہوا۔ مگر اس سے اور کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ بازار حسن سے وابستہ افراد جو مخصوص مقامات تک محدود تھے، اب عام آبادیوں میں بکھر کر ٹھکانا کر لیں گے۔ مغربی بازو کے حاکم پر کڑی تنقید کرتے ہوئے عاصی صاحب نے کہا۔ ”مگر یہ شخص صوم و صلوة کا پابند ہے لیکن اپنی نفرت میں سخت گیر، پرلے درجے کا فتنہ مزاج اور ظالم ہے۔ معاشرے کو اس کی لا حاصل ہم جونی کا بہت نقصان پہنچے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے ٹوپیاں سی کر اور کتابت کر کے دال روٹی کمانے والے شہنشاہ ہند نے اصلاح معاشرہ کی غرض سے بعض بیکاری اصلاحات نافذ کی تھیں۔“

مجھے دہرے تہرے صدمے نے آ لیا تھا۔ دادا دادی کی نشانی، منقش گما کر جو قیمتی انیک کا رد کر رہی تھی، اسکرپ کے بھانج دی اور پھر اصل مقصد حاصل کرنے سے بھی محروم رہا۔ کالے چور کی طرح مار کھائی جبکہ منزل دلولہ انگیز داستان سنا کر مجھے حسد اور حسرت و یاس کی آگ میں جھلسا رہا تھا۔ اس نے صاف صاف اپنے جذبات کا اظہار کر دیا اور بتا دیا کہ وہ یار مارتا بیت ہوا ہے۔ اس نے منت خوشامد کر کے مجھے راخی کر لیا۔ کہنے لگا۔ ”رختی بھی تجھے مولوی کہتی ہے۔ جب ہم سارے لڑکے پچھلے پہر کھینے جایا کرتے تھے، اس وقت وہ جاگ رہی ہوتی تھی۔ خود ہی بتانے لگ گئی کہ مولوی تم سب میں اچھا لڑکا ہے۔ مغرب سے پہلے ہی نماز کے لیے بھاگ پڑتا تھا۔ اپنا ہاکی کھیلنے والا ڈنڈا اماں کے حوالے کر کے سلام کرتا اور دوڑ پڑتا۔ میرا دل چاہتا ہے سب چھوڑ چھا کر نماز پڑھوں لیکن یہ مشکل اس وقت آسان ہوئی جب کوئی مولوی جیسا بندہ مجھے بوی بتانے لگا۔“

ماسٹر عاصی صاحب نے ہم پر وہ احسان کیا جو آج تک یاد ہے اور آئندہ بھی کبھی نہ بھولیں گے۔ ہم سے نیک چال چلن اور بورڈ کے امتحان تک خوب دل لگا کر محنت کرنے کا وعدہ لیا۔ اپنی ذاتی ضمانت پر ہیڈ ماسٹر صاحب سے معافی دلا دی۔ مجھے اباجی کی بار اس آگئی تھی۔ ایسی کا یا پٹلی کہ خود بھی سمجھ نہ پایا اور دن رات پڑھنا شروع کر دیا۔ منزل کو اس کے والد صاحب نے ٹیوشن لگوا دی۔ پڑھائی میں پناہ ملنے کے باوجود کسی لمحے ودھیان چھٹ کر موٹی ماسی کی طرف چلا جاتا لیکن وہاں سے واجبات کی وصولی کے طریقہ کار کا خیال آتے ہی اباجی حضور کی تقریر کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگتے کہ روز محشر کو بدکار عورت اور مرد کا کیا حشر ہوگا۔ نازک اعضا پر سانپ بچھوڑوں کے کانٹے کا منظر انہوں نے یوں بیان کیا گویا آنکھوں دیکھا ہو۔ دل دہلا دینے والے اس منظر نامے کے باوجود وہ گلدرائے ہوئے بھرے بھرے بدن والی گوری گلابی لڑکی یاد آ جاتی جو مجھے بھوری روشن آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ دل میں امنگ بیدار ہوتی کہ ایک بار وصولی کراؤں اور اللہ سے گڑگڑا کر معافی مانگ لوں۔ آئندہ کے لیے توبہ کر لوں۔ اس پر والد صاحب کی ایک اور تقریر یاد آ جاتی جس میں انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ اللہ سے معافی مانگ لینے کا سوچا سمجھا ارادہ کر کے گناہ کا مرتکب ہونے والا بد بخت انسان سیدھا جہنم میں جاتا ہے۔

عجیب ذہنی خلفشار و امن گیر ہوا رہا۔ منزل کے بارے

بازار حسن اجڑ گیا اور جس کے دم سے یہ نام زیبا تھا، جانے کہاں گئی۔ بورڈ کے امتحانات سر پر آن پہنچے۔ میری تیاری کئی بجش ہو گئی لیکن واجبات کی عدم وصولی کا قلق نہ گیا۔ یہی سننے میں آیا کہ اس بازار کی عورتیں مختلف محلوں اور جدید آبادیوں میں اٹھ آئی ہیں اور بعض دوسرے شہروں کو کوچ کر گئیں۔ ہر کسی کے اپنے چاہنے والے تھے جن کی معاونت سے نہ صرف سر چھپانے کو چھت لگی بلکہ آزمودہ کاروحیات بھی جاری و ساری رہا اور صالح حاکم کی مشاک کے برخلاف انسانی معاشرے کا قدیم ترین پیشہ پید نہ ہو سکا۔

میٹرک اور ایف اے منزل اور میں نے ایک ساتھ پاس کیا۔ میں نے ایک پرائیوٹ کالج میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ پڑھانا بھی شروع کر دیا۔ پویش کل سائنس میں ماسٹر کرنے تک مارکس اور لینن کے نظریات اور تعلیمات کا بغور مطالعہ کیا۔ پوری طرح قائل ہو گیا کہ زوال پذیر مملکتی معیشت کا سدھار داس کیپٹل کی روشنی میں ممکن اعلیٰ ہے۔ اس عرصے میں مجھے صوبائی محکمہ تعلیم میں بطور لیکچرر ملازمت مل گئی۔ فرانکفونٹ میں ادا کی گئی کے ساتھ ساتھ مطالعہ جاری رکھا۔ ملک میں حقیقی عوامی

پہلا پہلا

1- ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے والا پہلا شخص نیوزی لینڈ کا ایڈمنڈ ہیری ہے جو اپنے نیپالی گائیڈ شری پتنگ کے ساتھ 29 مئی 1953ء کو چوٹی پر پہنچا۔

2- خلا میں سب سے پہلا آدمی روس کا یوری گگارن 12 اپریل 1961ء کو خلائی جہاز، ووشک 1 کے ذریعے پہنچا۔

3- قطب شمالی میں بیٹھنے والا سب سے پہلا شخص امریکا کا رابرٹ ایڈون پیری ہے جو 16 اپریل 1909ء کو وہاں پہنچا تھا۔

4- قطب شمالی پر جانے والا سب سے پہلا شخص ناروے کا آمنڈسن ہے جو 16 دسمبر 1911ء کو وہاں پہنچا۔

5- چاند پر قدم رکھنے والا سب سے پہلا شخص امریکا کا نیل آرمسٹرانگ ہے جو 31 جولائی 1969ء کو امریکی جہاز اپالو 11 کے ذریعے وہاں پہنچا۔

6- ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے والا پہلا پاکستانی نذیر صابر ہے۔

7- خلا میں جانے والا سب سے پہلا مسلمان آدمی سعودی عرب کا شہزادہ سلطان سلمان السعود ہے۔ جو جون 1985ء میں امریکی خلائی شٹل ڈسکوری میں سوار ہو کر خلا میں پہنچا، دوران سفر شہزادہ سلطان نے پورے قرآن مجید کی تلاوت بھی کی۔

8- خلا میں سب سے پہلی خاتون روس کی ویلنٹینا ولادی میر وٹنا زینکوفا 12 تا 19 جون 1963ء کو ووشک 6 کی خلائی جہاز کے ذریعے پہنچی۔

ڈوگڑ رعالمی معلومات سے اقتباس
مرسلہ: بقیہ عباس باہر، اداکارہ

انتخاب لانے کے لیے مذہبی، مسلکی، لسانی اور نسلی گروہوں میں بٹے ہوئے عوام کو قریب لانا ضروری سمجھتا تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی لعنت یہی ہے کہ اس کے گماشتے، محروم طبقات کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کرنے کی غرض سے ہر طرح کے تعصب کو بروئے کار لاتے ہیں۔ لسانی اکائیوں کو باہم متحد کرنے کے لیے ان کی مادری زبان کو سمجھنا اور اس کی تکریم کرنا بڑا اہم نکتہ ہے۔ میں نے سب سے زیادہ محنت اسی شعبے میں کی اور بڑے شوق سے مختلف علاقائی زبانیں سیکھتا رہا۔ اباجی نے مجھ پر کفر کا فتویٰ لگانے کے باوجود قطع تعلق نہ کیا اور فرمایا کہ دین اسلام، غیر مسلم کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات استوار کرنے سے منع نہیں کرتا لیکن اس مقصد کے لیے بڑی واضح حدود و قیود مقرر کی گئی ہیں۔

مزل نے الف اے پاس کر لینے پر ہی اکتفا کیا۔ تاہم انڈسٹری تیزی سے سکڑ رہی تھی اور اس سے وابستہ شعبوں میں روزی کمانا مشکل ہوتا گیا۔ تاہم چاچا اچھل نے ایک محرکہ مار لیا۔ اس نے تقسیم ہند سے پہلے جس احاطے میں ٹھہرا ہوا تھا، اس کے ہندو مالک کی ہجرت کے بعد ہندوستان سے آئے مسلمان مہاجر بالائی کو شروع میں بیس روپے ماہوار کرایہ دیتا رہا اور کسی بھی قیمت پر قطع نہ چھوڑا۔ آگے چل کر کرایہ دینا بھی بند کر دیا۔ کئی حکومتیں آئیں اور گئیں۔ لڑتے لڑتے صرف الائی کی چونچ اور دم گم ہوئی اور پھر وہ خود بھی یوں گم ہوا کہ عدم کو سدھار گیا۔ چاچے کا بال بھی بچا نہ ہوا۔ جس کسی نے بھی دعویٰ جانے کی کوشش کی، چاچا لڑنے مرنے کو تیار ہو جاتا اور سب سے مؤثر ہتھیار کے طور پر ٹھوڑوں کو احساس کتری میں مبتلا کر دینے والی گالیاں کہنے لگتا۔

تاہم اسٹیڈ از خود ہی سٹ گیا اور غلہ منڈی پھلتی چلی گئی۔ چاچا بوڑھا اور کمزور ہو کر گھر بیٹھ گیا۔ مزل نے سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے زیادہ غلامانہ شکل، منڈی کی آزادی یا آزادانہ تجارت سے بھرپور استفادہ کیا، جس میں تاجر اور اجارہ دار کو اپنی شرح منافع مقرر کرنے کی مکمل چھٹی ہوتی ہے اور حکومت وقت کو موج ملتا اڑانے کے سوا کچھ نہیں کرنا ہوتا۔ غذائی اجناس کی خرید و فروخت اور ذخیرہ اندوزی شروع کر دی۔ کاروبار دن دوتا، رات چوگنا ہوتا گیا۔ شادی بھی جلد ہی کر لی اور بچے بھی ہو گئے لیکن جوت موٹی ماسی کے ہاں لگی تھی، وہ نہ گئی۔ میری سرکاری نوکری کتنے تک وہ اچھا خاصا مالدار تاجر بن چکا تھا۔ دولت ریلے کی صورت میں آنے کا فائدہ یہ ہوا کہ بری لت سے توبہ کر لی اور نماز باقاعدگی سے پڑھنے لگا۔ البتہ رمضان کے روزے کی ہمت کیجنا نہ کر پاتا اور

اس سعادت سے محروم رہنے پر نہ صرف ندامت محسوس کرتا بلکہ جھنجھلاہٹ میں ماتھا پیٹ لیتا۔ تاہم مذہب کے معاملے میں اس قدر جذباتی اور حساس ہو گیا کہ مجھ سے ایک روز بول دیا۔ ”مولوی! تیرے ساتھ یاری آخری دم تک بھھاؤں گا لیکن کبھی بھول کر بھی مجھے کیونہم کا سبق نہ پڑھانا اور نہ ہی میری مذہبی وابستگی کو ڈسکس کرنا۔“

رمضان المبارک کی سترہ تاریخ کو ہم دونوں نے ایک ساتھ لمبا سفر کیا۔ محرمی میں شاہراہ پر ایک اچھے ہوٹل سے کھانا کھایا۔ منزل کو سگریٹ نوشی کی عادت نویس دسویں جماعت میں ہی پڑ گئی تھی۔ اکثر اپنے والد کے سگریٹ بھی چرائی کرتا تھا۔ ہوٹل پر کھانے اور چائے کے بعد اس نے اوپر تلے دو سگریٹ پھونک ڈالے۔ میرا سلگنے پر پاس بیٹھے شخص نے اسے ٹوک دیا کہ اذان ہو رہی ہے، اب محرمی کا وقت باقی نہیں رہا۔ منزل نے باپ سے قیمتی کٹرٹیل جاکدایا نے کے علاوہ پنج مزاجی بھی وراثت میں حاصل کی تھی۔ بھنا کر بولا۔ ”سفر میں روزے کی رعایت ہے۔ تم کون ہوتے ہوئے کئے والے۔“

اس نے جواب دیا۔ ”رعایت ان روزوں کے لیے تھی جب پیدل سفر کرتا ہوتا تھا یا گھوڑوں اور اونٹوں پر۔ اس ... ایئر کنڈیشنڈ لکڑی کوچ میں روزہ رکھنے سے کیا مشکل پیش آ سکتی ہے؟“ اعتراض اٹھانے والے کی حمایت میں دو ٹوٹن اور لوگ بھی بول پڑے۔

منزل سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ پوچھتا اس کے کہ میدان میں کود پڑتا اور کھوم کھومنا شروع ہو جاتا، ہوٹل سے ملحقہ مسجد میں صفیں سیدھی ہونے لگ گئیں۔ منزل نے جھٹ سگریٹ کا سرا ایش ٹرے میں پھل ڈالا۔ بجلت میں کھلی کی اور دوڑ کر پچھلی صف میں کھڑا ہو گیا۔

آخر کار میں نے اپنی ہم خیال کامریڈ ساتھی سے شادی کر لی۔ بیوی کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی ہو تو زندگی سے پیار ہونے لگتا ہے۔ ہم قریبی دوست اپنے اسٹری مرکل میں مستقبل کے حقیقی عوامی انقلاب کے خدو خال اجاگر کرتے رہے۔ حقیقی انقلاب کیا برپا ہوتا، ستم بالائے ستم کہ ملک میں قائم نیم انقلابی حکومت کا تختہ بھی الٹ دیا گیا۔ مصائب و آلام کا ایک طویل دور شروع ہوا۔ بہت سے ہم خیال دوست نہ صرف ملازمتوں سے برخاست ہوئے بلکہ جیلوں میں ڈال دیے گئے اور اذیت ناک تفتیشی مراحل سے گزرتے رہے۔ میری بیوی چند ماہ کی بچی کے ہمراہ پابند سلاسل ہوئی۔ بااثر خاندان کی بیٹی تھی۔ بھائیوں کی بھاگ دوڑ رنگ لائی۔ حکومتی تفتیشی ادارے کو معافی نامہ لکھ دیا۔ مجھ سے خلع لیا۔ غالباً سچے

دل سے تائب ہوئی تھی۔ باقاعدہ حجاب میں باہر نکلتی۔ تیسرے سال اپنے ہم پلہ وہم کفو سے نکاح کر کے امریکا چلی گئی۔ زندگی برباد ہوئے اور بیوی بیٹی کی دکانی جدائی کے غم و اندوہ میں غرق ہونے کے باوجود جب میں چشم تصور سے دونوں کو دور دیکھ آ رام میں شب و روز بتاتے دیکھتا تو دل کو قرار آنے لگتا اور دل سے تسلیم کرتا کہ اس نے ظلم اور جبر کے نظام سے سمجھوتا کر کے اچھا کیا۔ کروڑوں عوام کا ہم کچھ نہ سنوار پائے۔ کم از کم میری بیٹی اور بیوی کا مستقبل تو محفوظ ہوا۔

ہم جو سب وطن و دین قرار پائے تھے، ملک کی نظریاتی اساس کو نقصان پہنچانے کے جرم میں سزا کاٹ کر رہا ہوئے تو خزاں رسیدہ پتوں کے مانند بکھر گئے۔ وطن عزیز میں ایک اور طرح کا بالکل نیا خوش حال طبقہ وجود میں آ چکا تھا جس میں میرے ابھی حضور بھی شامل تھے۔ گوکہ انہوں نے میری مالی مدد کر دی لیکن مجھ سے فاصلہ رکھنے میں ہی رعایت جانی۔ منزل نے کاروبار میں ہوش و ہمت راتنی کر لی تھی۔ میری توقع، جسے میں اس کے سامنے بے تکلفی میں اپنے خدشات کہا کرتا تھا، کے عین مطابق سچ کرنے کے بعد ڈاڑھی رکھ لی تھی، جو صاف طور پر سچ مندی، سرخروئی اور بالادستی کی علامت نظر آتی۔ نسبتاً بہتر رہائشی علاقے میں بہت بڑا گھر بنا لیا تھا۔ دو گاڑیاں اور نوکر چاکر۔ میری بہت خاطر تواضع کی لیکن نہ جانے کیوں اس کو رہ کر ہر اس سیاسی شخصیت کا تذکرہ چھیڑنے کا جوش آ جاتا جو نظریاتی اعتبار سے ذہنی طور پر میرے قریب تھی۔ تحائفین کو برا بھلا کہتے ہوئے غیظ و غضب کا شکار ہو جاتا۔ میں زخمی دل لیے اٹھ آیا۔ اچھی طرح جان لیا کہ دیرینہ دوست اور میری دنیا الگ الگ ہے۔ بچپن کے دوستوں میں سے صرف فرحت نے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے دلی خلوص کے ساتھ آؤ بھگت کی۔ عرصے بعد ہونے والی ملاقات میں صرف اتنا خلیف پایا کہ میرے بجائے خود اس نے ہمر پوز جیھی ڈال کر بڑی گرم جوش سے میرے دونوں گالوں پر بوسے جیت کیے۔

وقت کتابتی بڑا ہوا، انسان پر اس کا بکھی احسان ہے کہ بالآخر سر گزر جاتا ہے۔ حکومت بدلی اور ایٹلا کا دور اختتام پذیر ہوا۔ نہ صرف سرکاری ملازمت پر بحالی ہوئی بلکہ سابقہ واجبات یک مشت وصول ہو گئے۔ نئی ہاؤسنگ اسکیم میں درمیانے سائز کا پلاٹ لے کر سنگل اسٹوری سادہ اور مختصر گھر تعمیر کروا لیا۔ جہاں بڑے گھر بنے ہوئے تھے۔ بالکل بخل نما۔ یہاں گھومتے ہوئے گمان گزرتا کہ خاصے خوشحال ملک کا شہری ہوں۔ لیکن اس رہائشی علاقے کے قلعہ نما گیت سے باہر نکلتے ہی معاشرے کی اصل تصویر نظر آ جاتی۔ کپے کے ٹوٹے

پھوٹے ایک دوسرے میں گھسے ہوئے مسکن، جن کے مابین نقل و حرکت کی غرض سے چھوڑے گئے تنگ راستوں پر بہتا ہوا سیاہ کالا کچڑ نما کثیف پانی، باجبا غلاظت، بھکیاں، پھنجر، ہمار وزار کتے بلیاں اور فضا میں رچا ہوا ایسا لتھن کہ سانس لینے ہوئے جی مٹانے لگتا۔ ایسے ماحول میں کلابلائی ہوئی نسل انسانی کو دیکھ کر خیال آتا کہ ایک ہی ملک کے اندر کئی طرح کے ممالک سامنے ہوئے ہیں، جن کے مابین اتنا تضاد ہے جو کسی بڑے تصادم کا سبب بن سکتا ہے۔

میں نے اپنے گھر کے پچھلے حصے میں پانچ چھ فٹ کی جگہ چھوڑی تھی۔ اسی طرح میرے عقبی دیوار والے دو منزلہ مکان کی غالباً اتنی ہی جگہ ہوا کے لیے چھوڑی گئی تھی اور اس گھر میں آئے دن میاں بیوی کے درمیان مہر کا آرائی جاری رہتی جسے میں اکثر سن لیا کرتا تھا۔ وہ خاصی بلند آواز میں لڑتے تھے، عورت تو گوشت کا پھاڑ دکھائی دیتی تھی۔ اس دن بھی وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ ”وہ عالم انسان! تو نے میری پریوں جیسی بیٹیاں بیچ دیں اپنی عیاشی کی خاطر۔“

”میں نے ان کی بڑھوں سے شریعت کے مطابق شادی کرائی انہیں گناہ سے بچایا ہے۔ ورنہ جیسے تیری ماں نے تیری کمائی کھائی تھی اسی طرح انہیں بھی دھندلا کرنا پڑتا۔“ اکثر ان لوگوں کے درمیان اسی قسم کے مکالمات ادا کیے جاتے اور کبھی کبھی وہ اوپر سے مجھے کام کرتا دیکھ کر مسکراتی اور چھپرتی۔

”اتنی سنجوسی نہ کرو کوئی مامی رکھ لو۔“ میں مسکرا کر نظر انداز کر دیتا۔

☆☆☆

حاجی منزل نے غذائی اجناس کی ذخیرہ اندوزی کا دھندا ترک کر دیا اور انتہائی قیمتی کمرشل جگہ پر پلازا کھڑا کر کے ماہانہ ساڑھے تین لاکھ روپے کرائے کی مدد میں وصول کرنے لگا اور اچھے علاقے میں ٹھاٹھ سے رہنے لگا۔ آتے ہی مسجد کیٹی کا فعال ممبر بن گیا۔ عندیہ دیا کہ اس شرفاء کے رہائشی علاقے سے فاشی کے اڈے بند کروانے ہیں۔ اپنے ہم مزاج تینوں جوان بیٹوں اور چند جو شیعہ ساتھیوں کے ہمراہ فلپائن خواتین کے مساج سینٹر گیا اور پھر چینی پر۔ دونوں کو دمہلی دی کہ جلد سے جلد یہ ”چٹکے“ بند کیے جائیں۔ اصلاح معاشرہ کے جذبے سے سرشار عظیم باری باری سب کے پاس گئی۔ بیشتر اس کے کہ وہ یہ نیک کارنامہ سر انجام دے کر بروقت مسجد پہنچ جاتے اور مغرب کی نماز ادا کرتے، سب ان کیسر کی معیت میں ایک

موبائل میں سوار پولیس پارٹی نے راستے میں ہی اچک لیا اور شریف شہریوں کو دھمکانے اور نقص اس کے الزام میں تھانے لے گئے۔ تاہم ہرچہ درج کر کے حوالات میں بند کرنے کے بجائے آئندہ خطا رہنے کا تحریری حلف نامہ لے کر رات گیارہ بجے خلاصی کر دی۔ حاجی تو یہ تو یہ کراٹھا کہ ملک میں اس کی اپنی پسندیدہ سیاسی جماعت کی حکومت ہونے کے باوجود پوش علاقوں میں بھی نام بدل کر بازار حسن کھل گئے ہیں۔ اسلام سے دوری کا یہی نتیجہ نکلتا تھا۔

میرے اور حاجی کے والدین کب کے آسودہ خاک ہو چکے تھے۔ بہن بھائی اپنے اپنے گھروں میں خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ میری بینیشن اتنی تھی کہ بخوبی گزارہ ہو جاتا۔ بلکہ خاصی رقم بچ رہتی لیکن گھر کے سارے کام خود کرتا۔ حاجی کسی کسی روز گھر سے کوئی خاص پکوان لے کر آ جاتا اور اپنے ذرا نیور کو واپس بھیج دیتا۔ ہم ڈھیروں باتیں کرتے۔ بچپن کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد آ جاتیں۔ مرے ہوئے اور پھڑپھڑے ہوئے دور گئے بہت سے لوگوں کے بارے میں گفتگو کرتے۔ اس کا خیال تھا کہ ملک میں قائم حکومتوں کی عمدہ حکمت عملی سے نظام بدلا اور وہ ذلت آمیز غربت سے نجات حاصل کر پائے۔ میں اس کو بار دہراتا۔ ذرا گیٹ سے باہر دیکھتا تھا کہ جہاں تک کر دیکھو۔ کرڈوں لوگوں کا معیار زندگی دن بدن پست سے پست تر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ اپنے موقف پر چٹان کی طرح ڈٹا رہتا۔

سر دیوں کی مری مری دھوپ میرے گھر کی چھت کے اس کنارے تک ہی پانی رہ گئی تھی، جہاں نیچے چھوٹا سا صحن تھا۔ میں رینگ کے ساتھ ٹیک لگا لگا اخبار کا ادارتی صفحہ دیکھ رہا تھا۔ لوہے کی گول سیڑھی میں بھونچال آنے سے سمجھ گیا کہ ڈبل ڈیکر آن کھڑی ہوئی ہے۔ قصداً اس طرف نگاہ نہ ڈالی۔ منامیرے کانوں میں آواز پڑی۔ ”مولوی! چالیس پچاس سال سے تمہاری مقروض ہوں..... کیا خیال ہے، وصول نہیں کرو گے؟“ یک دم میرے دماغ میں جھماکا ہوا۔ چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بھوری آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ان کی چمک اب بھی ماند نہ پڑی تھی۔ بے اختیار بول دیا۔

”بہت تیرے کی..... رنجشی! میری آنکھوں میں تیری وہی تصویر تھی نوجوانی والی۔ اپنا تلخ و شیریں ماضی کریدتے ہوئے کچھ ہی دیر پہلے، خیال تیری طرف خواہ مخواہ پلٹ گیا تھا۔ ظالم عورت! تم نے میری انگوٹھی پٹی لٹکی یا دکاتیاں سا کر دیا۔“

مہفل شہر وسخن

ہادیہ ایمان، ماہا ایمان..... فورٹ عباس
قاصد نہیں یہ کام رتا اپنی راہ لے
اس کا شہنشاہ دل کے سوا کون لاسکے
محمد رفیق حکیم..... نیوکراچی
خوشیاں تو روٹھ گئیں ہم سے
کاش غموں کو بھی نظر لگ جائے
اوشاراہی..... ممبئی سندھ
زندگی میں کبھی کبھی ایسا اصول بھی اپنانا چاہیے
کہ جنگ اگر خود سے ہو تو..... ہار جانا چاہیے

زرین آفریدی..... حیدرآباد سندھ
ہم کو آتا نہیں دشمن کی نمائش کرنا
خود ہی روتے ہیں، ترپتے ہیں بھل جاتے ہیں
وزیر محمد خان..... بھل ہزارہ
تم سے ملے بھی ہم تو جدائی کے موڑ پر
کشتی ہوئی نصیب تو دیا نہیں رہا
کہتے تھے ایک بل نہ جس کے تیرے بغیر
ہم دونوں رہ گئے ہیں وعدہ نہیں رہا
لبٹی وکیل..... کوئٹہ

رسم الفت کو نبھائیں تو نبھائیں کیسے
ہر طرف آگ ہے دامن کو بچائیں کیسے
بوجھ ہوتا جو غموں کا تو اٹھا بھی لیتے
زندگی بوجھ بنی ہو تو اٹھائیں کیسے

زویب احمد ملک..... کراچی
آبلے کیسے بھی ہوں ضبط کے چمائے رکنا
اپنے اشکوں کو زمانے سے چھپائے رکنا
آج سوچا ہے جی بھر کے چھپیں دیکھیں گے
پھول پھرے کو ہٹیلی پہ لگائے رکنا

نامید یوسف..... اسلام آباد
روز کھالیتے ہیں ہشتے ہوئے چہروں سے فریب
کیا کریں اپنی نگاہوں میں مروت ہے ابھی
مہتاب احمد..... حیدرآباد
پھر خاک ہی کرنا تھا مجھ کو
تو پھر کاہے کو نہلایا گیا ہوں
نوشہ گزار..... بھکر
مدیاں تیری سمیٹ کے جو لے گیا قتل
اب تیرے پاس لوٹ کدھے مل نہ آئے گا
ظفر اقبال ظفر..... کامرہ شرقی
شوق، دھنک، ماہتاب بجلی، تارے، پھول
اس دامن میں کیا کچھ ہے، دامن ہاتھ میں آئے تو

✽ ملک مظہر بلال..... حلقہ گنگ

جس سے لڑتا ہوں اب اس کو منایا ہوں
خوب بدلی ہے تیرے بعد یہ عادت میں نے

✽ حمزہ آریان..... حلقہ گنگ

میں اس کو یاد کروں بھی تو یاد آتا نہیں
میں اس کو بھول گیا ہوں یہی سزا تھی میری

✽ باسط ولید الرحمن..... حلقہ گنگ

میں کیا کہوں کہ مجھے مبر کیوں نہیں آتا
میں کیا کروں کہ تجھے دیکھنے کی عادت ہے

✽ تحریم صدیقی..... کراچی

ہو نہ سکا کبھی ہمیں اپنا خیال تک نصیب
نقش کسی خیال کا لوح خیال پر رہا

✽ صبا سحر..... کراچی

کچھ اس کمال سے اترے تھے ہم سمندر میں
پھر اس کے بعد ہوئی ختم رسم غرقابی

✽ شاہد علی..... فیصل آباد

بس ایک ہل تری قربت کا زندگی جیسا
پھر اس کے بعد وہی میں ہوں اور زمانہ وہی

✽ عظیم احمد..... چنگ سٹی

موت کا دبدبہ ہے اپنی جگہ
زندگی کا ہے اپنا کرونر

✽ اطہر حسین..... کراچی

ذات سے انحراف کون کرے
اپنے دل میں شکاف کون کرے

راگناں کر دیا گیا ہے مجھے
ہاں مگر اعتراف کون کرے

✽ منیر گفشتہ..... دھاڑی

اس کے لیوں کی گفتگو کرتے رہے سبوسو
یعنی سخن ہوئے تمام یعنی کلام ہو چکا

✽ انعم کمال..... حیدر آباد

جانے ہم ایک تھے کہ بے حد تھے
بٹ گئے ہیں تمام رشتوں میں

✽ طاہر مجاہد..... پھالیہ

بس ایک بار مری نیند چھو گیا کوئی
پھر اس کے بعد ہر اک خواب دلشیں آیا

✽ آذین رضوان..... کراچی

اس نے پوچھا بھی مگر حال چھپائے گئے ہم
اپنے ہی آپ میں اک حشر اٹھائے گئے ہم

زندگی دیکھ کہ احسان رزے کتنے ہیں
دل کے ہر داغ کو آئینہ بنائے گئے ہم

✽ نادیہ ریاض..... نوابشاہ

یہ الگ بات کہ حالات وہی ہیں اب بھی
تیرے آنے سے مگر کچھ تو سہارا ہوا ہے

✽ ریاض انصاری..... لاہور

دست شفقت اٹھایا تم نے
ہم ہیں اور دشت بے اماں بابا

✽ سائرہ نواب..... پشاور

تعلی کی طرح اڑتے چلے جاتے ہیں لمبے
پھولوں کی طرح دیکھتے رہتے ہیں انہیں ہم

✽ عاصم خان..... کراچی

چلتا سکھایا اس نے مجھے ہاتھ تھام کر
تھی کیا خبر کہ اس کا سہارا تھا آخری

✽ شافیہ خان شافی..... کلشن، کراچی

کوئی خیال نہیں کسی بے خیالی ہے
کہ اب تو آنکھ کسی خواب تک سے خالی ہے

جو ہو سکے تو اسے بخش دے بنا مانگے
انا پرست ہے جو دل تیرا سوالی ہے

✽ محمد زریان سلطان..... اردو بازار کراچی

بچھڑتے وقت اس کا حکم تھا یہ
پلٹ کر اب کبھی دیکھا نہ جائے

گنوائے دوست پہلے، طے کیا پھر
خلوص و پیار کو پرکھا نہ جائے

✽ حظل شاہد..... سکھر

ریت کی دیوار تھی، کیا تھی انا؟ میں جھک گئی
آج پھر ایک شخص نے سر کا میرے سودا کیا

✽ شامینہ مہتاب..... چنیوٹ

میں چاہوں جرم محبت ہے معاف ہو جائے
تمہارا دل میری جانب سے صاف ہو جائے

مجھے خبر ہے یہ دل اس کے حق میں بولے گا
بہ ظاہر جتنا بھی اس کے خلاف ہو جائے

نصیم احمد..... بہاولپور

روز کاغذ پہ دل بناتا ہوں
پھر اسے آگ میں جلاتا ہوں

کا مران شاہد..... میرپورخاص
کبھی خوشی سے ہار کسی نے مانی ہے!
آخر دنیا کیوں ہم کو تسلیم کرے

صباحہ..... ٹنڈوالہیار
نہیں تھی حسنِ نظر کی بھی کچھ اسے پروا
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

وسیم اختر..... ملتان
کہیں سے صبح کی پہلی کرن ملے، تو چلے
کھڑا ہے وقت سیر رکھوار آخر شب!

کہیں نہیں ہے اشارہ کسی بھی آہٹ کا
وہی ہے درد، وہی انتظار آخر شب!

ردا جاوید..... جیل ہزارہ
لکھتے بیاضِ وقت پہ ہم کیا تاثرات
سب کچھ تھا درج اور کوئی حاشیہ نہ تھا

عمیر رضا..... پکوال
اپنا مطلب کھودتی ہے دل میں رکھی بات
رونا ہے تو کھل کے رو اور جلتا ہے تو، جل

ناصر خان..... کوئٹہ
بھٹکے ہوئے پھرتے ہیں کئی لفظ جو دل میں
دنیا نے دیا وقت تو لکھیں گے کسی دن

امجد پرویز..... سرگودھا
دیکھے گی زمیں، روز نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک، لوگ جھیلے میں رہیں گے

محمود نصیر..... میرپورخاص
حرم کھا جاتی ہے غریب کا رزق
ورنہ کچھ کم تو یاں اناج نہیں

دلاور خان..... بانسہرہ

افلاک کا سایہ ہے جو کچھ بھی زمیں پر ہے
ہے خواب کہیں میرا تعبیر کہیں پر ہے

سنبل..... گلگت
لپتی ہے جلیقی شمع بھی بجھنے میں کچھ تو وقت
ہے آدھی سا کوئی کہاں بے ثبات اورا

ارم کا مران..... سکھر
خدا گواہ، وہ آسودگی نہیں پائی
تمہارے بعد کسی سے بھی پیار کرتے ہوئے

بینش صدیقی..... حیدرآباد
ہر دم دنیا کے ہنگامے ٹھیرے رکھتے تھے
جب بے تیرے دھیان لگے ہیں، فرمت رفتی ہے

ساگر توکر..... میانوالی
نہیں وہ خواہش نجات میں بھی
جو کششِ دامنِ گناہ میں ہے

احسن جمال..... اسلام آباد
دل کو حصارِ رنج و الم سے نکال بھی
کب سے بکھر رہا ہوں مجھے اب سنبھال بھی

رانا کلیم..... کراچی
خوشبو سے بھری شام میں جگنو کے قلم سے
اک نظر بڑے واسطے لکھیں گے کسی دن

یمنی جاوید..... کراچی
شام کی دھند میں آتا ہے بہت یاد ہمیں
اس کا چہرہ تھا کھنی شب میں ستارے جیسا

ثنا صادق..... کراچی
روزِ ازل سے ہیں وہی گنتی کے چند رنگ
بننے ہیں جن سے اُن گنت منظر، نئے نئے

فیاض خان..... اوکاڑہ
بھلا دے مجھ کو کہ بے وفائی بجا ہے لیکن
گنوا نہ مجھ کو کہ میں تیری زندگی رہا ہوں

محفل شعرو سخن

کوین
برائے
شمارہ
اکتوبر
2017

نام: _____
پتا: _____



دہشت زدہ

شاہ زین رضوان

وہ جو زندگی سے دور دکھائی دیتا تھا لیکن احساسات کے انتہائی قریب تھا... اور اس کے کان گویا اس کی آہٹ پر لگے رہتے تھے۔ کیونکہ... وہ انتہائی پراسرار دشمن محسوس ہوتا تھا۔ اس کی عجیب و غریب حرکات لوگوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں لیکن یہ فسوس کاری بھی بالآخر ایک دن ختم ہو ہی گئی۔

انتہائی چالاکی و زیرکی سے کیس حل کرنے والے ایک سراغ رساں کی کاوش

ولی کو ستادوپہر کے وقت ساؤتھ بیچ پر واقع کلارک کے ہپ میں داخل ہوا۔ وہ یہاں ایس آر ڈین سے ملنے آیا تھا جو ایک ریٹین انٹرنی کے طور پر کام کرتی تھی۔ وہ دونوں مہینے میں ایک بار دوپہر کا کھانا ایک ساتھ کھاتے۔ کلارک کے برگر جنوینی فلوریڈا میں بہترین سمجھے جاتے تھے۔ اسی لیے انہوں نے بیچ کے لیے اس جگہ کو ترجیح دی۔ ولی نے ایک کونے کی میز کا انتخاب کیا اور وہاں بیٹھ کر وی پر نظریں جمادیں۔ دومنٹ بعد ہی ایس جی آ گئی۔ اس کے سنہری

”ہاں۔“

میامی پولیس ڈیپارٹمنٹ کے خفیہ یونٹ میں کام کرنے کے دوران ولی نے میکاؤٹس کے بارے میں سنا تھا۔ یہ سادہ کپڑوں میں سرکاری سرپرستی میں کام کرنے والا قاتلوں کا گروہ تھا جسے صدارتی محل سے احکامات ملتے تھے۔ ان لوگوں نے نئی عسروں تک بیٹی میں دہشت کا بازار گرم رکھا جس میں لوٹ مار، جنسی زیادتی اور قتل جیسے واقعات شامل تھے۔ ان کا اصل کام لوگوں میں دہشت پھیلاتا اور اس بات کو یقینی بناتا تھا کہ وہ حکمرانوں کے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کریں۔ حکومت انہیں بندوقوں، جاتو اور خنجروں سے مسلح کرتی تھی لیکن وہ پولیس یا فوج کی طرح باوردی نہیں تھے۔ اس کے برعکس وہ سادہ لباس پہنتے۔ ان کے سر پر پانامہ ہیٹ اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ ہوتا۔

اس کے علاوہ ان میں برائی کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ ان میں سے زیادہ تر کا تعلق ”ووڈو“ پر عمل کرنے والوں میں سے تھا جس کی وجہ سے وہ اور زیادہ خوفناک ہو گئے تھے۔ وہ کسی شیطان کے مانند تھے۔ ایک لمحہ وہ اپنے خداؤں کے حضور مرنے کی قربانی کرتے اور دوسرے ہی لمحے وہ نصف شب کے قریب کسی انسان کا گلا کاٹ دیتے، بعض اوقات متوتیلین کا تعلق حکومت کے سیاسی مخالفین سے ہوتا لیکن کبھی کبھی وہ کسی ترتیب کے بغیر بھی لوگوں کو قتل کر کے ان کی لاش درختوں پر لٹکا دیتے یا سڑک کے درمیان میں چھوڑ دیتے۔ ان کا مقصد صرف دہشت پھیلاتا اور لوگوں کو یہ پیغام دینا تھا کہ اگر انہوں نے حکومت کی مخالفت کے بارے میں سوچا تو ان کا بھی یہی انجام ہوگا۔

ولی نے یمن کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”جب اس کے باپ کا قتل ہوا تو کلاڈیا بہت چھوٹی تھی غالباً اس واقعے کو تیس برس یا اس سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا۔“

”درست لیکن ایک بات اور بھی ہے۔ کلاڈیا اور خاندان کے دیگر افراد جانتے ہیں کہ اس کے باپ کو کس نے قتل کیا۔ اس کا نام مارسل مینی تھا۔ وہ ایک طرح کا جعلی ووڈو پجاری تھا اور جہاں وہ رہتا تھا وہاں اس کی شہرت مکر وہات کے رسیا کی تھی۔ دوون پہلے کلاڈیا نے اپنی دکان سے نکلتے ہوئے اسے دیکھا اور اس سے بھی زیادہ بری بات یہ ہوئی کہ اس نے بھی کلاڈیا کو دیکھ لیا۔“

ولی نے اس کے الفاظ پر غور کیا۔ وہ جانتا تھا کہ بیٹی میں پرانی حکومت کے خاتمے کے بعد یہ افواہ پھیل گئی تھی کہ کچھ میکاؤٹ متوتیلین کے رشتے داروں کے انتقام سے بچنے

بال شالوں پر لہرا رہے تھے اور سرخ بلاؤز کے ساتھ نیلے رنگ کا بزنس سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ دونوں کئی سالوں سے ہر مہینے ایک ساتھ مل کر رہتے تھے۔ ایس بہت سے معاملات میں ولی سے کام لیتی تھی۔ اس لیے ان کی اکثر بیشتر ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اس دوران وہ ذاتی اور گھریلو معاملات پر بھی گفتگو کرتے۔ ولی کی خواہش تھی کہ وہ اور زیادہ ذاتی باتیں کریں لیکن ایس پیشہ ورانہ معاملات میں کسی قسم کی ملاوٹ پسند نہیں کرتی تھی۔

عام دنوں کے برعکس اس کے خوب صورت چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا بیگ فرش پر رکھا اور ولی کے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”کس بارے میں؟“

”مجھے کلاڈیا مین نے فون کیا تھا۔ وہ کافی خوفزدہ ہے۔“ ولی اسے اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ بیٹی میں پیدا ہوئی لیکن بعد میں اس نے امریکی شہریت اختیار کر لی اور ایس نے ہی اس کے بچوں کو امریکا لانے میں مدد کی تھی۔ درحقیقت یہ ولی ہی تھا جس نے بیٹی کا سفر کیا اور اس کے دونوں بچوں کو لے کر توسلیت گیا تاکہ ڈی این اے ٹیسٹ کے لیے ان بچوں کا خون لیا جاسکے۔ اس کے بعد ہی انہیں امریکا آنے کی اجازت ملی لیکن یہ سب کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔

”کلاڈیا کا مسئلہ کیا ہے؟“ ولی نے پوچھا۔

ایس آگے کی طرف جھکتے ہوئے پتلی آواز میں بولی۔ ”جب کلاڈیا صرف پانچ برس کی تھی تو اس کے باپ کو قتل کر دیا گیا تھا۔“

ولی نے چونکتے ہوئے کہا۔ ”اچھا! اس نے یہ بات مجھے کبھی نہیں بتائی۔“

”یہ ایسی بات نہیں جو وہ کسی کو بتاتی لیکن اس کے باپ کو انتہائی بے دردی سے قتل کیا گیا تھا کسی نے رات کی تاریکی میں سڑک کے کنارے اس کے گلے پر چھری پھیر دی اور بہت زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کی موت واقع ہو گئی۔ اس کی لاش اگل صبح ملی۔“

ولی جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ ”کیا یہ معلوم ہو سکا کہ کس نے اسے قتل کیا تھا؟“

ایس اپنی آنکھیں کھماتے ہوئے بولی۔ ”اس بارے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہا کہ یہ قتل کس نے کیا۔ وہ ٹوٹون میکاؤٹ تھا۔“

”کیا واقعی؟“ ولی نے پوچھا۔

کے لیے سرمایہ کار بن کر رہے ہیں۔ اگر یہ خبر صحیح تھی تو دلی نے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ یہاں خاموشی سے رہ رہے تھے۔ اس لیے دلی یا پولیس کے پاس ان کے خلاف کارروائی کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

لیکن بعد میں قانون بدل گیا۔ اب امریکا آنے والے پر فرض کو امیگریشن پر حلف اٹھانا پڑتا کہ وہ بھیجی بھی انسانی حقوق کی خلاف ورزی میں ملوث نہیں رہا۔ اس بارے میں جھوٹ بولنا جرم سمجھا جاتا تھا۔ تمام سابقہ میکاؤٹ کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کا مرتکب سمجھا جاتا تھا اور انہیں امریکا میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر یہ شخص مٹی پکڑا جائے اور اسے اپنی واپس بھیج دیا جائے تو اسے یقیناً مار دیا جائے گا کیونکہ وہاں اب بھی لوگ میکاؤٹ سے نفرت کرتے ہیں۔

دلی آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ”یہ ان میکاؤٹ میں سے ایک ہے جو ماضی میں قانونی طور پر یہاں آئے تھے یا یہ بعد میں کسی طرح چھپ کر آ گیا؟“

ایلیس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اس نام کے کسی شخص کو بھی قانونی طور پر آنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ میں نے امیگریشن میں ایک دوست کے ذریعے معلوم کر لیا ہے۔ وہ ضرور بعد میں آیا ہے اور یقیناً اس نے کوئی فرضی نام اختیار کیا ہوگا۔ کلاڈیا جانتی ہے کہ وہ کب اور کیسے یہاں آیا۔ تم اس سے پوچھ سکتے ہو۔“

”اور تمہارا کہنا ہے کہ اس نے بھی اسے پہچان لیا؟ یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ وہ اس وقت بچی تھی جب اس نے اس کے باپ کو قتل کیا؟“

”ایسا نہیں ہے کہ اس نے اسے پہچان لیا لیکن کلاڈیا کا کہنا ہے کہ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں جب اس نے دیکھا کہ وہ اس کی جانب متوجہ ہے۔ ممکن ہے کہ اس شخص نے یہ محسوس کر لیا ہو کہ وہ اسے جانتی ہے۔“

”لہذا اب کلاڈیا خوفزدہ ہے کہ وہ اسے خاموش رکھنے کے لیے اس کا چھپا کرے گا؟“

ایلیس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”صرف یہی نہیں۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان میکاؤٹ کے بارے میں اپنی کی لوک کہانیوں میں کیا کہا جاتا ہے؟“

”مجھے اس کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔“ دلی نے جواب دیا۔

”ازن کے اندر شیطان کی روح ہے۔ یہ بڑی پوری لے کر گھومتے اور بچوں کو اغوا کر لیتے ہیں۔ اب تم سمجھ گئے۔ کلاڈیا کو یہی خوف ہے کہ وہ صرف اسے ہی نہیں بلکہ اس کے

بچوں کو بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔“

کھانے کے دوران ایلیس نے کہا۔ ”مجھے اس بارے میں بہت پریشانی ہے اور صرف تم ہی وہ واحد شخص ہو جو میری مدد کر سکتے ہو کیونکہ تم پہلے سے ان لوگوں سے واقف ہو اور اس جگہ کو بھی اچھی طرح جانتے ہو۔“

دلی شخص سر ہلا کر رہ گیا لیکن اس نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ایلیس اسے کس کام کے لیے تیار کر رہی ہے۔

”تم میرے دوست ہو اور میں تمہیں اپنا ہیرو سمجھتی ہوں۔“ ایلیس نے مزید کہا۔

دلی چونکتے ہوئے بولا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ کلاڈیا کے پاس یہ نہیں ہیں اور مجھے اس کام کا معاوضہ نہیں ملے گا؟“

اس سے پہلے بھی ایسا ہو چکا تھا اور اس نے بھی ایلیس کو انکار نہیں کیا تھا۔ ایلیس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اس کے چہرے پر جمائیں اور بولی۔ ”ہمیں اس کا معاوضہ جنت میں ملے گا۔“

☆☆☆

وہ ساؤتھ بیچ سے روانہ ہوا اور مختلف علاقوں سے گزرتا ہوا اہل بیتی کے قلب میں پہنچ گیا۔ اس نے اپنا کیریئر میای پولیس ڈیپارٹمنٹ میں پٹرول مین کے طور پر شروع کیا تھا اور اس علاقے میں چند راتیں گزار چکا تھا۔ اس زمانے میں اس کے فرائض میں عموماً نقب زنی، جھوٹے موٹے معاشی جرائم اور گھریلو تنازعات کی تحقیقات شامل تھیں۔ اس علاقے میں تشدد کے واقعات بہت کم ہوتے تھے۔ بیتی سے ہجرت کر کے آنے والوں نے وہاں بہت تکلیفیں جیمیں تھیں اور اب وہ مزید کسی مشکل میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔

دلی گاڑی چلاتا ہوا سینٹر ایونیو پر آ گیا۔ جہاں کئی دکانوں کی تزئین و آرائش کر کے جدید بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہاں چرچ کے علاوہ میوزک اسٹور، بیکریاں، ریسٹوران اور گردوسری کی دکانیں تھیں۔ اس بیتی کے آخری سرے پر مشرق کی جانب کلاڈیا کی دکان تھی، جس کی کھڑکی پر بند ہے، کی تختی لگی ہوئی تھی۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ اس طے دلی کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔

وہ مزید دو بلاک آگے جا کر بائیں جانب مڑ گیا اور اسے وہ گلابی مکان تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی جس کے بارے میں ایلیس نے بتایا کہ وہ کلاڈیا کے کزن کا مکان تھا جہاں وہ اپنے بچوں سمیت رہ رہی تھی کیونکہ وہ

نہیں کہہ سکتی کہ اس وقت وہ کیا سوچ رہا تھا۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔
”پھر اس نے کیا کہا؟“

”پہلے تو اس نے کچھ نہیں کہا بلکہ میں وہاں سے مڑی اور اپنے استور کی طرف واپس جانے لگی جیسے کچھ بھول آئی ہوں۔ میں نے اندر سے دروازہ منقل کیا۔ کھڑکی پر بند ہے، کی تختی لگائی اور پچھلے دروازے سے نکل کر گھر کی طرف جانا شروع کر دیا لیکن جب کوئے پر پہنچی تو وہ چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا جیسے مٹی لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے مسکرایا کرتا تھا۔ اس لمحے مجھے یقین ہو گیا کہ یہ وہی تھا۔“

”کیا اس نے تمہارا تعاقب نہیں کیا؟“
”نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ میں جلدی جلدی گھر آئی۔ بچوں سے کہا کہ وہ اپنا سامان باندھیں اور پھر ہم یہاں آ گئے۔“

”اس کے بعد تم نے اسے دیکھا؟“
وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”نہیں، میں نے اسے نہیں دیکھا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میری نگرانی کر رہا ہے۔ عجیب و غریب واقعات پیش آرہے ہیں۔“
”کس قسم کے واقعات؟“

”گزشتہ روز میں نے معمول کے مطابق دکان کھولی۔ ایسٹریک کی وجہ سے مصروفیت زیادہ ہے لہذا میں دکان بند کرنے کا نقصان برداشت نہیں کر سکتی لیکن میں..... پورا دن مٹی سے ہوشیار رہی۔ میں نے اسے نہیں دیکھا لیکن جب اندھیرا ہونے کے بعد میں گھر واپس آ رہی تھی تو مجھے لگا کہ میں نے اپنے پیچھے کسی کے قدموں کی آواز سنی ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا لیکن ایک منٹ بعد میں نے دوبارہ وہی آواز سنی۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ کوئی تاریکی میں آگے بڑھ رہا ہے۔ میں نے آواز دی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بجائے میں نے ایک آواز سنی جیسے کوئی کھڑ کھڑا ہٹ ہو رہی ہو۔“
”جیسے کسی بچے کا جھنجھٹا؟“

”ہاں۔ ایسی ہی آواز تھی لیکن مٹی میں دوؤد کے ماننے والے اسے رسم کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ وہاں یہ رواج ہے کہ جھنجھٹے کو سانپ کی کمر کی ہڈیوں سے بھر دیا جاتا ہے۔“

”اس نے میری طرف دیکھا۔ میں یقین سے

اپنے گھر جانے سے خوفزدہ تھی۔
”ولی نے اپنی گاڑی پورچ میں روکی۔ بارن کی آواز سن کر کلاڈیا باہر آئی۔ اس نے نیلا اسکٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا جس پر گلاب کے پھول کڑھے ہوئے تھے اور اسی رنگ کا سرخ اسکارف اس نے سر کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس نے ولی کو ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہیں بیٹھ کر بات کریں گے ولی۔ میں نے بچوں کو گھر میں رکھا ہوا ہے اور ان سے یہی کہا ہے کہ ہمارے مکان میں کام ہو رہا ہے۔ اس لیے ہم چند روز یہیں قیام کریں گے۔ میں ان پر ظاہر نہیں کرنا چاہتی کہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ میری میری طرح پریشان ہو جائیں۔“
کلاڈیا ایسی عورت تھی جس نے زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کیا لیکن کبھی پریشان نہیں ہوئی مگر اب پچلی بار وہ اس کی خوب صورت آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دیکھ رہا تھا۔

”تم مجھے اس آدمی کے بارے میں بتاؤ؟“ ولی نے کہا۔
”وہ ایک میکاؤٹ تھا لیکن اس سے بڑھ کر ایک عفریت بھی۔ اس نے صرف میرے باپ کو ہی قتل نہیں کیا بلکہ ان برسوں میں کئی لوگوں کو جان سے مار ڈالا۔ کبھی میکاؤٹ چاہتے تھے کہ لوگ ان سے خوفزدہ رہیں۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو وہ ہشت زدہ کر کے ان سے پیسے غارتے یا غیر عورتوں سے ہم بستری کرتے لیکن ان میں کچھ ایسے تھے جو لوگوں کو مار کر خوشی محسوس کرتے اور مارسل مٹی بھی انہی میں سے ایک تھا۔ وہ ہمیشہ سیاہ چشمہ لگائے رہتا۔ اس لیے کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ وہ کسے دیکھ رہا ہے پھر جب وہ کسی ایک شخص کو گھورتا اور اس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ دوڑنے لگتی تو وہ آدمی سوچنے لگتا کہ اب اسی کی باری ہے۔“
”مجھے بتایا گیا ہے کہ تم نے اسے دو دن پہلے دیکھا تھا؟“

اس نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”وہ تقریباً شام ساڑھے چھ بجے کا وقت تھا جب میں سوڈا خریدنے کے لیے اپنی دکان سے باہر آئی۔ ایک آدمی اسی استور سے نکل رہا تھا۔ میں تقریباً اس سے بیس فٹ کے فاصلے پر تھی جب میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کی عمر اٹھ کے قریب ہوئی۔ اس کا چہرہ پہلے ہی پتلا تھا۔ اب اور بھی زیادہ سکڑ گیا ہے۔ میں اپنی جگہ پر رک گئی اور مجھے لگا جیسے میں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔“
”پھر کیا ہوا؟“

”اس نے میری طرف دیکھا۔ میں یقین سے

بہت ہی پراسرار چیز ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس نے تمہیں خوفزدہ کرنے کی کوشش کی۔“

کلاڈیا نے تائید میں سر ہلایا اور بولی۔ ”میں دوڈو پر اعتقاد نہیں رکھتی لیکن اس آواز نے مجھے ڈرا دیا۔ میں اب بھی یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ کون تھا۔ میں نے سوچا کہ شاید کوئی بچہ مذاق کر رہا ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھا... اس نے مزید میرا تعاقب نہیں کیا یا کم از کم میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ میں نے گھر آ کر دروازہ اندر سے بند کر لیا لیکن صبح جب میں دکان پر پہنچی تو میں نے اپنے دروازے پر یہ چیز پڑی ہوئی دیکھی۔“

اس نے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر ایک سرخ رومال نکالا۔ اس میں ایک مجسمہ لپٹا ہوا تھا۔ وہ اتنا چھوٹا تھا کہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ اس نے سیاہ ہیٹ اور لمبا فراک غما کوٹ پہن رکھا تھا۔

”دوڈو کے ماننے والے اسے موت کی علامت سمجھتے ہیں۔“ کلاڈیا نے کہا۔ ”اس کا نام ہارون سمیڈی ہے اور لوگ اس کی صورت کو کالے جادو کے لیے استعمال کرتے ہیں۔“

ولی نے اسے ایک دفعہ اور دیکھتے ہوئے کہا۔ ”بہت گندی شکل ہے۔“

کلاڈیا نے تائید میں سر ہلایا اور بولی۔ ”بالکل اسی کی طرح جو اسے چھوڑ کر گیا ہے۔ میں نے اسے اٹھایا اور وہاں سڑک پر آ گئی۔ دو بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے اسے کوئے پر کھڑا ہوا دیکھا۔ وہ بیٹی ہی تھا اور مجھے دیکھ کر سسکارا ہوا پھر وہ مڑا اور میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ میں یہاں سے چلی جاؤں کیونکہ اسے معلوم ہے کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے۔“

”وہ یقیناً یہاں غیر قانونی طریقے سے آیا ہوگا۔“ ولی نے کہا۔ ”کیونکہ اب یہاں میکاؤٹ کا داخلہ ممنوع ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ فرضی نام سے آیا ہوگا۔ کیا تمہیں کچھ معلوم ہے؟“

”دو سال پہلے بیٹی میں زلزلہ آیا تھا اور شدید زخموں کو علاج کے لیے میامی لایا گیا تھا۔“

”ہاں مجھے یاد ہے۔“

”سننے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ جو زخمی نہیں ہوئے، وہ بھی اپنے سوراخ جسم پر خون آلود پٹیاں لپیٹ کر علاج کی غرض سے یہاں آ گئے۔ انہیں اسپتال لایا گیا جہاں سے وہ غائب ہو گئے۔ سب لوگوں کا یہی کہنا ہے کہ وہ میکاؤٹ تھے۔“

ولی نے اس سے پہلے یہ بات نہیں سنی تھی جبکہ حقیقت

یہ ہے کہ بیٹی سے لوگوں کو سمندر کے راستے اسکل کیا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ پکڑے گئے اور انہیں واپس بھیج دیا گیا اور باقی ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے اور مقامی آبادی میں محل مل گئے۔ غالباً بیٹی بھی اسی طرح آیا ہوگا۔

”تم نے پولیس میں اس واقعے کی رپورٹ درج کیوں نہیں کروائی؟“ ولی نے پوچھا۔

کلاڈیا نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”یہاں کی پولیس ایسی کئی کہانیاں سن چکی ہے۔ جن میں لوگ دوسروں پر نقصان پہنچانے کا الزام لگاتے ہیں۔ ان کے دروازے پر رکی ہوئی مرغی پڑی ہو تو وہ پولیس میں رپورٹ درج کر دیتے ہیں کہ ان کے دشمن کالا جادو کر رہے ہیں۔ اگر پولیس کو بتایا تو وہ یہی سمجھیں گے کہ میں نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔“

”تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ ولی نے کہا۔ ”میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اس کی کیا شناخت ہے۔ میں نے اسے پہلے بھی نہیں دیکھا۔“

”اس کے اندر شیطان چھپا ہوا ہے۔ تم اسے دیکھتے ہی پہچان لو گے۔“

اسی وقت سامنے کا دروازہ کھلا اور اس میں سے دو بچے برآمد ہوئے۔ لڑکی کی عمر تقریباً بارہ سال اور لڑکے کی دس سال تھی۔ وہ دونوں بہت پیارے بچے تھے اور ان میں کلاڈیا کی بہت زیادہ شہادت آ رہی تھی۔

”میں نے تمہیں گھر میں رہنے کے لیے کہا تھا۔“ کلاڈیا ناراض ہوتے ہوئے بولی۔ ”انگل کو ویلو ہوا اور وہاں جاؤ۔ ورنہ مجھے غصہ آ جائے گا۔“

ان کے جانے کے بعد کلاڈیا نے کہا۔ ”میں اپنے بچوں کو اس کے شر سے بچانا چاہتی ہوں۔ میری مدد کرو ولی۔“

”مجھ سے جو ہو سکا وہ ضرور کروں گا۔“ ولی نے کہا۔

حالانکہ اس وقت اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے۔

وہ سیکنڈ اسٹریٹ پر واپس آیا اور اپنی کار سڑک کے کنارے کلاڈیا کے اسٹور کے سامنے کھڑی کر دی۔ اس کے ایک شوکیس میں خواتین کے لمبوسات اور ہینڈلنگر جبکہ دوسرے شوکیس میں پلاسٹر آف پیرس سے بنے ہوئے کٹواری مریم سمیت مذہبی پیشواؤں کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ وہاں سے آدھے بلاک کے فاصلے پر ایک بوڑھی عورت گئے کارس چھ رہی تھی۔ ہینڈلنگ کے زمانے میں ولی اکثر وہاں رک کر گئے کارس پیتا تھا۔ اسے دیکھ کر اس کے دل میں پھر یہ خواہش جاگی۔ ولی نے اس سے تازہ جوس کا ایک

کپ خرید اور کار میں بیچ کر پینے لگا۔

سڑک کے دونوں جانب راہ گیر آ جا رہے تھے۔ ولی کی نظر ایک درمیانے قد کے دپلے پتلے شخص پر پڑی۔ اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی اور اس نے لٹیٹی رنگ کا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ ولی نے پہلے تو اس پر کوئی توجہ نہیں دی پھر ایک منٹ بعد اس نے دیکھا کہ وہی آدمی دوسری جانب سے واپس آیا۔ کلاڈیا کی دکان پر کا اور اس نے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ کئی لمحے گزر گئے پھر وہ شخص مڑا۔ اس نے ولی پر نگاہ ڈالی۔ اپنا ہیٹ اوپر اٹھایا اور ہنسنے لگا۔ ولی لمحہ بھر کے لیے سکتے میں آ گیا۔ وہ شخص دیکھنے میں کوئی پاگل لگ رہا تھا۔ اس کی شکل اور دیکھنے کا انداز بالکل ویسا ہی تھا جو کلاڈیا نے بیان کیا۔ ولی کو یہ جاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ مٹی کے علاوہ کوئی نہیں ہو سکتا۔

وہ کار کا دروازہ کھول کر باہر آ گیا لیکن اس وقت تک وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ ولی اس کی تلاش میں تیز تیز چلتا ہوا بنگلی گلی میں داخل ہوا لیکن وہ وہاں بھی نظر نہیں آیا۔ ولی نے دکانوں کے عقب میں گلیاں بھی دیکھ ڈالیں۔ وہ تقریباً پندرہ منٹ تک اسے تلاش کرتا رہا لیکن مٹی کی بدروح کے مانند غائب ہو چکا تھا۔

ولی واپس اپنی کار میں آیا۔ اس کی نظر ڈیش بورڈ پر لگی جہاں ویسا ہی سیاہ مجسمہ رکھا ہوا تھا جو کلاڈیا کو اپنی دکان کے باہر سے ملا تھا۔ ولی نے اسے اٹھایا اور کافی دیر تک دیکھتا رہا۔ مٹی نے بڑی ہوشیاری سے وہ مجسمہ وہاں رکھا تھا جس سے یہ واضح ہو گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ ولی خوفزدہ نہیں تھا بلکہ وہ کلاڈیا اور اس کے بچوں کے لیے فکر مند تھا۔ ممکن ہے کہ مٹی نے اس کی کار وہاں دیکھ کر سوچا ہو کہ وہ کلاڈیا کی دکان کی حفاظت کر رہا ہے لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اسے کسی طرح کلاڈیا کے موجودہ شکار کے کاظم ہو گیا ہو۔ وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور یہ بات آسانی سے معلوم کی جاسکتی تھی۔

اس نے کلاڈیا کا نمبر ملا یا اور بولا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم بچوں سمیت کسی ایسے جگہ چلی جاؤ جو مل مٹی سے باہر ہو۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ”کیوں؟“

ولی اسے تھوڑی دیر پہلے ہونے والے واقعے کے بارے میں نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس طرح وہ اور زیادہ خوفزدہ ہو جاتی۔ اس نے ٹالنے کے لیے کہا۔ ”یہ محض احتیاطی تدبیر ہے۔ تم کسی ایسے جگہ جانے والے کے پاس چلی جاؤ جو اس علاقے میں نہ رہتا ہو۔ اس طرح ہم دونوں بچوں کے بارے میں پریشان نہیں ہوں گے۔“

”میرا ایک کزن نارٹھ میامی میں رہتا ہے۔ ہم وہاں جا سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ تم ابھی اپنا سامان پیک کر دو اور وہاں چلی جاؤ۔“

ولی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایس کے دفتر آ گیا۔ وہ اس وقت کسی کلائنٹ سے مصروف گفتگو تھی۔ اس کے ہاتھ کے بعد اس نے ولی سے کہا۔ ”اب بتاؤ سڑک ٹھیک ہے؟“

ولی نے اسے کلاڈیا سے ہونے والی گفتگو تفصیل سے بتادی۔ پھر اس کی میز پر وہ مجسمہ رکھ دیا جو اسے ڈیش بورڈ سے ملا تھا۔

ایس نے چند سیانی ہوئی آنکھوں سے اسے دیکھا اور بولی۔ ”مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگا۔“

”میرا ابھی یہی کہنا ہے۔“ ولی بولا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ جب میں کلاڈیا سے ملنے گیا تو مجھے یقین نہیں تھا کہ مارسل مٹی نے ہی اس کے باپ کو قتل کیا ہوگا۔ اس نے اسے تیس سال پہلے دیکھا تھا اور شاید یہی بات اس کے تصور میں تھی۔ مٹی اس کے دماغ میں بس کر رہ گیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ شخص وہ نہ ہو۔ شاید یہ کوئی دیوانہ ہے جو اسے پسند کرنے لگا ہے اور بے وقوفوں جیسی حرکتیں کر رہا ہے۔“

ایس نے وہ مجسمہ اٹھایا اور اس پر اپنی مخروٹلی انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ”کلاڈیا کوئی اسکول گرل نہیں جو آسانی سے خوفزدہ ہو جائے۔ وہ ایک معتدل مزاج کی بروہار عورت ہے۔ اگر وہ کہتی ہے کہ اس نے اس آدمی کو پہچان لیا ہے تو ہمیں اس پر یقین کر لینا چاہیے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ اس طرح کیوں کر رہا ہے۔ ایک ایسا شخص جو قاتلوں سے بھاگا ہوا ہو، اس کا یہ رویہ ناقابل فہم ہے۔“

ولی نے اپنی کمر کرسی کی پشت سے لگائی۔ ”میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ جن لوگوں کے پاس کبھی دوسروں کو خوفزدہ یا دہشت زدہ کرنے کی طاقت تھی، وہ اس کے عادی ہو جاتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ ان کا کیا اثر باقی رہ گیا ہے۔ کلاڈیا نے مٹی کو دیکھا اور خوفزدہ ہو گئی۔ مٹی یہی چاہتا ہے اور مجھ پر بھی یہی ظاہر کر رہا ہے کہ وہ مجھ سے خوفزدہ نہیں ہے۔“

ایس نے اپنا سر اس طرح ہلایا جیسے وہ کسی خیال کو جھٹکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ ”پاگل۔“

”شاید وہ پاگل ہی ہو۔ ان برسوں میں اس کے دماغ پر شیطان سوار رہا ہے۔ وہ یقیناً پاگل نظر آتا ہے اور اسی وجہ سے وہ غیر معمولی خطرناک ہو گیا ہے۔ اسی لیے ہم

اسے کلاڈیا کے قریب آنے اور اسے نقصان پہنچنے کا خطرہ
مول نہیں لے سکتے۔“

”پھر ہم کیا کریں؟“

”اگر ہمارے پاس اس کی کوئی تصویر ہوتی تو اسے
پورے علاقے میں پھیلا دیتے اور میں اس کے دوبارہ نظر
آنے کا انتظار نہیں کر سکتا لیکن شاید ہم اس کے پاگل پن کو
اپنے فائدے کے لیے استعمال کر سکیں۔ ہمیں اپنے
پروگرام کے مطابق اسے باہر نکالنا ہوگا۔ ہم چاہتے ہیں کہ وہ
کلاڈیا کی دکان یا کسی اور جگہ یہ سوچ کر آئے کہ وہ وہاں
موجود ہوگی اور میں اس کا انتظار کر رہا ہوں گا۔“

ایلس سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ”کیا اس کا یہ مطلب
ہے کہ تم کلاڈیا کو چاہے کے طور پر استعمال کر رہے ہو؟ کیا یہ
کچھ خطرناک نہیں ہے؟“

ولی نے کہا۔ ”تم پریشان مت ہو۔ میں اسے کچھ نہیں
ہونے دوں گا۔ یہ فول پروف تو نہیں لیکن اگر ہم نے اسے
ورغلا لیا تو میں اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دوں گا پھر ہم
یہ ثابت کر سکیں گے کہ وہ بیٹی ہی ہے اور اسے مجرم ہونے کی
بتا کر جیل بھیج دیا جائے گا۔“

”لیکن تم اسے کیسے ورغلاؤ گے؟“

”فی الوقت میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں
ہے۔ میرے یہاں آنے کی بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمیں
لوگوں کو ورغلا نا آتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس معاملے میں
تم سے کچھ مدد لوں۔“

ایلس اپنی آنکھیں سمھاتے ہوئے بولی۔ ”یقین کرو
کہ میں نے کسی میکاؤٹ کو نہیں ورغلا یا۔“

اس نے ایک بار پھر اپنی کرسی کو اس طرح گھمانا
شروع کر دیا جیسے مسئلے کے بارے میں سوچ رہی ہو۔ کافی
دیر تک وہ دونوں خاموش رہے پھر اچانک ایلس نے کہا۔
”میں سمجھ گئی کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ہم الفریڈ ویڈال سے ملنے
چاہیں گے۔“

ولی منہ بتاتے ہوئے بولا۔ ”یہ کون ہے؟“

”الفریڈ ایک ریڈیو اسٹیشن چلاتا ہے۔ یہ ایسا علاقے
میں واقع ہے اور سب لوگ اسے باقاعدگی سے سنتے ہیں۔
وہاں سے بیٹین میوزک کے علاوہ بیٹی کی تازہ ترین خبریں
بھی نشر ہوتی ہیں۔ ہم اپنے شکار کو ورغلا نے کے لیے الفریڈ
کی مدد حاصل کریں گے۔“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ ہماری مدد کرے گا؟“

اس سے پہلے ہی ایلس اپنی کرسی سے کھڑی ہو گئی

شناخت

ایک صاحب ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔
انہوں نے ویٹر کو بریانی کا آرڈر دیا۔ ایک گھنٹا گزر گیا،
ویٹر واپس نہ آیا۔ وہ صاحب جھنجھلائے بیٹھے تھے۔
وقت گزرتا رہا اور وہ تھماتے رہے۔ انہوں نے فیجر کو
بلا کر کہا۔ میں نے ویٹر کو بریانی لانے کا کہا تھا۔ اتنی دیر
گزرتی محترم واپس نہیں آئے۔ فیجر نے یہ سن کر چند
لمحے رک کر سوچا۔ سر! کیا اس کی ڈاڑھی مٹی؟ وہ صاحب
فیجر کی جرح سے جھنجھلا کر بولے۔ پہلے تو نہیں تھی، اب
ضرور نکل آئی ہوگی۔

ضروری

کہتے ہیں جو لڑکی سے ملنے سے پہلے اپنے بال
درست کرنے لگے وہ جوان اور جو نہ کرے سمجھ میں وہ
یوڑھا ہو گیا۔

حالانکہ جوانی میں بندہ بال درست تو کرتا ہے مگر
ملنے کے بعد۔ جہاں تک بڑھاپے کا تعلق ہے، اس میں
بال درست کرنے کے لیے لڑکی کا ہونا اتنا ضروری نہیں،
جتنا بالوں کا۔

مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

تھی۔ اس نے اپنا پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کئی
سال پہلے اس کی دادی کو یہاں لانے میں مدد دی تھی جب
اس کے لیے مشکلات پیدا کی جا رہی تھیں وہ ضرور ہمارا کام
کرے گا۔“

ریڈیو سیریل کے اسٹوڈیو سیکنڈ ایوینو سے آدھے
بلاک کے فاصلے پر تھے جو کہ لٹل بیٹی کا رہائشی علاقہ تھا۔ اس
کے ایک مکان میں وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہائش
پزیر تھا۔ اس کے پیچھے مچھ میں بلاک کی چار دیواری بنا کر
ایک کمر اکھڑا کیا اور اس پر ایلیکٹریسیٹ کی نالی دار چھت ڈال
دی جس پر ایک پندرہ فٹ اونچا اینٹینا نصب تھا۔ اس کمرے
میں کوئی کھڑکی نہیں تھی اور چھت پر تین بلب روشن تھے۔
اس کے علاوہ دو کمپیوٹر اسکرین، کنٹرول تختل اور دو عدد
مائیکروفون بھی وہاں نصب تھے۔ کمرے کو ساؤنڈ پروف
بنانے کے لیے چھت کی اندرونی سطح پر کارڈ بورڈ لگا دیا گیا
تھا۔ کنٹرول بورڈ کے پیچھے الفریڈ بیٹھا ہوا تھا جو ہیک وقت
ڈی جے، نیوز کاسٹر، رپورٹر، بیٹین اور ریڈیو اسٹیشن کے

مالک کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

اس نے مسکراتے ہوئے ایلس کو دیکھا اور بولا۔

”آج تم کیسے ادھر کا راستہ بھول پڑیں؟“

ایلس نے دلی کا تعارف کر دیا اور بولی۔ ”ہمیں

ایک سنجیدہ معاملے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔“

الفریڈ اپنے بازو پھیلاتے ہوئے بولا۔ ”ضرور، مجھ

سے جو ہر سکاہہ کروں گا۔“

”تم کلاڈیا جین کو جانتے ہو؟“

”ہاں۔ وہ ہمارے اسٹیشن پر اشتہار دیتی رہتی

ہے۔“

ایلس نے اسے کلاڈیا کے ساتھ ہونے والے واقعات

کے بارے میں بتایا۔ پوری بات سننے کے بعد الفریڈ نے

کہا۔ ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

”ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے ریڈیو پر اس کی دکان کے

بارے میں کچھ اعلانات کرو۔ اتوار کو ایئر سے اور کلاڈیا نے

ڈھیروں تحائف اور مذہبی اشیاء بیچنے کے لیے رکھی ہوئی ہیں۔

تم یہ اعلان کرو کہ کلاڈیا کی دکان ہفتے کی شب رات دس

بچے تک کھلی رہے گی تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ خریداری

کر سکیں۔“

الفریڈ بولا۔ ”گویا تم اس آدمی کو پھانسنے کی کوشش

کر رہے ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ وہ یہ اعلان سننے کے بعد

کلاڈیا کے گھر جانے کا انتظار اور اس کے ساتھ کچھ کرنے کی

کوشش کرے گا۔“

دلی کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”ہم اس کے ماضی

مے بارے میں جانتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کلاڈیا کو

خوفزدہ کرنا چاہتا ہے اور شاید اسے نقصان بھی پہنچائے۔ یہ

بھی ممکن ہے کہ وہ یہ اعلان نہ سنے اور اگر سن لے تب بھی

کچھ نہ کرے۔ ممکن ہے کہ اسے اندازہ ہو جائے کہ اس کے

لیے جال بچھا جا رہا ہے لیکن ہم اسے سامنے آنے پر اکسا

سکتے ہیں۔ اس کے بعد اسے قابو کرنا مشکل نہ ہوگا۔“

الفریڈ نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا کہ وہ یہ اعلان

سن لے۔ میں لوگوں کو بتاؤں گا کہ کلاڈیا کی دکان آج سارا

دن اور کل رات تک کھلی رہے گی۔ میں اس کا کوئی معاوضہ

نہیں لوں گا۔ شاید اس طرح ہم اسے پکڑ سکیں۔“

وقت واپس جاتے ہوئے ایلس اور دلی نے اس کے

ساتھ ساتھ ایک اور منصوبہ بھی تیار کیا۔ کوکہ دلی کو احساس تھا

کہ اس طرح کے اضافی منصوبوں یا اسکیموں سے کوئی فرق

نہیں پڑے گا کیونکہ ان کا واسطہ ایک پاگل انسان سے ہے۔

اسے درغلز کر گھیرنا ایک اچھا آئیڈیا تھا لیکن اس بارے میں

یہ سوچنا کہ اس کے بعد وہ کیا کرے گا، بالکل بے سود تھا

کیونکہ پاگل لوگ کسی بھی منصوبے میں فٹ نہیں ہوتے لیکن

ایلس اور دلی اس انداز میں نہیں سوچ رہے تھے۔ اس لیے

انہوں نے ایک جال تیار کر لیا۔

ایلس اس بات پر رضامند ہو گئی کہ فون کر کے کلاڈیا

کو بھی اعتماد میں لے لیا جائے۔ اس منصوبے میں ایک

خاتون سیکورٹی اہلکار کی بھی ضرورت تھی۔ اس کا انتظام دلی کر

کرنا تھا۔ اس نے گھر آ کر سروریل نیویل کا نمبر ملایا۔ وہ

میامی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں کام کر چکی تھی اور اس نے

ریٹائر ہونے سے پہلے شہر کے چند حساس مقامات پر فرائض

انجام دیے تھے۔ ان دنوں وہ... وقتاً فوقتاً سیکورٹی کے

حوالے سے دلی کی مدد کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کام کے لیے

ایک مضبوط اور مناسب شخصیت تھی۔ اس کا فون سننے ہی وہ

خوشی سے چپکتے ہوئے بولی۔

”کیا ہو رہا ہے دلی؟ کیا تمہارے پاس میرے لیے

کوئی کام ہے؟“

”ہاں۔ اگر تم کرنا چاہو۔ یہ کام تو بڑا خطرناک ہے۔“

وہ چپچہاتے ہوئے بولی۔ ”تم مجھے جانتے ہو دلی۔

میں خطرناک کام ہی کرتی ہوں۔“

دلی نے اسے کلاڈیا کے مسئلے کے بارے میں بتایا اور

اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ پوری بات سننے کے بعد

وہ بولی۔ ”تم پریشان مت ہو دلی۔ میں تیار ہوں۔“

دلی نے تفصیل سے سمجھایا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ ”تم

کل رات ٹھیک ساڑھے نو بجے اس کی دکان پر پہنچ جانا اور

اپنا پرانا سروریل ریو لوور بھی لیتی آنا۔ شاید اس کی ضرورت

پڑ جائے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں پہنچ جاؤں گی۔“

اگلے روز صبح کلاڈیا اپنے کزن کے ساتھ دکان پر آئی

جو سارا دن اس کے ساتھ کام کرتا تھا، یہ بھی اس منصوبے کا

حصہ تھا۔ وہ ایک مضبوط جسم کا نوجوان گریٹر نیویل تھا جسے بیک

وقت سیز کلرک اور پاڈی گارڈ کے فرائض انجام دینا تھے۔

دلی کا خیال تھا کہ مینی انڈر امپلینے سے پہلے نہیں آئے گا اور

اگر وہ دن کی روشنی میں آ گیا تو اس سے ششپن کے لیے

گریٹر نیویل ہی کافی ہوگا۔

آٹھ بجنے میں چند منٹ باقی تھے جب وہ لال بٹی کے

علاقے میں داخل ہوا۔ اس نے اپنی کار کلاڈیا کی دکان سے

دو بلاک کے فاصلے پر ایک سائڈ اسٹریٹ میں ٹھہری کی۔ وہ

پیدل چلتا ہوا سینڈ اسٹریٹ تک آیا اور صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ دکان میں کئی گاٹک موجود تھے جو اضافی وقت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خریداری کر رہے تھے۔ دلی نے کچھ دیر تک انتظار کیا پھر دو عمارتوں کے درمیان واقع ایک تنگ گلی میں چلا گیا۔ وہاں سے وہ کلاڈیا کی دکان پر نظر رکھ سکتا تھا۔

ٹھیک آٹھ بجے گریزول نے اپنی شفٹ ختم کی اور کلاڈیا کو اکیلا چھوڑ کر چلا گیا۔ یہ بھی پہلے سے طے شدہ تھا کہ گریزول اس سے مشتق نہیں تھا لیکن دلی نے اسے قائل کر لیا کیونکہ مینی کو باہر نکالنے کا بھی ایک طریقہ تھا۔ اس نے گریزول سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی کزن کا پورا خیال رکھے گا۔ اگلے ایک گھنٹے تک وہ دکان کی نگرانی کرتا رہا۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے اس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے موریل بول رہی تھی۔

”میں یہاں آگئی ہوں دلی۔“ اس نے اپنی کار دکان کے عقب میں کھڑی کی تھی۔
 ”وہاں غریب دو جاویں کوئی اور تو نہیں؟“
 ”نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اندر چلی جاؤ۔“
 دو منٹ بعد کلاڈیا اسٹور کے عقبی حصے میں واقع اسٹاک روم میں چلی گئی پھر چند لمحوں بعد اس کی واپسی ہوئی لیکن وہ کلاڈیا نہیں بلکہ موریل تھی۔ اس نے بھی سیاہ لباس اور سر پر سرخ رومال لپیٹا ہوا تھا جبکہ کلاڈیا پیچھے سے نکل کر گھر چلی گئی۔ اس طرح منصوبے کا یہ حصہ مکمل ہو گیا۔
 اگلے آدھے گھنٹے تک موریل دکان کی مالک کی طرح حرکتیں کرتی رہی۔ کبھی سامان کو ترتیب سے رکھتی۔ کبھی جھاڑ پونچھ کرتی۔ وہ بار بار گھڑی دیکھتی رہی تاکہ وقت پر دکان بند کر دے، اس دوران کوئی بھی دکان میں داخل نہیں ہوا اور نہ ہی وہاں سے گزرا۔

دس بجے کے قریب اس نے اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر کندھے پر لٹکایا۔ دکان کی روشنیاں بجھائیں۔ باہر نکل کر تالا لگایا اور کلاڈیا کے مکان کی جانب چل دی۔ وہ خالی سڑک پر بڑے سکون سے چلی جا رہی تھی۔ دلی نے دیکھا کہ اس کا رخ شمال کی جانب تھا اور کوئی بھی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا وہ اس گلی سے باہر نکل آیا اور ایک بلاک کا فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔

منصوبے کے مطابق موریل نے سینڈ اسٹریٹ پر دوبلاک کا فاصلہ طے کیا اور پھر کمرشل ایریا کو چھوڑ کر بائیں

جانب مڑ گئی۔ یہ ایک ٹوٹی پھوٹی سڑک تھی جس پر ایک خستہ حال چرچ، کچھ پرانی دکانیں اور ایک خالی میدان تھا جہاں دن میں عارضی بازار لگتا تھا۔ دلی پوری طرح چوکس تھا کہ مینی کسی وقت بھی تاریکی سے براہمد ہو سکتا ہے۔ موریل آگے بڑھتی رہی لیکن کوئی نمودار نہیں ہوا۔

ایک بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد موریل نے سڑک پار کی۔ لچھیرے کے لیے دلی کی جانب دیکھا اور ایک بغلی سڑک پر غائب ہو گئی جو مغرب کی جانب جا رہی تھی۔ دلی نے بھی اپنی رفتار تیز کر دی تاکہ وہ زیادہ دیر تک اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہے۔ یہ سڑک بہت زیادہ تنگ اور تاریک تھی۔ مکانات درختوں سے گھرے ہوئے تھے اور لگتا تھا کہ ان میں کوئی نہیں رہتا۔ یہاں کوئی بھی چھپ کر موریل پر حملہ آور ہو سکتا تھا لیکن وہ وہاں سے گزرتی چلی گئی اور کسی نے مداخلت نہیں کی، جب دلی نے سوچنا شروع کر دیا کہ مینی کو پھانسنے کی کوشش کھنص وقت کا باز یا ثابت ہو گئی شاید۔

موریل اگلے کوٹے پر پہنچ کر شمال کی جانب مڑ گئی۔ وہ بھی اسی سڑک پر پہنچ گیا اور دوبارہ اس کے تعاقب میں جانے ہی والا تھا جب اس نے اپنے عقب میں ایک آواز سنی۔ اس نے مڑ کر دیکھا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ موریل نے یہ آواز نہیں سنی اس لیے وہ چلتی چلی گئی۔ دلی نے اسے جانے دیا اور اپنی رفتار آہستہ کر کے محتاط انداز میں جنوب کی طرف دیکھنے لگا جہاں سے وہ آواز آئی تھی۔

چند لمحوں بعد وہ آواز دوبارہ آئی جیسے بہت سی ہڈیاں مل رہی ہوں۔ اس بار یہ آواز تاریک مکانات کے عقب سے آئی تھی۔ دلی سمجھ گیا کہ اسے پھنسا یا جا رہا ہے۔ مینی نے کلاڈیا کو چھوڑ کر اپنی توجہ اس پر مرکوز کر دی تھی۔ اس نے اپنی کن ٹکالی اور آگے بڑھ گیا۔ اب وہ ایک گلی کے سرے پر کھڑا ہوا تھا جو مکانات کے عقبی صحن کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر اندھیرے میں ایک شخص کھڑا ہوا نظر آیا جسے دلی نہیں پہچان سکا لیکن دوسرے ہی لمحے وہی آواز دوبارہ آئی۔ جیسے ہی دلی اس کی جانب بڑھا، اس شخص نے گلی کی جانب دوڑ لگادی۔ دلی نے بھی اس کا تعاقب کیا۔ مینی نے سڑک پار کی اور آگے کی جانب بڑھتا چلا گیا پھر آدھے بلاک کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ بائیں جانب مڑا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دلی دوڑتا ہوا اس جگہ تک آیا اور خشک کر رک گیا۔ وہ ایک لوہے کا گیٹ تھا جو ایک خستہ حال لکڑی کے مکان کے صحن میں مکمل رہا تھا۔ وہ سارے مکان تاریکی میں ڈوبے

ہوئے تھے۔ یہ اندرون شہر کا تباہ حال علاقہ تھا اور ان میں رہائش مزدک ہو چکی تھی۔ اس مکان کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں سے وہی آواز آرہی تھی۔

دلی تھوڑا سا چپکاپچا۔ یہ مکان اس کے لیے ایک جال تھا جس میں اسے داخل ہونے کی ترغیب دی جا رہی تھی لیکن وہ اس کے علاوہ کیا کر سکتا تھا۔ اس کے پاس پولیس کو فون کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ مٹی نے کلاڈیا کو دیکھ کر مسکرانے، اسے ڈرانے اور اس کے دروازے پر بمبوسر چھوڑنے کے سوا کیا کیا تھا، اس لیے دلی کو خود ہی کچھ کرنا تھا۔

وہ گیٹ سے گزر کر اندر داخل ہوا اور دیوار کے ساتھ ساتھ رہینگتا ہوا دوسرے دروازے تک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے کن پکڑ رکھی تھی۔ پورے گھر میں تاریکی اور ایک ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے نٹول کر سوچ کھلاش کیا لیکن روشنی نہیں ہوئی۔ اس گھر میں بجلی نہیں تھی۔ وہ آواز اب بھی آرہی تھی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کوئی گھٹنا رہا تھا۔

اس نے بہ آواز بلند پکارا۔ ”مٹی!“

اسے سانپ کی ہڈیوں کی آواز اور کسی کی بڑبڑاہٹ کے سوا کچھ نہیں سنائی دیا۔ وہ ہال کی طرف بڑھا۔ اس کے بالکل سامنے کارڈ بورڈ کی چھت کا ایک ٹکڑا گر کر لٹکا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کا راستہ رک گیا۔ وہ اس رکاوٹ کے پاس سے گزرتا ہوا دوسری ڈیوڑھی تک پہنچا اور جیب سے موبائل نکال کر اس کی ٹارچ روشن کر دی۔ اس نے روشنی کا رخ دائیں جانب ایک چھوٹے سے کمرے کی طرف کیا، جہاں ایک میلا سا گدا پڑا ہوا تھا اور اس پر لمبی ہی چادر بھی چھپی ہوئی تھی۔ گدے کی چاروں طرف بھی ہوئی موم تیلیوں کا موم پڑا ہوا تھا۔ گویا یہ جگہ مٹی کا ٹھکانا تھی۔

وہ آگے بڑھا۔ دوسرے کمرے سے اسے موم بتی کی مدھم روشنی دکھائی دی۔ وہ لیونگ روم تھا، جس کی کھڑکیاں ٹوٹ چکی تھیں اور یوسیدہ غیر نجربا کارہ ہو چکا تھا۔ اس کمرے کی چھت بھی خستہ حالت میں تھی اور کسی بھی وقت گر سکتی تھی۔ لہذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔

اس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور کمرے کے آخری سرے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہاں اس نے مٹی کو دیکھا۔ وہ ایک قربان گاہ کے سامنے کھڑا ہوا تھا جو کلڈی کی ایک چوکور میز پر بنی ہوئی تھی۔ وہاں ایک چھوٹی سی موم بتی جل رہی تھی۔ ارد گرد مچھائے ہوئے پھول، شراب کی خالی بوتلیں، گلے سڑے پھل اور دو کھوپڑیاں پڑی ہوئی

تھیں۔ مٹی نے بھی دوڑ و عقیدے کے مطابق موت کے فرشتے کا روپ دھار رکھا تھا۔ اس جیسے کی طرح اس نے بھی سیاہ ہیٹ اور لہا سیاہ کوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے بائیں ہاتھ سے جھنجھٹا بجایا اور دائیں ہاتھ سے پکڑا ہوا چاقو اپنی گردن تک لے گیا۔

”چاقو پھینک دو۔“ دلی نے اپنے اندرونی خوف پر قابو پاتے ہوئے کہا اور گن کار میں مٹی کی جانب کر لیا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور اس نے دلی کی جانب بڑھنا شروع کر دیا۔ دلی کے پورے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ وہ بھی مغربی قربان گاہ کی بیھشت چڑھنے والا ہے اور مٹی اس کا بھی سر کاٹ کر میز پر رکھ دے گا۔ اس کے پاس اپنے بچاؤ کی ایک ہی صورت تھی کہ وہ مٹی پر گولی چلا دے لیکن اس سے پہلے ہی وہ کچھ ہو گیا جس کی اسے بالکل بھی توقع نہیں تھی۔

دلی نے اس کا نشانہ لیا، یہی تھا کہ اس کے عقب سے ایک آواز آئی۔ ”رک جاؤ۔“ پھر موریل دوڑتی ہوئی اس کے پاس سے گزری اور اس نے مٹی کے گھٹنے پر زوردار لات رسید کی۔ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور لڑکھڑاتا ہوا فرش پر گر گیا۔ موریل نے جیب سے روشنی ڈوری نکالی اور اس کے دونوں ہاتھ پشت سے باندھ دیے پھر اس کا چاقو رومال میں لپیٹ کر دلی کو دیتے ہوئے بولی۔ ”پولیس کو فون کرو۔“

دلی نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو ہمارے منصوبے میں شامل نہیں تھا۔“

”ہاں لیکن جب یہ شخص میرے تعاقب میں نہیں آیا تو میں سمجھ گئی کہ اس نے اپنا ہدف تبدیل کر لیا ہے اور اب یہ تمہارے لیے جال بچھا رہا ہے چنانچہ جب تم اس پر اسرار آواز کا پچھا کرتے ہوئے آگے بڑھے تو میں بھی فاصلہ رکھ کر تمہارا تعاقب کرنے لگی۔ میرا خیال درست نکلا۔ اگر میں بروقت نہ پہنچتی تو تم دونوں میں سے ایک کی موت یقینی تھی۔“

دلی نے یہ سوچ کر سکون کا سانس لیا کہ اس کے ہاتھوں ایک خون ہونے سے رہ گیا۔ مٹی کے چاقو پر اس کی انگلیوں کے نشانات اور پراسرار قربان گاہ اسے حملہ آور ثابت کرنے کے لیے کافی ہوتے، اس کے علاوہ اس پر امریکا میں ناجائز طور پر داخلے، غیر قانونی قیام اور کلاڈیا کو ہراساں کرنے کے الزامات بھی تھے۔ اگر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکا تب بھی اسے ملک بدر کر دیا جائے گا اور اس طرح کلاڈیا ہمیشہ کے لیے اس کے خوف سے آزاد ہو جائے گی۔



شہدات

زویا اعجاز

کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام عقل و شعور اور دانائی انسان میں نہیں بلکہ مقدر میں محفوظ کر دی ہے۔ کبھی نشیب تو تقدیر کی نارسائی کا نوحہ اور کبھی فراز تو مقدر کی مہربانی۔ وہ جو خود کو لفظوں کا جادوگر سمجھتا تھا جانے کیسے اس کی نفرت کے طلسم کدہ میں قید ہو گیا اور نفرت و حسد کے جذبات کی آگ میں اس نے نہ صرف اپنے مستقبل کو جلا ڈالا بلکہ اپنے شاندار ماضی کو بھی راکھ کر لیا۔ ایسا ہی ہوتا ہے جب انسان خود کو عقل کل سمجھ بیٹھے تو اکثر تیز طوفان اس کی کشتی کو بہنور میں ڈال کر تماشادیکھتے ہیں۔

ایک ایسے بازیگر کا قصہ جس کی کتاب زیت میں

فکست کہیں نہیں لکھا تھا

دلوں میں ایک نئی ترنگ پیدا کر دیتی ہے اور بالآخر میرے ”دفین“ بن جاتے ہیں۔

قاری اور لکھاری کا یہ رشتہ بھی بہت اٹوکھا ہوتا ہے۔ الفاظ کی ڈور سے بندھا ایک بے عنوان قلبی تعلق استوار ہو جاتا

میں ایک کامیاب لکھاری ہوں۔ الفاظ میرے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں۔ ہری انگلیوں کی جنبش سے ہر روز صفحہ قرطاس پر ان لفظوں کی لہلیں رقص کرتی ہیں اور پھر اس رقص کی تال میل قارئین کے

ہے جو وقت کی ناؤ کے ساتھ بہتا ہوا کبھی بے حد کامیاب رہتا ہے اور کبھی محض ایک کسک بن کر رہ جاتا ہے۔ آج جانے کیوں اپنی کہانی لکھنے کے لیے بھی دل چل اٹھا۔ خوش خوشی کاغذ قلم تھا تو کچھ ہی لمحوں میں اندازہ ہو گیا کہ خود احتسابی کے عمل سے گزرناس قدر محض ہوتا ہے۔

میرا نام رانا راجیل ہے..... اور میں ایک لکھاری ہوں۔ لکھنا میرا جنون ہے لیکن پیسے کے اعتبار سے میں ایک ”بینکار“ ہوں۔ ممکن ہے بینکاری اور تخلیقی سفر کا یہ ملاپ آپ کے لیے بہت اٹوکھا ہو لیکن جب آپ میرے الفاظ کی انگلی تھامے میری دنیا کی سرکریں گے تو یہ چھوٹی موٹی الجھنیں دور ہوتی جائیں گی۔ حیثیت لکھاری یہ بات مجھ سے بہتر کوئی نہیں جانتا کہ زندگی میں ہر کہانی کی داغ بیل بچپن میں ہی پڑ جاتی ہے اور پھر مستقبل میں پیش آنے والا ہر واقعہ اسی کی کڑی ثابت ہوتا ہے۔ میرا بچپن بھی بہت دلچسپ تھا۔ گروہ کے سبھی لڑکے شرارتوں میں اپنی مثال آپ تھے اس لیے ہم ”تخریب کار“ کے نام سے مشہور ہو چکے تھے۔

شاد رہے کہ چرچہ گلیوں میں سننے کھیلنا، چمت پر دوستوں کے ساتھ مل کر چٹائیں اڑانے کے بعد بھی اگر وقت بچ جاتا تو ہم سبھی لڑکے دو پائے راوی کی لہروں کے ساتھ نہ نئے مشغلے تخلیق کر لیتے تھے۔

ان دنوں اس علاقے میں دس سال قبل پڑوسی ملک کی افواج کے ایک ناکام حملے کی یادداشت راوی کا پل توڑنے کی کوشش کے احوال نے لوک درٹے کی حیثیت اختیار کر لی تھی اور اس دریا کی حیثیت بھی ہم سب کے لیے کسی بھی پینٹلج سے کم نہ تھی۔ ہاں! تو میں بتا رہا تھا کہ میرا بچپن درجوں میں تقسیم تھا۔

☆☆☆

”راجیل! کدھر غائب تھے صبح سے؟“ گھر میں داخل ہوتے ہی میری سماعت میں بڑے بھائی کی آواز آئی۔
”میں اپنے درختوں کے ساتھ راوی کے کنارے کھیل رہا تھا۔“ میں نے مصومیت سے جواب دیا۔

”میرے کمرے میں چند سوٹ پڑے ہیں..... وہ دھوپ کو دے آنا..... کلف لگا کے اچھی طرح استری کرنی ہے۔“ انہوں نے حسب سابق میرے لیے کام کی ایک فہرست تیار کر رکھی تھی۔

”جی بہتر..... میں ابھی دے آتا ہوں۔“ میں نے تابع داری سے سر جھکا کر کہا تو انہوں نے اپنے بیٹے سے دو روپے کا ایک نوٹ نکال کر مجھے تھما دیا۔

صحن کے کونے میں موجود وینڈ پمپ سے پانی نکال کر میں

نے ہاتھ منہ دھوئے ہی تھے کہ ایک اور آواز سماعت میں پڑی۔
”راجیل! لائبریری سے میری کتابیں لے آئے کیا؟“
یہ میرے دوسرے بھائی تھے جو مطالعے کے بہت شوقین تھے۔ علاقے میں موجود واحد لائبریری سے ان کی گاڑی چھٹی تھی اس لیے مجھے رابطہ کا ذریعہ بنا کر اکثر کتابیں منگوایا کرتے..... وہ ذاتی آمدورفت سے اجتناب ہی کرتے تھے کیونکہ کتابوں سے سر اٹھانا انہیں پسند ہی نہ تھا۔
”آپ کی الماری میں رکھ دی تھیں۔“ میں نے وہیں سے تان لگائی۔

”میں نے دیکھی ہی نہیں..... آئندہ جب بھی کتابیں لاؤ تو میری میز پر رکھا کرو۔“ انہوں نے تحسانہ انداز میں کہا۔
”ہونہہ! ان سے فرصت ملتی تو الماری دیکھی ہوتی نا..... خواہ مخواہ رعب جٹانا آتا ہے بس مجھ پہ..... ہڈ حرام نہیں کے.....“ میں نے دل ہی دل میں کہا۔

”جی بہتر! آئندہ خیال رکھوں گا۔“ میں نے ایک بار پھر مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

صدیق بھائی بہت خوش ہوئے اور مجھے فوری انعام سے نوازا دیا۔

شام کو دوستوں میں شچی مارنے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے دونوں جانب سے ٹی۔”رقوم“ نعت تھیں۔ میری اس تابع داری کی اصل وجہ بھی یہی تھی..... ورنہ منہ میں زباں تو ہم سبھی رکھتے تھے۔

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹا تھا اور اسی ناتے بڑے بھائیوں کے فراموشی پر دو گرام پورے کرنے کی ذمے داری میرے ناواں کندھوں پر ہی تھی۔ میرے دونوں بھائی ذہانت اور جنیدگی میں بے مثال تھے۔

بڑے بھائی حمید یونیورسٹی میں جرنلزم کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ انہیں کلف دار شلوار قمیض پہننے کا بہت شوق تھا۔ دھوپ کی دکان پر چکر لگاتے تھے، میں ان کتابت کا شکار ہو جاتا تھا لیکن انہیں اپنی بلبلا ہٹ جتانے کی غلطی بھی بھی نہیں کر سکتا تھا۔

صدیق بھائی کولتیر پچ پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ یوں تو ہمارے گھر میں سگریٹ پان کے نشے کو بہت محبوب سمجھا جاتا تھا لیکن جانے کیوں اما جان نے بھی بھی صدیق بھائی کو کتب بینی کے نشے سے روکنے کی زحمت ہی نہ کی۔ وہ کھانا کھاتے ہوئے بھی کوئی نہ کوئی اخباری تراش یا کتاب بائیں ہاتھ میں ضرور رکھتے رہتے۔

اب رہ گیا میں..... رانا راجیل..... مجھے کتابوں کا شوق تھا

نہی اعلیٰ تعلیم کے حصول میں کوئی دلچسپی تھی۔ میں آزاد نغذاؤں کا پیچھے تھا اور آزاد ہی رہنا چاہتا تھا۔ اسکول کے بجائے میرا دل دوستوں کے ساتھ کھیل کود میں لگتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مشکل 33 فیصد نمبر لے کر اگلی جماعت میں منتقل ہوتا رہا۔

دووں بھائیوں کے احکام بجالانے سے میرے خوب دارے بنارے رہتے تھے۔ اباجی ائی جی سے ایشیے گئے پیسوں کے علاوہ بھائیوں کی دی گئی انعامی رقم جیب میں ڈالے جب میں اپنے دوستوں کے پاس جاتا تو احساسِ تفاخر سے گردن میں تٹاؤ اور سر بلند ہوتا کرتا۔

”ارے راجیل! اتنے پیسے کسے مل جاتے ہیں تمہیں؟ ایک ہمارے والدین ہیں کہ مشکل چار آنے یا آٹھ آنے دے کر بھی حساب طلب کرتے ہیں۔“ میرے بچپن کا دوست خادو اکٹر حسرت ناک انداز میں کہتا تو میرے دل میں خوشی کے شادیاں بجنے لگتے۔

”مجھ سے تو کبھی کوئی حساب طلب نہیں کیا گھر والوں نے..... وہ مجھے بہت پیار کرتے ہیں اور میری کوئی بات نہیں ٹالتے۔“ میں اطمینان سے کہتا۔

”بہت خوش قسمت ہو تم۔“ دوسرا دوست رشید بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

”بالکل! خوش قسمت تو میں واقعی بہت ہوں۔“ اس کے بعد ہم سب دوست مل کر رپڑھی والے سے مسالا لگا بھٹا کٹی ہوئی مسالے دار مولیٰ چھوٹی سی ڈبیا میں بند کھانا ٹاٹری نما چورن اور برف والے رنگ برنگے گولے خرید کر خوب مزے سے کھاتے۔

مجھے اس چھوٹی سی عمر میں ہی فتوحات اور تحفہ کی لت لگ گئی تھی اور صدیق بھائی کے بے ضرر شوق کو اگلے سیدھے القاب دیتے ہوئے میں یہ جان ہی نہ پایا کہ رانا راجیل بھی ایک مہلک ترین نشے کا شکار ہو چکا ہے۔

خود پسندی اور جذبہ تحفہ کا شوق..... خواہ اس کے لیے کتنے ہی جھوٹ کیوں نہ بولنے پڑتے۔

☆☆☆

جھوٹ بولنے کی یہ عادت کب اور کس طرح میرے اندر پروان چڑھی میں آج بھی اس حقیقت سے لاعلم ہوں جتنا بچپن کے اس دور میں تھا۔ دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرنے کے بعد شام سے قبل ہی گھر لوٹ آتا تھا، بصورت دیگر اباجی پٹائی کرنے سے بھی گریز نہ کرتے۔

”سارا دن گلیاں تاپنے کے سوا اسے کوئی فرصت ہی نہیں..... میزک میں آچکا ہے لیکن تنجید کی اسے چھو کر بھی نہیں

گزری۔“ وہ اسی جان کے درپے ہو جاتے۔

”بچہ ہی تو ہے ابھی..... کھیل جائے گا۔“

”میں سمجھاؤں گا اسے اباجی! آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں؟“ حمید بھائی اس صورت حال میں نجات دہندہ ثابت ہوا کرتے تھے۔

”سمجھا ہی لو تو بہتر ہے ورنہ میں کسی بھی سخت اقدام سے گریز نہیں کروں گا۔“

اباجی کے ارادے بہت خطرناک معلوم ہوتے تھے۔ وہ مجھے ہاسٹل میں داخل کروانے کا منصوبہ ترتیب دیے بیٹھے تھے لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی۔

انہی دنوں ہمارے محلے میں ایک نیا گھرانا آباد ہو گیا۔ قدوسی صاحب ایک ریٹائرڈ فوجی تھے جو اکہتر کی جنگ میں زخمی ہونے کے بعد اپنے فرائض سے سکدوش کر دیے گئے تھے۔ ان کی تین بیٹیاں اور ایک بی بی بیٹا تھا اور تمام طریقے تو یہی تھے کہ وہ میرا ہم عمر تھا۔

اظہر پڑھائی لکھائی میں جتنا خوبوں کا مالک تھا۔ اسکول کے کام کاج سے فراغت پاتے ہی وہ ہمارے ساتھ کھیل کود میں شامل ہو جاتا۔ اب ”خیریب کا گردہ“ ٹھہرا سدا کا نکما..... انہیں اظہر کی بہ خوبیاں بہت بھانے لگیں اور نتیجتاً میری ذات ہی پشت چلی گئی۔ گھر میں بھی آئے روز اسی کا ذکر ہونے لگا۔

”قدوسی صاحب کا لڑکا بہت فرمانبردار ہے بھئی! پڑھائی میں بھی ہوشیار ہے۔“ اباجی اس سے کافی متاثر تھے۔

”ہمارا راجیل بھی کسی سے کم نہیں ہے جی! وہ بھی اپنے بھائیوں یا ہمارے سامنے نظر نہیں اٹھاتا۔“ ائی جی کی مانتا ترپ اٹھتی۔

”مجھے اس کی تابع داری پر کوئی شک نہیں..... میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ اب پڑھائی میں بھی تنجید ہو جائے۔“

”اظہر کی قابلیت نے مجھے بھی بہت متاثر کیا ہے..... اس روز نیاز کے چاول دینے گھر آیا تو میرے ہاتھ میں شکیپہیز کا ڈراما ”مہملت“ دیکھ کر کہنے لگا کہ وہ اسے پچھلے سال ہی پڑھ چکا ہے۔“ صدیق بھائی نے بتایا۔

”بہت خوب! اس عمر میں مطالعے کا ایسا شوق؟“ حمید بھائی نے ہونٹ سکڑے۔

”جی ہاں! میں نے اپنی کتابوں کی ذمہ داری اسے سونپ دی ہے۔ اس کے ذوق اور کتب کے لیے احترام نے میرا دل موہ لیا۔“

یہ صورت حال بہت تشویش ناک تھی۔ میری برسوں کی

محنت خاک میں ملتی دکھائی دے رہی تھی۔ تاہم بہت سوچ بچار کے بعد میں نے اس کا حل بھی تلاش کر لیا اور غیر محسوس طریقے سے اظہر سے دوستی بڑھائی۔ شام کے اوقات میں جب بھی لڑکے کھیلنے کے لیے اکٹھے ہوتے تو میں اس سے قبل ہی اپنی کوئی نہ کوئی کتاب تھامے اس کے پاس چلا جاتا اور انھیں بھرے انداز میں کہتا۔

”یار اظہر! مجھے ریاضی کی اس مشق کی اسکول میں سمجھ نہیں آئی تھی۔“

”کوئی بات نہیں، جب ہم ہیں تو کیا غم ہے..... میں تمہیں سمجھائے دیتا ہوں۔“ وہ مسکرا کر جواب دیتا اور میرا مسئلہ حل کر دیتا۔

اس کی صحبت میں رہتے ہوئے ایک جانب میری نصابی کمزوریاں دھیرے دھیرے دور ہو گئیں تو دوسری جانب گھر والے بھی مجھ سے راضی رہنے لگے لیکن میں اب بھی اظہر کے باعث ہونے والی اپنی سبکی نہیں بھولا تھا۔ میری بہت سی خفیہ صلاحیتوں میں ایک خوبی ”مستقیم مزاجی“ بھی تھی۔ میں کسی کو بھی اپنی ذات پر حاوی ہوتے دیکھ سکتا تھا نہ ہی اپنی سبکی برداشت کر سکتا تھا۔

اظہر قدوسی سے بھی اس تاوان کی وصولی کے لیے میں نے ”ٹائٹنگ“ سیٹ کر لی تھی۔

☆☆☆

بڑھائی میں سنجیدگی اختیار کرنے کے بعد میرا نتیجہ تینتیس فیصد سے بڑھ کر ساٹھ فیصد کا ہندسہ عبور کر گیا۔ اس بہتری کے بعد گھر اور اسکول میں مجھے خوب پذیرائی ملنے لگی۔ میری تو کوئی یاد لی مراد بر آئی تھی۔ پذیرائی روزِ اول ہی سے میری کمزوری تھی۔

اسی دوران میٹرک کے بورڈ امتحانات کا وقت آن پہنچا۔ اظہر نے تیاری میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی۔ ہمارے اہل خانہ میں بھی اچھے تعلقات قائم ہو چکے تھے۔ اظہر تو ہمارے گھر میں آزادانہ کہیں بھی آجاتا لیکن میں ان کے بیرونی ڈرائنگ روم تک محدود تھا۔ اکثر ہم وہیں کہاں اسٹری بھی کر لیا کرتے۔ امتحانات سے ایک روز قبل قدوسی صاحب کو اپنی کپڑوں کی دکان کے لیے مال خریدنے کی غرض سے دوسرے شہر میں جانا پڑا۔ اسی رات میں نے اظہر کی ”رول نمبر سلپ“ ڈرائنگ روم میں پڑی کتاب سے نکال کر اپنی جیب میں رکھی اور رستے میں اسے پرزے پرزے کر کے گٹر میں پھینک دیا۔

اگلے روز اظہر پرچہ دینے کے لیے اہل ہو چکا تھا اور میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

حمید بھائی نے اپنے تعلقات بروئے کار لاتے ہوئے بورڈ آفس سے اس کی متبادل سلپ جاری کر وادی لیکن اس دوران دو پرچے ہو چکے تھے۔ اب اظہر قدوسی کا نتیجہ جو بھی آتا..... دو پرچوں میں ”کمپارٹ“ کا داغ اس کے رزلٹ کارڈ پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو چکا تھا۔

میرا وجود ہلکا پھلکا ہو گیا۔ نہایت اطمینان اور لگن سے پرچے دیے اور اپنی منصوبہ بندی کے اگلے حصے پر عمل شروع کر دیا۔ تین ماہ کی فراغت میں صدیق بھائی کی ذاتی کتابوں کا مطالعہ شروع کیا تو ان کتب نے مجھے اپنا سیر کر لیا۔ جوں جوں مطالعے میں اضافہ ہوا میری سوچ، فکر اور ذہنی اتق میں بے شمار تغیرات رونما ہونے لگے۔ تخریب کار گروہ سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد میں اپنے مستقبل کے لیے بے حد سنجیدہ ہو چکا تھا۔

کالج کی زندگی کا آغاز ہوا تو تفریح کا ایک اور جہاں میرا منتہر تھا۔ یہاں ایک نہیں کئی ایک اظہر قدوسی تھے جنہیں مات دینے کے لیے میں نے ذہانت اور بڑھائی کے ہتھیار تیز کر لیے اور کامیابی کی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ کتابوں سے دوستی مجھے یونیورسٹی میں ادبی میگزین کارکن بنا دیا۔

میگزین کے لیے لکھی گئی پہلی ہی کہانی مقبول ہو گئی۔ اساتذہ اور ادبی دوسو سہائی کی مدد سرائی سے ملنے والی خوش احوال تھی۔ اسی پہل میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں ”مصنف“ بن کر تخلیقی میدان میں اپنا نام منواؤں گا تاہم میرے اہل خانہ اس فیصلے پر قطعی خوش نہ تھے۔ وہ مجھے اب بھی گھر کے سب سے چھوٹے بچے ہی کی طرح سمجھتے اور برتاؤ کرتے تھے۔ اس لیے ایک ناجائز دھوکا لیا گیا۔

”میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں راجیل! لیکن تمہارا فیصلہ سراسر جذباتی ہے۔“ صدیق بھائی نے مجھے سمجھانے کی غرض سے کہا۔

”جذباتی کیسے ہو گیا بھائی..... کم از کم آپ تو میری مدد کیجیے..... کتاب دوستی میں نے آپ ہی سے تو سیکھی ہے۔“

”میری دعا ہے کہ تمہاری یہ دوستی ہمیشہ یوں قائم رہے لیکن اسے بطور پیشہ اپنانے کے حق میں، میں بالکل نہیں ہوں کیونکہ قلم کار ہمیشہ پس ماندگی کا شکار رہا ہے۔“

”میں اپنی محنت اور زور بازو سے یہ ٹرینڈ بدل دوں گا۔“ میرے جوش بھرے لہجے پر وہ مسکرانے لگے۔

”خواب دیکھنا اچھی بات ہے راجیل..... لیکن خوابوں میں رہنا حماقت ہے۔ چند سال بعد جب تم اپنے ہم جماعت لڑکوں کو باوقار سرکاری نوکری، تھیقات سے بھرپور زندگی سے

تارے نظر آ گئے۔ شہر کے مشہور جریڈے نے کئی ماہ تک میری ایک کاوش اپنے پاس رکھنے کے بعد نہایت بے دردی سے مسٹر دکر دی اور دو ٹوک انداز میں جواب دیتے ہوئے کہا۔
”آپ میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے لیکن فی الوقت اپنا مطالعہ وسیع کیجیے۔“

میری انا اور وقار پر بہت کاری ضرب لگی لیکن میں ان مشکلات کو خاطر میں نہیں لانا چاہتا تھا۔ نوکری کے اوقات کے بعد صدیق بھائی کے ذاتی ذخیرے میں موجود مشہور ادباء کی کتابوں کا مطالعہ از سر نو شروع کیا تو لٹریچر کی وسعت اور پھیلاؤ دیکھ کر حقیقی معنوں میں دنگ رہ گیا۔ شہر بھر میں موجود کتب خانوں کی خاک چھاننے میں ماہ و سال کا حساب ہی بھول چکا تھا۔

صدیق بھائی کے مشورے ان دنوں میرے لیے بہت صائب ہوتے۔ وہ میری ہمت بندھاتے ہوئے اکثر ایک ہی بات دہراتے تھے۔

”لکن اور محنت کسی بھی ناممکن امر کو ممکنات میں بدل دیتی ہے۔۔۔۔۔ اور کسی بھی پہاڑ پر چڑھنے کے لیے طویل چھلانگ نہیں لگائی جاتی۔“
”میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔“

”تمہاری سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تم مشکلات کے سامنے ڈٹ جاتے ہو لیکن جانتے ہو تمہاری سب سے بڑی خالی کیا ہے؟“ انہوں نے نرمی سے پوچھا تو میں نے نفی میں سر ہلادیا۔

”ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی اور مختصر وقت میں بڑی کامیابی کے حصول کی خواہش تمہاری کمزوری ہے اور اگر تم نے اس کمزوری پر قابو نہ پایا تو اس میدان میں کامیابی نہیں سمیٹ سکو گے۔“

”تو پھر میں کیا کروں؟“

”صبر اور سکون سے اس سفر کا دوبارہ آغاز کرو۔۔۔۔۔ اور ایک بات ذہن نشین کر لو کہ کامیابی کی بلندی پر ایک ہی جست میں رسائی ممکن نہیں ہوتی۔۔۔۔۔ اس سفر کے آغاز میں تمہارے قدم چھوٹے لیکن مضبوط ہونے چاہئیں۔۔۔۔۔ پھر دیکھنا کامیابی تمہارے قدم خود بخود چومے گی۔“

میں نے یہ بات ذہن نشین کر لی اور شہر کے ایک نسباً کم معروف جریڈے میں اپنی تحریر بھیج دی۔ چھ ماہ کے جان لیوا انتظار کے بعد بالآخر ”رانا راجیل“ کا نام ایک رسالے میں جگہ گتا دیکھ کر میرے محسوسات ناقابل بیان تھے۔

میں نے اپنی راہ میں حاصل رکاوٹوں کو مات دے دی

مخلوط ہوتے دیکھو گے تو اس وقت اپنے اس فیصلے کی بابت شدید بے چینی کا شکار ہو جاؤ گے۔“ انہوں نے مستقبل کا ایک ہولناک نقشہ کھینچا۔

”میں تمہارے اس شوق کی راہ میں رکاوٹ بھی نہیں بننا چاہتا۔۔۔۔۔ بلکہ مجھے تو قلم سے تمہارا ناتا جڑنے پر بہت خوشی ہے۔۔۔۔۔ لیکن میرے بھائی! میں یہ بھی تو نہیں چاہتا کہ تم زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جاؤ۔“

صدیق بھائی میرا کندھا تھپتھاتے چلے گئے۔ اب گیند میرے کورٹ میں تھی۔۔۔۔۔ اور میں بھی کبھی اٹھائے کا سودا کرنے کا عادی نہ تھا۔ اس لیے میں نے بہت سوچ سمجھ کر ایک اہم فیصلہ کیا اور اپنی متعین کردہ منزل کے حصول کے لیے کمر کس لی۔

☆☆☆

پہلے مرحلے میں رانا راجیل کی زندگی سے غیر بنجیدگی اور لابیالی پن کا خاتمہ میں نے بہت اہتمام سے کر ڈالا۔

میرا رجحان اعداد و شمار اور معاشیات کی جانب تھا لہذا میں نے بینکاری کا شعبہ اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ پڑھائی کے ساتھ میگزین میں میری تحریریں اور آرٹیکل بھی شائع ہوتے رہے۔ پذیرائی اور توصیف میری رگوں میں خون گرما دیتی اور میں ایک نئے جذبے سے محنت کا آغاز کر دیتا۔

سالہا سال کی لگن بالآخر رنگ لائی اور میں ایک سرکاری بینک سے وابستہ ہو گیا۔ والدین اور بھائیوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ حمید بھائی ملک کے معروف ترین اخبار میں صحافی بننے کے بعد شادی کے بندھن میں بندھ چکے تھے جبکہ صدیق بھائی ”کالج“ میں لیکچرار کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کی شادی تین ماہ بعد طے ملی۔

نوکری ملتے ہی والدین کے دل میں میری شادی کے ارمان پھٹنے لگے۔ ویسے کچھ بات بتاؤں تو میں خاصا رومان پسند حسن پرست اور مصنف نازک کی قدر کرنے والا شخص تھا۔ یونیورسٹی میں دوران تعلیم کی ایک لڑکیوں سے دوستی بھی قائم رہی تاہم زندگی کے اس اہم ترین موڑ پر میں شادی کی بابت کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا تھا بلکہ اب تو طویل انتظار کے بعد دلہ لجات میسر آئے تھے جب پذیرائی مدح سرائی اور تعریف کے ان مسحر کن الفاظ کو دایں روپ دیا جاسکے۔

میں نے باضابطہ ”لکھاری“ بننے کے لیے کمر کس لی۔ یونیورسٹی میگزین میں ملی شہرت سے مجھے یقین تھا کہ میری تحریریں ہاتھوں ہاتھ لی جائیں گی لیکن یہ گمان پانی پر لکھی تحریر ثابت ہوا اور پہلے ہی مرحلے پر مجھے دن میں

تھی۔ رانا راجیل کے راستے میں جو بھی رکاوٹ آتی ہمیشہ اپنے وجود پر شرمسار رہتی۔

☆☆☆

اس کے بعد یہ سفر بھی ختم نہ سکا۔

میرے دل و دماغ پر ایک جنون سا حاوی تھا۔ بینک سے گھر آتے ہی کاغذ قلم تمام لیتا اور اپنے ارد گرد پھیلے معاشرتی ناسوروں، زہنی روح کے حامل کرداروں اور بوسیدہ سوچ کو صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیتا۔

دھیرے دھیرے مجھے کامیابی ملتی چلی گئی گویا رانا راجیل کا قلم گھر تا جا رہا ہے۔

ہر ماہ کم و بیش قارئین کے تبصرے مجھے ایک عجیب سی سرشاری میں مبتلا کر دیتے اور میں شعوری کوشش کے تحت اپنی اگلی تحریر میں مزید بہتری پیدا کرنے کے لیے جت جاتا اور مجھے یہ کہنے بھی نہیں کوئی مضائقہ نہیں کہ کامیابی کی ویوی مجھ پر مہربان ہو چکی تھی۔

یہ سفر شاید یونہی عالم مدہوشی میں جاری رہتا لیکن میرے اہل خانہ اب شدید تحقیقات میں مبتلا ہونے لگے تھے۔ ایک روز امی جان شام کے وقت میرے پاس آئیں اور کہنے لگیں۔

”راجیل پترا کبھی دو گھنٹی بوڑھے ماں باپ کے پاس بھی بیٹھ جایا کر۔“

”آپ حکم کیجیے ای جی! میں ساری دنیا ترک کر کے آپ کے قدموں میں زندگی بسر کرنے کے لیے راضی ہوں۔“ میں نے ان کا ہاتھ اپنے لبوں سے لگا لیا۔

”حمید اور صدیق کے الگ گھروں میں منتقل ہونے کے بعد گھر میں سناتے اتر آئے ہیں۔ میں اب جلد از جلد تیری شادی کروانا چاہتی ہوں۔ تیری عمر کے سبھی لڑکے دو بچوں کے باپ بن چکے ہیں۔“ انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”ان لڑکوں نے آپ کے بیٹے جیسی شہرت اور کامیابی بھی تو نہیں پائی نا۔“ میں نے شرارت سے کہا تو امی جان بھی مسکرائے گئیں۔

”قدوسی صاحب کا بیٹا بھی ڈاکٹر بن کر امریکا سے کورس کر آیا۔۔۔۔۔ اور اب تو اس کے یہاں بھی بیٹے کی ولادت ہوئی ہے۔“ امی نے اظہار کا ذکر کیا تو میں بد مزہ ہو گیا۔

”وہ اکثر تیرے متعلق پوچھتا رہتا ہے لیکن تجھے فرصت ہی نہیں ملتی۔“

”کسی روز مل گا اس سے۔“ میں نے ٹالا۔

”ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی! لیکن اب میں شادی میں کسی قسم کی کوئی تاخیر نہیں کروں گی۔ اس لفافے میں چند لڑکیوں کی تصویریں موجود ہیں، مجھے کل تک اپنی پسند بتا دینا۔“ وہ حتیٰ لحد میں کہتی ہوئی چلی گئیں۔

میری آنکھوں میں یک لخت کئی سہانے خوب اتر آئے۔ بے پناہ مصروفیت میں مشغول رہنے کے باوجود زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے سب تصاویر کا بغور جائزہ لیا اور ایک پری بیکر کو سونپ دیتے عطا کر دی۔

دو ماہ کے بعد میری زندگی میں ایک سہانی تبدیلی درآئی اور میں عقد نکاح میں بندھ گیا۔

شادی کے بعد ذاتی مصروفیات میں اضافہ ہوا تو دوسری جانب پیشہ ورانہ زندگی میں یکدم غیر متوقع موڑ آ گیا۔ ایک میگزین نے مجھے سلسلہ وار ناول لکھنے کی پیشکش کی جسے ٹھکرانا میرے لیے سراسر کفرانِ نعمت تھا۔

میں نے بے تحاشا سختی کی اور جب چھ ماہ بعد میری تحریر میگزین کی زینت بنی تو سورد و کیف سنبھالنے نہیں سنبھل رہا تھا۔ قارئین کے پیچھے گئے خطوط کا انتظار اور پھر ان کی رائے پڑھ کر کشیدہ آتش ہو جاتا۔

اس کے بعد میں نے کبھی پیچھے مڑنے نہیں دیکھا۔ وقت بہت تیزی سے گزرتا گیا لیکن میرے جنون اور شوق میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ آئی۔ بینک کی سخت ترین نوکری، تخلیق کے کڑے اور کر بناک مراحل، خاندانی ذمے واریاں نبھاتے نبھاتے مجھے علم ہی نہ ہوا کہ عمر کی نقدی کم ہوتی جا رہی تھی۔

وفا دار خدمت گزار اور اطاعت شعار بیوی نے میرا گھر جنت بنا دیا تھا۔ دو بچوں کی آمد کے بعد زندگی میں کوئی کمی نہ رہی تھی۔ میرے حلقہ احباب میں رانا راجیل کی کامیابیاں اور لگن ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ دوست احباب، ساتھی کارکن اور رشتے دار میری محنت کی تعریف کرتے نہ جھٹھتے۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔ تعریف میری بہت بڑی کمزوری تھی۔ مجھے اپنی اس کمزوری سے بھی بہت محبت تھی۔

☆☆☆

تخلیق کے اس سفر کا رانی بنے دس سال کا عرصہ بیت گیا۔ اس تسخیر کے بعد میں اپنی ساکھ اور مقام پر کسی بھی سمجھوتے کا قائل نہ رہا۔ میری محنت، وقت اور لگن انتہائی بیش قیمت تھے اور مجھے اس عمل کا بھرپور معاوضہ درکار تھا۔ ماضی میں صدیق بھائی سے کی گئی بات آج بھی میرے دل و دماغ پر نقش تھی کہ میں احتیصال کے اس ٹریڈ کو تبدیل کر دوں گا۔۔۔۔۔ اور بالآخر میں اس مقام تک آن پہنچا تھا کہ غیر معروف

اور لیکن کی بدولت میں نے ”داستان ہزار رنگ“ میں ہالہ لراہا مقام پیدا کر ہی لیا لیکن سچ بتاؤں..... اس کامیابی میں بھی ایک نکتہ بہر حال برقرار تھی۔ یہاں ہزار ہا جتن کے باوجود ان قارئین سے وہ پذیرائی نہیں مل رہی تھی جس کا میں ہمیشہ سے عادی تھا لیکن بہر حال میں محنت کے ٹریک پر اب بھی اسی جوش و جذبہ سے رواں تھا۔

تین سال تک افسانے اور ناولٹ لکھنے کے بعد میں نے سلسلہ وار ناول لکھنے کا آغاز کیا تو کبھی تصور بھی نہ کیا تھا کہ مجھے ایسی اہانت آمیز صورت حال بھی پیش آسکتی ہے۔

☆☆☆

میرے ذہن پر ایک دھند سی طاری تھی۔ غصے اور طیش سے اپنے ہاتھ میں پکڑا رسالہ میں نے زور سے میز پر چٹا اور دم فرخت سے منہ پٹ پانی کی بوتل منہ سے لگا لی۔ غصہ پانی سے اعصاب قابو میں آئے تو میں ٹھکے ہوئے انداز میں کرسی پر ڈھکیا۔

گزشتہ دو سال سے میرا ناول ریٹنگ میں بہت اچھا تھا لیکن پچھلے کچھ ماہ میں بینک اور گھریلو مصروفیات میں لکھی گئی قسط دوبارہ پڑنے میں آڑے آجاتیں۔ چند واقعاتی غلطیوں کی وجہ سے براہ خطوط میں تنقیدی تبصرے میرا خون کھولا دیتے۔

”راجیل صاحب کا ناول اب پور کرنے لگا ہے.....“ اتفاقات کی بھرمار نے کہانی کا حسن ماند کر دیا ہے۔

”سلکتی چھاؤں تو اب واقعی ہمارے لیے ناقابلِ برواشت ہونے لگا ہے.....“

”کہانی کی طوائف اب پور کرنے لگی ہے..... میں نے تو اس ناول کا مطالعہ ہی ترک کر دیا ہے۔“

اس وقت بھی میں انہی فقروں کی بازگشت میں گھرا بیٹھا تھا جب میرا موبائل منگنانے لگا۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے بادل ناخواستہ فون آن کر کے کان سے لگایا تو حسبِ توقع ظفر کی سپاٹ آواز میری سماعت سے ٹکرائی تھی۔

”رانا صاحب! اپنی تحریر اب جلد از جلد سینے کی کوشش کیجیے۔ ہمیں بہت سے شکایتی خطوط موصول ہو رہے ہیں۔“

آپ کا ناول اپنا چارم کھو رہا ہے۔“

”بہتر ہے..... اگلی تحریر کس سے لکھوائی جائے گی؟“

میں نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

”جسید سحرانی سے..... ان سے بہترین کوئی آپشن موجود نہیں۔“ ظفر نے اطمینان سے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرے ہاتھ میں موجود سگریٹ کی طرح دل بھی بری طرح سلگ رہا تھا۔ بے شمار کوششوں کے باوجود مجھے وہ

جراںد کو اب میں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اگر کسی ادارے کے ساتھ مالی امور طے نہ پاتے تو میں استحصال کے خلاف ڈٹ جایا کرتا۔ مجھے اپنے ہنر اور صلاحیت پر کامل بھروسہ تھا اس لیے انتظامیہ کے دباؤ میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وقت مجھ پر مکمل مہربان تھا۔ مٹی میں بھی ہاتھ ڈالتا تو سونا بن جاتی۔ اس عرصے میں میرے مقابل کوئی بھی دوسرا مصنف ٹھہر ہی نہ پایا۔

میرا گھر ارضی جنت تھا۔ میری نوکری شاندار تھی۔ تخلیق کے سفر میں کامیابیاں میرے قدم چومتی تھیں۔ رانا راجیل جیسا خوش نصیب کہیں کوئی بھی تو نہ تھا۔

لیکن پھر زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا جس نے سب کچھ ٹپٹ کر دیا۔

☆☆☆

اس روز میں بینک میں اپنے معمول کے کام سرانجام دینے میں مگن تھا جب چڑاسی نے کسی ملاقاتی کی آمد کا عندیہ دیا۔ میرا شبث اشارہ پاتے ہی کچھ دیر بعد ایک ادھیڑ عمر باریادہ شخص مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”خاکسار کو ظفر الحق کہتے ہیں راجیل صاحب! کیسے کیسے احوال ہیں؟“ اس کا تعارف سن کر میں اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”ارے جناب! آپ نے کیوں زحمت کی؟ مجھے طلب کر لیا ہوتا۔“ میں نے بڑے جوش و خفا جواب دے دیا۔

ظفر الحق ایک ملک گیر شہرت یافتہ پبلی کیشنز کا مالک تھا۔ اس ادارے کے جاری کردہ شمارے بین الاقوامی سطح پر بھی خاصے مقبول تھے۔ ظفر کے بارے میں شدید بھی تھا کہ وہ

رائٹرز کو بہت لاڈ پیار سے رکھتا ہے۔ اس کی میرے پاس آمد کا مطلب بھی مجھے بخوبی سمجھ آ رہا تھا۔

”بیٹا سہمی کنوینس کے پاس چل کر آتا ہے جناب! ہم آپ کو اپنے ادارے میں مدعو کرنا چاہتے ہیں۔“ وہ فوری طور پر مطلب کی بات پر آگئے۔

ظفر کے ادارے کی ساکھ انتہائی مضبوط تھی۔ ان کے رائٹرز کی ایک مکمل ٹیم تھی جو سالہا سال سے اس ادارے سے منسلک تھے اور اب مجھے اپنے ساتھ بھی کرنا چاہتے تھے تو بلاشبہ یہ میرے سفر کی معرکہ تھی۔

میں نے اپنی شہولیت کی ہامی بھری۔ ادارہ ”داستان ہزار رنگ“ ملک کے ہر طبقے میں مقبول تھا۔ یہاں اپنا مقام پیدا کرنا ہرگز آسان نہ تھا اور آسانیاں مجھے پسند بھی تو نہ تھیں۔

قصہ مختصر..... آنے والے چند سالوں میں اپنی محنت

پذیرائی کبھی نصیب نہ ہوئی جو جشید کے حصے میں آتی تھی۔ جشید صحرائی دارالحکومت کا ایک مصنف تھا۔ وہ سادہ الفاظ اور سلیس پیرائے میں اس قدر خوبصورتی سے کہانی کے تانے بانے جتا کہ رہائی ممکن ہی نہ ہو پاتی تھی۔ وہ لفظوں کا کھلاڑی تھا اور جذبات کا بادشاہ۔ منظر نگاری میں اسے کمال حاصل تھا۔

اب آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اس کی تحریروں کے لیے یمن کیونکر جانتا تھا؟ تو یہ ہے کہ کسی بھی ادارے سے منسلک ہونے کے بعد میں ان کی ٹیم میں شامل مصنفین کو باقاعدگی سے پڑھتا تھا تاکہ مقابل کی خوبیوں اور خامیوں پر مکمل نظر رکھ سکوں اور جشید صحرائی کی تحریروں میں سے مبرا ہوتی تھی۔ ایک خلقت اس کی دیوانی تھی۔ چارواں چار میں نے مجھے دل سے اپنا ناول سینے کا آغاز کر دیا۔ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ میرے دل میں ایک گرہ سی بیٹھ گئی اور جشید ایک بہت بڑی پھانس بن گیا۔ اس کے ناول کی مقبولیت کا تصور جس قدر شبیہ تھا، اسی قدر ہولناک بھی۔

☆☆☆

اور پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ جشید کا ناول پانچ سال سے زائد عرصہ شائع ہوتا رہا اور ہر ماہ تقریبی خطوط میرے لیے مزید مبرا آزمائش ثابت ہوتے۔ میں فی الوقت مختصر کہانیوں اور ناول تک ہی محدود تھا۔ مجھے قوی امید تھی کہ اگلے ناول کے لیے ادارہ لازماً میری خدمات حاصل کرے گا لیکن اسے بسائے آرزو کہ خاک شد..... اگلے دو سال کے لیے ایک بار پھر جشید صحرائی کا قسط وار... ناول میگزین کی زینت بنا۔

ماہوسی کے عالم میں میں نے اپنا مسودہ ایک ہفت روزہ میگزین کو ارسال کر دیا جسے خاطر خواہ پذیرائی بھی نصیب ہوئی لیکن ”داستان ہزار رنگ“ کی ریڈر شپ کسی دوسرے ادارے کے پاس نہیں تھی۔ وہاں ہرگز نہ تھا مہینہ جشید کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ کر رہا تھا اور ایک بات تو اب طے تھی کہ اس کی موجودگی میں میری کامیابی بہت دشوار ہو چلی تھی۔ اس کا تیسرا ناول بھی سابقہ مقبولیت کے قیام پر یکاڑو توڑ گیا۔

اب ایسا بھی ہرگز نہیں تھا کہ مجھے دیگر کہانیوں میں پذیرائی نہیں ملتی تھی۔ رانا راجیل کا نام بھی ایک مستند منجھے ہوئے اور سینئر رائٹرز کی صف میں شمار ہونے لگا تھا لیکن مجھے اس دیوانگی کی طلب تھی جو قارئین جشید صحرائی کے لیے محسوس کرتے تھے۔ اس کا ہر کردار اور مکالمے ضرب المثل کی حیثیت

اختیار کر لیتے تو میرا دل جھلنے لگتا تھا۔

میری زندگی میں کئی دہائیوں بعد ایک اور ”اظہر قدوسی“ شامل ہو گیا تھا۔ کچھ مجھ ہی نہیں آتی کہ کیا کروں؟ لیکن پھر ایک ایسی غیر متوقع راہ دریافت ہوئی کہ میں خود ہی دنگ رہ گیا۔

تقدیر نے مجھے ایک نئی دنیا سے متعارف کروا دیا۔ اس روز میرے دفتر میں اپنے اکاؤنٹ کے مسائل حل کرنے کے لیے ایک شخص کی آمد ہوئی۔ چھریری جسامت درمیانی عمر اور قد و قامت کا یہ شخص ہاتھ میں کچھ کاغذات اور ایک رسالہ تھا۔

”مطلایے کے کافی شوقین معلوم ہوتے ہیں آپ؟“ میں نے مسکراتے ہوئے رسالے کی طرف اشارہ کیا۔

”جی ہاں۔۔۔ یہ میرا پسندیدہ ترین ماہنامہ ہے۔ آپ بھی پڑھیے گا کبھی۔۔۔ باقاعدہ قاری بن جائیں گے۔“

”قاری۔۔۔ ایسی محترم! میں اس ادارے کا باقاعدہ مصنف ہوں۔“

”بائی گڈنس!۔۔۔ اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ وہی رانا راجیل ہیں جن کا ناول اسی جریدے میں شائع ہوا کرتا تھا؟“ وہ شدید حیرت میں مبتلا تھا۔

”جی ہاں! آپ کا قیاس بالکل درست ہے۔“ میں ملاحظہ ہونے لگا۔

”اوہ۔۔۔ آپ میری خوشی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں آپ کی سب تحریروں بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔“ وہ... پر خوش ہو گیا۔

”توازش ہے آپ کی۔“

”ارے نہیں سر جی! آپ کا علم ہی نہیں کہ میں آپ کی تحریروں سے کس قدر متاثر ہوں۔“ اس کی بات پر میں شخص مسکرا کر رہ گیا۔

”آپ نے دوبارہ کوئی ناول کیوں نہیں لکھا؟“

”ارے بھی! امیری مصروفیت آپ کے سامنے ہی تو ہے۔۔۔ نان نوفا تو بچک جاب ہے۔ اس کے تقاضے نبھانا بھی آسان کام تو نہیں ہے پھر گھریلو ذمے داریاں ہیں۔۔۔ لکھنا لکھنا تو محض میرا شوق ہے اس لیے کبھی کبھار قلم اٹھا لیتا ہوں۔“ میں نے انکساری سے جواب دیا۔

”گریٹ! آپ سے مل کر بہت خوش ہوئی سر! اگر آپ براہ مناسبت تو اپنے فیس بک اکاؤنٹ یا آفیشل پیج پر ایڈ کر لیجیے۔“ اس نے الجاحت سے کہا۔

”مگر میرے پاس وقت ہی نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کبھی اسے سمجھنے کی کوشش... کی ہے۔“

”آپ اجازت دیجیے سر جی! میں آپ کا اکاؤنٹ بنا کر سب معاملات سمجھا دوں گا۔“

”اگر مناسب سمجھیں تو آج شام غریب خانے پر تشریف لے آئیے گا۔ یہاں ڈیوٹی کے اوقات میں ایسا ممکن نہیں۔“ میں نے نیم رضامندی ظاہر کی۔

”سر کے بل آؤں گا..... میرے لیے اس سے بڑھ کر خوش نصیبی کیا ہوگی بھلا؟“

اسی شام دلاور احمد نے میرے کمپیوٹر پر فیس بک اکاؤنٹ بنانے کے بعد تمام باریکیاں سمجھا دیں اور میں اس عجیب روزگار دنیا کی سر میں مگن ہو گیا۔ اگلے روز اس نے مجھے ایک ادبی بیٹھک میں پہنچا دیا جہاں ہر عمر و طبقے کے مرد و خواتین موجود تھے۔ اب اتفاق ایسا ہوا کہ وہاں میرے ہی ایک ناولٹ پر بحث جاری تھی۔ قارئین کے یہ براہ راست تاثرات میرے لیے بہت سسٹی خیر تھے۔ میں اسکرین پر نظریں جمائے بے حد اشتیاق سے اس سرگرمی کا جائزہ لینے لگا۔ توصیفی مکتب پڑھتے ہوئے مجھے اپنے جسم و جان میں شیرینی گھلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی لیکن یکدم ایک کمنٹ کڑوے بادام کی طرح حلق تک کڑواہٹ پیدا کر گیا۔ آصفہ خان نامی لڑکی نے نہایت دھڑلے اور بے باکی سے میری تحریر کے نیچے ادھیڑتے ہوئے لکھا تھا۔

”رانا راجیل صاحب ایک مستدر اسٹر ہیں..... لہذا ان کے قلم کی پستی میں تو کوئی دورائے ہو ہی نہیں سکتی۔ تاہم گزارشتہ کچھ عمر سے سے ان کی کہانیوں میں واقعاتی جھول سامنے آنے لگے ہیں جو کسی بھی صورت ایک سینئر رائٹر کے شایان شان نہیں اور یہی چیز ان کی تحریر کا حسن کہنا نہ لگی ہے۔“

یہ صاف گورائے پڑھ کر میرا ہوسنا گیا لیکن نظریں اب بھی اسکرین پر لگی تھیں۔

”مس آصفہ! ابھر ہوتا آپ ان واقعاتی جھول کی کوئی نشاندہی بھی کر دیتیں۔“ شاہ زیب نامی لڑکے نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا تو میری حسیات مزید متوجہ ہو گئیں۔

”ہاتھ لگن کو آرسی کیا؟ اوپر بیسوں لوگ کہانی پڑھنے کے بعد ہی سر دھن رہے ہیں۔ تاہم وہ بھی اس بات سے واقف ضرور ہوں گے کہ مذکورہ کہانی کے آغاز میں ہیرو کو یتیم ہونے کے ساتھ لاوارث بتایا گیا تھا اور واضح الفاظ میں یہ کہا گیا تھا کہ اس دنیا میں اس کا کوئی رشتے دار موجود نہیں..... لیکن چند صفحات کے بعد ہی لکھا گیا کہ اس کی پردوش ماموں اور ممانی نے کی..... اگر اس بات کو سچ تسلیم کیا جائے تو اول الذکر بیان غلط ہے..... اور اگر اول الذکر کو

درست تسلیم کیا جائے تو یہ بتائیے کہ ماموں اور ممانی کا ایک کون سی ویب سائٹ سے ڈاؤن لوڈ ہو گئے تھے۔“

توصیف و تنقید کا یہ ملاپ میرے لیے بکسر انوکھا تھا۔ اسی شام مجھے دلاور احمد کی کال موصول ہوئی۔

”کیسے جناب! کیا محسوسات ہیں آپ کے؟“

”نہایت شاندار..... آپ کی اس نوازش کا بے حد شکریہ.....“ میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

”اب شرمندہ تو نہ کیجیے سر جی! اوپے اگر آپ اجازت دیں تو گروپ میں آپ کی موجودگی اور ویلکم کی پوسٹ لگا دوں؟“

”آپ کی محبت ہے برادر! اور نہ ہندے کی کیا اوقات؟“

”ایسا نہ کہیں سر جی! آپ کی قدر و قیمت کوئی ہم سے پوچھے۔“ اس کا محاسن بھرالہجہ میرا دل گدگدائے لگتا۔

اگلے روز بینک سے واپسی کے بعد میں نے اپنا اکاؤنٹ کھولا تو حسب وعدہ دلاور میرے لیے ایک خصوصی پوسٹ لگا چکا تھا۔ لوگوں کے محبت بھرے مکتب پڑھ کر خوشی کی انتہا نہ تھی۔ چند گھنٹوں میں میرا ان باکس پیغامات اور فرینڈ ریکوئسٹ قبول کرنے کی التجاؤں سے لبریز ہو گیا۔

اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے میں ذہنی طور پر مکمل تیار تھا۔ قارئین کی یہ محبتیں میرے لیے بہت اصول تھیں اور میں ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانے کے لیے ایک بھرپور آنکڑ کھینچا چاہتا تھا۔ اس لیے براہ فرادی پیغام کا جواب بہت محبت اور توجہ سے دینے کا آغاز کر دیا۔

”رانا صاحب! ہم آپ کی قابلیت کے مداح تو پہلے سے ہی تھے لیکن اب آپ کے اخلاق نے تو دل ہی موہ لیا ہے۔“

”اخلاق سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں برادر! شہرت اور کامیابیاں تو فانی ہیں..... انسانیت سے زیادہ اہم میرے لیے کچھ بھی نہیں۔“ میں انکساری سے جواب دیتا۔

سوشل میڈیا میری زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی لے آیا تھا۔

☆☆☆

یہ صد رنگی دنیا تھی۔ ہر طبقے اور طرز فکر سے تعلق رکھنے والے افراد بے آسانی باہم گفتگو کرتے اپنے نقطہ نظر بیان کرتے اور چین کی ہنسی بجاتے۔

زندگی کے کسی بھی موڑ پر میں زاہد خشک نہیں رہا تھا۔ یونیورسٹی میں ادبی میگزین سے وابستگی کے باعث میری ذات منصفانہ کی دلچسپی کا مرکز بنی رہتی تھی تو پیشہ ورانہ زندگی میں بھی تاجا کی ایک خواتین برضا و رغبت میل جول قائم رکھے ہوئے تھیں۔ اب اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں

کہ میں دل بھینک قسم کا انسان تھا۔ میرے دل دو ماغ اور نظریات اس ضمن میں یکسو تھے۔ ایک کامیاب لکھاری ہونے کی حیثیت سے مجھے کہانیوں مختلف کرداروں کی نفسیات اور سوچ کی گہرائی جاننے کے لیے ایسے تعلقات کے لیے استثنا حاصل تھا۔

خواتین کے ساتھ بیجا وقت نرم و گرم گفتگو صفر قمر طاس پر لفظوں کے رقص کا تال میل بن جانی فطری طور پر ہی میں بہت حسن پرست تھا لیکن احتیاط کا دامن بھی ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ ریستوران کے خوبانک ماحول کی سرگوشیاں، عوامی تقریبی مقامات میں دیکھے قہقروں کی گونج، نگاہوں کا تصادم میرے قلم میں برقی روداد ڈالتا۔

سیاحی روابط کے پلیٹ فارم پر تو یہ آنکھ بھولی اور بھی دلنشین تھی۔ میری تحریروں سے متاثر خواتین گفتگو و روابط بڑھانے کے لیے بے تاب دکھائی دیتیں۔ روز اول ہی سے میں ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنے کا عادی تھا مگر اس دشت کی سیاحی میں بھی ناکامی کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

ادبی بیٹھک کے ممبران کی رائے زنی اس قدر طاقتور تھی کہ کئی ایک مصنفین نے متواتر تنقید سے دلبرداشتہ ہو کر اپنے قلم سے جزدی کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مستقبل قریب میں ایسی کسی بھی صورت حال سے بچاؤ کے لیے میں نے ان ممبران سے ذاتی روابط قائم کرنے کا آغاز کر دیا۔ میرے عندیے پر دلدار اکثر و بیشتر ادبی بیٹھک میں میری تحریروں کی بابت بحث چھیڑ دیتا۔

”رانا راجیل کی تحریروں کی بابت آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا آپ بھی میری طرح ان کی سلسلہ وار کہانی کے منتظر ہیں؟“ اس پوسٹ پر بے شمار لوگوں نے متوقع رد عمل کا اظہار کیا لیکن اس شیرینی کے درمیان آصفہ خان کڑوے باداموں کی چٹائی لیے ایک بار پھر آن دمگی۔

”رانا راجیل بلاشبہ ایک اچھے رائٹر ہیں۔۔۔۔۔ ان کی تحریروں میں محنت بھی نظر آتی ہے لیکن میری ذاتی رائے میں گمراہ اور گہرائی کا عنصر نسبتاً کم ہے۔ انہیں پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہانی کی آمد نہیں ہوتی بلکہ شعوری کوشش کے تحت تانے بانے بنے جاتے ہیں۔ رہا دوسرا سوال۔۔۔۔۔ تو اس بارے میں صرف یہی کہوں گی کہ ان کا کوئی سلسلہ دار ناول پڑھنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔“

اس لڑکی کی رائے پڑھ کر مجھے شدید غصہ آیا۔ جانے کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میرے کسی مقدس راز سے واقف ہو گئی ہے۔ بیس سال سے زائد عرصے پر مشتمل اس سفر

میں کسی نے میرا فن اس طرح بیان نہیں کیا تھا۔ آصفہ خان کا نام روز اول ہی سے میرے دل میں ایک پھانس بن کر چبھ رہا تھا۔ کسی بھی مصنف پر اس کی رائے اس قدر بے لاگ ہوتی تھی کہ سامعی ممبران مذاقاً برملا کہنے پر مجبور ہو جاتے۔ ”مس آصفہ! ایک دن آپ کسی نہ کسی رائٹر کے ہاتھوں قتل ہو جائیں گی۔“

”سبھی کو پتا ہونا چاہیے کہ ڈرتی ورتی میں کسی سے نہیں ہوں۔۔۔۔۔ خوشامد اور بے جا تعریفیں میری لغت میں ادبی خیانت کے زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔“ وہ اپنا مخصوص نکلیہ کلام دہرا دیتی۔

اس روز میں یونہی بے مقصد اس کی پروفائل کھول کر دیکھتا رہا۔ وہ دارالحکومت کی رہائشی تھی۔ پروفائل میں خاصی سخت پرائیویسی تھی اور کسی بھی نوعیت کی گھریلو تصاویر یا ذاتی معلومات کا اندراج نظر نہیں آتا تھا۔ اس کی پراسراریت، انفرادیت اور خاموشی نے میرے دل میں بھی جیس پیدا کر دیا اور میں نے دوسری پیغام روانہ کر دیا۔

”آپ کی صاف گوئی بے ساختہ رائے اور نڈر رویہ قابل تعریف ہے۔۔۔۔۔ ذہین قارئین کسی بھی مصنف کا اثاثہ ہوتے ہیں۔“

”شکریہ۔“ چند لمحوں بعد ایک مختصر جواب موصول ہوا۔ ”کمال کی بات تو یہ ہے کہ آپ جیسی با ذوق خاتون نے بھی میری قسط وار کہانی نہیں پڑھی۔“

”بس بھی اتفاق ہی نہیں ہوا۔“

”بائی داوے۔۔۔۔۔ آپ کس مصنف کو پڑھنا پسند کرتی ہیں؟“ ”جیشہ صحرائی۔“

”غالباً آپ کا مطالعہ وسیع نہیں۔۔۔۔۔ ورنہ آپ لازماً کسی نامور ادیب کا نام لیتیں۔۔۔۔۔ ویسے میں نے کم عمری میں ہی عصمت چغتائی، منو، مفتی شہاب، ہالو قدسیہ اور اشفاق احمد کو از بر کر لیا تھا۔“

”ہر شخص اپنی ذاتی پسند ناپسند میں آزاد ہے۔“ ”جیشہ صحرائی کی کہانیاں تو ایک ہی جینٹرن پر چلتی ہیں۔۔۔۔۔ کافی یکسانیت ہے ان کی تحریروں میں۔۔۔۔۔ میں نے بے ساختہ کہا۔“

”گنگا ہے آپ انہیں کافی تنقید کی سے پڑھتے ہیں۔“ اس کا جواب پڑھ کر مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔

”ارے نہیں مادام! میرے فنی ہی بس اکثر گلہ کرتے ہیں ورنہ مجھے اتنی فرصت کہاں؟“

”جیشہ صاحب کے الفاظ ساحر ہیں اور کردار

شام ڈھلے اس نے اپنے مخصوص لٹھ مار انداز میں جواب دیا۔
 ”ایگز امر میں مصروف ہوں۔“
 ”نیک تمنا میں قبول کیجیے۔۔۔۔۔ کون سے ایگز امر ہیں بانیِ دواوے؟“

”شکر ہے۔۔۔۔۔ بی ایڈ فرسٹ سیکسٹر۔“
 ”فراغت ملنے ہی میسج کیجیے گا۔۔۔۔۔ ہم مزاج لوگوں سے بات چیت بہت لطف دیتی ہے۔“ میں نے اپنا پہلا داؤ کھیلنے کا آغاز کر دیا تھا۔

”معذرت قبول کیجیے۔۔۔۔۔ میں اشد ضرورت کے علاوہ از خود میسج یا رابطہ نہیں کرتی۔۔۔۔۔ سوشل میڈیا استعمال کرنے کے کچھ اصول و ضوابط ہیں جن پر میں سختی سے کاربند ہوں۔“ اس نے ٹکسا جواب دیا۔

آصفہ نے پہلی ہی گیند اٹھا کر باؤنڈری سے باہر پھینک دی تھی۔ میری پیشانی ٹکسن آلود ہو گئی۔ سگریٹ سلگاتے ہوئے میں نے گہرائی لیا اور محتاط انداز میں جواب دیتے ہوئے لکھا۔

”امتحانات میں کامیابی کے لیے ایک بار پھر نیک خواہشات قبول فرمائیے۔۔۔۔۔ ویسے اگر مناسب تمہیں تو کیا میں جان سکتا ہوں آپ کی تعلیم کیا ہے؟“
 ”انگریزی ادب میں ماسٹرز کیا ہے۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ پنجابی اور اردو ادب بھی پڑھا ہے۔“

”کمال است۔“ میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ آپ ایک ذہین قاری ہیں۔“

”بہت شکر ہے۔۔۔۔۔ اور معذرت کہ مجھے کچھ مصروفیت ہے۔۔۔۔۔ اللہ حافظ۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر لاگ آؤٹ ہو گئی۔
 آصفہ کا یہ رویہ میرے ذہن میں شدید لچل چکا تھا لیکن شطرنج کی اس بساط پر ابھی مزید مہرے بانی تھے۔
 کچھ روز بعد دلاور اپنی بچنی کے چیک کیش کروانے کے لیے بینک آیا تو میں نے اسے لچ میں شریک کر لیا۔ باتوں باتوں میں گروپ اراکین کا تذکرہ بھی چھڑ گیا۔

”اے میرے قادرِ رواں لوگ ہیں سب۔ محبت سے پیش آتے ہیں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے اسے کہا۔
 ”دیریں چرچک۔۔۔۔۔ کن افراد کو شرفِ گفتگو بخشا ہے آپ نے سر جی؟“

”بھائی! امیرا در تو ہر ایک کے لیے وا ہے۔۔۔۔۔ سبھی قارئین میرے لیے بہت محترم اور محبوب ہیں۔“
 ”آصفہ خان سے بھی بات چیت ہوئی آپ

لازوال۔۔۔۔۔ ان کی تحریر کا گداز بے خود کر دیتا ہے۔۔۔۔۔ محبت ان کے ہر لفظ میں سانس لیتی ہے۔۔۔۔۔ معاشرتی برائیاں اپنے وجود پر سکتی دکھائی دیتی ہیں۔۔۔۔۔ ان کا قلم فوس طاری کر دیتا ہے۔“ آصفہ کے الفاظ و انداز نے مجھے تنگ کر دیا اور جشید سے اسز نو شہید جلن محسوس ہونے لگی۔ اسی پلِ دل میں بے ساختہ ایک خواہش ابھری کہ کاش ایسی محبت و دیوانگی میرا نصیب بھی قرار پا جائے۔

اس سے گفتگو کرتے ہوئے وقت کا اندازہ ہی نہ ہو سکا۔ میں روزانہ بیسیوں افراد سے سوشل میڈیا کے علاوہ فون کال پر گفتگو کرتا تھا لیکن کسی کے اندازِ بیان نے اس طرح متاثر نہیں کیا۔ آصفہ کی بات چیت سے اس کی کم کوئی ذہنی مضبوطی اور انکی تعلیم مکمل طور پر جھٹکتی تھی اور سچ بتاؤں تو پہلی ہی گفتگو میں اس کا رکھ رکھاؤ مجھے کافی متاثر کر گیا تھا۔
 میں کسی بھی قیمت پر اسے اپنی ”نیم“ کا رکن بنانے کا خواہشمند تھا۔

☆☆☆

میری خوش قسمتی ان دنوں عروج پر تھی۔
 ثمارے میں تین سال سے جاری ایک چخادری مصنف کا سلسلہ وار ناول ادبی بیٹھک میں بے رحم تنقید کی زد میں تھا۔ لہذا قبل از وقت اپنی تحریر کے تانے بانے سمیٹنے پر مجبور ہو گیا۔

پہلی انگڑ میں کامیاب اسٹروکس کھیلنے کے نتیجے میں ”قارئین“ کے اصرار پر مجھے سلسلہ وار ناول لکھنے کے لیے ایک بار پھر مدعو کیا گیا اس کامیابی کے بعد سوشل میڈیا ادبی بیٹھک اور یہاں موجود قارئین کی خوشنودی ناقابلِ گزیر ہو چکی تھی۔ پچانوے فیصد افراد تو پہلے ہی میرے گرویدہ تھے۔ باقی ماندہ میں آصفہ اور اس کے چند قریبی احباب شامل تھے۔ اس لیے میں نے لپٹا اگلا ”ٹارگٹ“ آصفہ خان کو منتخب کر لیا۔ اس لڑکی کے الفاظ اور گروپ میں مضبوط پوزیشن میرے لیے بہت سودمند ثابت ہو سکتی تھی۔

میں اپنے ذہن میں شطرنج کی بساط بچھاتے ایک نئی بازی کھیلنے کے لیے تیار ہو گیا۔

اگلے کئی روز میں آصفہ کی جانب سے کسی پیغام کا منتظر رہا لیکن اس کی خاموشی و بے نیازی جوں کی توہی برقرار تھی۔ ایک ہفتے بعد بالآخر میں نے خود ہی پہل کی اور بیٹھک میں دریافت کیا۔

”کہاں غائب ہیں محترمہ۔ گروپ میں بھی کم ہی نظر آ رہی ہیں؟“

ان کے رویے سے اوسنے لگا ہوں..... وہ وقت بے وقت بات چیت اور فون کالز کے خواہاں رہتے ہیں..... میرے کام کا بہت خرچ ہوتا ہے۔“

”اس میں کیا مشکل ہے؟ انہیں واضح طور پر بتا دیجیے کہ آپ کے کام میں خلل نہ ہوں..... وہ سمجھدار اور باشعور ہیں..... اس لیے خود ہی سنبھال جائیں گے۔“

”لیکن اگر وہ ناراض ہوتے تو مجھے دکھ ہوگا۔ میں کسی کی دل شکنی نہیں کرنا چاہتا لیکن اس مسئلے کا حل بھی چاہتے ہوں۔ آپ ہی راہنمائی کیجیے پلیز!“ میں اپنے اسٹروکس مکمل توجہ سے ٹھیل رہا تھا۔

”کن افراد سے بیزار ہیں آپ بائی داوے؟“

”کوئی ایک ہوتا بتاؤں..... مجھدا مجھے ان کی محبت میں کوئی شبہ نہیں لیکن ملاقات کے تقاضے اور طویل فون کالز وقت کا زیاں کرتے ہیں۔“

”اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں..... اگر آپ انہیں دو ٹوک جواب دینے کی ہمت نہیں رکھتے تو قوت برداشت میں اضافہ کر لیجیے..... افتادہ ہو گا۔“ اس نے مسکراہٹ کی اسٹائلیں کیجیے ہوئے کہا۔ ”اور ایک التجا بھی کر دو گی کہ دوسرے ممبران کے رویے کی شکایت مجھ سے مت کہہ کیجیے..... کیونکہ میرا اعتقاد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کی غیہ موجودگی میں اس کی بابت مجھ سے گفتگو کر سکتا ہے تو کہیں نہ کہیں میری ذات بھی موضوع گفتگو ہو سکتی ہے۔“

میں ایک گہری سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ اس انتظار میں خاطر خواہ کامیابی کے لیے بے پناہ مہر و محنت کی ضرورت تھی اور رانا راجس نے ہمیشہ ہر بازی میں مستقل مزاجی ہی سے حاصل کی تھی اس لیے ایک فوری نیم پلان مرتب کر لیا۔

میرے وسیع مطالعے اور تجربے کے مطابق منصف مخالف کو تین اقدام میں اپنے دام میں لایا جاسکتا ہے۔ اگر ضمن میں میرا پہلا داؤ ”اعتقاد“ کافی حد تک کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے مکمل حکمت عملی کے تحت ”توجہ اور اپنایت“ کا ردھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

تین ماہ کا عرصہ بیت گیا۔ آصف خان سے چٹنگ اب قدرے طویل ہو گئی تھی۔ اس کے رویے میں بھی قدرے نرمی اور خوش اخلاقی جھلکے لگی تھی۔ کتب بینی اس کا جنون تھا اس لیے کتابوں کے علاوہ کسی موضوع پر بہت کم گفتگو ہوتی۔

”آپ لکھنے لکھانے کی طرف توجہ دیجیے..... میں ہ

کی؟“ دلوار نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”بالکل..... ایک بار نہیں ہماری تو روز ہی چٹنگ ہوتی ہے۔“ میں نے طرح دی۔

”کمال ہے..... اس کے بارے میں تو سنا ہے کہ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتی..... اکثر ممبران اس کے خشک اور سخت رویے سے تالاں ہیں۔“

”ہاں! میں نے بھی محسوس کیا ہے کہ اس کے کمشن بہت سخت ہوتے ہیں..... لیکن خیر! مجھے تو خود ہی منیج وغیرہ بھیجتی ہے اور بہت خوش اخلاقی سے پیش آتی ہے۔“

”میں کو ایک کچھ نظر آتے ہیں کچھ..... ویسے سرجی! اکثریت اسی بات پر متفق ہے کہ یہ کوئی لڑکی نہیں ہے..... بلکہ اس آئی ڈی کے پس پردہ کوئی لڑکا ہے۔“ دلوار نے آہی بتائے خواتین کا رویہ اس قدر پراسرار کہ ہوتا ہے۔ وہ تو خود نمائی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے ہی نہیں دیتیں۔“ دلوار نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

”کوئی بات نہیں..... جلد ہی تجیلے سے باہر نکل آئے گی۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”ہم تو خود جانے کب سے اس کھڑی کے منتظر ہیں۔“

دلوار کے انکشافات اور اس پر مستزاد آصف کا رویہ میرے لیے ایک چیلنج بنے۔ گلے میں تو ایک بار پھر اپنے بچپن میں پہنچ گیا۔ راوی کی کہروں کی موج دمرنگی مجھے مجسم نظر آنے لگی تھی۔ جذبہ تغیر ایک بار پھر مکمل شدت سے عود آیا اور میں بے اختیار اس سے رابطہ کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

”آپ کی پروفائل میں ذاتی مواد کافی کم نظر آتا ہے..... اس کی کوئی خاص وجہ؟“ میں نے اس شام آصف کی پروفائل کھنگالنے کے بعد استفسار کیا۔

”آپ اپنی مصروفیات ترک کر کے میری پروفائل کی چھان بین کرتے رہتے ہیں..... اس کی کوئی خاص وجہ؟“

”میری برجستہ گفتگو مجھے بہت محفوظ کرتی ہے اور آپ کے ان باکس میں لے آتی ہے۔“

”یہ میرے سوال کا جواب ہرگز نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔

”اوہو! میں نے تو یونہی برٹیل تذکرہ پوچھ لیا تھا۔“

”آئی سی..... اب برٹیل تذکرہ یہ بھی بتا دیجیے کہ کتنے

ممبران آپ سے یہ کہہ چکے ہیں کہ آصف خان درحقیقت لڑکا ہے..... اور اب یہ مت کہیے گا کہ کسی نے نہیں کہا ایسا۔“ اس کے دو ٹوک انداز پر میں گزربڑا گیا۔

”کچھ تو لوگ کہیں گے..... لوگوں کا کام ہے کہنا..... اس لیے یہ ذکر چھوڑیے..... لیکن سچ بتاؤں میں اب

طرح سے راہنمائی کرنے کے لیے تیار ہوں۔“ میں اسے ترغیب دیتے ہوئے کہتا۔
 ”ابھی اس کا وقت نہیں آیا..... لیکن جلد ہی کوشش ضرور کروں گی۔“

”بھی ذاتی تحریر کردہ اقتباس دکھائیے گا۔ میں آپ کے الفاظ و خیالات کی گہرائی ماپ کر دھینا کسی بہتر مشورے سے نوازوں گا۔“

کچھ روز بعد اس نے ایک مختصر ذاتی کاوش روانہ کی۔ الفاظ کا چناؤ جذبات کی شدت اور سوچ کی گہرائی اس کے قلم کی چنگی کا منہ بولتا ثبوت تھی تاہم میں اسے کسی بھی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے ساتھ تنقید کے واجبات کی ادائیگی کا آغاز کرتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

”ابھی تحریر ہے..... لیکن ابھی آپ کا مطالعہ بہت کمزور ہے۔ اپنے پسندیدہ مصنفین کے دائرے سے رہائی حاصل کرنے کے بعد ہی خیالات و احساسات میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے۔“

”میں نے پہلے ہی عرض کی تھی کہ ابھی قلم اٹھانے کا وقت نہیں آیا لیکن آپ ہی بعد تھے کہ اقتباس روانہ کروں۔“ پوسی اور افسردگی کی جھلک نے میرا دل خوشی سے معمور کر دیا۔

”مگر تے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں..... آپ اپنی تحاریر مجھے دکھا دیا کیجیے..... میں بسر و چشم اصلاح کے لیے تیار ہوں۔“

”یہ باتیں قبل از وقت ہیں..... وقت آنے پر حالات کے مطابق ہی کوئی فیصلہ کیا جاسکے گا۔“ ایک مسکراتی ہوئی اسٹاکلی کے ساتھ جواب پڑھ کر میرے رگ و پے میں سستا ہٹ دوڑ گئی۔

اس کے رویتے کی یہ مبہم تبدیلی میرے دل میں خوش فہمیوں کی افزائش کرنے لگی تھی۔ صنف نازک کی جانب سے اک ڈرامائی زلی ازل ہی سے ابن آدم کے جذبات میں پہل چلا دیا کرتی ہے تو میں بھلا کیونکر محفوظ رہ پاتا؟ اس لیے ایک روز احتیاط کا دامن اتھم سے چھوٹ گیا۔

”آپ نے اپنی ذاتی زندگی کے متعلق کبھی کچھ نہیں بتایا..... کیا آپ مجھ پر اعتبار نہیں کرتیں؟“

”مجھے ذاتیات پر گفتگو پسند نہیں..... کیا میں نے کبھی

آپ سے ذاتی سوال جواب کیے؟“

”دوستوں میں اتنی پردہ داری بھی تو ابھی نہیں

ہوتی..... خیر میں خود ہی بتائے دیتا ہوں کہ میں اپنی زندگی میں

بہت تنہا ہوں۔ کامیابی کی لگن اور جنون نے گھر بسانے کا موقع ہی نہیں دیا۔ بڑے بھائی اور بھابی کے ساتھ بے انگ کیسٹ کے طور پر رہتا ہوں۔ بینک سے واپسی کے بعد کاغذ قلم کے ساتھ وقت بیت جاتا ہے۔ حلقہ احباب بھی بہت محدود ہے۔“ میں نے اطمینان سے نئی کہانی کھڑی۔ ”اب تو دل چاہتا ہے کہ کسی ہم خیال اور باذوق خاتون سے عقد کر کے زندگی کی تکمیل کر لی جائے۔“

”دوستی ہم پلہ افراد میں ہوتی ہے محترم! آپ کی اور میری کوئی برابری نہیں۔“ وہ میری اصل بات نظر انداز کر گئی۔ ”بہت افسوس ہوا جان کر..... اگر ہمارے مابین دوستی کا رشتہ نہیں تو پھر آپ ہی اس رشتے کو کوئی نام دے دیں۔“

”عزت و احترام..... آپ فکر میں..... اور میں قاری..... آپ کے پاس قلم کی مقدس امانت موجود ہے اور قلم کی قسم تو قرآن پاک میں بھی اٹھائی گئی ہے۔ صرف اسی سنگریم کے تحت میں آپ سے بات کر لیتی ہوں..... ورنہ بے مقصد چیٹنگ مجھے پسند نہیں ہے۔“

”مجھے دلی طور پر بہت دکھ ہوا کیونکہ میں حقیقتاً آپ کو ایک دوست سے بڑھ کر حیثیت دینے لگا ہوں..... اور یقیناً جانے کبھی کبھی بہت دل چاہتا ہے کہ اتنے خوبصورت خیالات کی حامل خاتون سے بالمشافہ ملاقات کی جائے یا کم از کم فون پر ہی گفتگو کر لی جائے۔“

”میں محض یہی کہوں گی..... کہ عزت بنانا تو بے حد آسان ہے لیکن اسے قائم رکھنا انسان کے ذاتی اختیار میں ہوتا ہے اور میری نظر میں جب کسی کی عزت نہ رہے تو مذکورہ فرد ”بلاک لسٹ“ میں منتقل ہو جاتا ہے۔“ اس کے الفاظ میں پوشیدہ تنبیہ میں بخوبی سمجھ گیا تھا۔

آصف کا رویہ مجھے بے طرح الجھانے لگا۔ میں رانا راہیل تھا۔ شوشل میڈیا کا بااخلاق اور متبول لکھاری..... لیکن وہ اپنے خول سے باہر آنے کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ یہ الجھاؤ میری گھنچلاہٹ میں اضافہ کرنے لگا۔

ان دنوں میں اپنے نئے ناول کی اقساط مکمل کرنے میں مگن تھا۔ انٹرنیٹ لکیشن بھی فی خرابی کا شکار تھا۔ ادارے میں چھ اقساط روانہ کرنے کے بعد میں نے ایک ہفتے بعد اپنا اکاؤنٹ کھولا تو ادبی گروپ میں ایک دھماکا دار خبر میری منتظر تھی۔ مقامی میگزین میں آصف خان کے تحریر کردہ مضمون کی اطلاعی پوسٹ دکھ کر میں بے حد حیران ہوا۔

”قلمی سفر کا آغاز بہت مبارک ہو ڈیر! لیکن آپ نے کبھی

اس بابے میں بتایا کیوں نہیں؟“ میں نے اسے پیغام بھیجا۔

”بہت شکریہ..... بتانے یا نہ بتانے سے کیا فرق پڑتا ہے جی؟“

”ارے بھی! میں آپ کی مدد کر دیتا..... میرے تعلقات بہت وسیع ہیں۔ میں کسی بھی بہترین ادارے میں آپ کو بریک دلوا سکتا ہوں۔“

”یہی تو میں نہیں چاہتی..... میں کسی بھی سہارے کے بغیر اپنی اہلیت کے بل بوتے پر یہ سفر جاری رکھنا چاہتی ہوں۔“ اس کا جواب پڑھ کر مجھے طش آگیا۔

سوشل میڈیا پر لوگ اپنی تحریروں کی اصلاح کے لیے میری منت سماجت کرتے رہتے تھے لیکن اسے جانے کس بات کا زعم تھا؟

”میں آپ کی خودداری کی قدر کرتا ہوں..... لیکن ایک بار میری پیشکش پر غور کیجیے گا۔ میں ایک سالانہ میگزین تک آپ کو رسائی دلوانا چاہتا ہوں۔ بہت نامور ادیب اس کے لیے لکھنا باعث فخر سمجھتے ہیں۔“

”میں بھی آپ کے غلوں کی قدر کرتی ہوں..... لیکن اپنی قوت پر دوازے کے مطابق ہی اڑان بھرنا چاہتی ہوں۔ فی الوقت میری اتنی بساط نہیں کہ نامور ادباء کے مقابل اپنی تحریریں پیش کروں..... اور آج اگر آپ میری مدد کریں گے تو مستقبل میں مجھ سے بھی یہی طریقہ طور پر کچھ نہ کچھ طلب کریں گے۔ اس لیے یہ سلسلہ یہیں روک دینا چاہیے۔“ اس سادہ اور قدرتی منطق پر میں خاموش رہ گیا اور ایک توقف سے لکھا۔

”کیا آپ کو علم ہے کہ ادارہ ایک نیا سلسلہ وار ناول کا آغاز کر رہا ہے؟ ہو جیسے تو سبھی کو وہ ناول کس مصنف کا ہوگا؟“

”رانا راجیل..... ایم آئی رائٹ؟“

”جی ہاں..... بالکل.....“ میں ہرجوش ہوا۔ ”کل میں نے کچھ اقساط ایک ساتھ جمع کروائیں اور جانتی ہیں کہ مدیر اعلیٰ نے بعد ازاں مجھے خصوصی طور پر دفتر میں طلب کیا۔ اپنی کرسی سے اٹھ کر ہنسی بھرے اور میری پیشانی پر بوسہ دے کر کہنے لگے..... راجیل! یہ ناول میگزین میں ایک نئی جان پھونک دے گا۔“

”مبارکباد قبول کیجیے..... چلیں اسی بہانے میں بھی آپ کی کوئی سلسلہ وار تحریر پڑھ لوں گی۔“

”میں تو کئی بار کہہ چکا ہوں کہ اپنا ایڈریس دیجیے۔ میں ”اپنے ناول“ کتابی شکل میں آپ کو گفت کرنا چاہتا ہوں۔“

”اس پیشکش کا شکریہ لیکن میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔“

”کیا مخالف کالین دین کسی ضرورت کے تحت کیا جاتا

ہے؟ لیکن خیر..... میں آپ کے مثبت جواب کا منتظر تو رہوں گا۔“ میں نے متنی خیز انداز میں اپنی سابقہ پیشکش کا عندیہ ایک بار پھر دہرایا۔ سوشل میڈیا پر اپنی گھریلو زندگی کی پوشیدگی سے میں ہمیشہ ہی بھرپور فائدہ اٹھاتا آیا تھا۔

”میں آج کل جمشید صاحب کا شاہکار ناول پڑھ رہی ہوں اور ابھی مزید کسی چیز کی تمنا نہیں۔“

”آپ کو علم ہی نہیں کہ اکثر لوگ کہتے تھے کہ جمشید صحرائی کے ناول میں بھی میرے کرداروں ہی کی جھلک تھی۔“ میں تنک گیا۔

اس سے قبل کہ وہ ایک بار پھر جمشید نامہ شروع کرتی، میں نے فوری طور پر کہا۔ ”آپ میرے ناول پر ہر ماہ اپنا تبصرہ لکھیے گا..... میں اس کہانی کو یادگار بنانا چاہتا ہوں اس لیے آپ سے وقتاً فوقتاً کردار و واقعات بھی ڈسکس کرتا رہوں گا۔ آپ ایک ذہین اور باشعور قاری ہیں اور میں اس ہنر سے فیض یاب ہونے کا خواہشمند ہوں۔“

”آپ کی نوازش ہے ورنہ میری کیا بساط..... تبصرہ تو میں ضرور کروں گی..... اور بالکل میرٹ پر کروں گی۔“ اس کے جواب نے مجھے زیر لب مسکراتے پر مجبور کر دیا۔ میں اسے اپنے رویے اور اعتماد تلے عمل طور پر زیر بار کرنے کا آغاز کر چکا تھا۔

آصفہ کے علاوہ بھی میری بات چیت کئی قارئین سے چل رہی تھی اور بینکار ہونے کے ناتے سرمایہ کاری کی اہمیت مجھ سے زیادہ بھلا کون جانتا تھا۔ ان سبھی افراد سے مستقبل قریب میں اس سرمایہ کاری کی بھرپور قیمت میری منتظر تھی۔ شطرنج کی بساط پر ہمارے اپنی جگہ سجائے میں ایک بھرپور بازی کھیلنے کے لیے تیار تھا۔

میری اس کاوش کا نتیجہ نہایت شاندار ثابت ہوا۔ تین ماہ بعد ”بنجارا“ کی پہلی قسط حقیقتاً دھماکا خیز ثابت ہوئی۔ ایک ہفتے بعد آصفہ کا تبصرہ پڑھ کر میرا دل باغ باغ ہو گیا۔

”رانا راجیل کے نئے ناول کی پہلی قسط نے بہت متاثر کیا..... کہانی کی اٹھان بہت شاندار ہے۔ امید ہے مستقبل میں یہ اپنا رنگ ضرور بجائے گی اور راجیل صاحب سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا۔“

”بہت خوب آصفہ جی! اگر آپ تعریف کر رہی ہیں تو واقعی یہ تحریر خامے کی چیز ہوگی۔ اس لیے پہلی فرمت میں اسی کا مطالعہ کریں گے۔“ گرد پمبران کا ملاملا رڈ کل میرے تن بدن میں بجلیاں دوڑانے لگا۔

”وہ مارا.....“ میں نے بے ساختہ غرہ لگایا اور اسے میسج

”بھجے ہوئے لکھا۔“ آپ کی پسندیدگی جان کر خوشی ہوئی۔“
 ”مکڈ ورک“ ٹھیک اپ..... لیکن میرا تجربہ
 میرٹ پر ہی ہوا کرے گا..... مائینڈ اٹ۔“ اس نے مسکراتی
 ہوئی اسما کی بھجی۔

”بالکل یہی حرکتی..... لیکن وہ ان خامیوں سے مبرا ہیں اور مثبت تنقید کو خوش دلی سے قبول کرتے ہیں اور یہی ان کی کامیابی کا راز بھی ہے۔“

”انتہائی بے ہودہ سوچ ہے یہ..... مجھے ان کی ذات سے کیا لینا دینا..... میں ان کے قلم کی مرید ہوں۔“

”ایک ٹکڑی اس سوچ پر میں انوس ہی کر سکتی ہوں..... اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو پھر یہ بھی جان لیجیے کہ آپ ذاتی پسندیدگی کے میرٹ پر بھی پورا نہیں اترتے۔“ اس نے اطمینان سے چوٹ کی۔

”میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔“

”اچھی طرح سوچ سمجھ لو..... مجھے امید ہے تم گھائلے کا سودا نہیں کرو گی۔ اگر قیمت زیادہ درکار ہو تو بھی بتا دینا..... ورنہ ایک شبی تباہی تمہاری منتظر ہوگی۔“

”میں آپ کے پیچھے بلاک کر رہی ہوں..... آپ جو کرنا چاہتے ہیں، بخوشی کیجیے۔ آصفہ خان بھی ڈرے گی نہ جھکے گی۔ کرائے کے سپاہی اور بھی بہت مل جائیں گے..... گڈ لک۔“

اس کے بعد آصفہ نے میرے بیچ کا رستہ ہی ہلاک کر دیا۔ اس اہانت اور سابقہ ”سیٹ اپ“ کی ناکامی پر میں اپنا ضبط کھو چکا تھا اور اب کسی بھی قیمت پر اس لڑکی کو سبق سکھانا

”بہت اچھے کردار ہیں..... لیکن ہیرو ضرورت سے زیادہ خود اعتماد اور پُر جوش ہے..... اس کا ایکشن غیر منطقی محسوس ہوتا ہے..... اس نکتے پر زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔“

”میں خیال رکھوں گا..... شکریہ..... آئندہ بھی یونہی اپنی قیمتی رائے سے آگاہ کرتی رہے گا۔“

”اب آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔“ آصفہ کا جواب بڑھ کر میسرے لہولہا ایک بھر پور مسکراہٹ سمجھ گئی۔

”کہانی بہت تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کے بعد

دیگرے ریاستی ستونوں کی کرپشن کا بیان بہت سنسنی خیز محسوس ہوتا ہے۔

میرے دل و دماغ نے تو شوق کر دی کہ آصفہ خان اب

☆ ☆ ☆

میری خوشی و سرشاری کا یہ دورانیہ بہت مختصر ثابت ہوا۔
دو ماہ بعد سرحدی علاقے کے ایک نوجوان ذوالفقار

دو ماہ بعد سرحدی علاقے کے ایک نوجوان دوا سٹار نے کہانی میں چند غلطیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے گروپ میں خصوصی رپورٹ لکھی تو آصف خاں کا اس پر رد کیا اور کمنٹ دکھ کر

میں ادماغ کھول اٹھا۔

”ایک بخارا جو ہر قسم کے کلنکی امور سے ناواقف ہے، تربیت یافتہ افراد سے بھڑک کر مالی حاصل کرتا ہے..... یہ نکتہ

نا قابل ہضم لگتا ہے۔ کہانی میں چند ایک واقعاتی جھول بھی

اس قیط پر ہونے والی تنقید نے مجھے بے قابو کر دیا اور

”آپ نے ذوالفقار کی ہرزہ سرائی کو پسندیدگی کی سند
 کیا ہے؟“

”اپنا لہجہ درست فرمائیے محترم..... اور اس نے کچھ غلط“

”آپ کی رائے پڑھ کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں

آپ کو اپنا نمائندہ خاص بنانا چاہتا تھا تاکہ میری بہترین ترجمانی ہو سکے لیکن آپ نے ہی تنقید کا آغاز کر دیا..... اپنا

چاہتا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے تحت میں نے کچھ دن کے لیے ادبی بیٹھک سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے دوست دلاور اور سبحان میری غیر حاضری پر ذاتی طور پر رابطہ کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں گے۔
”سر جی! کوئی غلطی یا کوتاہی ہوگئی کیا ہم سے؟ ایسی بے رخی آپ پہ نہیں چلتی۔“ حسب توقع تیسرے ہی روز سبحان نے مجھے فون کیا۔

”بے رخی کیسی یار! سن! چند روز سے میں دلی طور پر بہت دکھی ہوں۔“

”الٹی خیر! کیا ہوا میرے مرشد سائیں کو؟“ اس کی تشویش زدہ آواز ابھری۔

”سبحان مہاں! بخار کے معلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟“

”ایک انتہائی شاندار اور بین الاقوامی سازشیں بے نقاب کرتی ہوئی زبردست تحریر ہے۔ لیکن آپ کی دلی کیفیت کا تعلق بخار سے کیونکر پیدا ہو گیا؟“

”کیا آپ نے اس نکتے پر غور نہیں کیا کہ آصف خان اس کہانی پر ابتدائی داد کے ڈوگرے برسانے کے بعد یکدم مخالف بیانات کیوں دانش لگی ہے؟“ میں نے محتاط انداز میں پوچھا۔

”واللہ! میں کئی دن سے یہی بات کہنا چاہ رہا تھا۔ اس تبدیلی کی کیا وجہ ہے آخر؟“

”وہ بے انتہا مکار، منافق اور موقع پرست لڑکی ہے یار! سن! اس نے میری زندگی اس قدر برباد کر دی ہے کہ میں نے سماجی روابط سے تائب ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ارے سر! یہ ظلم نہ کیجیے گا۔“ سبحان بولکھلا گیا۔

”بس بھائی میرا دل ہی ٹوٹ گیا ہے۔ سچائی کافی

زمانہ بھی انجام ہوتا ہے۔ آصف خان بعد بھی کہ میں اس کے نام سے داستان ہزار رنگ میں کہانیاں لکھا کروں۔ لیکن جب میں نے انکار کیا تو میرے ناول پر تنقید کی دھمکیاں دینے لگی۔ ایک ادیب بہت حساس ہوتا ہے۔ ایسے معاملات سے اس کی سوچیں بھولہاں ہو جاتی ہیں۔“

”آپ فکر ہی نہ کریں سر جی! آپ ایک جانب رہے۔ یہ محاذ ہم سنبھال لیں گے اور آصف کو یہاں ٹھٹھے ہی نہ دیں گے۔“ اس نے جوش سے کہا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

”اب آئے گا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔“ میں نے سر جھٹکتے ہوئے خود کلامی کی۔

☆☆☆

کچھ وقت گزرا تو ادبی بیٹھک میں کہانی میلے کا آغاز کر دیا

کیا۔ نو آموز مصنفین اس سلسلے میں اپنی مختصر تحریروں پوسٹ کر کے سینئر سے رائے طلب کرتے تھے۔ مجھے بھی اس مقابلے کا بیج بتا دیا گیا۔ شیند بھی تھی کہ آصف بھی اس میں حصہ لے رہی ہے۔ میری دلی مراد برائی۔ مقابلے کے شرکاء مجھ سے ذاتی رابطہ کرنے کے بعد مثبت رائے کے لیے منت ساجت کرنے لگے اور میں نے دور اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذرا سے...

رد و کد کے بعد ان کی بات تسلیم کر کے زیر بار کر لیا۔ مجھے یقین تھا کہ آصف بھی مجھے اپنی تحریر پر رائے دینے کے لیے ضرور مدعو کرے گی لیکن اس نے اپنی رد واتی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی رابطہ نہ کیا۔ احساس تو ہیں اور غصے سے میں نے بھی اس کی کہانی نظر انداز کر دی۔ مجھے گمان تھا کہ اس کہانی کی ریٹنگ بری طرح خرابی کا شکار ہوگی لیکن صورت حال میں اس قدر ڈرامائی تبدیلیاں پیدا ہوئیں کہ میں خود بھی بولکھلا کر رہ گیا۔

جشید صحرائی نے اس تحریر پر مثبت اور حوصلہ افزا رائے دے کر سبکی کو انکشت بدعناں کر دیا۔ میرا تاق بدن جھلنے لگا۔ اسی بل مجھے دلاور کی کال موصول ہوئی۔

”سر جی! یہ آصف کی کہانی تو ایک ہی کنٹ سے سپر ہٹ ہو جائے گی۔“

”جشید اسے ذاتی فیور دے رہا ہے دلاور۔ میں تمہیں ایک غیر جانبدار رائے لکھ کر دیتا ہوں۔ تم اپنی جانب سے اسے پوسٹ کرو۔“ میں نے مضیاں میچیں۔

”ارے نہیں سر جی! جشید صاحب اسے جانتے ہی نہیں۔ لیکن بہر حال میں کنٹ کیے دیتا ہوں۔ آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے۔“

اگلے دس منٹ بعد دلاور نے میرے الفاظ وہاں پہنچاتے ہوئے لکھا۔

”آصف خان کی تحریر اس مقابلے کی کمزور ترین کہانی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ مصنف خواہش کے شماروں سے بہت متاثر ہیں۔ کہانی کا پلاٹ گھسا پٹا اور آؤٹ ڈیٹڈ ہے لیکن ایک مصنف اپنے ٹریٹمنٹ اور انداز بیان سے اسے پرکشش بنا سکتا ہے جو آصف نہ کر سکیں۔ تحریر میں جا بجا املاء کی غلطیاں ہیں لیکن خیر یہ تو مصنف کی کم علمی یا لاعلمی کہہ سکتے ہیں۔ آصف میں لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اگر وہ مزید کوشش کریں تو قدرے بہتر لکھ لیں گی۔ تاہم یہ ایک بیانیہ تحریر ہے جس میں کہانی کا کوئی عنصر موجود نہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہانی میلے کی کمزور ترین تحریر ہے۔ تحریر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ سرے سے کہانی ہی نہیں ہے۔“

چند لمحوں بعد میں نے باجرہ کو فون کیا اور حال احوال دریافت کرتے ہی استفسار کیا۔

”آپ کی کہانی پر جمید صاحب نے کوئی رائے دی تھی کیا؟“

”نہیں سربئی! مجھے بہت دکھ ہے اس بات کا۔“ وہ

کافی آزرده تھی۔
”احتجاج آپ کا حق ہے ڈیر..... آپ سب ساتھیوں سے مشاورت کیجیے اور اس غیر مساوی سلوک کے خلاف ایونٹ کا بائیکاٹ کر دیں۔ میں ہر موڑ پر آپ کے ساتھ ہوں۔“

اور پھر وہی ہوا جو میں چاہتا تھا..... کہانی میلاختازندہ حیثیت اختیار کر گیا۔

میرے ذہن و قلب اب پُر سکون ہو چکے تھے۔ آصفہ سے ملی اذیت میں سود سمیت لوٹا چکا تھا۔ ”بخارا“ پر اس کے تنقیدی تبصروں کے جواب میں میرے جانثار ساتھی اس کے خوب لٹے لیتے۔ میں وقتاً فوقتاً انہیں آصفہ سے منسوب جھوٹے قصے سنا کر اپنی مظلومیت ثابت کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑتا لیکن وہ اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ ہوتی۔ اسے شکست سے دو چار کرنے کی تمنا شدید سے شدید تر ہوتی گئی اور پھر ایک ایسا دھماکا ہوا جو مجھ سمیت ہزاروں اراکین کے وہم و گمان کی سرحدوں سے بھی بعید تھا۔

☆☆☆

چھ ماہ بعد بینک اوقات میں دلاور اور سبحان کی مشترکہ فون کالز موصول ہوئیں۔

”سربئی! آصفہ خان کی وہی کہانی داستان ہزار رنگ میں شائع ہو گئی ہے۔“

”واٹ رئش! ایسا کیسے ممکن ہے؟ ارے مجھ جیسے رائٹر کو وہاں دس سال بعد موقع ملا تھا۔ وہ کل کی بچی دہاں کیسے پہنچ گئی۔ اس نے کسی اور سے لکھوائی ہوگی یہ کہانی یا جمید صاحب کی سفارش ہی ہوگی۔“ میں بے قابو ہو گیا۔

”آپ ذرا گروپ میں ایک پوسٹ پڑھ لیجیے۔“ دلاور نے سپاٹ انداز میں کہا تو میں نے فوراً موبائل فون پر ہی پٹا کاؤنٹ کھول لیا۔

ادبی بیٹھک میں آصفہ نے سب ممبران کی مبارکباد اور توصیف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”آپ سب کی محبتوں کا بہت شکریہ..... یہ کہانی نہیں..... میری بقا کی جنگ تھی۔ جمید صاحب نے اپنی رائے دیتے ہوئے لکھا تھا کہ اسے طوالت دی جانی

چاہیے۔ ان کا یہ کنٹ ایک ”معزز ہستی“ سے برداشت نہ ہو سکا۔ اس ہستی نے اپنے ایک ”سپاہی“ کے کندھے پر بندوق رکھتے ہوئے اس کہانی پر ”کمزور ترین تحریر“ کا فتویٰ لگا دیا۔ جمید صحرائی کی رائے پر ایسی ہرزہ سرائی پر خاموشی اور بے عملی ان سے میری محبت کی توہین تھی۔ ایک طرف جمید صاحب سے محبت تھی تو دوسری جانب کسی کی نفرت..... قرض تو مجھے چکانا ہی تھا۔ آج اس کہانی کی اشاعت سے زیادہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ اب میرے ذمے کوئی قرض نہیں۔“

اسی لمحے مجھے ان باکس میں ایک میسج موصول ہوا۔ آصفہ خان کا نام دیکھ کر میں حیران ہوا تبھی بھول گیا۔

”زہے نصیب! آج ہمارے میسج کیسے اُن بلاک کر دیے؟“ میں نے طنز کیا۔ ”شاید اپنی ناکارہ کہانی پر تعریفی تبصرہ لکھوانا ہوگا۔“

”ہرگز نہیں..... یہ جوڑ توڑ آپ کا خاصہ ہیں لہذا آپ ہی کو مبارک..... میں تو شکریہ ادا کرنے آئی تھی۔ آپ کی ”محبت اور اعلیٰ ظرفی“ نے میرے ارادے ہمیز کیے۔ آئندہ بھی یو پی کی کرتے رہے گا، میرے سفر میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اور ہاں، ایک آخری بات یہ کہوں گی کہ کسی کو مات دینے کی خواہش میں ہم اکثر فراموش کر دیتے ہیں کہ قادر مطلق ہمیں ”شہ مات“ بھی دے سکتا ہے۔ آپ اپنی مہم جاری رکھیے..... میں اپنی محنت، خلوص نیت سے جاری رکھوں گی..... پھر یہ وقت خود ہی گواہی دے گا کہ شہ مات کس کا نصیب ٹھہری؟“

آصفہ کے ان الفاظ نے میری ذات کے پر نچے اڑا دیے اور اس روز سے ہمارے مابین ایک سرد جنگ کا آغاز ہو گیا۔

☆☆☆

آتش انتقام نے میرے دل و دماغ بے طرح جھلکا رکھے تھے۔ آصفہ خان کا تصور میرے رگ و پے میں چنگاریاں پیدا کر دیتا۔ سبحان، باجرہ اور شہباز میری دلی کیفیت سے بخوبی آگاہ تھے اس لیے کسی جانثار دوست کی طرح میری ہمت بندھانے میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔

”سربئی! کم ظرف لوگوں کے لیے پریشانی میں مبتلا ہونا حاصل ہے۔“ سبحان اکثر ملاقات کے لیے آتا اور مجھے بے حد محبت سے مخاطب کرتے ہوئے کہتا۔

”بس برادر! میری حساس طبیعت نے اس واقعے کا بہت اثر لیا ہے۔ آصفہ کے نام سے داستان ہزار رنگ میں کہانیاں لکھنے سے انکار کی پاداش میں آج میرا ناول بے

لیکن سچ بتاؤں تو میری توجہ اب اپنی تحاریر سے زیادہ آصفہ کے خلاف مہم جوئی پر مرکوز ہو چکی تھی۔ شہباز نے میری ہدایات کے مطابق سوشل میڈیا پر موجود دیگر مصنفین سے روابط بڑھاتے ہوئے انہیں بھی ”سچائی“ سے آگاہ کرنے کا آغاز کر دیا تو سبجان نے باضی قریب میں آصفہ کے سر درویشے سے ”مناثرہ افرا“ پر مشتمل ایک ٹیم کی تشکیل شروع کر کے اس کے گرد گھیرا ہوا تنگ کر دیا۔

ہم سب کا مقصد محض ایک منکبر اور بد اخلاق لکھاری کی ”رسوائی اور راہ راست“ پر واپسی تھا۔ اتحاد کی قوت سے تو چڑیاں بھی طاقتور جال اڑانے میں کامیاب ہو جاتی ہیں ہمارے مقابل تو ایک ایسی صنف موجود تھی جس کی کمزوری مسلمہ ہے۔

میں شدت سے اس کی شہ مات کا منظر تھا۔

☆☆☆

چند دن سے بینک کی مصروفیات میں اس قدر اضافہ ہو گیا تھا کہ سر کھانے کی فرصت بھی نہ ملتی۔ پیشہ ورانہ مسائل کے علاوہ آصفہ کا سفر مسلسل بھی باعث آزار بن چکا تھا۔ میری ٹیم کے اراکین کی سب تدابیر کے باوجود وہ ”داستان ہزار رنگ“ میں باقاعدہ لکھاری بن گئی تھی۔ ہر ماہ ادبی بیٹھک میں اس پر ریکارڈ تنقید جاتی لیکن اس تنقید کے کوڑے کھا کر اس کی اگلی تحریر اس قدر گھبر کر سامنے آتی کہ میں دم بخود رہ جاتا۔ مختصر دورانیے میں ہی اس کی تحاریر نے قارئین کے دلوں میں گھر کر لیا۔ جوشید صحرائی کے بعد ایک اور ”رقیب“ میرے لیے ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔

نفرت، عداوت اور بغض کا یہ سفر دھیرے دھیرے میرے اعصاب میں انتشار پیدا کرنے لگا۔ تھکاوٹ ڈہنٹی تناؤ اور بے آرامی دیگر امور پر بھی بے طرح اثر انداز ہونے لگی تھی۔ اس روز بھی میں سچ کے اوقات میں ہی صحن سے چور ہو چکا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے سگریٹ سلگایا ہی تھا کہ موبائل فون پر داستان ہزار رنگ کے رابطہ افسر کا پیغام دیکھ کر ٹھنک گیا۔

”رانا صاحب! آج شام کچھ وقت نکال کر دفتر میں ملاقات کا شرف بخشیں۔۔۔۔۔ کچھ ضروری امور پر بات چیت کرنی ہے۔“

میں نے الجھے ذہن سے ملاقات کی توثیق کر دی اور طے شدہ وقت کے مطابق دفتر روانہ ہو گیا۔ چیف ایڈیٹر نے خوش اخلاقی سے استقبال کرتے ہوئے حال احوال

طرح تنقید کی زد میں ہے۔“
”آپ فکر ہی نہ کریں سچی! ہم اسے اس حرکت کا مزہ ضرور چکھا سکیں گے۔“ سبجان کی جنگجو طبیعت جل اٹھی۔
”لیکن کیسے؟“

”اگر ہم آصفہ خان کے مقابلے میں اپنی ٹیم سے ایک رائٹر میدان میں لے آئیں تو اس کا سفر آغاز میں ہی بے موت مر جائے گا۔“

”نیک خیال ہے۔“ میں نے نیم رضامندی ظاہر کی۔
”ہاجرہ بھی لکھنے لکھانے کا شغف رکھتی ہے۔۔۔۔۔ اگر آپ اس کی راہنمائی کریں تو وہ آصفہ کو چاروں شانے چت کر دے گی۔ علاوہ ازیں ہم سبھی احباب اس کے خلاف ادارے میں شکار بننے اور تنقیدی مواد بھیجتے رہیں گے۔ ادبی بیٹھک میں اس کی کسی بھی تحریر کا ذکر خیر نہیں ہو گا۔ آپ دیکھیے گا وہ بہت جلد اپنی کہانیوں کے فلاب ہونے پر کھٹکتے ہوئے معافی طلب کرے گی۔“ سبجان کی حکمت عملی پر میں آتش کراٹھا۔

”مجھے منظور ہے۔۔۔۔۔ میں کسی بھی قیمت پر اپنی اہانت کا بدلہ لیتا چاہتا ہوں۔ اس کے لیے میں ہاجرہ کو کہانیاں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔“

”بہت خوب! یہ ہونی ناپت۔۔۔۔۔ بس اب آپ اطمینان سے اس منکبر اور بد ماخ انسان کا زوال دیکھتے رہیے۔“

بہت عرصے بعد میں نے محل کر سانس لی۔ آصفہ کی تلخ گفتگو اور اپنی ناکامی کسی پھانس کی طرح میرے دل میں گڑ چکی تھی تاہم سبجان اور ہاجرہ کی اس حکمت عملی نے مزاج میں قدرے بشاشت پیدا کر دی۔

چند روز بعد ہاجرہ نے اپنی کہانیوں کے کئی مسودات کا پلندہ اچھے ارسال کر دیا۔ ان مسودات پر نظر ڈالتے ہی میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کے انداز بیان جملوں کی بناوٹ اور دیگر لوازمات میں بے پناہ غلطیاں تھیں لیکن اب ادھلی میں سر دیا تھا تو موصول سے کیا ڈرتا؟ میں نے ان تخلیقات کی زیبائش کے لیے کمر کس لی۔ درجن بھر سے زائد کہانیاں از سر نو لکھتے ہوئے میں ”بجارا“ کی کئی اقساط پر نظر ثانی بھی فراموش کر دیتا۔

اسی آنکھ بھولی میں چھ ماہ سے زائد عرصہ بیت گیا۔ میں اپنی ٹیم کی کارکردگی سے مکمل مطمئن تھا۔ میری تحریر پر محترم افراد ان کے جارحانہ انداز سے بے حد خائف رہتے۔ میں نے اپنی کٹھنہ میراث ”پنہ یرانی“ ایک بار پھر حاصل کر لی۔ زندگی میں قدرے ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا

در یافت کیا لیکن جانے کیوں مجھے اس کی آنکھوں میں واضح تباہ و محسوس ہو رہا تھا۔

”رانا صاحب! آپ کی ہمارے ادارے سے وابستگی اور خلوص انتہائی قابلِ تحریف ہے لیکن عزم! اگر آپ کسی ذہنی دباؤ کا شکار ہیں تو ایک وقفہ لے لیجیے..... ہمیں چنداں اعتراض نہ ہوگا۔“

”کیا وقفہ جناب؟ میں سمجھ نہیں پایا۔“

”دیکھیے عزم! عروج و زوال تو زندگی کا ایک انوٹ حصہ ہیں۔ آپ کی فروعی مصروفیات اب براہِ راست تحقیقی عمل پر اثر انداز ہونے لگی ہیں..... اس لیے آپ سے عرض کر رہا ہوں کہ ”بنجارا“ کو جلد از جلد سینے کی کوشش کیجیے اور کچھ عرصہ اپنے قلم کو آرام دیجیے۔“

”یہ سراسر نا انصافی ہے..... میرا ناول ریٹنگ میں ٹاپ پر ہے۔ ہر ماہ آپ کے شمارے میں تحریری خطوط کی بھرمار ہوتی ہے۔ اس صورت میں یہ تحریر سمیٹنا چہ معنی دارد؟“ میں بھڑک اٹھا۔

”حضور! ذرا دیر جرح رکھیے..... آپ سے یہ کس نے کہہ دیا کہ ناول ریٹنگ میں ٹاپ پر ہے؟“ وہ طنز یہ گویا ہوئے۔

”سوشل میڈیا پر ”بنجارا“ کی مقبولیت ریکارڈ ساز ہے۔ ہر ماہ آپ ڈیڑھ سو تحریری خطوط شائع کرتے ہیں۔“

”رانا صاحب! ہم اپنا ادارہ ”ہارڈ کاپ“ کی صورت میں چلاتے ہیں..... داستان ہزار رنگہ، ڈیجیٹل ادارہ نہیں ہے کہ ہم سوشل میڈیا کی دنیا سے روابط قائم رکھیں..... اور یہی بات تحریری خطوط کی تو آج یہ بھی جان لیجیے کہ ہمیں وہ خطوط بھی سنسر کر کے شائع کرنے پڑتے ہیں۔ اصل فیڈ بیک اور عوامی رائے پر بھی نظر کرم کر لیجیے۔“ ایڈیٹر نے اپنے سامنے فائل میں موجود کچھ پرنٹ آؤٹس اور خطوط مجھے تھما دیے۔

میں نے بے تابی سے ان کاغذات پر نظر دوڑائی۔

الفاظ کی خنجر کے مانند دل میں گڑے جا رہے تھے۔

”رانا راجیل کا یہ ناول جغرافیہ کا مضمون بن چکا ہے۔ اگر یہی عالم رہا تو میں اس ناول کا مطالعہ ترک کر دوں گا۔“

”راجیل صاحب کا ہیر و انسانی خوبیوں کا مالک ہی نہیں..... وہ خلائی مخلوق کے مانند لگتا ہے۔“

”بنجارا کا آغاز بہت شاعرانہ تھا لیکن اب تو یہ تحریر اتفاقات اور بے سرو پا پائیکشن پر مبنی تامل قلم کا تاثر دینے لگی ہے۔“

”ایک بہترین آغاز کے بعد مصنف اپنی تحریر سے انصاف کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ گمان ہوتا ہے

کہ وہ محض خانہ پری کے لیے لکھ رہے ہیں۔“

ان لفظوں کی پیش مجھے بے حال کر رہی تھی۔

”نیا ناول کس سے لکھوایا جائے گا..... جشیہ صحرائی تو پہلے ہی سے مصروف ہیں۔“ میں نے ایک نئی تحریر کے آغاز کا عندیہ دینے کے لیے تمہید باندھی۔

”پورڈ میننگ میں چند ایک نام شارٹ لسٹ کرنے کے بعد حتیٰ فیصلہ آصفہ مان کے حق میں دیا گیا ہے۔“

”وہ ایک نا تجربہ کار لڑکی ہے..... اسے اتنا بڑا پریذیکٹ سوچ کر اپنے ادارے کی ساکھ داؤ پر لگا رہے ہیں آپ؟“ میرا ذہن کھول اٹھا۔

”محترم ایہ آپ کا اور میرا دوسر نہیں ہے..... ایڈیٹر میل بورڈ نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔“

میرے وجود میں آتش فشاں دھپکنے لگا لیکن اس کیفیت سے بے خبر ایڈیٹر نے اپنی روایتی مسکراہٹ اور خوش اخلاقی سے معاف کیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

ایڈیٹر کے دفتر سے گھر واپسی کا سفر بے حد کشن تھا۔

زہرے لے تبصرے اور تند الفاظ کی بازگشت اعصاب کو کھل جامہ کر گئی۔ راتنگ ٹیبل پر کاغذات کا ڈھیر میری نظر کرم کا مختصر تھا لیکن دست بستہ حاضر رہنے والے الفاظ بھی روٹھ کر جانے کہاں جا چکے تھے۔

مسودات کی سیانی چائے کا خالی کپ، سگریٹ کے بیسیوں ادھ بجھے گلوئے میز کے کناروں پر گر گئی راکھ کمرے میں آئیر کنڈیشنر کی مدھم سرسراہٹ اور قد آدم کھڑکی سے متعسک شفق کی گہری سرخی میں ایک ہی ہیولا بار بار اپنی جھلک دکھلاتا اور کلکھلاتی سرگوشی میں چند الفاظ دہرا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا۔

”ایک آخری بات یہ کہوں گی کہ کسی کو مات دینے کی خواہش میں ہم اکثر فراموش کر دیتے ہیں کہ قادرِ مطلق ہمیں ”شہ مات بھی دے سکتا ہے۔“ کمرے میں موجود ہر شے سے انہی الفاظ کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

”نہیں! ہر شے نہیں..... رانا راجیل کبھی بھی شکست تسلیم نہیں کرے گا..... آخری مات آصفہ ہی کو ہوگی۔ میری رسائی اور تجربہ اسے کبھی کامیاب نہیں ہونے دے گا..... کبھی بھی نہیں۔“ میں نے عزم نو سے سوچا اور ایک نئی سپاہ کی تیاری کے لیے کمر کس لی۔

زہرے لے بازگشت اب مدھم ہونے لگی تھی۔

وقت : بادشاہ اور کائنات کی پرشے اس کی رعایا ہے لیکن... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر

قسط نمبر: 6

وقت

حسام برٹ

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب

تھا، ایک ایسے پُر عزم بازی گر کی بازی گری

..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک

درباط طویل داستان

موت کے کنویں میں بھی وقت جس کا ہم رکاب تھا، ایک ایسے پُر عزم بازی گر کی بازی گری..... سنسنی خیز واقعات پر مشتمل ایک درباط طویل داستان

وقت : بادشاہ اور کائنات کی پرشے اس کی رعایا ہے لیکن... اس کی نہ کوئی شکل اور نہ ہی وجود ہے۔ اس کے باوجود یہی وقت روپ بدل بدل کر سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ جس کی گردش آسمان کی زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ ایک ہی بل میں کسی کو بادشاہت سے نوازتا ہے اور کسی کو زمین کی خاک چاٹنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ کبھی دن اور رات میں ڈھل کر عمر ویاں کا فام پاتا ہے اور موسم کی طرح گزر جاتا ہے۔ کبھی مہربان اور مخلص دوست بن جاتا ہے اور کبھی سفاک دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ کبھی محبت بن کر ہونٹوں پر ہنسی بکھیرتا ہے اور کبھی درد کی صورت آنسو بن کر دلوں میں گھائی ڈال دیتا ہے۔ چونکہ یہ کسی کا غلام نہیں اسی لیے کسی کی پروا بھی نہیں کرتا لیکن... اتنا سنگدل ہے جو اس کی پروا نہیں کرتا اسے ایسی مار مارتا ہے کہ پینے کو دو ہونڈ پانی تک نہیں ملتا اور اتنا بے ایمان بھی ہے کہ جس پر اپنی مرضی سے مہربان ہو جائے اس کے لڑکھڑانے قدموں سے بھی تھم ملا کر عروج عطا کرتا ہے مگر شرارت سے پلٹ کر ان کی طرف بھی دیکھتا ہے جنہیں وہ بیچ بھنور میں تنہا چھوڑ آتا ہے۔ وہ بھی ایک ایسے ہی مہربان لمحہ کا اسیر تھا... جسے یہ تک خبر نہ تھی کہ وہ کون ہے اور کس خاندان سے وابستہ ہے۔ جس کی اپنی کوئی شناخت نہ تھی اس کے باوجود اس کی داستان حیات میں چاہنے والوں کی کمی نہ تھی۔ دو مختلف معاشروں اور تہذیبوں کا حسین امتزاج... ایک ایسا سلسلہ جو برسوں پاد رہے گا۔





اس کا نام اسد علی رکھا گیا جسے ”علی“ کے نام سے جانا جاتا تھا۔ علی اپنے والدین کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جب اس نے ہوش سنیا تو خود کو علی سلطان کی محمد اشد میں پایا۔ علی سلطان نیکس (امریکا) کا ایک مستعرب کاروباری شخص تھا۔ ایک حادثے نے علی سلطان کو مکمل چیتر تک محدود کر دیا تھا۔ اس کی سببی ہوئی ریکٹانڈاٹکس سے طے کر ہو چکی تھی۔ وقت رخصت رہنا اپنی اکلوتی بیٹی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ علی سلطان نے اپنی اور علی کی دیکھ کر کے لیے ایک کل وقتی ملازمدہر کی ہوئی تھی اور پچھن سے جوانی تک علی کی تعلیم و تربیت کے تمام تر اخراجات اٹھائے تھے۔ وہ علی کے ساتھ اپنی اولاد ایسا بنا کر رہتا تھا جو اسے اکل جانتا تھا۔ اپنے والدین کے حوالے سے علی کے ذہن میں بیکڑوں سوالات اس کے ساتھ ہی بڑھ کر جان بولے تھے۔ اس نے جب بھی اپنے محسن و مربی اہل سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو اس پر دوبارہ محسن نے نہایت ہی خوب صورتی سے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا..... ”میرے بچے انکار کرو۔ وقت آنے پر تمہیں سب بتا دوں گا۔“ یہ عقلی علی کے محسن کو ہوا جتنی عقلی لہذا نتیجے کے طور پر اس کا ذہن بے سمت سوچوں کے جالے میں الجھ کر رہ جاتا تھا۔ اس اضطررانی کیفیت میں بھی اس نے زندگی کے سفر کی روانی میں کوئی رکاوٹ نہیں آنے دی تھی۔ کالج میں قدم رکھتے ہی اس نے نیکس کے علاقے میں مکمل طور پر ”سٹرکل“ ائے۔ نامی ایک اسٹور پر جڑو وقتی ملازمت کر لی تھی۔ بیس سال کی عمر میں جب علی نے سائیکلائی میں پچھڑ ڈگری حاصل کر لی تو سخت تنے بنگا سے اس کے تعاقب میں لگ گئے۔ پولیس نے خلک کی بنا پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے بعد وہ ذکییت علی کے ساتھ موجود کل میں نظر رکھوٹ کر گئے۔ پولیس نے خلک کی بنا پر علی کو بھی شامل تفتیش کر لیا۔ علی کا دامن صاف تھا۔ پولیس کے سوالات کے جواب میں اس نے انہیں مطمئن کر دیا۔ بعد ازاں ان دونوں میکینک ڈیکٹ کوئی گھس (امریکی زونا) سے گرفتار کر لیا گیا علی کا کالج ایک جیکسن (نیکس) میں تھا جیکب علی سلطان کی رہائش بے بیٹی (نیکس) میں تھی علی ایک ہوش میں رہتا تھا اور ایک جیکسن کے اکثر ریٹوئٹس میں اس کا آنا جانا تھا رہتا تھا۔ ”وٹی لاؤنچ“ نامی ایک ریٹوئٹ میں اس کا زیادہ دل لگتا تھا کیونکہ وہاں ایک ہسپانوی ڈیڑھ شادو اپنے فن کا مظاہرہ کرتی تھی۔ اس دل نہیں مہ جیوں نے علی کے در بدل پر دیکھ دی تو اس کی زندگی میں بہار اتر آئی۔ ایک رات وٹی لاؤنچ میں جب لیونا ڈوٹا کی ایک میکینکس غنڈے اور اس کے حواریوں نے شادو سے بدچیز کی کوشش کی تو علی چلچل میں کود پڑا۔ اس مارا ماری کو ایک امیر وکیر اسٹیشن لیزڈ ڈیٹلیٹا نے بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا وزینگ کارڈ علی کو ہاتھ کر یہ کہتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی..... ”مجھے بہار لوگ بہت پسند ہیں۔ زندگی میں جب بھی میری ضرورت محسوس کر تو روابط کر لیں۔“ اس واقعے کے بعد کو لیونا ڈوٹے علی کی دشمنی کا باقاعدہ آغاز ہو گیا تھا۔ آنے والے دنوں میں علی اور لیونا ڈوٹے کے غنڈوں میں گاہے بہ گاہے مذہم پھیر ہوتی رہی۔ لیونا ڈوٹے نے نہایت جہیزت کا بدلہ لینے کے لیے شادو کو ٹارگٹ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ وٹی لاؤنچ والے ناخوشگوار واقعے کی بنا پر علی نے شادو کی ریٹوئٹ ورثہ والی جا بچھڑا کر اسے اہل سلطان کی خدمت کے لیے کھر میں رکھ لیا تھا۔ ایک روز جب شادو اپنے اسٹیل اسٹور سے گرمی خریدنے گئی تو لیونا ڈوٹے اسے اغوا کر لیا۔ علی نے شادو کی تلاش میں بہت نہاری اور شادو کو صوبہ تارباہا لایا خراک رات لیونا ڈوٹے کا ایک قریبی ساتھی پیو اس کے ہتھے چڑھ گیا۔ دونوں کے بیچ خوش معرکہ ہو گیا۔ شادو اور لیونا ڈوٹے کے حوالے سے زبان کو لے کر تیار نہیں ہوا۔ علی نے طیش کے عالم میں مار مار کر پیو کو اوردہ مار کر دیا۔ یا آئندہ روز پیو کے قتل کی خبر ایک جیکسن اور اس کے قریب وجوار میں گردش کر رہی تھی۔ پولیس قاتل کی تلاش میں تھی۔ ایک جیکسن میں مزید قیام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لہذا علی نے اہل سلطان کو بصورت حال سے آگاہ کیا اور اپنی سرخ ہنڈا ائے اسپورٹ کار میں ایک جیکسن سے یوش بھیج گیا۔ بالمرخ ہنڈا ائے گا۔۔۔۔۔ میں قاتل کے فرار ہونے کی خبر نے علی کے ہوش اڑا دیے۔ اس سنگین صورت حال میں علی نے ڈیٹلیٹا سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ رابطہ ہونے پر ڈیٹلیٹا نے علی کی کھاتے کے بعد کہا کہ اگر وہ بہتر کھتے تک باہر کی دینا سے کہہ کر اس کے ساتھ بیٹھے میں رہے تو وہ اس تمام مسائل سے نجات دلا دے گی۔ رضی ہوئے پر ان بہتر کھتوں میں رہنے لگی پر تیر توں کا ایک نادارو ہوتا رہا۔ ڈیٹلیٹا بہت اونچی بیچ کی مالک ایک برسرار لیزڈ تھی۔ اس نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے علی کو پیچلور مڈریس سے اس طرح نکال لیا جیسے محسن سے پال..... علاوہ ازیں ڈیٹلیٹا نے فوس ٹیوٹ کی مدد سے علی کو بتایا کہ لیونا ڈوٹے شادو کو اغوا کر کے کیوبا کے شہر ہوانا لے گیا ہے جہاں وہ شادو کو مصمت فروشی کے جہنم میں جمونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ڈیٹلیٹا نے علی کو قیمن دلایا کہ اگر وہ بہتر کھتے پورے ہونے کے بعد اس کی ایک خواہش پوری کر دے تو وہ شادو کو کچھ سلامت واپس لے آئے گی۔ شادو کے حصول کی خاطر علی ڈیٹلیٹا کی بات ماننے کے لیے تیار ہو گیا۔ پریشن ہالو والے اس بیٹکے میں ڈیٹلیٹا کی سنگت میں گزرنے والے وہ طلسم ہوش رہا بہتر کھتے بڑے رنگین، رنگین، رومان پرور اور ناقابل یقین تھے۔ ڈیٹلیٹا کی شخصیت کسی معنی سے کم نہ تھی۔ اس پر مستزاد ڈیٹلیٹا نے اپنے ہی الکی دہر برسرار شخصیات ربی آنرک باروئ لاؤڈو لیا اکیلے نام سے علی کی ملاقات بھی کروادی۔ علی جب پر یہ انکشاف ہوا کہ وہ تمام افراد ہیڈیو یوں کی ایک سیکرٹ اور بہت طاقتور سوسائٹی ”اسکل اینڈ بوز“ سے تعلق رکھتے تھے۔ جو لوگوں کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں آڑا تھے۔ یہ لوگ خود کو ذہنی طاقت جانتے تھے۔ انہیں علی کے ہم عمر ایک ایسے نوجوان کی تلاش تھی جس کی بااں سلمان اور باپ بیٹائی تھا۔ انہیں خلک تھا کہ علی وہی نوجوان ہے جس کے والدین اسے علی سلطان کے حوالے کر کے کہیں روپوش ہو گئے تھے۔ ڈیٹلیٹا کی تہمتی کہ علی ان کی شرائط پر صاگر تھے ہونے ”اسکل اینڈ بوز“ کی رکنیت حاصل کرنے پر باؤ کی خاطر کہہ دیے لیکن علی نے ڈیٹلیٹا کی خواہش کو ٹھکرایا اور ڈیٹس سے بے بیٹی اپنے اہل کے پاس آ گیا۔ یہاں حالات کی ایک ترقی اس کی راہ دکھ رہی تھی۔ اہل نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں علی کو اس کی زندگی کے دیرینہ اور رستہ راز سے آگاہ کر دیا۔ علی سلطان کے مطابق، انیس سال پہلے، ایک برس کی عمر میں علی کو کراچی (پاکستان) سے نیو یارک (امریکا) مرزا عامر بیگ کے پاس بھیجا گیا تھا۔ مرزا عامر بیگ، علی سلطان کا دوست تھا۔ اس نے علی کو علی سلطان کے حوالے کر دیا تھا۔ علی سلطان نے ایک گاڑی میں کی حیثیت سے انیس برس تک علی کی پرورش کی تھی۔ اس سلسلے میں ہونے والے تمام تر اخراجات کراچی میں مقیم ایک نیک خاتون برداشت کر رہی تھیں مگر کچھل چہاہ سے اچانک کراچی سے یہ ریم آئندہ ہو گئی تھی جس سے مرزا عامر نے بھی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ خاتون کی مصیبت میں گرفتار ہو گئی ہے چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ علی کو انور کراچی روانہ ہو جانا چاہیے۔ علی سلطان اور مرزا عامر بیگ مذکورہ خاتون کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں

رکھتے تھے۔ ان کا اعزاز وہ تھا کہ اس خاتون کا علی کے ساتھ کوئی خونی رشتہ ہے۔ مرزا عامریگ نے علی کو چند ایسے اشارے دیے جن کی مدد سے علی کراچی میں اس خاتون کو تلاش کر سکا تھا۔ اس صورت حال میں علی کا دل علی الاعلان یہ کہہ رہا تھا کہ وہ عورت اس کی ماں ہے۔ علی نے بھی الامکان سرعت سے تیاری کی اور پوٹھن سے کراچی آ گیا۔ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی نئے ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ ایئر پورٹ سے ایک ٹیکسی پکڑ کر اپنے ہوٹل کی جانب روانہ ہوا تو ٹیکسی ڈرائیور نے اسے ویرانے میں جا کر لوٹنے کی کوشش کی مگر علی نے اسے ناکام بنایا۔ اگلے ہی لمحے ایک سیاہ نوپوتا کروا اس کے سر پر آن پہنچی۔ علی ہر نوعیت کے حالات سے نمٹنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو گیا۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ڈرائیور کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے؟“
”میں ایک مسافر ہوں۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ ٹیکسی والا مجھے ہوٹل پہنچانے کے بجائے کسی ویران جگہ لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اپنی حفاظت میں تھوڑا ”ہاتھ چلایا“ اور یہ بچے ہوٹل ہو گیا۔“ بات کے اختتام پر میں نے بڑی بے پروائی سے کندھے اچکا دیے۔

اس دوران میں شلوار سوٹ والا نوجوان اپنے سبل فون کے ساتھ مصروف ہو گیا تھا۔ ادھر میری بات ختم ہوئی، ادھر اس نے کسی کو ہدایات دینا شروع کر دیں۔
اور جس جگہ وہ کھڑا تھا اس کا پتا سمجھاتے ہوئے ایک موبائل گاڑی طلب کی۔

”تم نے تھوڑا نہیں، کافی زیادہ ہاتھ چلایا ہے۔“ دراز قامت نوجوان نے میری طرف دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا پھر وہ اپنے سامگی کی جانب مڑتے ہوئے بولا۔
”ارباب! ذرا چیک تو کر..... کہیں یہ کمینڈو نہیں گیا؟“
اس کا اشارہ ٹیکسی ڈرائیور کی طرف تھا۔ شلوار سوٹ پوش ارباب سر کو اٹھاتی جنبش دیتے ہوئے ٹیکسی کی جانب بڑھ گیا۔

”رات کے آخری پہر تو بیرون ملک ہی کی فلائٹس یہاں پہنچتی ہیں۔“ دراز قامت نوجوان نے کہا۔ ”خصوصاً یورپ اور امریکا سے آنے والی۔ تم کہاں سے آرہے ہو؟“
”میں امریکا سے آیا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔
اس بات کا تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے نہیں تھے ورنہ وہ اس طرح میرا انٹرویو کرنے کے بجائے لوٹ مار کو ترجیح دیتے اور اپنا کام کر کے رو چکر ہو جاتے۔ اس خیال نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ بہر حال وہ دونوں میرے دشمن نہیں تھے۔

”کمینڈو زندہ اور صحیح سلامت ہے۔“ ارباب نے اعلان کرنے والے انداز میں بتایا۔ ”دو چار تھپڑ پڑیں گے تو آکھیں کھول دے گا۔“ پھر وہ میری جانب اشارہ کرتے

یہ حالات کی ستم ظریفی تھی یا شوٹی قسمت کہ پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ہنگاموں سے میرا واسطہ پڑا تھا۔ ان حالات میں انکل سلطان بے طرح مجھے یاد آئے۔ میں نے ان کی زبان سے ایک محاورہ سنا تھا..... سرمزنا تے ہی اولے پڑے۔ یہ بھی کچھ ایسی ہی سچویشن تھی۔

میرے دائیں ہاتھ کی چوپ نے بحرمانہ ذہن رکھنے والے ٹیکسی ڈرائیور کی گلدی کی ایسی ”مزاج پرسی“ کی تھی کہ وہ اپنی گردن کو ایک جانب ڈھلکا کر دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی ٹیکسی کی ڈرائیونگ سیٹ پر ”براجمان“ تھا۔ سیاہ نوپوتا کروا سے برآمد ہونے والے اس کے دونوں ساتھیوں نے تشویش بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا تھا، اس کے بعد ہی انہوں نے میری سمت پیش قدمی کی تھی۔

ٹیکسی سے باہر نکلنے وقت میں نے اپنا سفری بیگ بھی اٹھالیا تھا جو اس وقت میرے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ میرا قیمتی لیپ ٹاپ اور پاسپورٹ بھی اسی بیگ میں تھا۔ ہنگامی صورت حال میں میرا ذہن بھی اپنی رفتار کو بڑھا دیا کرتا تھا۔ میں نے سیکنڈ کے دس ویں حصے میں سیاہ نوپوتا کروا سے برآمد ہونے والے نوجوان کا تعقید جاری نہ کیا۔

ان میں سے ایک دراز قامت اور دوسرا میرا نے قد کا مالک تھا۔ دراز قامت نوجوان نے جینز پر پٹی شرٹ پہن رکھی تھی اور وہ خاصا خوش شکل انسان تھا۔ اس کے چلیے میں ہیروز والا لک تھا۔ اس نے کلائی میں اوپل والا برسلٹ پہن رکھا تھا اور اس کی انگریز فیکر (نگشت شہادت) میں مجھے پلے سیفنگز کی ایک انگوٹھی بھی نظر آئی۔ درمیانے قد کے مالک شخص نے سفید کاش کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ مضبوط کاشی کا مالک تھا۔ میں یہی توقع کر رہا تھا کہ وہ فوراً مجھ پر ٹپ پڑیں گے اور مجھ سے سفری بیگ کو چھیننے کی کوشش کریں گے۔ اس کے بعد میرے سبل فون، والٹ وغیرہ کی باری آتی لیکن ان کا رد عمل میری توقع کے برعکس تھا۔

دراز قامت بہر واثق نوجوان نے بڑے معتدل انداز میں مجھ سے پوچھا۔ ”بھائی! تم کون ہو اور ٹیکسی

ہوئے اپنے ساتھی سے بولا۔

”عظیم! یہ مسافر خوش قسمت ہے جو لٹنے سے بچ گیا اور زریہ پھولی کی طرح آج اس کا بھی کام ہو جاتا تھا۔“
ان کی باہمی گفتگو سے مجھے ان دونوں کے نام معلوم ہو گئے تھے۔ دراز قامت عظیم نے کہا۔

”اے! یہ خوش قسمت اس لیے ہے کہ امریکا سے آیا ہے اور تمہاری پھولی زریہ آئی تھیں جرمنی سے۔ نازی اور اتحادی میں کچھ تو فرق ہوتا ہے نا..... آئی کو امریکا۔“
عظیم کے آخری جملے سے مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ امریکا کا حمایتی تھا۔

ارباب نے کہا۔ ”عظیم! اگر تجھے امریکا سے اتنی ہی محبت ہے تو ہمیشہ کے لیے وہاں چلا جا۔ ایک ماہ گزار کر واپس کیوں آ گیا ہے؟“

ارباب کے لہجے میں بیزاری سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے امریکا بالکل پسند نہیں تھا شاید۔

”چلا جاؤں گا۔“ عظیم نے بڑے فخر سے کہا۔ ”اپنا تو پانچ سال کا ٹیٹل مل ویزا لگا ہوا ہے۔ ابھی میں نومرتبہ اور بھی امریکا جاسکتا ہوں اور جب میں مناسب سمجھوں گا تو وہاں سیٹل بھی ہو جاؤں گا۔“ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے ہوئے بولا۔

”بھائی! لٹنے سے بچنے کے لیے مبارک ہو۔ اپنا نام تو بتا دو۔“

”علی..... اسد علی۔“ میں نے جواب دیا۔
عظیم نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اٹھے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”علی میرے چھوٹے بھائی کا نام ہے۔ ارباب میرا کزن ہے۔ یہ میری پھولی کا بیٹا ہے اور..... یہ پولیس والا ہے۔“

میں نے عظیم اور ارباب سے باری باری مصافحہ کیا۔ وہ دونوں کزن تھے اسی لیے آپس میں کافی بے تکلف تھے اور ”تو ترائق“ سے بات کرتے تھے۔ تھوڑی دیر پہلے ارباب نے جو کسی کو فون کیا تھا تو یقیناً اس نے پولیس کی موبائل گاڑی کو وہاں بلایا ہوگا۔ مالک کا شکر کہ میں نہ صرف لٹنے سے بچ گیا تھا بلکہ اس وقت محفوظ افراد کے سچ تھا لیکن ایک بات میرے ذہن کو ابھار رہی تھی کہ یہ بات ارباب اور عظیم کو کیسے پتا چلی کہ ٹیکسی ڈرائیور مجھے لوٹنے کی غرض سے اس طرف لایا تھا جو وہ سیاہ ٹوپوٹا کرولا میں وہاں پہنچ گئے۔ جب یہی سوال میں نے ان سے کیا تو ارباب نے بتایا۔
”اس ٹیکسی ڈرائیور کو ہم کافی دنوں سے تلاش کر رہے

تھے۔ یہ کئی مسافروں کو اسی طرح لوٹ چکا ہے۔ چند روز پہلے اس نے جرمنی سے آنے والی میری پھولی زریہ کو بھی لوٹ لیا تھا۔ پھولی کے پاس زیور اور نقدی کے علاوہ بہت سا قیمتی سامان بھی تھا۔ سب کچھ چلا گیا۔ پھولی نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نامراد ٹیکسی کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ ہم بھی اس کی تلاش میں تھے لیکن یہ ذلیل انسان بہت شاطر ہے۔ پھولی کو لوٹنے کے بعد اس نے کئی روز تک اپنی ٹیکسی روڈ پر نہیں نکالی ورنہ یہ کہیں نہ کہیں ضرور پولیس کی گرفت میں آ جاتا۔ اجنی ہاؤ..... اس وقت میں ڈیوٹی پر بھی نہیں ہوں اس لیے تمہیں سول ڈریس میں نظر آ رہا ہوں۔ میں عظیم کے ساتھ نہیں جا رہا تھا کہ اس ٹیکسی پر میری نگاہ پڑی اور میں نے اس کا تعاقب کیا، پھر ہم یہاں پہنچ گئے۔“

”میری مدد کرنے کا بہت شکریہ۔“ میں نے تشکرانہ انداز میں کہا۔ ”میں آپ لوگوں کا یہ احسان زندگی بھر یاد رکھوں گا۔“

”ہم نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔“ ارباب نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میں پولیس ڈیپارٹ میں انسپٹر ہوں۔ میں نے جو کچھ کیا وہ میرا فرض بننا تھا۔“

”اور جہاں تک ”مدد کرنے“ کی بات ہے تو اس کی تمہیں ضرورت ہی نہیں تھی۔“ عظیم نے ٹیوٹی ہوئی نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے تم یہ کام یہ غولی کر چکے تھے۔“ پھر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کی جانب اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کیا۔

”تمہارے تھوڑا سا ہاتھ چلانے سے جو وہ انعام غنیمت ہوا ہے تو اب تک واپس آنے کا نام ہی نہیں لے رہا۔ تمہارے ہاتھوں میں ضرور کوئی گن چھپا ہوا ہے..... کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“

”مسٹر عظیم! میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ جو کچھ بھی کیا، وہ اپنی حفاظت کی خاطر کیا ہے۔“ میں نے مضمرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لوگ اس ٹیکسی کا تعاقب کر رہے ہیں تو میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے اطمینان سے بیٹھا رہتا اور جہاں تک میرے ہاتھوں میں کسی گن کے چھپے ہونے کی بات ہے تو.....“ لچائی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد معتدل انداز میں کہا۔

”نہیے تو ایسا کچھ بھی نظر نہیں آتا.....!“
”بہت گہرے ہو.....!“ عظیم نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معنی خیز انداز میں کہا۔

علامت

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے، کرکٹ انگریزوں کے لیے مشغلہ نہیں، مشن ہے۔ لیکن اگر آپ نے بھی کرکٹ کی ٹیموں کو مٹی جون کی بھری دوپہر میں نا عاقبت اندیشانہ جرأت کے ساتھ موسم کو چیلنج کرتے دیکھا ہے تو ہماری طرح آپ بھی اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہ رہ سکیں گے کہ ہمارے ہاں کرکٹ مشغلہ ہے نہ مشن، اچھی خاصی تعزیری مشقت ہے، جس میں کام سے زیادہ عرق ریزی کرنا پڑتی ہے۔ اب اگر کوئی سر پھر امنہ مانگی اجرت دے کر بھی اپنے مزدوروں سے ایسے موکی حالات میں یوں کام کرائے تو پہلے ہی دن اس کا چالان ہو جائے۔ مگر کرکٹ میں چونکہ عام طور سے معاوضہ لینے کا دستور نہیں، اس لیے چالان کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاتھوں جس طرح ہلکا پھلکا کھیل ترقی کر کے کام میں تبدیل ہو گیا وہ اس کے موجدین کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا۔ غالب نے شاید ایسی ہی کسی صورت حال سے متاثر ہو کر کہا تھا کہ ہم غفل پنچے بھی غضب ہوتے ہیں، جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔

اور اس کا سبب بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کھیل کے معاملے میں ہمارا رویہ بالعموم جیسا نہیں، بالکل بچوں کا سا ہے۔ اس لحاظ سے کہ صرف بچے ہی کھیل میں اتنی سنجیدگی برتتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے بچہ سبانا ہوتا ہے، کھیل کے ضمن میں اس کا رویہ غیر سنجیدہ ہوتا چلا جاتا ہے اور یہی ذہنی بلوغت کی علامت ہے۔

کرکٹ کے رسیا ہم جیسے نا آشنائے فن کو لا جواب کرنے کے لیے انکڑ کہتے ہیں: ”میاں! تم کرکٹ کی باریکیوں کو کیا جانو؟ کرکٹ اب کھیل نہیں رہا، سائنس بن گیا ہے سائنس!“

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب
”چراغِ تلخ“ سے اقتباس

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، پولیس کی پٹرولنگ موبائل وہاں پہنچ گئی۔ ہم سب پولیس کی گاڑی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تین باوردی پولیس والے موبائل میں سے نکلے اور انہوں نے ارباب کو سیلوٹ کیا۔ ارباب نے ٹیکسی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اسے ہوش میں لاؤ اور ڈالو موبائل میں۔ تھانے چل کر اس کا آریٹن کرتے ہیں۔“

ایک پولیس والا موبائل کی طرف بڑھا اور باقی دونوں ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ معصوف ہو گئے۔ یہ ”معصوفیت“ بے دریغ طمانچوں پر مبنی تھی۔ اسی دوران میں تیسرا پولیس والا موبائل میں سے پانی کی ایک بوتل اٹھا لایا۔ پھر اس پانی کی مدد سے ٹیکسی ڈرائیور کے گالوں پر طمانچوں کے ساتھ ساتھ پانی کے چھینٹے بھی مارے جانے لگے۔ اگلے ہی لمحے ٹیکسی ڈرائیور نے آنکھیں کھول دیں۔

اس نے اپنے گرد پولیس والوں کو دیکھا تو سہم گیا۔ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ”میں کہاں ہوں؟“

”تم اس وقت اپنے باپ کی سسرال میں یعنی اپنی تفصیل میں ہو۔“ ارباب نے غصیلے لہجے میں کہا۔ ”اب یہ نہیں پوچھنا۔۔۔۔۔ میں کون ہوں؟“ کیونکہ ہمیں پتا ہے، تم بڑے چال باز ٹیکسی ڈرائیور ہو۔ رات گئے مسافروں کو ویران سڑکوں کی طرف لے جا کر لوٹتے ہو۔“ لچائی توقف کر کے ارباب نے ایک گہری سانس لی اور پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”نام کیا ہے تمہارا؟“

”تم۔۔۔۔۔ مقصود۔۔۔۔۔“ وہ کلفت زدہ لہجے میں بولا۔

اسی وقت اس کی مجھ پر نظر پڑی تو وہ اور بھی خوفزدہ ہو گیا۔ اس کے چہرے کے تاثرات بتاتے تھے کہ اس صورت حال میں اسے اپنی بچت کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

عظیم نے اس کے قریب آ کر خوں خوار لہجے میں کہا۔ ”بیٹا جی! اب تم شہید ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ بہت عیش کر لیے تم نے۔“ میں نے مزید گڑھ لگائی۔

”شہید تو تمہیں ہونا ہی پڑے گا اور وہ بھی تمہارے لیے۔“

”عظیم! تم اسد علی کو اس کی منزل تک پہنچاؤ۔“

ارباب نے کہا۔ ”میں اس خبیث کو تمہارے لیے جا رہا ہوں۔ پھولی زینے نے اتنے دن سے طعنے مار مار کر میری زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ کتنی ہیں۔۔۔ ارباب پتر! تیرا پولیس والا ہونے کا کیا فائدہ۔ میں تو تمہارے شہر میں آ کر لٹ گئی۔“

جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”تھوڑی دیر پہلے تک ایسا ہی تھا۔“ میں نے گاڑی کے باہر کے مناظر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”لیکن اب میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرا کوئی اپنا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ عظیم نے چمکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”مسٹر عظیم! مشکل وقت میں جو انسان آپ کی مدد کرے وہ آپ کا اپنا ہی تو ہوتا ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ نیک اور خیر خواہانہ کام آپ نے کیا ہے.....“ لہجائی توقف کر کے میں نے دوبارہ گاڑی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا اور حیرت بھرے لہجے میں اضافہ کیا۔

”ارے..... اب لگ رہا ہے کہ میں ہوٹل پلہ سی کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ بد بخت ٹیکسی ڈرائیور تو مجھے کہیں ہی لے جا رہا تھا۔“

”میں نے کوئی نیک کام کیا ہے یا نہیں، یہ تو اللہ ہی جانتا ہے مگر میں اتنا ضرور سمجھ گیا ہوں کہ تم اپنے معاملات کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہے ہو۔ اپنی داؤ، میرے پوچھنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ کیا کراچی میں تمہارا کوئی رشتے دار یا دوست نہیں ہے جو تم اتر پورٹ سے سیدھا پلہ سی جا رہے ہو۔“

”تمہارا اندازہ بالکل درست ہے مسٹر عظیم۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں زندگی میں آج پہلی مرتبہ پاکستان آیا ہوں۔ یہاں پر میں کسی کو جانتا ہوں اور نہ ہی کوئی مجھے جانتا ہے۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم یا تو ٹورسٹ ہو اور یا پھر کسی خاص مشن پر یہاں آئے ہو؟“ عظیم نے شک زدہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

”عظیم! تمہارا پہلا اندازہ درست تھا۔ اس کی دونوں باتیں درست تھیں یعنی میں ٹورسٹ بھی تھا اور ایک خاص مشن لے کر بھی کراچی آیا تھا لیکن میں نے اس کے سوال کے جواب میں کہا۔

”عظیم! تمہارا پہلا اندازہ درست ہے۔ میں ٹورسٹ ہوں۔ تین دن تک کراچی میں قیام کروں گا پھر شمالی علاقہ قلات کی طرف نکل جاؤں گا۔ دیش آل۔“

وہ چند لمحات تک بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا پھر پوچھا۔

”اسٹوڈنٹ ہو؟“

”نہیں۔“

ذہانت

☆ رات کو نیند نہیں آتی، دن کو چین نہیں آتا۔
دل سے پوچھا کیا یہی پیار ہے۔ دل نے کہا نہیں پاگل
گرمی کی وجہ سے سب کا یہی حال ہے۔

☆☆☆

☆ امتحان میں سوال آیا کہ چیٹنج کسے کہتے ہیں؟
ایک لڑکے نے پورا پیچہ خالی چھوڑ دیا اور آخری صفحے پر
لکھا..... اپنے باپ کی اولاد ہے تو پاس کر کے دکھا۔
مرسلہ: اہم حرم شیش - نیکو کراچی

ڈرائیور کو رک کر اس نے گہری سانس لی پھر ٹیکسی ڈرائیور کی
جانب دیکھتے ہوئے بڑے کڑوے لہجے میں بولا۔

”میں نے سورج طلوع ہونے سے پہلے اس لٹیرے کے
اندر سے پھوٹی زربینہ کا سارا سامان اور سارا مال نکلوا تا ہے.....“

”او کے ارباب! تم اپنے محکمہ جاتی کاموں کو زیادہ
بہتر سمجھتے ہو۔“ عظیم نے کہا پھر میری جانب دیکھتے ہوئے
بولا۔ ”آؤ بھائی، ہم چلتے ہیں۔“

میں نے ارباب سے الوداعی مصافحہ کیا اور سیاہ ٹویوٹا
کرولا میں پانچرز سیٹ پر آ بیٹھا۔ عظیم نے ڈرائیونگ سیٹ
سنبھالی اور مجھ سے پوچھا۔

”کہہ جاؤں گے؟“

”ہوٹل پلہ سی۔“ میں نے جواب دیا۔
”امریکا سے آئے ہو اور ہوٹل جا رہے ہو؟“ عظیم
نے گاڑی کو واپس اتر پورٹ کی سمت موڑتے ہوئے پوچھا۔

”خیریت تو ہے نا بھائی؟“

”بالکل خیریت ہے۔“ میں نے سرسری لہجے میں کہا
پھر گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مقصود تو مجھے مخالف
سمت میں لے جا رہا تھا۔ اگر میں اس کے ہاتھوں لٹ جاتا تو
پھر شاید خیریت نہ رہتی.....“

میں عظیم کی کرید کو سمجھ رہا تھا لیکن ظاہر ہے، میں کسی
اجنبی کے ساتھ فری نہیں ہو سکتا تھا۔ اگرچہ یہ ثابت ہو چکا تھا
کہ وہ میرا دشمن نہیں، مجھے اس کی ذات سے کوئی نقصان پہنچنے
کا اندیشہ بھی نہیں تھا۔ اس کی ٹولپ کے نتیجے میں، اسے میں جو

جواب دے رہا تھا ان سے اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔
”ہوٹل میں ٹھہرنے کا تو ایک ہی مطلب ہے کہ ادھر
کراچی میں تمہارا کوئی اپنا نہیں ہے؟“ عظیم نے ڈرائیونگ

میں ایک نیا پھندا کھڑا ہوتا ہے۔“
 ”اس میں مہرا لسا کا کوئی قصور نہیں۔“ میں نے کہا۔
 ”کیا مطلب؟“ وہ ابھمن زدہ لہجے میں بولا۔ ”کیا تم
 مہرا لسا کو جانتے ہو؟“
 ”ہاں جانتا ہوں۔“ میں نے عظیم سے تفریح لینے کی

غرض سے کہا۔
 ”تم تو پہلی مرتبہ پاکستان آئے ہو۔“ وہ شک زدہ
 نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس لیے کراچی میں تو تم
 دونوں کی ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... تو اس کا
 مطلب ہے، وہ نیو یارک یا یوسٹن میں تم سے ملی ہوگی.....“
 لحاظی توقف کر کے اس نے گہری نظر سے مجھے دیکھا پھر
 سوال کیا۔

”تم امریکا میں کہاں رہتے ہو؟ میرا مطلب ہے،

”کیا پڑھ رہے ہو؟“
 ”سائیکا لوچی.....“ میں نے بتایا۔ ”گرجویشن
 کر لیا۔ آج کل سروکیشنز ہیں۔ میں سیر سپاٹے پر نکل آیا۔“
 ”سائیکا لوچی.....“ اس نے زیر لب دہرایا پھر
 پوچھا۔ ”سیلو کی یا سیلو کی؟“
 ”ہیومن سائیکا لوچی!“ میں نے جواب دیا۔ ”اور یہ
 دونوں ہیومن میں ہی شمار ہوتے ہیں۔“
 ”شاید.....“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔
 ”شاید کا کیا مطلب؟“ میں نے کہا۔ ”کیا تم ایسا
 نہیں سمجھتے؟“

”میرا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں انسان ہی ہیں لیکن
 میرے خیال میں دونوں کی نفسیات میں کافی فرق ہوتا ہے۔“
 ”دونوں بنیادی طور پر تو ہیومن (انسانی) نفسیات ہی
 کے حامل ہوتے ہیں۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن جینز کے فرق کی وجہ سے تمورالگ ضرور ہیں۔“
 ”تمورالگ کیا، مجھے تو بالکل ہی الگ لگتا ہے۔“ وہ ایک
 ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے بولا۔ ”بلکہ ایک دوسرے کے
 برعکس ہیں اسی لیے وہ کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔“
 ”وہ کون؟“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔
 ”مہرا لسا.....“ اس نے بوہل لہجے میں بتایا۔
 ”اوہ.....“ میں نے کہا۔ ”کیا مہرا لسا تمہاری محبوبہ ہے؟“
 ”کبھی وہ میری محبوبہ تھی۔“ وہ ونڈا سکرین کے پار
 دیکھتے ہوئے بولا۔

”تھی کا کیا مطلب ہوا عظیم؟“

”اب وہ میری بیوی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔
 ”آپ شادی شدہ ہو؟“ میں نے بے یقینی سے اس
 کی طرف دیکھا۔
 وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”صرف
 شادی شدہ ہی نہیں بلکہ چار بچوں کا باپ بھی ہوں۔ میرا ایک
 بیٹا اور تین بیٹیاں ہیں۔“
 ”ویری گڈ۔“ میں اتنا ہی کہہ رکھا۔

”میں نے کو میرج کی تھی۔“ وہ خواب ناک لہجے میں
 بولا۔ ”مجھے مہرا لسا سے شدید نوعیت کا عشق ہو گیا تھا لیکن
 دونوں طرف کا سماج ہمارے کمن کے حق میں نہیں تھا چنانچہ
 ہم نے کورٹ میرج کر لی لہذا دونوں جانب کے ظالم سماج کو
 ہمارے سامنے گھٹنے ٹیکنا پڑے لیکن شادی کے بعد مہرا لسا کا
 مجھ سے رویہ تبدیل ہوتا چلا گیا۔ میں اب بھی اس سے اتنی
 ہی محبت کرتا ہوں لیکن اسے میری کوئی پروا نہیں۔ ہر روز گھر

کراچی

ماہنامہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک
 نیا اور منفرد سلسلہ باتیں مہار و خزاں کی.....
 پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر
 قاری بہن دے گئے سوالوں کے
 جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی
 ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات
 ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو تائیں آج ہی

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہا کر سے بک کر دالیں

تمہارا تعلق امریکا کی کس ریاست سے ہے؟“

اسے کیسے جانتے ہو؟“

”فیکس“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتایا۔
”یوشن بھی تو فیکس ہی میں ہے.....“ وہ سرسراتی

ہوئی آواز میں بولا۔

”بالکل ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میں ابھی یوشن ہی سے کراچی آیا ہوں لیکن میری رہائش یوشن میں نہیں۔ میں فیکس کے علاقے لیک جیکسن میں رہتا ہوں۔ تم نے نیویارک اور یوشن کا ذکر کیوں کیا۔ کیا مہرالنسا وہاں رہتی ہے؟“

”وہ وہاں رہتی نہیں بلکہ وزٹ ویزا پر آج کل ادھر مکنی ہوئی ہے۔“ عظیم نے بتایا۔ ”میں نے فروری میں وزٹ ویزا لینے کے لیے پوری فیملی کو ٹرائی کیا تھا جس کے نتیجے میں مجھے، مہرالنسا اور چاروں بچوں کو پانچ سال کا ملٹی پل ویزا مل گیا۔ پہلے میں امریکا گیا اور لگ بھگ ایک ماہ وہاں گزارنے کے بعد واپس آ گیا۔ میرے اس وزٹ کا مقصد اپنے بزنس کے لیے امریکا کی مارکیٹس کو چیک کرنا تھا۔ چند روز میں نیویارک میں رکا۔ شیرٹن ہوٹل میں میرا قیام تھا جو خاصا مہنگا پرزہ تھا لہذا میں اپنے ایک فیملی فرینڈ کے پاس کیلی فورنیا چلا گیا۔ وہ شخص ایل اے (لاس اینجلس) میں رہتا ہے۔ اس مختصرے ٹور میں تو امریکا میری سمجھ میں نہیں آیا اور میں واپس آ گیا۔ کچھ عرصے کے بعد دوبارہ ٹرائی کروں گا.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے تھما پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”آج کل مہرالنسا دو بیٹیوں کے ساتھ امریکا مکنی ہوئی ہے۔ اس کی والدہ یعنی میری ساس صاحبہ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ یہ لوگ یہاں سے بہت سے ڈریس اپنے ساتھ لے کر گئی ہیں۔ ان ڈریس کو وہاں کی ایگری بشور میں سیل کریں گی اور ساتھ ہی سیر و تفریح بھی چلتی رہے گی۔ یہ لوگ پہلے بروکلین نیویارک میں چند روز ٹھہرے ہوئے تھے۔ اب یوشن گئے ہیں۔ یوشن میں میری ساس کے رشتے دار رہتے ہیں۔ زیادہ وقت یہ لوگ یوشن ہی میں گزاریں گے۔ وہاں بھی ڈریس کی ایگری بشور کریں گی۔ گیارہ جولائی کو آغا خان کیونی کا کوئی بڑا دن آنے والا ہے۔ فیکس، خصوصاً یوشن میں اس کیونی کے کافی لوگ آباد ہیں لہذا بڑے دن کی تیاری کے لیے خوب شاپنگ کریں گے۔ اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مہرالنسا ڈریس فروخت کرے گی اور اچھی خاصی رقم کما کر واپس آئے گی..... اسی لیے میں نے تم سے پوچھا کہ مہرالنسا سے تمہاری ملاقات کہاں پر ہوئی اور تم

اس نے مجھے جتنی تفصیل کے ساتھ اپنی فیملی کے حالات و واقعات کے بارے میں بتایا تھا، اس سے اس کی سادگی اور نیک نیتی جھلکتی تھی۔ میں اگر چاہتا تو ان معلومات کی روشنی میں عظیم کے ساتھ کوئی بھی ٹیم ٹیمیل سکتا تھا۔ اگر میں اسے بتاتا کہ میں نیویارک یا یوشن میں مہرالنسا سے ملاقات کر چکا ہوں تو وہ کبھی میرے اس جھوٹ کو پکڑ نہیں سکتا تھا لیکن میرے ضمیر کو کسی بھی قیمت پر یہ گوارا نہیں تھا کہ شفاف دل کے مالک عظیم کے ساتھ ایسی چیٹنگ کروں۔ جب وہ میرے ساتھ ٹھہرے تو پھر میں اسے دھوکا کیسے دے سکتا تھا۔

”عظیم!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں مہرالنسا سے نیویارک میں ملا ہوں اور نہ ہی ہماری ملاقات یوشن میں ہوئی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری ملاقات کبھی بھی نہیں ہوئی۔“

”پھر تم نے کیوں کہا کہ تم مہرالنسا کو جانتے ہو؟“ وہ خفگی آمیز لہجے میں متعجب ہوا۔ ”اور یہ کہ تم اسے بے قصور سمجھتے ہو؟“

”یہ بات میں نے ہیومن سائیکالوجی کی بنیاد پر کہی تھی۔“

”ہیومن سائیکالوجی۔“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”ہیومن سائیکالوجی کا سیدھا سیدھا مطلب ہے، انسانی نفسیات۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ علم بتاتا ہے کہ مجھ پر جب بیوی بنتی ہے تو پھر اس سے مجھ پر والی اندھی اور طوفانی محبت کی توقع نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ اب آپ اس کے شوہر بن چکے ہوتے ہیں اور پھر جب وہ بچوں کو جنم دیتی ہے تو اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اب وہ کسی کی ماں بھی ہے۔ مجھ پر جب بیوی بنتی ہے تو اس کی ذات دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور اولاد پیدا کرنے کے بعد اس کی ذات تین حصوں میں بٹ جاتی ہے۔ گویا اسے ان تینوں حصوں کے لیے ٹائم نکالنا ہوتا ہے۔ اس کا محبوب اور اس کا شوہر کسی اور کی اولاد ہوتا ہے جبکہ بچے اس کی اپنی اولاد ہوتے ہیں لہذا فطری اور نفسیاتی طور پر اس کی سب سے زیادہ توجہ اپنی اولاد پر مرکوز رہتی ہے۔ اس مصروفیت سے وہ محوزی بہت فرصت اپنے شوہر کی دیکھ ریکھ کے لیے نکال لیتی ہے اور محبوب..... کے لیے اس کے پاس وقت ہی نہیں بچتا چنانچہ کسی بیوی اور بچوں کی ماں سے سب سے زیادہ شکایت ہے

”ناٹشے کی کوئی خاص طلب محسوس نہیں ہو رہی۔“
میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”ادھر دینی
میں کافی کچھ کھالیا تھا۔“

”یار! تمہارے بہانے میں بھی کچھ کھالوں گا۔“ عظیم
نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ”اور تھوڑی گپ شپ بھی ہو جائے
گی۔ ابھی تو میں نے تمہیں اس مسئلے کا حل بھی بتانا ہے۔“
”او، ایس!“ میں نے ہونٹ سیڑ کر کہا۔ ”اوکے، ہم
ہلکا پھلکا ناٹشہ کر سکتے ہیں۔“

”ٹینکس برؤ! کیا منگو اوں؟“ عظیم نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”ایز یوش۔ سب چلے گا۔“

عظیم نے ویش کو اشارے سے اپنے پاس بلایا اور
کہا۔ ”باس! دو کیپی چینو، کلب سینڈوچ اور گوئی اچھا سا
کیک کھلا دو۔“

ویش آرڈر لے کر چلا گیا تو عظیم نے اپنی جینز کی ہپ
پاکٹ میں سے والٹ نکالا اور اس والٹ کے اندر سے ایک
وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

”برؤ! یہ رکھ لو۔ آپ تین دن کے لیے کراچی کے
مہمان ہو۔ اگر کوئی بھی پرابلم ہو تو آپ مجھے کال کرو گے۔
اوکے.....!“

میں نے اس کے ہاتھ سے وزیٹنگ کارڈ لے کر اس
پر نگاہ ڈالی۔ وہاں ”عظیم احمد پور“ کا نام درج تھا۔ عہدے
والی لائن میں ڈائریکٹر لکھا تھا اور کمپنی کا نام ”اے کے
ٹریڈرز“ تھا۔ نیچے نیچے چالی کے علاقے کا ایڈریس تھا۔ میں
نے مذکورہ کارڈ کا یہ غور جائزہ لیا پھر عظیم کی طرف دیکھتے
ہوئے کہا۔

”عظیم! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”کون سی بات برؤ؟“

”عظیم احمد اور پور کا ملاپ.....“ میں نے الجھن زدہ
انداز میں کہا۔ ”میں سمجھ نہیں پا رہا کہ ایک مسلمان شخص کے
ساتھ کسی ہندو فیملی کا سرنم کیوں لگا ہوا ہے؟“

”اکثر لوگوں کو اس بات پر حیرت بلکہ الجھن ہوتی
ہے۔“ وہ زیر پر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”بات دراصل یہ
ہے کہ میرے آباؤ اجداد کا تعلق ماضی میں ہندوؤں سے
رہا ہے اور اگر تین چار نسلیں پیچھے چلے جائیں تو ہم لوگ ہندو
ہی تھے پھر جب ہندوستان میں دعوت اسلام کا آغاز ہوا تو
بہت سے سکھوں اور ہندوؤں نے مذہب اسلام اختیار
کر لیا۔ اسی زمانے میں میرے آباؤ اجداد نے بھی اسلام
قبول کر لیا تھا اور ہم مسلمان ہو گئے تھے۔ میرے پردادا کی

ہمارے محبوب ہی کو ہوتی ہے جیسا کہ تمہیں ہے.....“
”او بھائی نفسیات داں!“ وہ معنی خیز انداز میں
مسکراتے ہوئے بولا۔ ”اگر میں تمہاری تقریر سن رہا ہوں تو
اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم مہر النساء کی حمایت میں مجھے ہی
قصور وار ٹھہرا دو۔“

”میں نے نہ تو مہر النساء کی حمایت کی ہے اور نہ ہی
تمہاری مخالفت۔“ میں نے دو ٹوک انداز میں کہا۔ ”میں
نے تو ایک اصولی بات کی ہے۔“

”یو بھائی، ہم ہیسی پہنچ گئے۔“ عظیم نے سیاہ کرولا کو
پرل کانٹیننٹل ہوٹل کے اندر داخل کرتے ہوئے کہا۔
تمہاری اصولی بات سے میں نہ تو اتفاق کروں گا اور نہ ہی
اختلاف..... بس تم مجھے یہ بتا دو کہ اس مسئلے کا حل کیا ہے؟“
”مہر اور برداشت۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں
کہا۔ ”بے شک! مالک ممبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

”ملا دالی لولی پاپ سے کام نہیں چلے گا۔“ وہ گاڑی
کو ایک طرف روکتے ہوئے بولا۔ ”تم ماہر نفسیات ہو تو مجھے
اس مسئلے کا کوئی سائنٹیفک حل بتاؤ۔“

”میاں بیوی کا رشتہ ایسا بندھن ہے کہ جس کے بیچ
اپلائی کی جانے والی ہر سائنس زیر ہو جاتی ہے۔“ میں نے
مریاناہ انداز میں کہا۔ ”اگر اس ایپلیکیشن کو بار بار غرائی کیا
جائے تو سسٹم بیک ہو جاتا ہے۔“

”لیکن میرے پاس ہے ایک حل اس مسئلے کا۔“ وہ
شرارت بھرے لہجے میں بولا۔

”کون سا حل؟“ میں پوچھتے بناندرہ سکا۔

”تم ریسپشن پر پہنچو اور چیک ان کا پراسس مکمل
کرو۔“ عظیم نے بہ دستور معنی خیز انداز میں کہا۔ ”میں گاڑی کو
پارک کر کے آ رہا ہوں پھر اس ٹاپک پر بات کریں گے۔“

”اوکے.....“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے
کہا اور اس کی گاڑی سے نیچے اتر گیا۔

اگلے دس منٹ میں چیک ان کا پراسس مکمل ہو گیا۔
میری میری تین دن کے قیام کی بکنگ تھی۔ اس دوران
میں عظیم اپنی گاڑی کو پارکنگ میں لگا کر واپس آ گیا تھا۔ ہم
دونوں لابی میں بیٹھ گئے۔ عظیم نے کہا۔

”ابھی تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی لیکن تم ایک
لوہل سفر کر کے یہاں پہنچے ہو لہذا تمہیں ڈٹ کر ایک بھر پور
پنڈ لینا چاہیے۔ میں تمہیں زیادہ دیر لابی میں نہیں روکوں گا۔
تم تمنا کر دو پھر اوپر اپنے کمرے میں جا کر آرام سے
ہو جانا۔“

مذہبی کرم اپنا فیملی سریم نہیں ہٹائیں گے لہذا ہم سب کے ناموں کے ساتھ ”کپور“ لگا ہوا ہے۔“

”انٹریسٹنگ!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ”آپ کی یہ کہانی ”اے کے ٹریڈرز“ کس قسم کی ٹریڈنگ کرتی ہے؟“

”ہم لوگ ملائیشیا، پوائے ای اور دوسرے ملکوں سے ایڈیٹل آئل امپورٹ کرتے ہیں۔“ عظیم نے بتایا۔

”ایک زمانہ تھا ایڈیٹل آئل (کھانے کا تیل) کی امپورٹ میں ہمارا طوطی بولتا تھا لیکن آج کل بزنس کافی ٹھنڈا جا رہا ہے پھر بھی اللہ کا شکر ہے۔ اس پروردگار نے اپنے کرم سے بہت عزت سے نوازا رکھا ہے۔“

”آج کل پوری دنیا میں بزنس کا حال کم و بیش ایک جیسا ہی ہے۔“ میں نے اظہار حقیقت کرتے ہوئے کہا۔

”ہر بزنس مین اپنے اپنے سر میں ایک ہی رونا رہا ہے۔ اپنی ہاؤ..... اے کے ٹریڈرز سے مراد ”عظیم کپور ٹریڈرز“ ہی ہے نا؟“

”اے“ ”عظیم کپور“ سمجھیں یا ”علی کپور“ کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم دونوں بھائی مل کر بزنس کو سنبھالتے ہیں اور پاپا ہماری راہ نمائی کرتے ہیں۔ میرے پاپا حفیظ احمد کپور کا نام بزنس کی دنیا میں بہت معروف ہے۔“

”ویری گڈ!“ میں نے میرا ہنے والے انداز میں کہا۔

”تم سے مل کر واقعی مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔“

”میں تمہیں اپنے پاپا اور چھوٹے بھائی علی سے بھی ملواؤں گا۔“ عظیم نے کہا۔ ”تم اچھی طرح ریٹ کرلو۔ میں شام میں تم سے کاٹیکٹ کروں گا۔ اگر تمہارا کوئی کانٹیکٹ نمبر ہے تو مجھے دے دو۔“

”میرے پاس تو امریکا والا نمبر ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس پر کال کرو گے تو تمہیں روٹنگ لگے گی اور کال بہت مہنگی ہو جائے گی۔“

”اس مسئلے کا تو بہت ہی آسان ساحل ہے۔“ وہ چٹکی بجاتے ہوئے بولا۔ ”میں جب امریکا میں تھا تو میں نے وہاں کا سم کارڈ بھی لیا تھا۔ بس، اس میں کریڈٹ ڈالنا ہوگا۔“

”میرے پاس اس مسئلے کا اور بھی آسان حل موجود ہے۔“ اب کی بار میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔

”وہ دلچسپ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”وہ کیا ہے؟“

”تم واٹس ایپ یوز کرتے ہو؟“

”ہاں..... یوز کرتا ہوں۔“

”بس تو پھر ہم واٹس ایپ پر کانٹیکٹ کریں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ہم دونوں واٹس ایپ کے نمبرز آپس میں بھیج کر لیتے ہیں۔“

”گڈ آئیڈیا۔“ عظیم نے ستائشی نظر سے میری طرف دیکھا۔

اس کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو نہ صرف اپنا واٹس ایپ کا نمبر دیا بلکہ ایک دوجے کو اپنے پاس ایڈ بھی کر لیا۔ میں نے کہا۔

”عظیم! ابھی تک تم نے اس مسئلے کا حل نہیں بتایا جس کا تعلق بیوی اور محبوب سے ہے!“

”برو! اس مسئلے کا ایک ہی حل ہے۔“ وہ آنکھ دبا کر بولا۔ ”محبوب اور بیوی دو الگ کردار ہونا چاہیے۔ ایک گھر والی، ایک باہر والی۔ گھر میں بھی سکون، باہر بھی شانتی۔“

”زبردست!“ میں نے کہا۔ ”اس میں اگر تیسرا کردار آفس والی کا بھی شامل کر لیں تو ایک مثلث بن جائے گی۔“

”پھر مجھے گھنا ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔“ عظیم نے ایک جبر جھری لیتے ہوئے کہا۔ ”مہر النساء کو پہلے ہی مجھ پر شک ہے کہ میرا کسی سے کوئی چکر دو کر چل رہا ہے اور.....

پاپا اس کے شک کو مضبوط کرتے رہتے ہیں۔“

”عظیم! ایک بات ذہن میں فیڈ کر لو کہ شک صرف مرد کو ہوتا ہے، عورت کو ہمیشہ یقین ہوتا ہے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اپنی ہاؤ..... اب تمہاری مہر النساء سے کب بات ہوگی؟“

”کیوں..... خیریت؟“ وہ بدکے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔

”گھبراؤ نہیں، میں تمہاری کوئی شکایت نہیں کرنے والا۔“ میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔ ”تمہاری جب بھی اپنی وائف سے بات ہو تو اسے یہ پتہ دینا کہ یوشن میں اساعیلی کیونٹی کا جو سب سے بڑا جماعت خانہ ہے اس کے

نزدیک ہی ساؤتھ وکریسٹ ڈرائیو پر ”سوائے“ ریسٹورنٹ اینڈ شاپنگ مال ہے۔ گیارہ جولائی والے آغا خان کیونٹی کے امامت ڈے کے حوالے سے سوائے میں چوٹیوں،

مہندی اور لمبوسات کے مختلف اسٹالز لگتے ہیں۔ کوئی بھی شخص جماعت خانے کے کھایا سے اسٹال لگانے کی اجازت حاصل کر سکتا ہے۔ اس اجازت نامے کو دیکھ کر سوائے والے

اسٹال کے لیے ایک بڑی ٹیبل مہیا کر دیتے ہیں۔ اگر مہر النساء اس آپشن کو یوز کرے تو اس کی خوب کمائی ہو سکتی ہے۔“

”زبردست آئیڈیا ہے یار۔“ وہ پرجوش انداز میں

ہوا۔ ”میں آج ہی مہر النساء کو بتاتا ہوں۔“
 تھوڑی دیر کے بعد عظیم ہوٹل سے رخصت ہو گیا۔
 میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کر سب سے پہلے اکل
 سلطان سے رابطہ کیا۔ کراچی ایئر پورٹ پر لینڈ کرنے کے بعد
 میں نے اپنی رستہ وادج اور سل فون میں پاکستان کا معیاری
 وقت سیٹ کر لیا تھا۔ اس وقت میرے پاس ستائیس جون کی صبح
 کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ بے سٹی، ٹیکساس میں اس
 وقت چھبیس جون کی رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔
 تیری گھنٹی پر اکل نے میری کال ریسیو کر لی۔

”ہیلو اکل! آپ کیسے ہیں۔ آپ سوتو نہیں گئے تھے؟“
 ”تمہاری طرف سے خیریت کی خبر سے بغیر میں کیسے
 سو سکتا ہوں میرے بچے!“ وہ اپنے مخصوص انداز میں
 بولے۔ ”میں پچھلے پانچ گھنٹے سے تمہارے فون کا
 انتظار کر رہا ہوں۔ میرے اندازے کے مطابق، پانچ گھنٹے
 پہلے تمہیں کراچی پہنچ جانا چاہیے تھا۔ مجھ سے رابطہ کرنے میں
 اتنی تاخیر کیوں ہوئی..... سب ٹھیک تو ہے نا؟“

”سب ٹھیک ہے اکل!“ میں نے تسلی آمیز انداز
 میں کہا۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے۔ میں مقررہ وقت پر
 کراچی پہنچ گیا تھا۔ یہی سوچا تھا کہ اپنے ہوٹل کے کمرے
 میں جا کر آپ کو کال کروں گا لیکن راستے میں ایک چھوٹا سا
 اپ سیٹ ہو گیا تھا اس لیے.....“
 ”کیسا اپ سیٹ میرے بچے؟“ وہ میری بات مکمل
 ہونے سے پہلے ہی بول اٹھے۔

جواب میں، میں نے انہیں خود کو پیش آمدہ واقعے کی
 تفصیل سنائی۔ انہوں نے پوری توجہ کے ساتھ میری بات
 سنی اور میرے خاموش ہونے پر ایک اطمینان بھری سانس
 خارج کرتے ہوئے بولے۔

”خدا کا شکر ہے کہ تم سلامت ہو۔ میں سمجھتا ہوں،
 اللہ نے تمہاری خصوصی مدد کی ہے۔“
 ”جو مالک کی مرضی۔“ میں نے مختصر آ کہا۔

”تم نے عظیم نامی جس نوجوان کا ذکر کیا ہے، وہ تمہیں
 کیسا لگے؟“ اکل نے پوچھا۔

”مجھے تو وہ معقول اور سمجھ دار انسان لگا ہے۔“ میں
 نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس کے سینے
 میں ایک مخلص اور ہمدرد دل ہے.....“ کھاتی توقف کر کے
 میں نے ایک گہری سانس لی پھر پوچھا۔

”اکل! آپ نے عظیم کے بارے میں کیوں سوال کیا؟“
 ”تم نے مجھے اس کی زندگی کے حوالے سے جو کچھ بھی

بتایا ہے، اس سے میں ایک نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ دل کا
 صاف انسان ہے۔“ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے
 کہا۔ ”تم اس کے لیے اجنبی تھے لیکن اس نے تمہارے
 ساتھ اپنے گھریلو حالات بھی ڈسکس کیے۔ تمہیں ہوٹل تک
 پہنچانا اور مدد کر کے ٹاشا بھی کر لیا۔“
 ”جی اکل! یہی سبھی اہم اندازہ ہے کہ عظیم ابھی نیت
 کا مالک ایک پُر غلوں شخص ہے۔“ میں نے اظہار خیال
 کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں، مجھے عظیم کے ساتھ
 دوستی کر لینا چاہیے۔ ماں کی تلاش میں وہ میرے بہت کام
 آ سکتا ہے۔ وہ کافی اثر رسوخ والا بندہ ہے۔“

”تمہاری بیان کردہ تفصیل کے مطابق، مجھے بھی یہی
 لگ رہا ہے کہ قدرت نے کسی خاص مقصد سے تمہیں عظیم
 سے ملوایا ہے۔“ اکل نے کہا۔ ”تم اس کے ساتھ دوستی
 بڑھاؤ لیکن ایک بات کا خیال رکھنا میرے بچے۔“

”کون سی بات اکل؟“ میں نے پوچھا۔
 ”تم نے بتایا ہے کہ عظیم کا کزن ارباب پولیس والا
 ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”تمہیں پولیس اور قانونی ہیکسزوں
 سے دور رہی رہنا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہونا؟“

”اچھی طرح سمجھ رہا ہوں اکل۔“ میں نے گہری
 سنجیدگی سے کہا۔ ”آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ میں ایک
 ایک قدم پھونک پھونک کر رکھوں گا اور مالک کے کرم سے
 کوئی کڑ بڑ نہیں ہوگی۔“

”ان شاء اللہ!“ وہ مضبوط لہجے میں بولے۔ ”میں
 تمہیں بار بار فون کر کے ڈسٹر بنیں کروں گا۔ تمہیں جیسے
 ہی فرصت ملے، اپنی خیر خیریت کی خبر دیتے رہنا اور سبکی
 صاحبہ کی تلاش کے سلسلے میں جو بھی پیش رفت ہو، اس سے
 مجھے آگاہ کرتے رہنا۔“

”یہ تو میرا فرض ہے اکل۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے
 لہجے میں کہا۔ ”آپ پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کو اپنے
 معاملات سے باخبر رکھوں گا۔“

”اوکے میرے بچے۔“ وہ شفقت بھرے انداز
 میں بولے۔ ”میں اب سونے جا رہا ہوں۔ تم بھی کچھ دیر
 آرام کر لو۔“

”مجھے بھی نیند آرہی ہے کیونکہ ابھی تک میرا دماغ
 سونے جانے کے اوقات کے لحاظ سے امریکا کے ٹائم کے
 ساتھ سیٹ ہے۔“ میں نے ایک طویل جمانی لیتے ہوئے
 کہا۔ ”ایک دو دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
 ”گڈ نائٹ!“ اکل نے عادتاً کہا۔ ”تم بھی

سو جاؤ۔“

میں نے بھی اکل کو ”گڈ نائٹ“ کہا اور رابطہ موقوف کر دیا۔

پاکستان کی سرزمین پر یہ میرا پہلا دن تھا۔ میں جس عظیم ہستی کی تلاش میں کراچی پہنچا تھا، وہ اس شہر میں مجھ سے کتنے فاصلے پر موجود تھی، مجھے اس کی کوئی خبر نہیں تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ میں بہت جلد اس سے باخبر ہو جاؤں گا۔ بہت جلد.....!

☆☆☆

ایک بچے دو پہر میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے سونے سے پہلے سیل فون کو آف کرنے کے بعد چار جنگ پر لگا دیا تھا۔ میں نے بستر چھوڑا اور واش روم میں ٹھس گیا۔ اگلے پندرہ بیس منٹ میں، میں فریش اپ ہو چکا تھا۔

سب سے پہلے میں نے سیل فون آن کیا۔ وہاں واش ایپ پر عظیم کا ٹیکسٹ پڑا تھا۔ میں نے مذکورہ ٹیکسٹ کو ادھار لے لیا۔

”برو! جب تم اپنی نیند پوری کر چکو اور گھومنے پھرنے کا موڈ ہو تو بتا دینا۔ میں تمہیں پک کر لوں گا۔ آج میں بالکل فری ہوں۔ اسی بہانے تمہیں تھوڑی لمبائی دے دوں گا۔“

عظیم کا ٹیکسٹ پڑھنے کے بعد میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو پہلی ہی نظر میں دل و دماغ میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ عظیم کا شمار بھی انہی افراد میں ہوتا تھا۔ ہماری ملاقات کو ابھی چند گھنٹے ہی ہوئے تھے لیکن اس مختصر سے عرصے ہی میں وہ مجھے اپنا اپنا سا لگنے لگا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ میرے لیے قابلِ بھروسہ ثابت ہوگا۔ ٹیکسٹ کا رپلائی کرنے کے بجائے میں نے فون کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں نے واش ایپ پر اسے کال کیا۔ رابطہ ہونے پر میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”عظیم! اٹھان صاحب! آپ کیسے ہو؟“

”تم نے مجھے کیا کہا.....؟“ وہ چونکے ہوئے لہجے میں بولا۔

”عظیم! اٹھان صاحب۔“ میں نے اپنے الفاظ دہرائے پھر پوچھا۔ ”کیوں..... کیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی؟“

”نہیں یار.....“ وہ ٹالنے والے انداز میں بولا۔ میں نے کہا۔ ”پھر تم اس لفظ پر بے طرح کیوں چونک اٹھے؟“

”علی! بات دراصل یہ ہے کہ.....“ وہ وضاحت

کرتے ہوئے بولا۔ ”میری دادی نے میرا نام عظیم اٹھان ہی رکھا تھا لیکن کچھ عرصے کے بعد باپا نے میرے نام کے ساتھ لگے شان کو ہٹا دیا اور میں صرف عظیم رہ گیا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد اس عظیم کے ساتھ احمد کا اضافہ کر دیا گیا اور اب میں عظیم احمد ہوں..... عظیم احمد پور۔“

”اوہ..... سمجھ گیا۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”اسی لیے تم میرے منہ سے اپنا اصلی نام سن کر چونک گئے تھے۔“

”بالکل یہی بات ہے۔“ اس نے تائیدی انداز میں کہا۔ ”لیکن اصلی اور نقلی نام کا چکر بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ میرے تمام ڈاکیومنٹس میں عظیم احمد پور ہی لکھا ہوا ہے لہذا میں اسی نام کو اپنا اصلی نام سمجھتا ہوں۔“

”بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ پیدائش کے بعد بچے کا جو نام رکھا جاتا ہے یعنی جو اس کا پہلا نام رکھا جاتا ہے، وہ کارخانہ قدرت میں اسی نام سے رجسٹر ہو جاتا ہے۔ جدید زبان میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نام ہی اس کی ”آئی ڈی“ ہوتا ہے۔“ میں نے گہری تنبیہ کی سے کہا۔ ”بعد ازاں وہ دس مرتبہ بھی اپنا نام تبدیل کر لے مگر اپنے ابتدائی نام کے اثرات سے وہ بچھا نہیں چھڑا سکتا۔ اپنی باؤ، اس ٹاپک پر بعد میں بھی بات کریں گے۔ یہ بتاؤ، آج تم فری کیوں ہو کیا آج آفس نہیں گئے؟“

”آج آفس کی چھٹی ہے۔“ عظیم نے بتایا۔

”آج تو فری ایڈے ہے۔“ میں نے چونکے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”کیا پاکستان میں فری ایڈے کی چھٹی ہوتی ہے؟“

”یہ بات نہیں ہے یار۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”چھٹی تو یہاں سنڈے ہی کی ہوتی ہے۔ بعض جگہ ہفتہ اور اتوار دو دن کی چھٹی ہوتی ہے لیکن آج چاند رات کی وجہ سے ہم آفس نہیں گئے۔“

”چاند رات..... میں سمجھا نہیں!“ میں نے ابھمن زدہ لہجے میں کہا۔

”برو! آج رمضان کا چاند نظر آنے کی قوی امید ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اس لیے لوگ اپنے اپنے روزگار سے ذرا جلدی آف کر کے گھر کی طرف دوڑ لگا دیتے گے۔ ہمارا آفس بزنس سینٹر کے قلب میں واقع ہے۔ یہاں عام دنوں میں ٹریفک جیم ملتا ہے، رمضان کی آمد کے سبب تو وہ

افراطی ریلوے کی تمام سڑکیں گاڑیوں سے بھری ملیں گی۔ ہم عموماً چھ بجے شام آفس سے نکلے ہیں اور ساڑھے چھ یا زیادہ سے زیادہ پونے سات بجے گھر پہنچ جاتے ہیں لیکن

زیادہ سے زیادہ پونے سات بجے گھر پہنچ جاتے ہیں لیکن

ہو۔ اس سے تمہارے ذہن میں کہیں یہ بات نہ آ جائے کہ میں یہ پیشکش اپنی کسی غرض کے لیے کر رہا ہوں۔“

”مثلاً ایسی غرض؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے جب میں امریکا آؤں تو تم اسی طرح میری بھی مہمان نوازی کرو۔“ اس نے کہا۔

”اوہ..... تو یہ بات ہے۔“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”عظیم! اگر ہمارے بیچ دوستی کا رشتہ قائم ہو گیا ہے تو پھر ہر قسم کے تکلفات کو رخصت ہو جانا چاہیے۔ ہم ایک دوسرے کے مخلص اور بے غرض دوست ہیں لہذا ہم میں سے کوئی کسی کا نہ تو مہمان ہے اور نہ ہی میزبان۔ میں اس وقت تمہارے ملک اور تمہارے شہر میں ہوں۔ تم اپنی استعداد کے مطابق، میرے ساتھ جتنا بھی تعاون کر سکتے ہو کرو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جب تم میرے ملک اور میرے شہر میں ہو گے تو اس وقت میں اپنی بساط کے مطابق تمہارے ساتھ جتنا بھی تعاون کر سکوں گا، تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ ہماری دوستی ہمیشہ بے لوث رہے گی۔“

”ان شاء اللہ.....!“ وہ ٹھوس لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ”تمہارا سیل فون ڈوکل سم والا ہے..... کیا تم اس میں دوام استعمال کر رہے ہو؟“

”نہیں.....“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگرچہ میرا سیل فون ڈوکل سم ہی ہے لیکن میں ایک سم ہی استعمال کرتا ہوں۔ دوسری سم کا سلاٹ خالی پڑا ہے۔“

”اوکے..... میں آ رہا ہوں۔“ عظیم نے سرسری انداز میں کہا۔ ”خدا حافظ۔“

”اللہ حافظ!“ میں نے یہ کہتے ہوئے رابطہ ختم کر دیا۔

عظیم سے بات کر کے اچھا لگتا تھا۔ اس دنیا میں چاروں طرف منافقت اور ریاکاری کا دور دورہ ہے۔ آپ کو اپنے ارد گرد بے شمار جھگڑتے ہوئے چہرے نظر آئیں گے جن کی زبان سے شہد فیکد رہا ہوگا، ان کے الفاظ میں دنیا بھر کی دانش بھری ہوگی۔ وہ پارسائی کے دعوے دار بھی ہوں گے اور ان کا ماضی یہ زبان خود انسانیت کی خدمت کے واقعات سے بھرا ہوگا لیکن ان میں سے کتنے افراد صادق اور امین ہوں گے، یہ بتانا بہت مشکل بلکہ تکلیف دہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لوگوں کی اکثریت ”قول و فعل میں تضاد“ کے امتحان میں اول پوزیشن حاصل کرنے کی تیک و دو میں لگی ہوئی ہے۔

اگر آج یہ معمول دہرایا جاتا تو گھر تک پہنچنے پہنچنے تو نہیں تو آٹھ تو بج ہی جاتا تھے لہذا ہم نے آج آفس بند رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تھوڑی دیر پہلے ہی سوکھا ہوں۔ فریٹس ہونے کے بعد تمہیں کال کیا ہے۔“

”مگنا!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا پھر پوچھا۔ ”تم نے بیچ تو نہیں کیا نا ابھی؟“

”نہیں.....“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

”اوکے۔ ہم بیچ ایک ساتھ کریں گے۔“ عظیم نے کہا۔ ”تم ریڈی رہو۔ میں تمہیں پک کرنے آ رہا ہوں۔“

”پک کرنے..... مطلب ہم ہوٹل سے باہر کہیں بیچ کریں گے؟“ میں نے استفسار کیا۔

”ہاں یا راتم گھونسنے پھر نے پاکستان آئے ہو۔“ وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ”ہوٹل رات گزارنے کے لیے ٹھیک ہے۔ دن بھر تمہیں سیر سائے کرنا چاہئیں۔ اگر تمہارا موڈ ہو تو میں آ جاتا ہوں ورنہ جو تمہاری خوشی.....!“

”پاکستان میں تم میرے پہلے مخلص دوست ہو۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہاری تجویز کو رد کیسے کر سکتا ہوں۔ آ جاؤ..... میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

”ہوٹل کے نزدیک پہنچ کر میں تمہیں کال کروں گا۔“ عظیم نے کہا۔ ”پھر تم لائی میں آ جانا۔ تم نے مجھے دوست سمجھا ہے تو تمہیں دوستی نہ بھاری دکھاؤں گا۔ اسی لمحے سے اپنے ذہن میں یہ بات نقش کر لو کہ یہاں پاکستان میں تم میرے مہمان ہو..... میرے مہمان دوست۔ میری اس بات کا کوئی ایسا دیر مطلب نہیں نکال لینا۔“

”ایسا دینا مطلب سے تمہاری کیا مراد ہے؟“ میں پوچھتے بہانہ رہا۔

”علی! میں اندر باہر سے ایک جیسا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر بھی آ جاتا ہے اس لیے اکثر لوگ میری بات کا برا مان جاتے ہیں.....“

”تم فکر نہیں کرو عظیم۔“ میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”میں صاف گو لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ ان شاء اللہ! ہماری خوب نیچے گی۔ اب بتاؤ، ایسا دینا مطلب نکالنے سے تمہاری کیا مراد سی؟“

”یار! سیدھی سی بات ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں نے کہا کہ پاکستان میں تم میرے مہمان

اس قحط الرجال کی فضا میں اگر کوئی سچا اور کھرا انسان آپ کو میسر آ جائے تو اسے نوبت غیر مترقبہ سمجھنا چاہیے اور اس کی قدر بھی کرنا چاہیے۔ عظیم بھی ایک ایسا ہی انسان تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد اس کی کال آگئی اور اس نے بتایا کہ وہ ہوٹل کے قریب پہنچ گیا ہے۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور لابی میں آ بیٹھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کسی انسان کے بارے میں فوری طور پر کوئی حتمی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے ان پر عظیم کے حوالے سے جو رائے دی ہے، وہ ایک فوری فیصلے کا نتیجہ ہی نظر آتی ہے لیکن اس سلسلے میں، میں اتنا ضرور کہوں گا کہ ایک عام آدمی کی رائے اور میری رائے میں بہت فرق ہے۔ میں کوئی پہنچا ہوا ماہر نفسیات تو نہیں مگر سائنس کا کوئی ایک مہنکار اسٹوڈنٹ ضرور ہوں۔ جس طرح کوئی ماہر باور پچی چاول کے ایک دانے سے پوری دیگ کا احوال معلوم کر لیتا ہے، بالکل ویسے ہی میں بھی پہلی ملاقات میں انسان کی حرکات و سکنات سے اس کی سوچ کا اسکریے کر لیتا ہوں اور اکثر اوقات میرا یہ اندازہ درست ثابت ہوا ہے۔ ہاں، اگر کوئی بڑا مجھا ہوا ادارہ کار ہو اور کسی خاص مقصد کے تحت وہ ایکٹنگ کر رہا ہو تو اس صورت میں بعد ازاں میرا اندازہ غلط نکل سکتا ہے۔

عظیم سے ہوٹل کی لابی میں ملاقات ہوئی تو اس نے اپنے والد میں سے ایک سم کارڈ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”اے اپنے سیل فون کے خالی سلات میں لگا لو۔“

”یہ کیا ہے؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”ارے سم ہے یار۔“ اس نے بتایا۔ ”ڈرو نہیں۔ یہ لیگل کنکشن ہے۔ میرے نام پر رجسٹرڈ ہے۔ یہ۔ اس سے تمہیں پاکستان میں ہر جگہ کال کرنے میں آسانی رہے گی۔ یہ پوسٹ پیڈ کنکشن ہے لہذا کریڈٹ لوڈ کرانے کی ضرورت نہیں۔ تم بے فکر رہو اسے استعمال کرو۔ جب بل آئے گا تو میں ادا کر دوں گا۔ تمہیں نیشن لینے کی ضرورت نہیں۔“

”نیشن کی بات تو ہے نا عظیم۔“ میں نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ ”اگر میں تمہاری سم لے لوں گا تو پھر تم کیا کرو گے؟ تمہیں بھی تو اس کی ضرورت ہوگی نا.....!“

”تو تم اس لیے پریشان ہو رہے ہو کہ یہ سم تمہیں دینے کے بعد میں کیا کروں گا۔“ وہ معتدل انداز میں بولا پھر اپنے دوسل فون مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ ”میں چار سم آل ریڈی یوز کر رہا ہوں۔ دو ایک موبائل میں اور دو دوسرے موبائل میں۔ یہ پانچویں سم میرے پاس اسپریم میں

پڑی تھی۔ تم بے دھڑک اسے استعمال کر سکتے ہو۔“

عظیم کے پاس دو اینڈ رائڈ سیل فون تھے۔ براؤن کا نام اس لیے بیس لوں گا کہ یہ ان کیپٹن کی مارکیٹنگ ہو جائے گی اور بزنس کا اصول یہ ہے کہ بغیر پیسے وصول کیے کسی کی مارکیٹنگ نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے عظیم کے ہاتھ سے مذکورہ سم لے کر اپنے سیل فون میں لگاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا یہ پانچوں کی پانچوں سم تمہارے ہی نام پر ہیں؟“

”ہاں جی ایہ پانچوں سم میرے“ سی این آئی کی سی پر ہی رجسٹرڈ ہیں۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”تمہیں کسی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا۔ ”جب تم میرے دوست ہو تو پھر مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ کیا پاکستان میں اتنی آسانی سے سم کارڈ مل جاتے ہیں کہ ایک آدمی کے پاس پانچ پانچ کنکشن موجود ہیں!“

”بعض لوگوں کے پاس تو اس سے بھی زیادہ سم ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”یہ تو کچھ عرصہ پہلے دہشت گردی کی روک تھام کے لیے جی پی ای اے نے کافی سختی کر دی ہے اور اس وقت وہی سم کام کر رہی ہیں جو کسی نہ کسی کی این آئی سی پر رجسٹرڈ ہیں ورنہ اس سے قبل تو اندھی لگی ہوئی تھی۔ موبائل کی سم پان اور سگریٹ کی دکانوں پر بھی فروخت ہو رہی تھیں۔“

”آپ لوگوں کے تو مزے ہیں عظیم بھائی۔“ میں نے کہا۔ ”امریکا میں تو ایسی آسانیاں حاصل نہیں ہیں۔ واقعی تم لوگ آزاد ملک کے آزاد باسی ہو۔“

”ظن کر رہے ہو.....!“

”تمہیں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔“

”اپنی ہاؤ.....“ وہ سادگی سے بولا۔ ”میں نے تمہیں جو سم دی ہے، اس کا نمبر نوٹ کر لو۔“

اس نے نمبر بتایا اور میں نے نوٹ کر لیا۔ اس نے بتایا۔

”اس وقت پاکستان میں پانچ موبائل سروس پروو اینڈ ریپیز کام کر رہی ہیں اور میرے پاس سب کا ایک ایک کنکشن ہے۔ ایک سم تمہیں دے دی ہے، باقی چار میرے پاس ہیں۔ ان میں سے کچھ پوسٹ پیڈ اور کچھ پری پیڈ ہیں۔ میں نے تمہیں جو سم دی ہے وہ پوسٹ پیڈ ہے۔ مزے کرو.....“

عظیم سے ہونے والی اس تمام تر گفتگو میں میرا ذہن ایک خاص انداز میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ اچھی بات ہے کہ اس وقت جو سمر آن ہیں، وہ کسی نہ کسی کے سی این آئی کی پر رجسٹرڈ ہیں۔ ضرورت پڑنے پر حکومتی حساس ادارے بہ آسانی اس شخص کا سراغ لگا سکتے ہیں جس کے نام پر وہ سم رجسٹرڈ ہو۔ بی بی اے کے احکامات سے پہلے جو سمر جاری کی جا چکی تھیں کیا وہ سب کی سب بند کر دی گئی ہیں یا ان میں سے کچھ ابھی تک آن ہیں؟“

”میری معلومات کے مطابق، اس وقت صرف وہی سمر آن ہیں جن کی پی ٹی اے کے پاس مستند رجسٹریشن موجود ہے۔ پچھلے دنوں بی بی اے نے ایک مہم چلائی تھی جس کے تحت ہر سم ہولڈر کو اپنے سروس پر ووائز کر کے پاس جا کر اپنے اور بی بی سی این آئی کی ساتھ اپنے نمبر کو کنفرم کرانا تھا۔ علاوہ ازیں ہر سم ہولڈر کا بائیو میٹرک بھی کیا گیا ہے لہذا اس وقت جو بھی سمر آن ہیں، ان کا مالک حساس اداروں کی پہنچ سے دور نہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ بہ آسانی اس کا سراغ لگا سکتے ہیں۔“

”اور جو سمر بند کر دی گئی ہیں اگر ان کے مالکان کا سراغ لگانا ہو تو اس کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے؟“ میں نے۔۔۔

”دستور اس کی آنکھوں میں بھٹکتے ہوئے سوال کیا۔

”اگر ان میں سے کوئی سم بھی کسی سی این آئی کی پر رجسٹر ہوئی ہو تو اس کے مالک کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔“

”عظیم نے بتایا۔“ لیکن تم اتنی دہک رہی ہے یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیا انہیں بھی کسی کی کھوج لگوانی ہے؟“

”ہاں، ایسی ہی بات ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس کراچی کے چند افراد کے سلی فون نمبرز ہیں لیکن اتفاق کی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی نمبر رسپانڈ نہیں کر رہا۔ بعض نمبرز پر یہ ریکارڈنگ سنائی دیتی ہے۔۔۔۔۔“ آپ کا مطلوبہ نمبر کسی کے استعمال میں نہیں۔“ اگر ان سمر ہولڈرز میں سے کسی ایک کا بھی ایڈریس مجھے معلوم ہو جائے تو میرے لیے بڑی آسانی ہو جائے گی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ یہ تو بہت معمولی سی بات ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”کئی موبائل سروس پر ووائز ریکالائزر کے کال سینٹرز میں میرے دوست کام کرتے ہیں۔ تم وہ تمام نمبرز مجھے دے دینا۔ میں پتا کر دوں گا لیکن۔۔۔۔۔“ لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”لیکن ابھی تو پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ پہلے لچ کریں گے۔ باقی باتیں اس کے بعد۔“

”اوکے۔ تو لچ کے لیے نکلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”تم اپنی گاڑی میں ہو؟“

”ہاں۔۔۔۔۔ گاڑی ہوٹل سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اگر تم ریڈی ہو تو چلتے ہیں۔“

”آئی ایم ریڈی۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن صرف دو منٹ لوں گا۔ مجھے ذرا اپنے کمرے تک جانا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، تم کمرے سے ہو آؤ۔“ وہ سرسری لہجے میں بولا۔

میں لابی سے اٹھا اور لفٹ کی جانب بڑھ گیا۔

بروکلین (نیو یارک) میں مرزا عامریگ نے مجھے جو چالیس فون نمبرز دیے تھے، وہ میں نے ایک کاغذ پر نوٹ کر لیے تھے۔ علاوہ ازیں یہ تمام نمبرز میں نے اپنے سلی فون میں بھی فیز کر رکھے تھے۔ میں اگر چاہتا تو سلی فون سے بھی یہ نمبرز عظیم کو سینڈ کر سکتا تھا لیکن میرے خیال میں کاغذ پر لکھی ہوئی لسٹ دینا زیادہ مناسب تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ راستے میں اس لسٹ کی کہیں سے زیرکس (فونٹو کاپی) کروا کے عظیم کو دے دوں گا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اپنے تعلقات استعمال کر کے ان چالیس میں سے کسی ایک شخص کا پتا ٹھکانا تو معلوم کر ہی لے گا۔ اگر میں کسی ایک بھی ایسے شخص تک رسائی حاصل کر لیتا جس نے مٹی ٹرانسفر سے بیک صاحب کو رقم بھیجی تھی تو مجھے اپنی مال بیک رسائی حاصل کرنے میں بہت آسانی ہو جاتی۔ مجھے ہر قیمت پر اپنی مال کو تلاش کرنا تھا۔ یہ میرا مشن تھا اور یہی میرا مقصد حیات۔۔۔۔۔!

عظیم کی گاڑی ہوٹل کی بیک سائڈ پر ایک پارک کی پارکنگ میں کھڑی تھی۔ عظیم نے مجھے بتایا کہ مذکورہ پارک ”پولو کراؤنڈ“ کے نام سے موسوم ہے۔ کسی زمانے میں وہاں پولو کا کھیل ہوا کرتا تھا لیکن اب اس کی حیثیت ایک فیملی پارک ایسی تھی۔ میں نے عظیم سے پوچھا۔

”تم نے اپنی گاڑی یہاں کیوں پارک کی؟“

”بی بی میں غیر متعلقہ گاڑیوں کی پارکنگ کی اجازت نہیں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اس لیے مجھے یہاں گاڑی پارک کرنا پڑی۔ یہ چارنڈ پارکنگ ہے اور یہاں کوئی بھی اپنی گاڑی پارک کر سکتا ہے۔ ایسا ہی ایک وسیع و عریض پارکنگ لاٹ ہوٹل شیرٹن کے پہلو میں بھی ہے۔ اس شہر میں کار پارکنگ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ کراچی شہر کی دیوانی مرض کی طرح پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ فلک بوس عمارتوں پر عمارتیں بنتی چلی جا رہی ہیں لیکن گاڑیوں کی پارکنگ کی طرف کسی کی

کہلاتا ہے۔“
”میں سمجھ گیا۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلائی۔
”تم نے جس پاؤ ڈر کا ذکر کیا ہے، امریکا میں اسے وہاٹ
پائزن اور سفید موت بھی کہتے ہیں۔ مالک ہر انسان کو اس
نفعتی نشتے سے محفوظ رکھے۔“

”آمین.....!“ عظیم نے تہ دل سے کہا۔
”یار! مجھے ایک پیپر کی زیروکس کروانا ہے۔“ میر
نے گاڑی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”کوئی شاپ نظر آئے
تو بتانا۔“

”ڈونٹ دری!“ وہ اطمینان بھرے انداز میں
بوللا۔ ”پہلے پیٹ بوجا کر لیں پھر زیروکس کو بھی دیکھ لیں
گے۔ کراچی میں ہر پچاس گز پر ایک فوٹو کاپی والا بیٹھا ہو
ہے۔ تم جتنی جاہو گے اتنی زیروکس ہو جائیں گی۔“
میں مطمئن ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد عظیم نے اپنی وٹر کو ایک عالی
شان عمارت میں داخل کرتے ہوئے کہا۔ ”آج میں تمہیں
ایک ایسی جگہ لے جاؤں گا جہاں بیٹھ کر کھانا ہر کسی کے بس کی
بات نہیں۔“

”تھینک یو۔“ میں نے کہا۔
گاڑی کو پارکنگ میں لگانے کے بعد ہم عمارت کے
اندرونی حصے میں داخل ہو گئے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں
ذرا دقت محسوس نہیں ہوئی کہ وہ کوئی عالی شان کلب تھا۔
جب ہماری گاڑی اندر داخل ہوئی تھی تو میں نے مین گیٹ
کے اوپر ہی حصے پر ”سروسز نہیں“ کے الفاظ لکھے دیکھے تھے۔
یہ الفاظ دیکھ کر میں چونکا تو تھا لیکن میں نے عظیم سے کوئی
سوال نہیں کیا تھا۔

ہم ڈائمنگ ہال میں جا کر بیٹھے تو میں نے چاروں
جانب نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”ہال تقریباً خالی نظر آ رہا
ہے۔ ہمارے علاوہ بس دو تین میزوں پر ہی لوگ دکھائی
دے رہے ہیں۔“

”یہاں پر لچ کے وقت اتنا ہی رش ہوتا ہے..... نہ
ہونے کے برابر۔“ عظیم نے بتایا۔ ”البتہ رات میں ڈنر
کے وقت کچھ رونق ہو جاتی ہے۔ دیکھ اینڈ پر یہاں اچھا
خاصا رش ہوتا ہے کیونکہ کھانے کے اہتمام کے علاوہ رات
گئے تک تفریحی پروگرامز کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے۔“

”اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو“ ”سروسز نہیں“ کا تو
مطلب یہ ہوا کہ یہاں کسی فورس سے تعلق رکھنے والے افراد
کے لیے کھانے پینے کا بندوبست ہوتا ہے۔“ میں نے عظیم کی

توجہ نہیں۔ اکثر پیٹرول پمپس اور ہاسٹلز نے ٹوٹ ہاتھ کو
بھی اپنے احاطے میں شامل کر رکھا ہے۔ کراچی میں چھپیں
جائے جانا جائز تجارت دیکھنے کو ملیں گی۔“

”کوئی مسئلہ نہیں، دیکھ لوں گا۔“ میں نے اس کی
وہاٹ وڈز میں بیٹھے ہوئے کہا۔ ”پارکنگ کے مسائل تو
دنیا کے ہر ملک میں ہیں لیکن فرق صرف یہ ہے کہ ترقی
یافتہ اور مہذب ملک ان مسائل کو بہت خوش اسلوبی سے
ٹھیک کر لیتے ہیں۔“

”ہاں یار! تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ ایک ٹھنڈی سانس
خارج کرتے ہوئے بولا۔ ”میں مہذب اور ترقی یافتہ بننے
میں ابھی کم از کم سو سال تو لگ ہی جائیں گے۔“

وٹر پارکنگ سے نکل کر مین روڈ پر آئی تو پی سی ہوٹل
کے سامنے سڑک کی دوسری جانب مجھے ایک کنگ سائز زیر
تعمیر عمارت دکھائی دی۔ اس عمارت کو زیر تعمیر کہنا مناسب
نہیں تھا۔ اس کی حالت سے بھی محسوس ہوتا تھا کہ کافی عرصہ
پہلے اس کی تعمیر کا سلسلہ رک گیا تھا۔ اسٹرکچر کے اعتبار سے
وہ ادھوری عمارت کوئی ہوٹل یا جدید شاؤنگ مال نظر آتا تھا۔
میں نے عظیم سے پوچھا۔ ”اس عمارت کی تعمیر کیوں
روک دی گئی ہے؟“

”کوئی پولیٹیکل ایٹو ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”اور اس
”ایٹو“ کے پیچھے بعض بڑی بااثر قوتوں کی رسائی ہے اسی
لیے یہ بے چارہ بیچ میں لنگ کر رہ گیا ہے۔ میں کھلے پچیس
تیس سال سے اسے ایسے ہی لٹکا ہوا دیکھ رہا ہوں..... اپنے
بچپن سے!“

”ویری سیڈ!“ میں نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے
کہا پھر پوچھا۔ ”کیا یہ کوئی ہوٹل وغیرہ بن رہا تھا؟“
”انٹرنیشنل چین ہوٹل..... ہائٹ ریجنی!“ عظیم نے بتایا۔
”ہائٹ ریجنی!“ میں نے دہرایا۔ ”یہ تو ایک
معروف انٹرنیشنل چین ہوٹل ہے۔“

”اب اس زیر تعمیر بلکہ مفقود تعمیر ہائٹ ریجنی ہوٹل
میں آوارہ کتے اور لمباں قیام پذیر ہیں یا بچر، ہیر دھنچوں نے
ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔“
”ہیر دھنچ.....؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی
طرف دیکھا۔

”نیں ہیر دھنچ.....“ ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے
اس نے جواب دیا۔ ”ہیر دھنچ ایک خطرناک نشہ ہے۔ یہ
پاؤڈر فارم میں ہوتا ہے۔ اسے بعض لوگ وہاٹ کولڈ بھی
کہتے ہیں۔ ہیر دھنچ کو استعمال کرنے والا نشہ باز ہیر دھنچ

”کون مقصود؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔
 ”ارے وہ ٹیکسی ڈرائیور جس نے آج علی الصباح
 مجھے لوٹنے کا منصوبہ بنایا تھا۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔
 ”اور تم لوگوں کی آمد نے اس کا منصوبہ خاک میں ملادیا تھا اور
 میں لٹنے سے بال بال بچا تھا۔“

”تم کس قسم کی کام لے رہے ہو۔“ عظیم نے
 میرے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے وہاں
 پہنچنے سے پہلے ہی تم اپنی حفاظت کا بندوبست کر چکے تھے۔“
 ”اپنی باؤ..... میں خود بجایا آپ لوگوں نے مجھے
 بجایا، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے گہری سنجیدگی
 سے کہا۔ ”میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ مالک نے میری حفاظت
 فرمائی ہے۔“

”بے شک! اللہ ہی سب سے بہتر حفاظت کرنے والا
 ہے۔“ وہ پورے یقین سے بولا۔

میں نے کہا۔ ”تمہارا انسپکٹر کرن ارباب اس لیئرے
 ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ کیا مقصود سے
 ارباب کی جرمنی پلٹ چھوٹی زرینہ کا مال و اسباب برآمد
 کر دیا گیا ہے؟“

”یار! مجھے کوئی خبر نہیں۔ ارباب سے اس بارے
 میں میری کوئی بات نہیں ہوئی۔“ عظیم نے بتایا۔ ”یہ بات
 ذہن میں بٹھا لو کہ پاکستان کی پولیس بڑی کارگر ہے۔ جب
 کوئی جرائم پیشہ شخص ان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے تو یہ اس کی
 ایسی خاطر داری کرتے ہیں کہ وہ اپنے دماغ اور پیٹ میں
 کچھ بھی چھپا کر نہیں رکھ سکتا۔ اسے سب کچھ اٹھنا پڑتا
 ہے..... سب کچھ!“

”اگر تمہیں برآمدہ لگے تو ایک بات کہوں.....!“ میں
 نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تمہارا دوست ہوں علی!“ وہ ٹھہرے ہوئے
 لہجے میں بولا۔ ”تمہاری جو بھی بات مجھے ناگوار کرے گی،
 میں دل میں نہیں رکھوں گا، تمہارے منہ پر صاف بول دوں
 گا لہذا تم بھی مجھ سے جو کہنا چاہتے ہو، بلا تردد کہہ ڈالو۔“
 ”تم نے پاکستان کی پولیس کے لیے ”کارگر“ کا لفظ
 استعمال کیا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے
 ہوئے کہا۔ ”میں اس میں کچھ اضافہ کرنا چاہوں گا۔“

”کیسا اضافہ؟“ اس نے، جنھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔
 ”میری معلومات کے مطابق، پاکستان کی پولیس
 ”کارگر“ نہیں بلکہ ”جادوگر“ ہے۔“ میں نے ایک ایک لفظ
 پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”یہ جادو کی چھری گھما کر اپنی کسڈی

آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہاں کے ماحول سے بھی
 کچھ ایسا ہی ”اینٹین شین“ تاثر مل رہا ہے۔“
 ”تم غلطی پر نہیں ہو۔“ وہ زیر لب مسکراتے ہوئے
 بولا۔ ”تم بالکل درست انداز میں سوچ رہے ہو۔“
 ”تو کیا تمہارا تعلق کسی فورس سے بھی ہے؟“
 ”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔

”پھر یہ تمہارے کزن کے تعلقات کا کرشمہ ہے!“
 میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

علی الصباح یہ بات میرے علم میں آچکی تھی کہ عظیم کا
 کزن ارباب محکمہ پولیس میں انسپکٹر تھا۔ میری ارباب سے
 ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ ارباب ایک دیگ پولیس آفیسر تھا
 اسی لیے میں نے اس کا تذکرہ کیا تھا لیکن عظیم نے ایک بار
 پھر نفی میں گردن ہلا دی اور بولا۔

”نہیں یار! ارباب کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔“
 ”پھر.....؟“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔
 اسی وقت ویڈیو میو لے کر آگیا۔ ”عظیم نے کہا۔“ پہلے
 آرڈر دے دیں پھر اس ٹاپک پر بات کرتے ہیں۔ بتاؤ،
 کیا کھاؤ گے؟“

”کوئی ویسی ڈش منگواؤ۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن
 زیادہ آٹلی اور اسپاٹسی نہ ہو۔“

”ویسی ڈش تھوڑی بہت آٹلی اور اسپاٹسی تو ہوگی
 یار۔“ عظیم نے میو پر نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ ”لیکن
 پریشانی والی کوئی بات نہیں۔ اگر کوئی مسئلہ پیدا ہو گیا تو
 ڈیزرٹ سے کنٹرول کر لیں گے۔“

”ویشن گنڈ!“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔
 عظیم نے ویڈیو کو آرڈر نوٹ کر داتے ہوئے کہا۔

”ایک چکن بریانی، ایک مشن تورمر، ایک ماش کی وال.....“
 ”سر! ان یا چپاتی؟“ ویڈیو نے پوچھا۔

”چپاتی.....!“ عظیم نے جواب دیا۔
 ویڈیو نے استفسار کیا۔ ”میٹھے میں کیا لیں گے سر؟“

”اس وقت میٹھے میں سے کیا کیا؟“
 ”سر! کسٹرڈے، لب شیریں ہے اور قلعی تو ہمیشہ ہوتی ہی

ہے۔“ ویڈیو نے ڈیزرٹ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے بتایا۔
 ”ٹھیک ہے، آپ کھانا سر دکر دو۔“ عظیم نے فیصلہ

کن لہجے میں کہا۔ ”میٹھے کا بعد میں بتائیں گے۔“
 ”اوکے سر!“ ویڈیو نے عظیم سے گردن جھکائی اور

واپس چلا گیا۔
 میں نے عظیم سے پوچھا۔ ”مقصود کی کوئی خبر ہے؟“

میں آئے ہوئے بندے کی زبان سے ان جرائم کا بھی اقبال کروا لیتے ہیں جو اس نے بھی خواب و خیال میں بھی نہیں کیے ہوتے۔“

”ہااا.....“ عظیم نے دھیمے سروں کا ایک قہقہہ لگایا۔
”میں تمہاری معلومات کو بیچ نہیں کروں گا۔ یہ ”صلاحیت“ بہر حال ہماری پولیس کے اندر پائی جاتی ہے لیکن جس طرح ایک ہاتھ کی پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں، بالکل اسی طرح تمام پولیس والے بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں، میں ارباب کی مثال دوں گا۔ اس لیے نہیں کہ وہ میرا کزن ہے۔ اگر وہ میرا رشتے دار نہیں بھی ہوتا تو میں اس کے بے دارغ کردار کو سیلوٹ کرتا ہوں۔“

”اگرچہ تمہارے کزن سے میری نہایت ہی مختصر سی ملاقات ہوئی ہے۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے کہ وہ بڑا جنگ اور اصول پرست پولیس آفیسر ہے۔“

ہمارے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری تھا کہ وینر نے آرڈر لیں کر دیا پھر وہ عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”سوری سر! میں بھول گیا تھا۔ بیٹھے میں لب شیریں ریڈی ٹی نہیں ہے۔ اس کی جگہ خوبانی کا میٹھا موجود ہے۔“

”او کے!“ عظیم نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”کھانا اینڈ ہو جائے توفیقی اور خوبانی کا میٹھا لا دینا۔“

امریکا میں انڈین ہوٹلز میں ایسے کھانے آسانی سے مل جاتے ہیں جو انڈیا اور پاکستان میں کھائے جاتے ہیں۔ میں نے ان کھانوں میں سے بعض ڈشز کھائی ہوئی تھیں لیکن ظاہر ہے کہ ایسی دیکڑی ڈشز میرے روزمرہ کے کھانوں میں شامل نہیں رہی تھیں۔

ماش کی وال اور مٹن قورمہ اگرچہ تھوڑے اسپانسی تھے لیکن یہ دونوں ڈشز بہت میٹھی تھیں۔ بریانی لینے وقت میں نے اپنے لیے کم سالے والے حصے میں سے چاول نکالے تھے۔ چکن بریانی کا ذائقہ بھی لا جواب تھا۔ میں نے ہاتھ روکے بغیر خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس دوران میں ہماری گپ شپ بھی چلتی رہی۔

عظیم نے بتایا۔ ”کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک ابن جی او کے لیے بہت کام کیا تھا۔ اس آرگنائزیشن کے اعلیٰ عہدے داروں میں فورس کے ایک ریٹائرڈ کرنل بھی شامل تھے۔ کرنل خان کے ساتھ میری بڑی گہری دوستی ہو گئی تھی اور ہماری اکثر ملاقاتیں اسی میس میں ہوا کرتی تھیں۔ یہاں

کے اسٹاف کو معلوم ہے کہ میں خان صاحب کا دوست ہوں لہذا یہ لوگ میرا ریکارڈ کرتے ہیں۔ اگر میں خان صاحب کے بغیر بھی یہاں آ جاؤں تو مجھے ڈانٹک میں بھی کوئی دقت نہیں ہوئی.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے لمبے بھر کو ہاتھ پھراہتی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”میں سولیٹن ہوں۔ اصولی طور پر میں اس میس کی سہولیات کو انجوائے کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ یہاں کے اسٹاف کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ گیٹ پر ہی مجھے روک کر ”سوری“ کہہ سکتے ہیں کہ آپ فورس کے کسی آدمی کے ساتھ نہیں ہیں لہذا ہم آپ کو میس کے اندر داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ ان لوگوں کی مہربانی ہے کہ مجھے خان صاحب کا خاص دوست اور مہمان خیال کرتے ہوئے میرے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے ہیں۔ بس یار! اللہ کا بڑا کرم ہے۔ دوستوں کی دعاؤں سے اللہ نے بڑی عزت دے رکھی ہے۔“

عظیم سے پہلی ملاقات کے وقت ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک یار باش آدمی ہے۔ پھر ہوش چلتی کرنا مشا کرنے کے دوران میں میرے اس اندازے کو تقویت پہنچی تھی اور اب اس کے ٹھاث باٹ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں جس مشن کے لیے کراچی آیا تھا اس سلسلے میں عظیم میرے لیے بہت معاون اور مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔

”یار عظیم! ایک کام یاد رکھنا۔“ میں نے خوبانی کے بیٹھے پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”وہ قفنی کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے بولا۔ ”کون سا کام علی؟“

”مجھے ایک صفحے کی زبرد کس کروانا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”مجھے یاد ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”یہاں سے انھیں گے تو پہلے فوٹو کاپی کرائیں گے، اس کے بعد کہیں اور کارخ کریں گے۔“

”او کے۔“ میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلا دی۔

اس نے کہا۔ ”یار! میں تمہیں ”اسد“ کہہ کر مخاطب کروں گا۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں کیونکہ میرا اصل نام اسد ہی تو ہے..... اسد علی!“ میں نے تائیدی انداز میں کھم کھم پوچھا۔

”تمہارے اس فیصلے کا کوئی خاص سبب ہے؟“

”میرے چھوٹے بھائی کا نام علی احمد پور ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”ہم سب اسے ”علی“ کہہ کر بلااتے ہیں۔ اس کا یہی نام ہم سب کی زبانوں پر چڑھا ہوا

جہانگیر بکس



نسیم مجازی کے شاہکار تاریخی ناول

450/- انسان اور یوتا

یہ نئی سارون کے قلم پر برصغیر میں پہلی داستان ہے جس نے اچھوتوں کو اپنی اصلیت پر مجبور کیا

300/- پاکستان سے دیوار ترک

نارنگی پریس، محترمیں گلہبانے والا ایک دلچسپ ستر ستر جاز

450/- آخری چٹان

سیہ خوار زم جلال الدین خوارزمی کی داستان شجاعت جو تاروں کے سلسلہ رواں کے لیے ایک چٹان ثابت ہوا

225/- سوسال بعد

گاندھی جی کی اہمیت، اچھوتوں اور مسلمانوں کے خلاف سامراجی مقاصد کی سرچھی تصویر

325/- سفید جزیرہ

بزرگ کمال کے کسی نامعلوم جزیرے کی داستان

475/- شاہین

اُنڈس میں مسلمانوں کے شہید ہزار کی کہانی

475/- معظّم علی

لاہور کلاسیک اسلام آباد، یہ چتر کی خدائی، بھال کی آزادی حریت کے ایک شاہکار معظّم علی کی داستان شجاعت

550/- خاک اور خون

سکس، خوجی انسانیت، قیامت خیز مناظر، تقسیم برصغیر کے پس منظر میں داستان خوشحال

450/- کلیسا اور آگ

فروری پینڈی، مسلمان سپہ سالار کی خدائی، سقوط، غرور اور اندلس میں مسلمانوں کی گھٹ کی داستان

599/- قافلہ جاز

راہق کے مسافروں کی ایک سب سے مثال داستان

425/- محمد بن قاسم

عالم اسلام کے 17 سالہ ہرولہ تاریخی داستان، جس کے منظر اور حاکم کی داستان برصغیر میں اُنڈس کے منظر اور حاکم کی داستان برصغیر میں اُنڈس کے منظر اور حاکم کی داستان

300/- پورس کے تھپی

1965ء کی جنگ کے پس منظر میں نئی اور مہمیں کے سامراجی حاکم کی گھٹ کی داستان، جنہیں جہاز پر منڈی کہانی پڑی

550/- اور تلوار ٹوٹ گئی

شیر پور، شیخ سلطان حمید کی داستان شجاعت، جس نے محمد بن قاسم کی غیرت، محمود غزنوی کے چاہو جلال اور احمد شاہ ابدالی کے عزم و استقلال کی یاد تازہ کر دی

500/- گمشدہ قافلے

بھری کی اسلام آباد، پینڈی کی عید کی دیکھائی اور سکسوں کی مصوم بچوں اور محروم محروم کو خون میں بہا ہونے کی تازہ خبر جی داستان

300/- داستان مجاہد

جنگ دہلی کے بعد راجہ دہرے راجوں مہاراجوں کی رو سے دو سو تھپوں کے علاوہ 50 ہزار سوار اور بیادوں کی تیغ و تلوار، بھلی، قلعہ منڈی کی حرکت لارا داستان

450/- پرویکی درخت

اسلام آباد، پینڈی، سکسوں اور سکسوں کے گھڑوں کی کہانی جنہوں نے مسلمانوں کو نشانہ بنانے کے لیے تمام علاقائی حدود کو پال کرنے سے بھی گریز کیا

500/- یوسف بن تاشین

اندلس کے مسلمانوں کی آزادی کے لیے اکادمی و مصاب کی تاریک راتوں میں امید کی قندیں بند کرنے والے گم نامہ سپاہی کی داستان

550/- آخری معرکہ

جب مسلمانوں کے بڑے بہادر کوڑے کی بادی آنی تو بہادر راجہ اور چھاتی سلطان کے قدوس میں گرنے کو کہام اس کے دوران کے سردار سوہنے کیلئے تاریخیں۔ سلطان کا چروٹے سے تھکا ہوا اس نے جواب دیا میں بہت فروش نہیں، میں کلاں چاہتا ہوں، میں چاہی کی ایک کھلا گھر

اندھیری رات کے مسافر

اُنڈس میں مسلمانوں کی آخری سلطنت غرور و تلوار کی داستان کے گھڑوں کی داستان، محروم اور محروم کی داستان

475/-

ورسائی کی اہم داستان

300/- ثقافت کی تلاش

نامہ نگار ثقافت کا چھان کرنے والوں پر ایک تحریر، جنہوں نے ملک کی اخلاقی و روحانی قدوس کو لکھیں

625/- قیصر و سرکری

ظہور اسلام سے قبل عرب و عجم کے تاریخی، سیاسی، اخلاقی تہذیبی اور مذہبی حالات زندگی اور فرزند نام اسلام کے ابتدائی نقوش کی داستان

سبق آموز کتب سلسلہ

دورنگی طباعت اور تصویری خاکوں سے مزین



165/- اقوال حضرت علی المرتضیٰ

165/- اقوال آئمہ کرامؑ

195/- حکایات گلستان سعدیؒ

140/- اقوال شمسعدیؒ

180/- حکایات رومیؒ

170/- دلچسپ و عجیب حقائق

199/- حکایات بوستان سعدیؒ

150/- دلچسپ و حیرت انگیز باتیں

180/- ایمان افروز و سبق آموز سچے واقعات

165/- بڑے لوگوں کے روشن واقعات



جہانگیر
اردولفت
(جامع ترین)

مفتی صاحبزادے مفتی محمد رفیع کے ساتھ اردولفت کا پہلا نمونہ

042-35757086 022-2780128
021-32765086 051-5539609 042-37220879

جہانگیر بک ڈپو

ہے۔ جب تم اور علی ایک ہی جگہ پر موجود ہو گے تو پھر بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ ہمارے علی پکارنے پر تم دونوں متوجہ ہو جاؤ گے۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”بہت اچھی طرح سمجھ رہا ہوں برو۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”امریکا میں سب مجھے شارٹ شیٹ ”علی“ سے مخاطب کرتے ہیں۔ یہاں پاکستان میں اگر میں ”اسد“ کے نام سے پکارا جاؤں گا تو یہ بہت ہی اچھی بات ہے۔“

کھانے کے اختتام پر جوبل آیا، اس نے مجھے حیران کر دیا۔ میں نے عظیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یار اداؤ ادا دیوں نے پیٹ بھر کر اتنا عمدہ کھانا کھایا ہے اور وہ بھی اتنے کم پیسوں میں۔ کیا پاکستان میں کھانا اتنا ہی سستا ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں اسد!“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”یہاں پر فورس سے متعلقہ افراد کو انتہائی کم نرخ پر بہت عمدہ کھانا مہیا کیا جاتا ہے ورنہ دوسرے اسٹار ہوٹلز میں بیٹھ کر کھاؤ گے تو لگ پتا جائے گا۔“

”فورس والوں کے تو ہر جگہ خرے ہیں بھی۔“ میں نے کہا۔ ”امریکا میں بھی انہیں زندگی کے ہر شعبے میں خصوصی رعایت دی جاتی ہے۔“

”لیکن ہمارے یہاں تو نہ صرف ان کے بلکہ ان کے عزیز و اقارب کے بھی بڑے خرے ہیں۔“ وہ معتدل انداز میں بولا۔ ”میرا ایک دوست ہے فرخ..... اس کی کہانی سنو گے تو اشک کر اٹھو گے۔“

”میں تمہارے دوست کی کہانی ضرور سنوں گا۔“ میں نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کہانی میں تمہیں گاڑی میں بیٹھ کر سناؤں گا۔“ عظیم نے کہا۔ ”اب ہم یہاں سے انھیں گے اور سی سائڈ کا رخ کریں گے..... اوکے!“

میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلادی۔ ہم ایک مرتبہ پھر عظیم کی وڈ میں آ بیٹھے اور ساحل سمندر کی طرف ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ میں نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

”عظیم اپنی سی ٹکٹ کے بعد سے لے کر اب تک میں نے جتنا کراچی دیکھا ہے، اس سے تو کہیں بھی یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ پاکستان ایک غریب ملک ہے جبکہ پوری دنیا میں اس کی غربت کا ڈھنڈو اڑا پڑا جاتا ہے اور ورلڈ بینک کے علاوہ اور بھی بہت سے بینک ہر سال اس ملک کی مالی امداد کی مدد میں

اسے بھاری قرضے دیتے رہتے ہیں۔ یہ کیا معما ہے؟“ ”اس مجھے کو حل کرنے کے لیے تمہارے لیے چند حقائق سے آگاہ ہونا بہت ضروری ہے۔“ عظیم نے میریٹ ہوٹل کے سامنے سے گاڑی گزارتے ہوئے کہا۔

”میں پوری توجہ سے سن رہا ہوں۔“ میں نے ہمدردی کا گوشہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”بتاؤ، وہ حقائق کون کون سے ہیں؟“

”اول یہ کہ کراچی ایک کاسمپلوشن شہر ہے۔ اس کی آبادی دو کروڑ یعنی بیس ملین سے زیادہ ہے اور اسے پاکستان کا سب سے زیادہ مصروف اور تیز رفتار شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”دوم، تم اس وقت شہر کے جس حصے میں سفر کر رہے ہو، وہ کراچی کا سب سے زیادہ پوش اور صاف ستر علاقہ ہے۔ اکثر فائیو اسٹار ہوٹلز، شاپنگ مالز اور مختلف ملکوں کے سفارتخانے اسی ایریا میں واقع ہیں۔ تمہارے امریکا کی ایسی ہی پہلے اسی میریٹ ہوٹل کی بغل میں ہوا کرتی تھی۔ اب وہ شہر سے باہر مانی کولاجی کے ایریا میں چلی گئی۔ بعض ناخوشگوار دہشت گردی کے واقعات کے سبب امریکا بھادر کو اپنی ایسی ہی یہاں سے کہیں اور شفٹ کرنا پڑی ہے۔ اس زمانے میں یہ میریٹ ہوٹل بھی ہالینڈ سے ان ہوا کرتا تھا.....“ لکھائی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”لہذا کراچی کے اس صاف سترے پوش علاقے کو پورے پاکستان کا پرمونیشن سمجھنا چاہیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ لاہور اور اسلام آباد میں اس سے بھی زیادہ نیٹ اور کلین علاقے موجود ہیں لیکن یہ پورے ملک کی تفسیر نہیں ہو سکتی۔“

”آپ صحیح کہہ رہے ہو برو۔“ میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ایسا تو واقعتاً کسی بھی ملک میں نہیں ہوتا کہ وہاں ہر علاقہ ایک جیسا پوش اور صاف ستر ہو۔ تم صرف نیو یارک ہی کو لے لو۔ وہاں ڈاؤن ٹاؤن

مین ہینٹن اور مڈ ٹاؤن مین ہینٹن کا جو حال ہے، وہ اپ ٹاؤن مین ہینٹن میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ڈاؤن ٹاؤن مین ہینٹن بزنس سینٹر ہے اور مڈ ٹاؤن مین ہینٹن کو میڈیا اور شوبز سینٹر سمجھ لو۔ مین ہینٹن کے یہ دونوں حصے پوش اور صاف سترے ہیں

جبکہ اپ ٹاؤن کا حال اس سے کافی مختلف ہے۔ اب ٹاؤن مین ہینٹن میں ہارلم اور ارد گرد کے سیاہ فام کے بعض ایسے علاقے بھی ہیں جو گندگی اور غلاعت کے عالمی مقابلے میں پہلا اور دوسرا انعام حاصل کرتے نظر آتے ہیں۔“

”اور جہاں تک ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دیگر

ریٹورٹس اور کھانے پینے کے اسپاٹس کے علاوہ نوڈ اسٹریٹس کی بھی کمی نہیں ہے۔ جیسے حسین آباد، بلس روڈ، بوٹ بیٹن اور سی وی کی نوڈ اسٹریٹ وغیرہ۔

”جہاں تک مہمان نوازی کی بات ہے تو وہ مجھے تمہارے رویتے ہی سے اندازہ ہو گیا ہے۔“ میں نے صدق دل سے کہا۔ ”امریکا میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ مہمانوں کو یوں اپنے ساتھ لیے گھومتا رہے۔“

”مجھے امریکا کی زندگی کا تجربہ ہو چکا ہے۔“ وہ گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک ماہ ایل اے (لاس اینجلس) میں گزار کر آیا ہوں۔ میں جن لوگوں کے گھر میں ٹھہرا ہوا تھا وہ دونوں میاں بیوی جاب والے تھے۔ صبح کے گھر سے نکلے رات گئے ہی لوٹتے تھے۔ اس ایک ماہ میں ان کے ساتھ میں ایک آدھ بار ہی کہیں گھومنے نکلا ہوں گا اور وہ بھی گھر دوسری وغیرہ لینے دینے میں دن بھر گھر میں پڑا تو سوتا رہتا تھا یا بیوی دیکھتا تھا اور یا پھر شام میں کسی پارک میں جا بیٹھتا تھا جہاں نوجوان نسل کے بڑے رنگین اور سنگین نظارے دیکھنے کو ملتے تھے۔ ہمارے پھر کے لحاظ سے تو وہ کھلی بے حیائی ہے۔“

”ہر پھر کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے عظیم الشان صاحب!“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم جسے کھلی بے حیائی کہہ رہے ہو، وہ وہاں کے ماحول کے لحاظ سے یوں ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو لیکن بات اپنی اپنی برداشت کی بھی ہے۔“ وہ بخند لہجے میں بولا۔ ”جب سے ہماری ٹیلی کے افراد کا امریکا کا پانچ سال کا ٹیلی مل وڈٹ ویزا لگا ہے، مہرالنسا کی ایک بی رٹ ہے کہ ہمیں کسی طرح بھی کوشش کر کے مستقل طور پر امریکا میں سیٹل ہو جانا چاہیے لیکن میں وہاں یک جزیشن کی آزادی اور بے راہ روی کا جو حال دیکھ کر آیا ہوں، اس کی روشنی میں تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کے ساتھ وہاں مستقل رہائش اختیار کرنا تو میری برداشت سے باہر ہے اسی لیے.....“ وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

”اسی لیے میں نے مہرالنسا کو امریکا کا وڈٹ کرنے بھیجا ہے تاکہ وہ اپنی آنکھوں سے وہاں کے بچوں کی آزادی کا حال دیکھ لے۔ اس کے بعد وہ فیصلہ کرنے کی بہتر پوزیشن میں ہوں گی کہ ہمیں امریکا میں سیٹل ہونا چاہیے یا دور کے ڈھول سہانے.....!“

”تم نے بہت عقل مندی کا فیصلہ کیا ہے عظیم۔“ میں

ہینکوں سے قرضے لینے کا معاملہ ہے نا.....“ وہ میری سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی ہی دھن میں بولتا چلا گیا۔ ”اگر تم یہ سوچ رہے ہو تو سنگین غلطی کر رہے ہو کہ وہ ملین ڈالرز یا ان کا کچھ حصہ پاکستان کے غریبوں تک بھی پہنچتا ہوگا یا ان کی فلاح و بہبود پر خرچ ہوتا ہوگا۔“

میں پوچھتے ہانا نہ رسکا۔ ”تو پھر وہ ملین اور بلین ڈالرز کہاں چلے جاتے ہیں؟“

”چند مخصوص اداروں سے گزر کر چند مخصوص افراد کے پیٹ میں۔“ وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ”یہ بہت ہی اذیت ناک موضوع ہے۔ اس پر بھی کبھی بات کریں گے۔ ابھی موڈ کو خوشگوار رکھنا ضروری ہے کہ ہم سیر و تفریح پر نکلے ہوئے ہیں۔“

”اوکے..... رائٹ یو آر۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”اسد! کراچی کے جس حصے کو دیکھ کر تمہیں پاکستان کے ایک غریب ملکہ ہونے پر رشہ ہوا ہے، ایسی زندگی اس ملک کے زیادہ سے زیادہ پانچ فیصد افراد کو میسر ہے۔ باقی پچانوے فیصد میں سے پچاس فیصد بے چارے غریب غرباء ہیں اور باقی ماندہ پینتالیس فیصد افراد غربت کی کلیں سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔“

”سوسڈ!“ میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

”تم یہ کہہ سکتے ہو کہ پاکستان ایک امیر ملک ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”لیکن اس ملک کے عوام کی اکثریت غرباء پر مشتمل ہے۔“

”ونڈرفل.....“ میں بس اتنا ہی کہہ دیا۔

ہم ساحل سمندر پر پہنچ گئے۔ عظیم نے ساحل کے متوازی ڈرائیو کرتے ہوئے مجھے بتایا۔

”یہ سی وی کا علاقہ ہے۔ آگے ہم دو دریا کی طرف جا رہے ہیں۔ ادھر بہت سے ریٹورٹس بنے ہوئے ہیں۔ تم اسے نوڈ اسٹریٹ بلکہ سمندر کی مناسبت سے ”نوڈ کوسٹ“ بھی کہہ سکتے ہو لیکن اس ایریا میں اصل رونق رات ہی کو ہوتی ہے۔“

”اس سے تو بیسی ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانی لوگ کھانے پینے کے بہت شوقین ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”کھانے کے ہی نہیں، کھلانے کے بھی۔“ وہ فخریہ لہجے میں بولا۔ ”پاکستان کے ہر حصے کے لوگ بہت مہمان نواز ہوتے ہیں اور کراچی والے تو حد سے زیادہ چٹورے ہیں۔ یہ لوگ گھر سے باہر کھانے پینے کو ایک فن سمجھتے ہیں اسی لیے یہاں ریٹورٹس کا بزنس بہت منافع بخش ہے۔ بے شمار

نے سراہنے والی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”انسان جب تک خود کی تجربے سے گز نہ کرے، دوسروں کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔“

ہماری گفتگو جاری رہی اور سمندر کی سیر کرتے ہوئے ہم دودریا کے علاقے سے واپس آ گئے۔ عظیم نے ڈولمن سٹی کی پارکنگ میں گاڑی لگاتے ہوئے کہا۔

”اوپر ہا ہیر اسٹار میں ایک بہت اچھی کافی شاپ ہے۔ وہاں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔ اس کے بعد میں تمہیں اپنے گھر لے کر چلوں گا۔“

”اپنے گھر کیوں؟“ میں نے گاڑی سے نکلے ہوئے پوچھا۔
 ”تاکہ تمہیں اپنے پاپا اور چھوٹے بھائی سے ملو اسکو۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو۔۔۔!“

بات کے اختتام پر اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا تو میں نے تیر باب مٹکراتے ہوئے جلدی سے کہا۔
 ”نہیں یار۔۔۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

ہم ڈولمن سٹی کے ہا ہیر اسٹار میں واقع ”گلوریا جینز“ نامی کافی شاپ میں جا بیٹھے۔ مذکورہ کافی شاپ کا ماحول بڑا رومانٹک اور خواب ناک تھا۔ تھوڑی دیر پہلے یہ خوب پیٹ بھر کے کھانا کھا چکے تھے لہذا صرف کپی چینو کافی کا آرڈر دیا گیا۔

گلوریا جینز کی کافی عمدہ بلکہ لاجواب تھی۔ میں نے کہا۔ ”عظیم! تم مجھے اپنے فرخ نامی کسی دوست کی کہانی سنانے والے تھے!“

”ہاں یار۔۔۔ فرخ پیٹے کے اعتبار سے تو ایک عام سا جرنلسٹ ہے لیکن اس نے قسمت خوب پائی ہے۔“ عظیم کافی کامپ لیتے ہوئے بولا۔ ”حسن اتفاق کہہ لو یا اس کا نصیب کہ فرخ کی جس لڑکی سے شادی ہوئی، وہ ڈینٹس کے ایک کالج میں اسلامیات کی ٹیچر رہے۔ ڈینٹس سوسائٹی سے تعلق کی وجہ سے ان لوگوں کی رہائش بھی ڈی ایچ اے کے ایک اپارٹمنٹ میں ہے جو کہ کالج ہی کا مہیا کردہ ہے۔ پچھلے دنوں یعنی کچھ عرصہ پہلے پچھرا صاحبہ کو دو پلاٹ بھی الاٹ ہوئے تھے۔ اب ان پلاٹس کی مالیت کروڑوں میں ہے۔ مستقبل قریب میں فرخ کا منصوبہ دونوں پلاٹس کو فروخت کر کے دہلی میں الویسٹ منٹ کا ہے۔ ڈینٹس کے پاس ہونے کے ناتے مسز فرخ کے پاس ڈینٹس کرکٹ کلب کی ممبر شپ بھی ہے۔ اگر کوئی ڈینٹس والا نہ ہو تو اس ممبر شپ کے لیے لگ بھگ آدھا کروڑ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ ڈینٹس

کرکٹ کلب میں ایلٹ کلاس اور شہر کی کریم ہی دیکھنے کو ملے گی اور وہاں کا کھانا اپنے معیار اور ذائقے کے اعتبار سے شہر کے کسی بڑے سے بڑے ریستورانٹ میں بھی دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ میں نے فرخ کا ذکر کس ذیل میں کیا تھا۔۔۔؟“

”سروسز میں انتہائی کم مل پر جب میں نے حیرت کا اظہار کیا تھا تو تم نے کہا تھا، اس سلسلے میں تمہیں میں اپنے دوست فرخ کی کہانی سناؤں گا۔“

”ہاں یاد آ گیا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”فرخ اس لحاظ سے بھی خوش بخت ہے کہ اس کے چار بچے ہیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ دونوں بیٹے جڑواں اور دونوں بیٹیاں بھی جڑواں۔“

”فلٹنگ!“ میں نے کہا۔
 ”ڈینٹس کرکٹ کلب میں بھی ممبرز کو پرائس پر عمدہ کھانا فراہم کیا جاتا ہے۔“ عظیم نے بتایا۔ ”فرخ کے گھر میں رات کا کھانا نہیں جتا۔ مسز فرخ سر شام بچوں کو لے کر کلب پہنچ جاتی ہیں۔ بچے اپنے اپنے کھیل میں لگ جاتے ہیں اور مسز فرخ اپنی سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف ہو جاتی ہے۔ کلب کے اندر بچوں کے لیے تمام انڈور گیمز کا بندوبست ہے پھر یہ لوگ کلب میں ڈنر کرنے کے بعد ہی گھر واپس آتے ہیں۔ یہ ان کا روز کا معمول ہے کیونکہ کرکٹ کلب میں پانچ چار افراد کا ڈنر گھر میں پکانے کی نسبت کافی سستا پڑتا ہے اور وہ بھی فائبر اسٹار ہوٹل کے معیار کا۔“

”زبردست۔“ میں نے سراہنے والے انداز میں کہا۔ ”فرخ تو واقعی بہت لکی ہے۔“

ہم کافی شاپ سے نکلے تو عظیم کے دو دوست ہا ہیر اسٹار میں مل گئے۔ عظیم نے ان سے ٹیک وینڈ کرنے کے بعد کہا۔

”تم لوگ ادھر آئے ہوئے ہو۔“
 عظیم کے دونوں دوستوں سے میں نے بھی ہاتھ ملایا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام عدنان اور دوسرے کا نام عمران تھا۔ عدنان نے کہا۔

”ہم لوگ ادھر آئے ہوئے تو ہیں لیکن سمجھ نہیں آ رہا کہ واپس کیسے جائیں گے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ عظیم نے پوچھا۔
 ”یار! ہم جس کے ساتھ آئے تھے، وہ ایک لونڈیا کے ساتھ کہیں غائب ہو گیا ہے۔“ عدنان نے بتایا۔ ”ہمیں یہی کہا تھا کہ ابھی آتا ہوں اور ہم پچھلے ایک گھنٹے سے اس کے انتظار میں ادھر خوار ہو رہے ہیں۔“

سپینس ڈائجسٹ

”جو لوگ فرخ اور سلمان کی طرح گھر سے باہر، ایک سے بڑھ کر ایک ”کارنامے“ انجام دے رہے ہوتے ہیں، وہ گھر میں اپنی بیویوں کے سامنے بیٹگی ملی کیوں بن کر رہتے ہیں؟“ عظیم نے مجھ سے پوچھا۔ ”سلمان کی تو ابھی خیر سے شادی نہیں ہوئی لیکن میں فرخ کی گھریلو زندگی سے اچھی طرح واقف ہوں۔ مسز فرخ اسے ننھے بچوں کی طرح خوب ڈانٹ کر رکھتی ہے۔“

”انسان کو کسی ایک ہی جگہ کی بادشاہی مل سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے یہ دیکھا ہے کہ جو لوگ گھر میں اپنی بیویوں سے دب کر رہتے ہیں، گھر سے باہر ان کے بڑے ٹھاٹھ باٹھ ہوتے ہیں۔ انہیں شان و شوکت حاصل رہتی ہے لیکن جو لوگ زور و زبوتی سے اپنے بیوی بچوں کا جینا حرام کر کے رکھتے ہیں، انہیں ہر وقت اپنی رعب داب میں رکھ کر ان پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں، گھر سے باہر انہیں وہ اختیار اور اقتدار حاصل نہیں ہوتا۔ اس معاملے میں ایک اہم فیکٹر بچے بھی ہیں۔“ لچاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

”جب بچے پیدا ہو جاتے ہیں تو مرد کو گھر میں بہت سی چیزوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے کیونکہ عام طور پر بچوں کا دوٹ اپنی ماں کی طرف ہی ہوتا ہے لہذا بہت سارے معاملات میں شوہر کو بیوی کے سامنے ہتھیار پھینکنا پڑتے ہیں۔ شوہر شرابے اور بد مزگی سے بچنے کے لیے شوہر بیوی کی بہت سی زیادتیاں کو برداشت کر جاتا ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے، بچوں والی بیوی بھاری ہوتی ہے۔“

”یہ بات.....!“ عظیم نے پر جوش انداز میں کہا۔ ”اسد یار! تم نے بڑے پتے کی بات کی ہے۔ میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔“

”عظیم! لگتا ہے، اسد نے تمہارے ذاتی معاملات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔“ عدنان نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ ”تمہارے ساتھ بھی تو کچھ اسی قسم کی پتویشن ہے..... ہے نا؟“

”لیکن اسد نے تو کہا ہے کہ بچوں والی بیوی بھاری ہوتی ہے۔“ عمران نے تفرقہ لیتے ہوئے کہا۔ ”جبکہ عظیم کی بیوی تو دلی پتلی ہے!“

”تم دونوں کو بہت مذاق سوچ رہا ہے نا۔“ عظیم نے اپنے بے تکلف دوستوں کی بات کا برا منائے بغیر کہا۔ ”ابھی تم آزاد گھوم رہے ہو اس لیے دماغ میں بڑی سستی ہے۔ جب کسی کھونٹے سے بندھو گے تو پھر آئے دال کا بھاؤ پتا

”تم لوگ تھے کس کے ساتھ؟“ عظیم نے استفسار کیا۔

عمران نے بتایا: ”سلمان کے ساتھ۔“

”اوہ.....“ عظیم نے ایک گہری سانس خارج کی۔

”وہ تو بے ہی خوار لڑکیوں کے پیچھے.....“ پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اسد! میں نے تھوڑی دیر پہلے تمہیں فرخ کی کہانی سنا کی ہے نا، وہ اللہ کا بندہ ان کاموں کا بڑا ماہر ہے۔ یار دوست اسے گرد کہتے ہیں۔ لڑکی کو سیٹ کرنا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔“

”پھر تو میں تمہارے دوست سے ضرور ایک تفصیلی ملاقات کروں گا۔“ میں نے مذاق کے رنگ میں کہا۔ ”میں اس شے میں کافی نا لائق واقع ہوا ہوں۔ ہو سکتا ہے، فرخ کی صحبت میں کچھ وقت گزارنے سے کوئی فائدہ ہو جائے۔ دو چار گرتو وہ مجھے سکھائی دے گا۔“

”اب تم اتنے بھی ننھے بچے نہیں ہو اسد کہ تمہیں یہ کام سیکھنے کے لیے فرخ کی شاگردی اختیار کرنا پڑے۔“ وہ ہنسنے لگی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم جہاں سے آئے وہاں دس سال کی عمر میں ہی لڑکے اور لڑکیاں کو گرد کا اعزاز حاصل کر لیتے ہیں اور تم اسی آزاد ماحول میں پل بڑھ کر جوان ہوئے ہو۔ اپنی ہاؤ..... میں تمہیں فرخ سے ضرور ملواؤں گا۔“ پھر وہ اپنے دوستوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم فکر نہیں کرو۔ میں گھر جا رہا ہوں۔ تم میری گاڑی میں آ جاؤ۔ میں فیروز کی طرف سے نکل جاؤں گا اور تمہیں ڈیفنس مارکیٹ پر ڈراپ کر دوں گا۔“

عدنان اور عمران نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ہم بائیر اسٹار سے نکل کر عظیم کی گاڑی میں آ بیٹھے۔ عدنان نے کہا۔

”عظیم! تم خیابان اتحاد سے نکل کر مین کورنگی روڈ پر آؤ تو ہم سب کے لیے آسانی رہے گی۔ راستے میں ڈیفنس فیروز کی مارکیٹ پر ہمیں ڈراپ کر کے تم کو راقبرستان کے راستے اپنے گھر کی طرف نکل جانا۔“

”تم فکر نہیں کرو۔“ عظیم نے کہا۔ ”میرے ذہن میں بھی یہی روٹ ہے۔“

دہانت وڈ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی کی صاف ستھری سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ میں عظیم کی بغل میں پیچگریڈ پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ عدنان اور عمران عقبی نشست پر براجمان تھے اور اتفاق سے فرخ ہمارا موضوع گفتگو بنا ہوا تھا۔ عظیم نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

”اسد! تم سائیکلو پیڈ ہرہ رہے ہو۔ ایک بات مجھے سمجھاؤ۔“

”پوچھو برو.....!“

چل جائے گا۔ تمہاری بیویاں جو تے مار مار کر ساری مستی، پتا نہیں کہاں کہاں سے نکال دیں گی۔“
عدنان اور عمران، عظیم کے اس رد عمل پر بلند آہنگ تہقیر لگانے لگے۔

عظیم نے مجھ سے کہا۔ ”اسد! تمہارا تجزیہ بالکل درست ہے۔ بچوں والا باپ کئی ایک معاملات میں مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی بیوی سے ڈرنے لگتا ہے۔ وہ ڈرتا ہے، بچوں کی نفسیات سے اور لوگوں کے تبصروں سے۔ اس ذلیل میں سب سے زیادہ بے چارہ شوہر وہ ہوتا ہے جو جو اسٹنٹ فیملی میں رہ رہا ہو۔“
”اور ایسے مجبور ولا چار شوہر کو عظیم احمد پکڑ کتے ہیں۔“ عدنان نے چوٹ کی۔

عمران نے اس پر ایک رد اچڑھاتے ہوئے کہا۔
”اور ایسے شوہر پر اگر قلم بنائی جائے تو اس کا ناسٹل ہوگا۔“
جور کا غلام!“

میں ان تینوں کی باہمی نوک جھوک کو سمجھ رہا تھا۔ وہ بے تکلف دوست تھے اور بے تکلف دوستوں میں ایسی جملے بازی چلتی رہتی ہے۔ میں ان کی گفتگو کو انجائے کر رہا تھا۔ اس ”نیک کام“ میں، میں نے بھی اپنا حصہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”تاش کے چوں میں“ چیک آف اسپید“ یعنی حکم کا غلام تو سنا تھا لیکن ”جور کا غلام“ کبھی مرتبہ سننے میں آیا ہے۔
”برٹس..... یوٹو.....!“ عظیم نے شکایتی نظر سے میری طرف دیکھا۔

”نہیں عظیم.....“ میں نے جلدی سے اس کی غلط فہمی دور کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تو سمجھنے کے لیے کہا ہے۔“
”میں سمجھتا ہوں اسد۔“ عدنان نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”جور کا غلام اور حکم کا غلام ایک ہی بات ہے۔ جو روکتے ہیں، بیوی کو یعنی کہ وائف..... اور وائف جب حکم دیتی ہے اور شوہر اس کا حکم بجالاتا ہے تو وہ جور کا غلام کہلاتا ہے۔“

”اب سمجھا.....“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

”اسد کیا سمجھا اور کہا نہیں سمجھا، یہ میں بعد میں اسد سے خود پوچھ لوں گا۔“ عظیم نے عقبی نشست کا منظر دکھانے والے آئینے میں دیکھتے ہوئے قدرے ترش لہجے میں کہا۔ ”لیکن میں تم دونوں کا کمینہ پن پہ خوبی سمجھ رہا ہوں۔ مہمان کا خیال کرتے ہوئے میں تم دونوں کی

چھیڑ خانی کو برداشت کر رہا ہوں ورنہ کب کا تمہیں گاڑی سے باہر پھینک چکا ہوتا۔“

”وہ تو تمہیں پھینکو گے ہی۔“ عدنان نے کہا۔ ”مگر یہاں نہیں..... فیروڈا ولی مارکیٹ کے سامنے۔“
”بڑے کمینہ ہو تم لوگ۔“ عظیم کی ہنسی نکل گئی۔

”تمہارے ہی دوست ہیں عظیم۔“ عمران گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”وہ کیا کہتے ہیں کہ..... انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے..... جیسے تم، ویسے ہم..... اللہ اللہ خیر سلا!“

ہنسی مذاق کے اس سلسلے کو اس وقت بریک لگ گئے جب عظیم نے گاڑی کو خیابان اتحاد سے مین کو رنگی روڈ پر ڈالا۔ میں پہلی مرتبہ کراچی آیا تھا۔ یہاں کے گلی کوچوں سے میری شناسائی نہیں تھی لیکن میں ان تینوں کی باہمی گفتگو سے بہت پک کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں میں..... مسلسل گاڑی کے باہر بھی دیکھ رہا تھا لہذا سڑکوں کے نام سے کافی واقفیت حاصل ہوتی جا رہی تھی۔

گاڑی مین کو رنگی روڈ پر چڑھی تو آگے پولیس کا ٹانکا لگا ہوا تھا۔ وہ لوگ گاڑیوں کو روک کر چیک کر رہے تھے لیکن ہر گاڑی کو نہیں۔ جس گاڑی پر ان کا دل آ جاتا، وہ ہاتھ کے اشارے سے اسے سائڈ پر کر لیتے تھے۔

”ان لوگوں کو کبھی پتا چل گیا ہے کہ آج رمضان کا چاند نظر آ جائے گا۔“ عظیم نے کہا۔ ”اس لیے انہوں نے ایڈوائس ہی میں کمائی شروع کر دی ہے۔“

”کمائی شروع کر دی ہے۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ لوگ تو چینگ کر رہے ہیں۔ اس میں کمائی کا پہلو کہاں سے نکل آیا؟“

”بھولے بادشاہ! تمہیں یہاں کی پولیس کے کارناموں کا کچھ اندازہ نہیں ہے۔“ عدنان نے کہا۔ ”یہ جن لوگوں کو سائڈ میں کر رہے ہیں، ان سے کچھ نہ کچھ ضرور نکلوا دیں گے۔“

”یہ بھولا بادشاہ نہیں ہے عدنان۔“ عظیم نے عدنان کی تھج کرتے ہوئے کہا۔ ”ہماری پولیس کے بارے میں اسد کی معلومات بڑی گہری ہیں۔ اپنی ہاؤ، میں تو نکل رہا ہوں یار۔“

بات ختم کرتے ہی عظیم نے گاڑی کو ڈگ ڈیک کر کے ٹریفک کے ریوڈ میں سے آگے نکالا۔ اسی لمحے ایک بانیک والے کو پولیس والوں نے روکنے کی کوشش کی مگر وہ رکائیں اور بانیک کو بھگالے گیا۔ اس بانیک پر دو افراد سوار

واقعہ پیش آیا ہو۔ دہشت گردی کے کسی متوقع والے کو روکنے کے لیے بھی ایسی پابندی لگادی جاتی ہے۔“

”کافی الجھی ہوئی صورت حال ہے۔“ میں نے کہا۔

”کچھ دن اس شہر میں رہو گے تو سب کچھ سمجھ میں آجائے گا۔“ عمران نے کہا۔

عدنان بولا۔ ”بائیک پر ڈبل سواری کی پابندی سے جرائم کی شرح میں کمی واقع ہو یا نہ ہو لیکن چیکنگ کے بہانے پولیس والوں کی چاندی ضرور ہو جاتی ہے۔ یہ ہر آئے جانے والے کو روک کر اپنی جیبیں گرم کرتے رہتے ہیں۔“

”یہ تو کھلی لاقانونیت ہے۔“ میں نے برا سامنے بناتے ہوئے کہا۔ ”قانون کے رکھوالوں کو تو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سن کر مجھے سخت افسوس ہوا کہ شہریوں کی زندگی کو تحفظ دینے کے بجائے پولیس الٹا انہیں لوٹنے پر کمر بستہ ہے۔“

”بات تو افسوس کی ہے مگر یہی یہاں کی سچائی ہے۔“

عظیم نے سرسری انداز میں کہا۔

”عظیم! افسوس کرنے اور سچائی بیان کرنے کے اور بہت سے مواقع آئیں گے۔“ عدنان نے فکرمندی سے کہا۔ ”فی الحال پولیس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو۔ آگے سنل بھی مجھے بند نظر آ رہا ہے۔ وہ ہمیں قح کر نکلے نہیں دیں گے۔“

”سنل بند نظر آ رہا ہے تو کیا ہوا۔“ عظیم بے پروائی سے بولا۔ ”کیا ہماری گاڑی کے لیے کراچی میں صرف ایک یہی سڑک رہ گئی ہے۔ میں ڈیفنس موڑ سے ٹریک بدل رہا ہوں۔“

”عظیم!“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”میرا خیال ہے، جمہیں گاڑی روک کر حالات کا سامنا کرنا چاہیے۔ فرار اور وہ بھی مجرمانہ فرار اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ جب تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو پھر ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”عظیم تو اب رکنے والا نہیں برو۔“ وہ اٹل لہجے میں بولا۔ ”جب اوکھلی میں سر دے دیا تو پھر مولوں سے کیا ڈرنا۔ میں ان سے ہار نہیں مانوں گا۔ تم دیکھنا، میں انہیں کیسے ڈانچ دیتا ہوں۔“

بات ختم کرتے ہی اس نے ویز کو لیفٹ سائڈ پر موڑ لیا کیونکہ اس وقت تک ہماری گاڑی سنل پر پہنچ چکی تھی۔ سنل چوکنک بند تھا، اسے تو زکراً گئے نہیں بڑھا جاسکتا تھا لہذا بچت کا یہی ایک راستہ تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ عظیم نے ڈیفنس موڑ سے گاڑی کو لیفٹ

تھے۔ عظیم نے بھی بائیک والے کی دیکھا دیکھی اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔

گاڑی پولیس والوں کے پاس سے گزری تو انہوں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا مگر عظیم نے گاڑی روکی نہیں بلکہ گاڑی کی اسپنڈ کو اور بڑھا دیا۔ اگلے ہی لمحے فضا فائرنگ کی آواز سے گونج اٹھی۔

”ابے انہوں نے ہماری گاڑی پر فائرنگ کی ہے۔“

عدنان نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ ”گاڑی روک لو عظیم ورنہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔“

”مسئلہ کھڑا ہو یا بیخار ہے، مجھے پروا نہیں ہے۔“

عظیم نے گاڑی کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اب تو میں نکل آیا جیسے بائیک والا نکل گیا تھا۔“

”بائیک والا اس لیے نکل گیا تھا کہ وہ ڈبل سواری جارہے تھے۔“ عدنان نے کہا۔ ”اگر وہ بائیک کو روک لیتے تو ہزار پانچ سو روپے دے کر ہی ان کی جان چھوٹی مگر ہم تو کسی قانون شکنی کے مرتکب نہیں ہو رہے تھے۔ اگر تم گاڑی روک لیتے تو اچھا تھا۔ اگر انہوں نے ہمارا تعاقب کیا تو ہم مشکل میں پھنس جائیں گے۔“

”ہم مشکل میں پھنس جائیں گے نہیں بلکہ مشکل میں پھنس چکے ہیں۔“ عمران نے اپنے عقب میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”نوٹس کی ایک موبائل ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔“

عظیم نے بیک ویو مرر میں دیکھا تو اس بات کی تصدیق ہوئی کہ ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ ان کی باتیں کچھ گہری سمجھ میں آ رہی تھیں اور کچھ کچھ اوپر سے گزر رہی تھیں۔ میں نے ابھرن زدہ لہجے میں استفسار کیا۔

”کیا پاکستان میں بائیک پر ڈبل سواری قانوناً منع ہے؟“

”یہ پاکستان کا نہیں، صرف کراچی کا مسئلہ ہے۔“

عظیم نے بتایا۔ ”اگر ملی بھی کہیں پیٹاب کر دیتی ہے تو موٹر سائیکل کی ڈبل سواری پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ میری انجمن میں اضافہ ہو گیا۔

”ارے یار! یہ سب اپنی شنسی دہشت گردی کی ایک کے تحت دکھائی جاتی ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

”شہر میں کہیں کوئی دہشت گردی کا واقعہ پیش آ جاتا ہے تو فوری طور پر موٹر سائیکل کی ڈبل سواری پر پابندی لگادی جاتی ہے۔ تصور یہ ہے کہ دہشت گرد موٹر سائیکل پر سوار ہو کر مجرمانہ کارروائیاں کرتے ہیں۔“

عدنان نے کہا۔ ”ایسی پابندی عائد کرنے کے لیے یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ کہیں لازمی دہشت گردی کا کوئی

ٹرن کیا تھا کیونکہ چند لمحے پہلے وہ اس ارادے کا اظہار کر چکا تھا۔

”مذشائٹ۔“ عدنان نے ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”عظیم پولیس والوں کی موبائل سنٹرل پر پھس کر رہ گئی ہے۔ شاید وہ یہی سوچ رہے تھے کہ ہم مین کورنگی روڈ پر سیدھے آگے بڑھیں گے۔ اس لیے وہ دھوکا کھا گئے۔“

عظیم نے عدنان کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے مجھ سے پوچھا۔ ”اسد! کیا تمہیں کسی قسم کا ڈر محسوس ہو رہا ہے؟“

”جی بات تو یہ ہے کہ مجھے کوئی ڈر محسوس نہیں ہو رہا۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔“

”اگر تم کہو تو میں گاڑی روک دیتا ہوں۔“ وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

”عظیم! اس مختصر عرصے میں تمہیں.... جتنا سمجھ پایا ہوں اس کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ تم رکو گے نہیں۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تم بہت نڈر ہو۔“

”اس کا مطلب ہے، تم مجھے اچھی طرح سمجھ گئے ہو۔“ وہ ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں زندگی میں رسک لینے سے کبھی ہچکچاتا نہیں ہوں۔“

”بے شک! زندگی اور موت پر مالک کو ہی اختیار حاصل ہے لیکن انسان کو جانتے ہو جیسے کوئی خواخواہ کارسک نہیں لینا چاہیے۔“ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ”اپنی ہاؤ، میں بہادر لوگوں کو پسند کرتا ہوں اور تم ایک جی دار انسان ہو۔“

”تھینکس برو.....“ وہ منونیت بھرے لہجے میں بولا۔

اگلے ہی لمحے اس کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس وقت ہم ڈیفنس لائبریری کے پاس سے گزر رہے تھے۔ عظیم کی نظر وینڈ اسکرین کے اس پار سڑک پر لگی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا تو اس کے چہرے کے اچانک بدلتے ہوئے تاثرات کا سبب مجھے دکھائی دے گیا۔ سامنے سے ایک پولیس موبائل بڑی تیزی سے ہماری طرف آ رہی تھی۔

عظیم ایک لمحے کے لیے پریشان ضرور ہوا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بڑے اطمینان کے ساتھ وٹو کو لیفٹ سائڈ کی ایک اسٹریٹ پر موڑ لیا۔

”ارے..... یہ کیا کر رہے ہو؟“ عمران چلتا ہوا۔ عدنان نے ابھمن زدہ لہجے میں کہا۔ ”عظیم! تم نے گاڑی لیفٹ سائڈ پر کیوں موڑ دی؟ ہمیں گھر جانا ہے جو رائٹ سائڈ پر ہے۔“

”کیا تم ہمیں ٹار شہید پارک کی سیر کرانے لے جا رہے ہو؟“ عمران نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ میں چونکہ پولیس موبائل کو دیکھ چکا تھا اس لیے عظیم کی حکمت کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے گاڑی کو ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری اسٹریٹ میں گھماتے ہوئے اپنے دوستوں کے سوالات کے جواب میں کہا۔

”اے اوگڈھے کے بچو! تمہیں گھر جانے اور ٹار شہید پارک کی سیر کرنے کی سوجھ رہی ہے۔ پہلے اپنے ان باپوں سے تو جان چھڑاؤ پھر ایسا سوچنا۔“

”کن باپوں سے؟“ عدنان نے بے ساختہ پوچھا۔ ”میں پولیس والوں کی بات کر رہا ہوں۔“ عظیم برہمی سے بولا۔

”عظیم! پولیس موبائل کو تو ہم ڈیفنس موڑ والے سنٹرل پر چھوڑ آئے ہیں۔“ عمران نے اپنے عقب میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ”اب تو ہم محفوظ ہیں۔“

”او محفوظ کے بچے! کیا کراچی پولیس کے پاس صرف ایک ہی موبائل ہے۔“ عظیم نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جس موبائل کو ہم نے ڈیفنس موڑ والے سنٹرل پر جل دیا ہے، لگتا ہے انہوں نے دائرئیس پر اپنے بھائی بندوں کو ہمارے بارے میں اطلاع دے دی ہے۔“

”عظیم! ٹھیک کہہ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے خود ایک پولیس موبائل کو سامنے سے آتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد ہی عظیم نے گاڑی کو سائڈ اسٹریٹ میں گھمایا تھا۔“

عدنان نے منت ریز انداز میں کہا۔ ”عظیم! تمہیں ہیرو بننے کا شوق ہے تو تم اپنا ہی شوق ضرور پورا کرو لیکن ہمیں اللہ کے واسطے یہیں اتار دو۔“

”ہاں یا! تم ہمیں گاڑی سے اتار دو۔“ عمران نے عدنان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ ”ہم یہاں سے پیدل مارچ کرتے ہوئے گھر چلے جائیں گے۔“

”بزدل کہیں کے۔“ عظیم نے گاڑی کو ایک طرف روکتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگ کیا خاک لڑکیاں چھنڈاؤ گے۔ پولیس کو دیکھ کر تو تمہاری سانس خشک ہوتی ہے۔ اگر کسی لڑکی کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تو یہ کہہ کر جان چھڑاؤ گے کہ..... سر! یہ تو میری بہن ہے!“

ہم ہیں پاکستانی

ہم پاکستانی بہ آسانی شناخت ہو سکتے ہیں کیونکہ.....

☆ ہر کھانا ہین اور پیاز میں پکاتے ہیں۔

☆ گھٹ پیپر ز کو دوبارہ استعمال کرتے ہیں۔

☆ گیٹ پر رخصت ہونے سے پہلے آدھا گھٹا ضرور بات کرتے ہیں۔

☆ بچا ہوا کھانا فروغ میں ضرور رکھتے ہیں۔

☆ کھانا پکاتے ہوئے بھی بھی پیانہ ٹاپ کر آئل استعمال نہیں کرتے بلکہ اندازے سے ڈالے جاتے ہیں۔

☆ بغیر ڈاکٹر کی تجویز کے دوا میں استعمال کرتے ہیں۔

☆ ہمیشہ کہتے ہیں گندا کپڑا دینا کوئی چیز صاف کرنی ہے۔

☆ مرسلہ: وزیر محمد خان۔ بٹل ہزارہ

پہلو کی بنا پر نہیں کرتے بلکہ اس سے ان کا مقصد صرف اپنی جیب گرم کرنا ہوتا ہے۔

”ویری بیڈ اینڈ ویری سیڈ۔“ میں نے افسوسناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”امریکا میں تو پولیس سے اس نوعیت کی بدعنوانی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔“

”برو..... یہ امریکا نہیں، پاکستان ہے۔“ عقلم نے ایک قہقہہ لگایا۔ ”یہاں بہت کچھ چلتا ہے بلکہ یہاں سب چلتا ہے۔“

”اس سب چلتا کو دیکھ کر تو مجھے بھی لگتا ہے کہ پاکستان کی پولیس بہت امیر ہوگی۔“ میں نے پر خیال انداز میں کہا۔ ”قدم قدم پر تو ان کی کمائی کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔“

”اس تمام تر کمائی کے باوجود بھی وہ امیر نہیں ہوا کرتے۔“ عقلم نے بتایا۔ ”میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ وہ اور ان کی فیملی کے افراد کیسے کسے عذابوں میں مبتلا رہتے ہیں۔“

”مال حرام سے بھی سچی خوشی نہیں خریدی جاسکتی۔“ میں نے گہری غنجدی سے کہا۔

”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔“ وہ گاڑی کو ایک ایسی جگہ پر روکے ہوئے بولا جہاں پہلے سے چند کاریں کھڑی تھیں۔

”خیریت.....“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف

”تم ہمیں ذلیل کر رہے ہو!“ عدنان نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

”میں ویل دے رہا ہوں۔“ عقلم نے بیزار سی کہا۔ ”اب اترو گاڑی سے۔ اگر وہ تمہارے رشتے دار پولیس والے ادھر آگئے تو ہم سب دھر لے جائیں گے۔“

وہ دونوں چپ چاپ وڑے اتر گئے۔

عقلم نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔ میں نے پوچھا۔ ”یہ لڑکیوں کو پھنسانے کا کیا قصہ ہے؟“

”برو! یہ امریکا نہیں پاکستان ہے۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”یہاں کسی لڑکی سے دوستی کرنے کے لیے، اسے پٹانے کے لیے کافی محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ دونوں اس ٹیلنٹ سے پیدل ہیں۔ پہلے انہوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں انہیں لڑکیاں پھنسانے کے گڑبٹاؤں لیکن ان کی بزدلی کو دیکھتے ہوئے میں نے انہیں چلتا کر دیا۔

آج کل یہ دونوں سلمان کی شاگردی میں ہیں اور آج سلمان انہیں پائپر اسٹار میں چھوڑ کر کسی لڑکی کے ساتھ غائب ہو گیا۔ یہ سب کل کہانی۔“

”یہ کل کہانی نہیں ہے۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگے۔

”اس کہانی میں تمہارا بھی تو کردار ہے۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ورنہ یہ دونوں لڑکی پھنسانے کے گڑبٹاؤں کے لیے تم سے درخواست کیوں کرتے..... ان کے لیے تم ایک لوگو کی حیثیت رکھتے ہو۔“

”ارے یار! ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ”یہ دونوں خود ہی مجھے گزر رہے ہیں اس لیے ادھر ادھر سے سہارے ڈھونڈتے رہتے ہیں ورنہ یہ کام اتنا مشکل کہاں ہے۔“

”ٹھیک کہتے ہو، یہ کام واقعی مشکل نہیں ہے۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا پھر اپنی معلومات کی غرض سے پوچھ لیا۔ ”کیا یہاں پولیس والے لڑکی لڑکے کو ایک ساتھ دیکھ کر پریشان کرتے ہیں؟“

”ہاں یار! یہ ایک حقیقت ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”بڑی عجیب و غریب حقیقت ہے۔“ میں نے کہا۔

”تمہارے امریکا کی طرح یہاں لوجوان نسل کو آسانیاں اور آزاویاں حاصل نہیں ہیں۔“ عقلم نے ایک ٹھنڈی سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ”باقی جہاں تک پولیس کا معاملہ ہے تو وہ اس قسم کی روک ٹوک کسی اصلاحی

دیکھا۔ ”کیا یہاں رکنے کا ارادہ ہے؟“

سے سگریٹ کا تو پوچھا ہی نہیں۔ کیا تم اسموکنگ کرتے ہو؟“
بات کے اختتام پر اس نے مارلیورولانس کا پیکٹ
اور لائٹر میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ایک اچھٹی سی نگاہ
مارلیورولانس کے پیکٹ پر ڈالی پھر کندھے اچکاتے
ہوئے کہا۔
”تو تھینکس..... میں اسموکنگ نہیں کرتا۔“
”ڈرنک تو کرتے ہو گے؟“ وہ میری آنکھوں میں
دیکھتے ہوئے متفہم ہوا۔

میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نو
ڈرنک..... نو اسموکنگ۔“
”مجھے یقین نہیں آ رہا یار۔“ وہ شک زدہ نظر سے مجھے
دیکھتے ہوئے بولا پھر پوچھا۔ ”تم امریکا سے آرہے ہو یا
سعودی عرب سے؟“

”اس میں بے یقینی والی کون سی بات ہے۔“ میں
نے جواباً اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو کوئی
اصول نہ ہوا کہ امریکا میں رہنے والا ہر شخص سگریٹ نوش اور
شراب نوش ہوگا اور سعودی عرب کا ہر باشندہ ان دونوں
چیزوں سے نااہل اور محروم.....“ میں نے لمحاتی توقف کر کے
ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔
”یہ عین ممکن ہے کہ امریکا میں رہنے والے کسی شخص
نے زندگی میں بھی سگریٹ اور شراب کے جام کو اپنے
ہونٹوں سے نہ لگا یا ہو اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ سعودی
عرب میں رہنے والے بعض لوگ روزانہ پابندی کے ساتھ
ڈرنک بھی کرتے ہوں اور اسموکنگ بھی.....!“

”میں تمہاری بات سے اختلاف نہیں کروں گا۔“ وہ
تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں نے بس
اپنے ہی امریکا اور سعودی عرب کی ایک مثال دے دی تھی۔
واقعی اسے اصول نہیں بنایا جاسکتا۔ ویسے عموماً تاثر یہی ہے
کہ مغرب زدہ لوگ آزاد خیال ہوتے ہیں اور کہہ دینے
سے تعلق رکھنے والے نیک و بارسا۔“

”یہ تاثر بھی سراسر غلط ہے۔“ میں نے ایک ایک
لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”انسان کی پارسانی اور
بدکاری کا تعلق دنیا کے کسی مخصوص خطے کے ساتھ نہیں جوڑا
جاسکتا۔ یہ تو انسان کے اندرون کا معاملہ ہے۔ اندر سے
اچھا انسان برائی اور بے حیائی کے گڑھ میں رہ کر بھی گناہ
سے خود کو بچا سکتا ہے اور اس کی بہترین مثال کنول و کچھڑکی
ہے لیکن جو انسان اندر سے برا ہے، وہ پائیزہ اور متحرک
مقام پر بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے گا۔ ہاں، یہ

وہ اپنی ونڈ کو ان گاڑیوں کے بیچ اس طرح پارک
کرنے لگا کہ دور سے وہ دکھائی نہ دے۔ میں اس کا مقصد
بہ خوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ پولیس والوں کی نگاہ سے اپنی گاڑی کو
چھپانا چاہتا تھا۔ یہ احتیاط مناسب تھی حالانکہ کافی دیر سے
ہمیں اپنے عقب میں پولیس کی کوئی گاڑی نظر نہیں آئی تھی
لیکن عظیم کی یہ حکمت عملی مجھے پسند آئی کہ..... احتیاط افسوس
سے بہتر ہے!

ہم دونوں گاڑی سے باہر آئے تو اس نے میرے
سوال کے جواب میں بتایا۔ ”یار! تھوڑی دیر پارک میں
بیٹھ کر ری لیکس کریں گے پھر گھر جائیں گے۔“
”اوکے۔“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔
ہم ایک لمبا راؤنڈ لگا کر شارشید پارک میں آ بیٹھے۔
عظیم نے کہا۔ ”اگر تمہیں کوئی مسئلہ نہ ہو تو میں ایک سگریٹ
لی لوں۔“

”کیا تم اسموکنگ کرتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”ہاں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ ”لیکن
پاپا کے سامنے نہیں۔“

”اس کا مطلب ہے، تمہارے پاپا کو تمہاری
اسموکنگ کی خبر نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔
”ایسی بات نہیں ہے۔“ وہ سگریٹ کا ایک گہرا سش
لیتے ہوئے بولا۔ ”علی انہیں میرے بارے میں پوری
رپورٹنگ کرتا ہے۔ پاپا کو تو یہ بھی پتا ہے کہ میں ڈرنک بھی
کرتا ہوں۔“

”اوہ.....“ میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے
ہوئے کہا۔ ”اور تمہارے پاپا کو یہ بات پسند نہیں ہے.....
ہے نا؟“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔“ وہ نیچے ہوئے لہجے میں بولا۔
”ایک اسموکنگ اور ڈرنک ہی کی بات نہیں اسد، پاپا کو تو میری
کوئی بھی بات پسند نہیں ہے۔“

آخری جملہ اس نے بڑی اداسی کے ساتھ ادا کیا
تھا۔ ان لمحات میں وہ مجھے ایک مجبور اور دکھی انسان نظر آیا
تھا۔ اس کے لہجے سے اپنے پاپا کے لیے گہرا اٹھو جھلکا تھا۔
میں نے ٹٹولنے کی غرض سے پوچھ لیا۔

”عظیم! تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ پاپا کو
تمہاری کوئی بھی بات پسند کیوں نہیں ہے؟“
”یہ بہت لمبی کہانی ہے دوست۔“ وہ مغموم لہجے میں بولا
پھر جلدی سے اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ ”سوری یار! میں نے تم

لے کر آ رہا ہوں۔“
دونوں بھائیوں کے درمیان ٹیلی فونک سلسلہ موقوف ہوا تو عظیم نے مجھ سے کہا۔
”پاپا کا فون تھا۔“
”پاپا کا فون.....“ میں نے حیرت بھری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”مگر تم نے تو تمام تر گفتگو علی کے ہی ہے!“
”علی تو پاپا کا چچہ ہے۔“ وہ بیٹھ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں جانتا ہوں، علی نے پاپا کے کہنے پر ہی مجھے فون کیا ہوگا۔“

میں نے بھی اس کی تقلید میں پارک کی بیٹھ چھوڑ دی اور الجھن زدہ انداز میں کہا۔ ”یار عظیم! تم اپنے باپ اور چھوٹے بھائی کی طرف سے اتنے بدگمان کیوں ہو؟“
”یہ معاملہ آسانی سے تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔“ وہ پارک کے گیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ ”کبھی فرصت میں بیٹھیں گے تو میں تمہیں اپنی لائف اسٹوری تفصیل کے ساتھ سناؤں گا۔ بس اتنا سمجھ لو کہ جب سے میں نے نو میرج کی ہے، پاپا کا رویہ میرے ساتھ بالکل بدل گیا ہے۔ وہ اس شادی کے خلاف تھے۔ ابھی تک انہوں نے مہر النسا کو دل سے اپنی بہو تسلیم نہیں کیا جبکہ اس عرصے میں، میں نے پاپا کو ایک پوتے اور تین پوتیوں کا دادا بھی بنایا ہے۔ مہر النسا میرے چار بچوں کی ماں ہے اسد.....“
”کیا علی کی شادی نہیں ہوئی؟“ میں نے پوچھا۔

”علی بھی شادی شدہ ہے۔“
”اس کے کتنے بچے ہیں؟“
عظیم نے جواب دیا۔ ”علی ابھی صاحبِ اولاد نہیں ہوا۔“
”اوہ.....“ میں نے متاسفانہ انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ”کیا علی کی بھی نو میرج ہے؟“

”نہیں۔“ وہ زہریلی مسکراہٹ ہنسنے پر سجاتے ہوئے بولا۔ ”علی پاپا کی نظر میں بہت ہی فرمانبردار اور بی با بیٹا ہے۔ اس نے پاپا کے کہنے پر اپنے ماموں کی بیٹی سے شادی کی ہے اور پاپا کی نظر میں علی اور اس کی بیوی دنیا کے سب سے زیادہ قابلِ انسان ہیں جبکہ عظیم اور مہر النسا دنیا کے نالائق ترین انسان.....“

میں نے عظیم کے اظہارِ خیال پر کوئی تبصرہ نہیں کیا کیونکہ یہ خالصتاً ان کا فیملی میٹر تھا اور مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ میں اسے کریدنے کی کوشش کروں۔ اگر وہ اپنی زبان سے خود ہی کچھ بتادے تو یہ الگ بات ہے۔ میں جانتا تھا کہ جو انٹ فیملی سسٹم میں افراد کے بیچ اس نوعیت کے ایڈجسٹمنٹ

ٹھیک ہے کہ ماحول سے انسانی سوچ پر بڑا اثر پڑتا ہے لیکن یہ تمام تر اثرات خارجی نوعیت کے ہوتے ہیں اور ان کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ انسان اس وقت بدلتا ہے جب اس کے داخلی معاملات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا میں مالک نے صرف دو ہی طرح کے انسان پیدا کیے ہیں۔ ایک وہ جن کا خمیر خیر سے اٹھا ہے اور دوسرے وہ جن کا خمیر شر سے اٹھا ہے۔ خیر والا ہمیشہ خیر والا ہی رہتا ہے اور شر والا سدا شر والا ہی۔ ان میں داخلی تبدیلی ممکن نہیں ہوتی۔ دیکھنے والی آنکھ کو ان میں جو بھی تبدیلی نظر آتی ہے، وہ خارجی اور عارضی ہوتی ہے۔“

”اوکے..... اوکے.....“ وہ زہرب لب مسکراتے ہوئے بولا۔ ”میں تمہاری بات کو اچھی طرح سمجھ گیا بغیر مونچھ ڈاڑھی کے مولوی صاحب۔“

”میں مولوی صاحب نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔
”میرا مطلب یہ تھا کہ.....“ وہ بات کو بدلنے ہوئے بولا..... ”کہ تم صرف ماہر نفسیات ہی نہیں بلکہ ایک فلسفی بھی ہو۔ اس وقت تمہارے اندر سقراط، بقراط اور ارسطو کی رو میں بیک وقت متحرک ہیں۔“

وہ اس قسم کی باتیں کر رہا تھا جیسے اسے اس ٹاپک سے فرار کا راستہ چاہیے ہو۔ میں نے اسے خاصا کھلا راستہ فراہم کرتے ہوئے ایک چوٹ بھی کروی۔

”اچھا تو تمہارے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اس خطے کے مولوی صاحب اندر سے سقراط، بقراط اور ارسطو ہوتے ہیں.....؟“

اس سے پہلے کہ وہ میرے سوال کا جواب دیتا، اس کا سیل فون جاگ اٹھا۔ اس نے فون اٹینڈ کرتے ہوئے مجھے سے کہا۔ ”علی کی کال ہے۔“

پھر اس نے فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں علی.....!“
دوسری جانب علی نے کیا کہا، میں نہیں جانتا تاہم عظیم کے جواب سے یہی لگا کہ علی نے پوچھا ہوگا، کہاں ہو بھائی؟
”میں اپنے دوست کے ساتھ ہوں۔“ عظیم نے کہا۔
”زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے میں گھر پہنچ جاؤں گا۔“

عظیم نے دوسری طرف علی کو سنا پھر بولا۔ ”ارے یار! پتا ہے مجھے۔ جب سعودی عرب میں گزشتہ شام رمضان کا چاند نظر آ گیا تھا اور آج وہاں پہلا روزہ ہے تو آج لازمی پاکستان میں چاند دکھائی دے جائے گا۔“
عظیم نے چند لمحوں خاموش رہ کر اپنے چھوٹے بھائی کی بات سنی پھر کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ میں اسد کو بھی اپنے ساتھ

جہیں یاد ہوگا، پولیس والوں نے تمہیں روکنے کے لیے فائرنگ کی تھی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”ہاں، مجھے یاد ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”اور اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب اس فائرنگ سے محفوظ رہے تھے۔“
 ”درست!“ میں نے اس کی تائید میں کہا۔ ”ہم مالک کے کرم سے محفوظ رہے تھے اور تمہارے وہ دونوں دوست اب تک صحت سلامت اپنے گھر کی پہنچ چکے ہوں گے لیکن.....“ میں نے تھوڑی دیر کو رک کر ایک پومصل سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”لیکن میرے خیال میں تمہاری دتر محفوظ نہیں رہی۔ اس فائرنگ کے نتیجے میں کوئی اندھی گولی اس کے فیول ٹینک کو پھاڑتی ہوئی گزرتی ہے یہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ فیول ٹینک اس گولی سے معمولی سا متاثر ہوا ہوگا۔ اگر گولی عین فیول ٹینک کے اندر گھسے تو ہم چاروں کے چاروں ایک خوفناک دھماکے کے نتیجے میں گاڑی کے ساتھ ہی بھٹک سی اڑ گئے ہوتے اور اس وقت تک ہمارے جسم درجنوں ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر فضا میں بکھر چکے ہوتے۔“

عظیم کے چہرے پر سراسیمگی نمودار ہوئی۔ وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔ ”اسد! گاڑی سے نیچے اتر دو.....“ وہ حالات کی سنگینی کو سمجھ گیا تھا۔ میں اس کے کہنے کے مطابق دتر سے باہر آ گیا اور پوچھا۔ ”کیا کرنے کا ارادہ ہے؟“
 ”میں اسٹیزنگ کو کنٹرول کرتا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”تم گاڑی کو پیش دے کر اس کی جگہ سے ہٹاؤ۔“

میں اس کے مقصد کی تہ میں پہنچ گیا۔ وٹس اس زاویے سے پارک کی گئی تھی کہ اسے آگے کی طرف نہیں دھکیلا جاسکتا تھا کیونکہ اس کے فرنٹ کے ساتھ چند انچ کے فاصلے پر پارک کی دیوار تھی۔ دھکا لگا کر گاڑی کو پیچھے ہی ہٹایا جاسکتا تھا۔ میں پارک کی دیوار کی طرف آیا اور دونوں ہاتھ دتر کے بونٹ پر رکھتے ہوئے عظیم سے پوچھا۔

”گاڑی کو ریورس میگز میں ڈالنا ہوا ہے نا؟“
 ”ہاں ہاں.....“ وہ جلدی سے بولا۔ ”بے فکر ہو کر دھکا لاؤ۔“

میں نے دونوں پاؤں کو زمین پر جمایا اور جسم و جان کی پوری قوت سے دتر کو پیش کرنے لگا۔ اس سلسلے میں عظیم بھی گھڑی سے پیش دے کر میری مدد کرنے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم دونوں نے گاڑی کو اس کی پارکنگ کی جگہ سے ہٹا کر ایک دوسرے مقام پر کھڑا کر دیا۔

دتر اپنی جگہ سے ہٹی تو میرے خیال کی تصدیق

لے ہی رہے ہیں۔

ہم جس راستے سے پارک میں داخل ہوئے تھے اس کے مخالف سمت سے باہر نکل آئے۔ میں بہ خوبی سمجھ رہا تھا کہ عظیم نے یہ احتیاط پولیس کے ممکنہ خطرے کے پیش نظر کی تھی۔ ٹارشید پارک بہت ہی صاف ستھرا اور دل خوش کن جلی پارک تھا۔ اس کا مقابلہ یورپ اور امریکا کے کسی بھی پارک سے کیا جاسکتا تھا۔ میں نے آج دوپہر میں پولو گراؤنڈ والے نیلی پارک پر بھی نگاہ ڈالی تھی لیکن ٹارشید پارک اس سے کافی اگے کی چیز تھا۔ شاید اس کا ایک سبب یہ بھی ہو کہ یہ شہر کے پوش علاقے کے دامن میں واقع تھا۔ اس پارک میں آنے والے افراد کے چہروں سے بھی اطمینان اور آسودگی بھلتی تھی۔

عظیم نے اپنی دتر کو جہاں پارک کیا تھا، وہ وہاں سے کچھ فاصلے پر رک گیا اور چونکا نظر سے گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا پھر مطمئن ہونے کے بعد اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گیا جواب بالکل تمہارہ گئی تھی۔ اس کے اریب قریب کھڑی گاڑیاں رخصت ہو چکی تھیں۔

ہم گاڑی کے اندر آ کر بیٹھے اور عظیم گاڑی اسٹارٹ کرنے لگا تو میں نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے، پولیس والے اس طرف نہیں آئے۔“

”میں بھی ایسا ہی محسوس کر رہا ہوں۔“ وہ گاڑی کے ساتھ مصروف رہتے ہوئے بولا۔ ”دتر اب تک ہم دھر لے گئے ہوتے۔“

عظیم نے دو تین مرتبہ گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی مگر اس کی کوشش بار آور نہیں ہوئی تو مجھے تشویش ہوئی۔ دہائٹ وٹس نو براؤنڈ گاڑی تھی۔ میں نے بے ساختہ اس کے گیس (فیول) میٹر کی طرف دیکھا اور چونک اٹھا۔ میٹر کی سوئی زیر و پر براجمان تھی۔

”عظیم!“ میں نے غصہ سے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ساری کوششیں فسل ہیں کیونکہ گاڑی کا فیول ختم ہو چکا ہے۔“

”اوہ نو.....“ وہ فیول میٹر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں نے تمہاری طرف آنے سے پہلے ٹینک فل کر دیا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے.....؟“

”یہ ہو چکا ہے عظیم الشان صاحب۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اور میں جانتا ہوں، یہ کیسے ہوا ہوگا۔“

”کیسے؟“ وہ اضطرابی لہجے میں متضرع ہوا۔

”تم جب پولیس کے ناکے سے رسی ٹرا کر نکلے تھے تو

عظیم چند لحظات تک ٹٹولنے والی نظر سے مجھ دیکھتا رہا پھر سرسراہٹ ہوئی آواز میں گویا ہوا۔ ”اسدا! تم بڑے گہرے انسان ہو، کسی سمندر کی طرح..... تمہاری عمر تو اتنی زیادہ نہیں ہے لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ تمہارے وجود میں کسی سوسالہ بڑھے کی روح ساکن ہوئی ہے.....“

”ارے یار! تم سمندروں کی گہرائی کو اپنے والا کام چھوڑ دو۔“ میں نے تفرق لینے والے انداز میں کہا۔ ”اس قسم کا کام راکیل ویلش اور میڈم ڈیلفینا ہی کو زیب دیتے ہیں۔“

”میں نے راکیل ویلش کی دو تین فلمیں دیکھی ہیں۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”یہ ہالی ووڈ فلم انڈسٹری کی ایک حسین و جمیل اداکارہ ہے لیکن یہ میڈم ڈیلفینا کون ہے؟“

”ڈیلفینا ویلش کی ایک بھی ہوئی کلاکارہ ہے۔“ میں نے عظیم سے تفرق لینے کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ راکیل ویلش سے بھی آگے کی چیز ہے۔“

”میں نے ڈیلفینا کا نام آج پہلی مرتبہ سنا ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”بس سمجھو کہ تم نے کچھ بھی نہیں سنا۔“ میں نے کہا۔

”میرے الفاظ تمہارے ایک کان سے دوسرے کان سے نکلے اور ہوا میں تحلیل ہو گئے۔“

”کیا یہ ڈیلفینا کوئی خطرناک عورت ہے؟“

”ایسی ویسی خطرناک۔“ میں نے کہا۔

”اس کے بارے میں مجھے کچھ بتاؤ.....“ اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔

”میں نے پوچھا۔“ تم نے راکیل ویلش کی کون کون سی فلم دیکھی ہے؟“

”ون ملین ایئر زبی سی، فیدیم.....“ اس نے بتایا۔

”فیدیم..... اوکے!“ میں نے بدستور سنجیدہ لہجہ میں کہا۔

”تم نے دیکھا ہوگا کہ ”فیدیم“ میں ہالی ووڈ کی ساحرہ راکیل ویلش کس طرح چھوٹ کاسکیل اٹھائے بحرا کال کی اتھاہ گہرائیوں کو اپنے اپنے حسن و جمال کی خیرات فلم بینوں میں بانٹی پھرتی ہے..... دیکھا ہے نا؟“

”ہاں دیکھا ہے۔“ وہ خوبانہ لہجہ میں بولا۔

”راکیل ویلش کا بدن لا جواب اور اداکاری باکمال ہے۔“

”یہ جو ڈیلفینا ہے نا.....“ میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”یہ راکیل ویلش سے کہیں زیادہ حسین و سنگین ہے۔ یہ کسی بھی معقول انسان کو پریشان ہالو والے بنگلے میں بہتر گھسنے کے لیے ٹھہرا کر اپنے ناز و ادا سے اس کی مت مار دیتی ہے۔ یہ پاؤں کے نیچے

ہوگئی۔ اس مقام پر عین گاڑی کے فیول ٹینک کے نیچے پیٹرول گرنے کا ایک دائرہ نما نشان بڑا واضح نظر آ رہا تھا۔ اس کا ایک ہی مطلب تھا کہ فائرنگ کے دوران میں پولیس والوں کی چلائی ہوئی کوئی گاڑی کے فیول ٹینک کو کھٹا کر گئی تھی۔ یہاں تک پہنچتے ہوئے راستے میں ٹینک سے پیٹرول نکلتا رہا ہوگا اور ٹینک کے اندر جو پیٹرول بچا تھا وہ سارے کا سارا یہاں پر ”ڈھیر“ ہو گیا تھا..... ایک لمحے سے ”تالاب“ کی شکل میں!

”تم بالکل ٹھیک کہہ رہے تھے۔“ عظیم نے پریشان کن لہجہ میں کہا۔ ”کوئی گاڑی کے ٹینک میں لگی ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر کہ پولیس والوں کو اس خوفناک حقیقت کا علم نہیں ہو سکا ورنہ آسانی سے ہمارا اچھا نہ چھوڑتے۔“

”مالک کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور سبق چھپا ہوتا ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔

”تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟“

”دھننی دھننی!“ اس نے جواب دیا۔

”دھننی دھننی..... کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ میں تمہاری آدمی بات سمجھ پایا ہوں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

”اللہ کی پوشیدہ مصلحت تو نظر آرہی ہے کہ ہمیں بچانا مقصود تھا اس لیے پولیس والوں کو ہماری کمزوری کا علم نہیں ہو سکا کہ ہماری گاڑی کا فیول ٹینک متاثر ہو چکا ہے لیکن اس سے قدرت ہمیں کیا سبق سکھانا چاہتی ہے، یہ میرے لیے نہیں پڑ سکا.....“

”قدرت ہمیں اور خاص طور پر ہمیں اس واقعے سے یہ سبق سکھانا چاہتی ہے کہ اس قسم کی ایفی فینسی جان لیوا ہو سکتی ہے لہذا اجتناب بہت ضروری ہے۔ قدرت دو طریقوں سے انسان کو سبق سکھاتی ہے.....“ میں نے لمحائی توقف کر کے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”نمبر دن..... انسان کو نقصان پہنچا کر.....“

”کفرانِ رحمت..... کیا مطلب؟“ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔

”تھوڑی دیر پہلے ہم بات کر رہے تھے کہ مالک بعض خوش نصیب انسانوں کو نقصان سے بچا کر کوئی سبق سکھا دیتا ہے۔“ میں نے سمجھ بھرا انداز میں کہا۔ ”اس نے ہم سب کی جان بچا کر ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ جان لیوا خطرناک کاموں سے دور رہنا چاہیے۔ اس سبق کو فراموش کر دینا کفرانِ رحمت ہی تو ہوگا۔“

”لیکن ہم نے اس سبق کو کب فراموش کیا ہے؟“

”تم نے چھید والے فیول ٹینک میں پیٹرول ڈال کر گھر پہنچے گا جو مخصوص بیان کیا ہے، وہ صد فیصد رسی اور جان لیوا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”روڈ پر سفر کرتے ہوئے کوئی بھی سنگین حادثہ پیش آ سکتا ہے۔“

وہ بے بسی سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تو پھر کیا کریں؟“

”ویری سہیل۔“ میں نے زبردست مسکراتے ہوئے کہا۔

”کوئی گاڑی یا ٹیکسی پکڑ کر یہاں لاتے ہیں اور وٹر کو نوکر کے کسی ملکیک کے پاس لے جاتے ہیں۔ پھر اس گاڑی کے فیول ٹینک کی مرمت کا معاملہ ملکیک پر چھوڑ دیتے ہیں۔“

”گڈ آئیڈیا۔“ وہ تعریفی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”کمال ہے، یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہیں آیا؟“

”وہ اس لیے کہ تم اس وقت پریشان ہو۔“ میں نے کہا۔ ”جب انسان کا ذہن کسی الجھن کا شکار ہوتا ہے تو پھر کوئی نیا خیال آنا تو دور کی بات ہے، جو نیالات پہلے سے وہاں موجود ہوتے ہیں وہ بھی رفو چکر ہو جاتے ہیں۔“

”میں علی کو فون کر کے یہاں بلا لیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”پھر ہم وٹر کو نو (کھینچ کر) کر کے اپنے ملکیک کے پاس طارق روڈ لے جاتے ہیں۔ وہاں سے ہمارا گھر بھی قریب ہی ہے۔“

”علی کو بلاؤ گے تو پھر یہ بات تمہارے باپا سے چھپی نہیں رہے گی کہ وٹر پر پولیس نے فائرنگ کی تھی جس کے نتیجے میں فیول ٹینک لیک ہو گیا ہے۔“ میں نے ایک خاص نکتے کی جانب توجہ مرکوز کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر اس سے تمہارے پلے گھر میں کوئی مسئلہ نہ اٹھتا تو ہوتا تو بلاؤ لگو کو۔“

”علی کو یہ بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے کہ پولیس نے ہم پر فائرنگ کی تھی۔“ وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔

”پھر.....؟“ میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم دیکھتے جاؤ، میں کیا کرتا ہوں۔“ وہ اپنے سیل فون کے ساتھ مصروف ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں اسٹیئر فون

سے اس طرح زمین کھینچتی ہے کہ اس کے چنگل میں آیا ہوا انسان منہ کے بل تخت الشرنی میں جا گرتا ہے۔ خیر..... میں لمبے بھر کے لیے رکھ کر تشویشناک انداز میں کہا۔

”تم ان دونوں عورتوں کو دفع کرو اور یہ بتاؤ کہ اس پھویشن سے کیسے لکھتا ہے!“

”بات کو بدل رہے ہونا؟“ وہ شکایتی لہجے میں بولا۔

”میں بات کو بدل نہیں رہا بلکہ نظریہ ضرورت کے تحت موجودہ صورت حال کا احساس کر رہا ہوں۔“ میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”راکیل ویلش اور میڈم ڈیلفینا تو دنیاوی حوری ہیں۔ ان کا گلیسر میں ذکر کہیں سکون سے پیش کر کریں گے..... انسان زندہ، قصہ باقی!“

”موجودہ پھویشن سے نکلنے کے دو حل ہیں میرے پاس۔“ عظیم نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر کہا۔

”ہاں بتاؤ.....“ میں ہمت نہ گوش ہو گیا۔

”ہم بہت سی چیزیں کم چپا کر اس کا ایک گولہ سا بنالیں۔“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”پھر گاڑی کے نیچے لیٹ کر اس گولے کو فیول ٹینک کے متاثرہ حصے پر چپا دیں۔ پھر گاڑی میں پیٹرول ڈلو کر گھر چلے جائیں۔“

”تمہاری وٹر برائنڈ نو ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس کے نیچے کوئی اسپر وغیرہ بھی نہیں ڈلا ہوا۔ گاڑی کے نیچے اتنی محاش نہیں ہے۔ تم جو ترکیب بتا رہے ہو اس پر عمل کرنا ہم دونوں کے بس کی بات نہیں پھر مجھے گاڑی کے نیچے لیٹ کر کام کرنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے..... کیا تمہیں ہے؟“

”بالکل نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلا دی۔

”اس منصوبے پر کوئی ماہر ملکیک ہی عمل کر سکتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیونکہ خالی فیول ٹینک کے متاثرہ حصے کو تلاش کرنا بھی کاردارو ہے لہذا یہ حل تو قابلِ عمل نہیں۔“

بات ختم کر کے میں نے عظیم کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں دوسرے حل کے بارے میں استفسار کر رہا ہوں۔ اس نے کہا۔

”گاڑی کی ڈکی میں ایک خالی گیلن رکھا ہوا ہے۔ ہم کسی پیٹرول پمپ سے اسے بھرا لیتے ہیں پھر تھوڑا تھوڑا پیٹرول ڈال کر گاڑی کو چلاتے ہیں۔ جیسے ہی فیول میٹر کا کاؤنٹائپر کی طرف بڑھے گا، ہم گاڑی روک کر اس میں اور پیٹرول ڈال لیں گے پھر تھوڑا سا فاصلہ طے کر لیں گے۔

اس طرح بالآخر ہم گھر پہنچ جائیں گے۔“

”یہ ترکیب قابلِ عمل مگر کفرانِ رحمت ہے۔“ میں نے کہا۔

تجربہ نہیں تھا۔ میں علی، عظیم اور ان کے پاپا کے بیچ تناؤ کی جو کیفیت دیکھ رہا تھا، ممکن ہے، یہ سب عین فطری اور نارمل ہو۔ اصل صورت حال اسی وقت واضح ہو سکتی تھی جب میں علی کپور اور حفیظ کپور سے مل کر عظیم کے بارے میں ان کا پوائنٹ آف ویو بھی لے لیتا۔

میں کپور فیملی کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ عظیم کا سیل فون بج اٹھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”شیخ صاحب ہیں۔“

وہ لگ بھگ ایک منٹ تک شیخ صاحب سے بات کرتا رہا۔ شیخ صاحب کو بھی اس نے ڈاکوؤں والی کہانی ہی سنائی تھی۔ بات مکمل کرنے کے بعد اس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”شیخ صاحب نے یہاں ٹائر شہید پارک کے اسٹاف میں کسی بااثر آدمی سے بات کی ہے۔ ان کا ایک بندہ ابھی یہاں آئے گا اور ہم گاڑی کی چابی اس کے حوالے کر کے سیدھے ٹیکسی میں بیٹھ کر اپنے گھر جائیں گے۔ وژ جانے اور شیخ صاحب جائیں..... کیسا ہے؟“

”عمدہ ہے لیکن.....!“ میں نے دائرہ جملہ ادھر اور چھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”لیکن کیا؟“

”یہ عمدہ کی داغ دار ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ عجیب سی نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

”اگر آپ کے پاس پیسیم کا سب سے اعلیٰ شیشہ ہو لیکن اس شیشے میں بال آجائے تو اس کی قدر و قیمت خاک میں مل جاتی ہے۔“ میں نے گہری تنجید کی سے کہا۔

”پیسیم کے شیشے کا یہاں کیا کام؟“ اس کے استفسار میں الجھن تھی۔

”کام شیشے کا نہیں، بال کا ہے۔“ میں نے کہا۔

”میں اب بھی نہیں سمجھا.....“ اس کی الجھن دو چند ہو گئی۔

”تم نے جو کچھ کیا، وہ یقیناً عمدہ ہے۔“ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمہارے چھوٹ کی وجہ سے اس کی عمدگی کہنا گنتی ہے۔ تمہیں علی کو اور شیخ صاحب کو سب سے بچ بچانا چاہیے تھا کہ ہماری گاڑی پر پولیس نے فائرنگ کی تھی اور اس کا سبب ہماری اہلی غلطی تھی۔“ لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”عظیم! میری ایک بات ذہن میں نقش کر لو کہ آپ

آن کر رہا ہوں۔ تم بھی سننے جاؤ۔“

تھوڑی ہی دیر میں اس نے علی سے رابطہ کر لیا اور کہا۔ ”علی! میں ایک پرائلم میں ہوں۔ کیا تم ابھی میرے پاس آ سکتے ہو؟“

”کیا ہوا بھائی۔“ علی کی تشویش بھری آواز مجھے سنائی دی۔ ”تم اس وقت کہاں ہو اور پرائلم کیا ہے؟“

”یار ڈاکو ہمارے پیچھے لگ گئے تھے۔“ وہ گہری تنجید کی سے بولا۔ ”ہم نے بڑی مشکل سے بھاگ کر جان بچائی ہے۔ ڈاکوؤں نے ہم پر فائرنگ بھی کی ہے جس سے وژ کا فیول ٹینک ڈیج ہوا ہے۔ میں اس وقت ٹائر شہید پارک کے قریب ہوں۔ پلے لینڈ والی سائڈ پر۔“

”میں پاپا کو فون کرتا ہوں.....“

”پاپا کو فون کرنے کی ضرورت نہیں۔“ عظیم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”تم اپنی گاڑی میں آ جاؤ۔ ہم وژ کو نوکر کے ملکینک کے پاس لے جائیں گے۔“

”اصل میں پاپا اس وقت تمہارے قریب ہی ہیں۔“ علی نے بتایا۔ ”میری گاڑی وہ لے کر گئے ہوئے ہیں۔“

”پاپا میرے قریب ہیں..... مطلب کہاں ہیں؟“

”وہ اس وقت شیخ صاحب کے گھر میں ہیں۔“

”اوکے ٹھیک ہے، میں خود بات کر لیتا ہوں۔“ عظیم نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”برو! کام بن گیا۔“

”ابھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

”شیخ صاحب یہاں قریب ہی فیئر ٹو ایکسٹینشن میں رہتے ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”شیخ صاحب کا تعلق ہائی کورٹ سے ہے۔ وہ پاپا کے دوست ہیں اور مجھ سے بھی ان کی بہنی پاری ہے۔ اس موقع پر وہ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ میں انہیں فون کر رہا ہوں۔ وہ کسی کو بھی بھیج کر ہماری گاڑی کو نو.....

دالیں گے۔ فیئر ٹو ایکسٹینشن میں موٹر ملکینکس کی پوری مارکیٹ ہے۔“

”تم اپنے پاپا کو فون کر دو گے یا شیخ صاحب کو؟“ میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھا۔

”شیخ صاحب کو۔“ وہ میرے سوال کی تہ میں پہنچتے ہوئے بولا۔ ”پاپا کو تو علی اب تک ساری کہانی سنا چکا ہوگا۔“

دونوں بھائیوں کے بیچ بد اعتمادی کی فضا دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔ میں علی سے ابھی تک ملا نہیں تھا۔ اگر عظیم اچھا تھا تو وہ بھی یقیناً اچھا ہی ہوگا۔ مجھے کبھی جو اسٹ فیملی میں رہنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اس لیے رشتوں کے باہمی ایڈجسٹ کا کوئی

جسے اپنا کہتے ہیں اس کے ساتھ کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہیے۔
جھوٹ رشتوں کے لیے زہر ہے۔ اسے بنیاد بنا کر جو کبھی
عمارت کھڑی کی جائے وہ چاہے سو منزلوں تک بلند کیوں نہ
ہو جائے، سچائی کا ایک نرم جھونکا چشم زدن میں اسے زمین
پس کر دیتا ہے۔“
عظیم نے ندامت سے گردن جھکا دی۔

☆☆☆

جب ہم عظیم کے گھر پہنچے تو اندھیرا پھیلنے لگا تھا اور اس
وقت تک رمضان کے چاند کا بھی اعلان ہو چکا تھا۔ گویا کل
پہلا روزہ تھا۔

عظیم کا گھر عالی شان تھا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ وہ
کراچی کا پوش رہائشی علاقہ تھا۔ وہاں پر زیادہ تر بزنس مین
اور کاروباری افراد رہتے تھے۔ یہ رہائشی ایریا دہلی
مرکھال سوسائٹی کہلاتا تھا۔ ہم ٹیکسی کے ذریعے عظیم کے گھر
پہنچے تھے۔ ہینکے کے گیٹ پر میں نے ایک عجیب منظر دیکھا۔
وہاں لگ بھگ ایک سو مرد وزن کا ایک چھوٹا سا جہوم لگا ہوا
تھا۔ عظیم نے مجھے لے جا کر اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں
بٹھا دیا اور کہا۔

”فریش ہونا ہے تو بتاؤ؟“

”نہیں یار، میں فریش ہی ہوں۔“ میں نے کہا۔
”اوکے!“ وہ بولا۔ ”تم بیٹھو، میں فریش ہو کر آ رہا
ہوں۔ دلیے وہ سامنے اٹھ بیٹھ جاؤ۔“ اس نے ایک
دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اگر کوئی
ضرورت محسوس کرو تو کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا
اپنا ہی گھر ہے۔“

”تھینک یو۔“ میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔
عظیم کے جانے کے بعد میں ڈرائنگ روم کا جائزہ
لینے لگا۔ وہاں پر موجود ہر ہر شے سے اہل خانہ کے اعلیٰ ذوق
اور امارت کا اظہار ہوتا تھا۔ ڈرائنگ روم کا سارا فرنیچر قیمتی
اور عمدہ لکڑی کا تھا۔ ڈرائنگ روم کی دیواروں پر بڑی بڑی
آئل پینٹنگز آویزاں تھیں لیکن ان میں سے کسی بھی پینٹنگ
میں کسی انسان یا کسی جانور کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ وہ سب کی
سب آئل پینٹنگز کیلنی گرائی کا انمول شاہکار تھیں۔ ہر پینٹنگ
میں قرآنی آیات کو بڑے خوب صورت انداز میں پینٹ کیا
گیا تھا۔ حسین رنگوں کا استرجاع ان پینٹنگز کی خوب صورتی کو
چار چاند لگ رہا تھا۔ میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی
کہ زیادہ تر پینٹنگز میں چاروں قل اور آبیہ الکرسی کو جدید
ڈیزائن میں لکھا گیا تھا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ قائم کرنے

میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوئی کہ عظیم کا تعلق ایک مذہبی
گھرانے سے تھا۔ ڈرائنگ روم کی ایک دیوار کے ساتھ شیٹے
کی بڑی سی چوٹی الماری بھی رکھی ہوئی تھی۔ مذکورہ الماری
کے اندر موٹی موٹی کتابیں بڑے سلیقے سے جاکر رکھی ہوئی
تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق، وہ سب ضخیم مذہبی
کتابیں تھیں۔ میں صوفے سے اٹھا اور یہ سوچ کر واٹش روم
میں گھس گیا کہ..... چلو، میں بھی فریش ہو لیتا ہوں!

تھوڑی دیر کے بعد عظیم بھی وہاں آ گیا۔ اس دوران
میں، میں فریش ہو کر دوبارہ صوفے پر براجمان ہو چکا تھا۔
عظیم جاتے ہوئے ڈرائنگ روم کا اسے سی آن کر گیا تھا لہذا
کمرے کا موسم خوشگوار ہو چکا تھا۔

عظیم کی آمد سے قبل ایک ملازم صورت آدمی پانی کا
جگ اور گلاس سینئر ٹیبل پر رکھ گیا تھا۔ عظیم نے میرے لیے
گلاس میں پانی نکالا اور کہا۔

”لو..... حلق تر کرو۔ ابھی چائے بھی آرہی ہے۔“

”یار! اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔“ میں نے پانی
کے گلاس کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”میں تو
تمہارے پایا اور تمہارے بھائی سے ملنے یہاں آیا ہوں
لیکن وہ دونوں مجھے کہیں دکھائی نہیں دے رہے۔“

”اسد! تمہارے ساتھ تکلف والا کوئی معاملہ نہیں۔“
وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”اس چائے پانی کے علاوہ تمہیں
ہمارے ساتھ ڈٹ کر ڈرنجی کرنا ہے۔ بعد کی بعد میں دیکھی
جائے گی اور جہاں تک پایا اور علی کا تعلق ہے تو.....“ وہ لمبے
بھر کو رکا پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

”پاپا بیج صاحب کے گھر سے نکل چکے ہیں اور
راستے میں ہیں۔ تھوڑی دیر میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے اور
علی باہر والے لوگوں کے ساتھ مصروف ہے۔ وہ بھی فارغ
ہو کر ادھر ہی آئے گا۔“

عظیم نے ”باہر والے لوگوں“ کا ذکر کیا تو مجھے یاد آیا
کہ میں نے باہر بہت سے مردوں اور عورتوں کو دیکھا تھا۔
میں نے عظیم سے پوچھا۔

”یار! یہ کیوں لوگ ہیں.....؟“

”یہ مفلس، نادار اور محنتی لوگ ہیں۔“ اس نے بتایا۔
”ہر سال جب رمضان کا چاند نظر آتا ہے تو ہم لوگ ضرورت مند
افراد میں راشن کے تحلیف تقسیم کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہر سال کی
طرح اس سال بھی اپنا حصہ لینے آئے ہیں۔ ایک تحلیف کے اندر
کسی بھی چار پانچ افراد کی ٹیکسی کے لیے مینے بھر کے استعمال کی
خوردنوش کی ہر شے موجود ہوتی ہے۔“

ہو جاؤ۔“

”ٹھیک ہو یا ر۔“ وہ مومنیت بھرے لہجے میں بولا۔
میں نے کہا۔ ”اُس او کے۔“

ہمارے چائے ختم کرنے تک عظیم کے پاپا بھی گھر پہنچ گئے۔ وہ سیدھے ڈرائنگ میں آ گئے۔ میں نے کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ بڑی گرم جوشی سے ملے پھر مصافحہ کرنے کے بعد میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئے۔ رمی علیک سلیک کے بعد انہوں نے کہا۔

”سب خیریت ہے نا؟“

”جی انکل سب اسن و اماں ہے۔“ میں نے

ظہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

حفیظ کپور درمیانے قد کا مالک ایک فریب اندام شخص تھا۔ رنگت سائولی اور چہرے کے خال دھڑ سے جھانسی جھلکتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ذہانت اور زبانی بھر کا تجربہ پٹکتا تھا۔ وہ جنگ شخصیت کا مالک ایک متاثر کن شخص تھا۔ میں نے اس کی عمر کا اندازہ بیسٹھ کے قریب لگایا۔ بعد ازاں مجھے پتا چلا کہ حفیظ کپور اس وقت اپنی عمر کی باسٹھویں منزل پر کھڑا تھا۔

مجھ سے رمی علیک سلیک کے بعد حفیظ کپور نے

یہ آواز بلند کہا۔ ”اکبر بادشاہ.....!“

میں کچھ نہ سمجھا اور سوالیہ نظر سے عظیم کی طرف دیکھا۔ نکل اس کے کہ عظیم کچھ بولا، حفیظ کپور نے اس سے پوچھ لیا۔

”اکبر کو تم نے کہیں بھیجا ہے؟“

”نہیں پاپا! ابھی تھوڑی دیر پہلے تو وہ ادھر ہی تھا۔“ عظیم نے بتایا پھر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”میں جا کر دیکھتا ہوں پاپا۔“

پھر پاپا کا جواب سننے بغیر عظیم ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ وہ دانستہ وہاں سے اٹھا تھا۔ وہ پاپا کے ساتھ بیٹھنے سے کئی کاٹ رہا تھا۔ باپ بیٹے کے بیچ شیخی ہوئی اس نازک رشتے کی ڈور کے بارے میں مجھے عظیم کی دن بھر کی گفتگوں کر ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے حفیظ کپور کے روئے میں بھی عظیم کے لیے بڑی واضح بے رحمی اور بے اعتنائی محسوس کی تھی۔ کچھ بھی تھا، عظیم نے انہیں اگر براہ راست نہیں بھی بتایا تھا لیکن علی کی زبانی یقیناً انہیں اس واقعے کی خبر ہو چکی تھی کہ ڈاکوؤں نے ہماری گاڑی پر فائرنگ کی تھی۔

”دیری گڈ۔“ میں نے سناٹائی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ”غریبوں اور ضرورت مندوں کا خیال رکھنا تو بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ انسان کے اس عمل سے مالک بہت خوش ہوتا ہے۔“

”بس یا ر! ہم تو اپنی بساط کے مطابق کوشش کرتے ہیں۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”قبول کرنا یا نہ کرنا اللہ کی مرضی پر منحصر ہے۔“

”کائنات کے رجسٹر میں انسان کا معمولی سے معمولی عمل بھی درج ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اور مالک کسی کے بھی عمل کو ضائع نہیں کرتا۔ کسی کو اس کے عمل کے برابر اور کسی کو دو گنا، چو گنا، دس گنا اور ستر گنا صلہ عطا کرتا ہے۔ وہ بڑا کار ساز ہے۔“

ہماری بات چیت کا سلسلہ جاری تھا کہ چائے آ گئی۔ وہ محض چائے نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ خاصہ ڈیفریشن منٹ کے لوازمات بھی تھے۔ ملازم نے چائے کے برتن اور دیگر لوازمات میز پر سجائے اور ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔ میں نے برتنوں سے بھری ہوئی میز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یا ر عظیم! یہ چائے ہے یا ڈنر.....؟“

”بس! آپ تم شروع ہو جاؤ۔ بسم اللہ کر کے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”باقی تمبرے بعد میں ہوں گے۔“

اور میں شروع ہو گیا.....!

عظیم نے کہا۔ ”یا ر! ایک بات ذہن میں رکھنا۔“

”کون سی بات؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے علی اور شیخ صاحب کو ڈاکوؤں والی جو اسٹوری سنائی ہے اس سلسلے میں، ہمارے بیان میں تضاد نظر نہیں آتا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں دوست بنایا ہے تو اب تمہارے جھوٹ کو بھی نہ مانا پڑے گا۔“

”یا ر! میں عموماً جھوٹ نہیں بولتا۔“ وہ شرمندگی بھرے لہجے میں بولا۔ ”لیکن تم میرے پاپا کو نہیں جانتے۔ وہ کسی تھانے دار سے کم نہیں ہیں۔ بال کی کھال نکالتے ہیں اور اگر کوئی میرا معاملہ ہو تو کھال کے بال بھی نکال سکتے ہیں۔ میں نے ان کے بہت سے سوالات اور لعن طعن سے بچنے کے لیے یہ کہانی فٹ کی ہے۔“

”بس تو پھر اس کہانی کو فٹ اور ہٹ ہی سمجھو۔“ میں نے تسلی بھرے لہجے میں کہا۔ ”تم میری طرف سے مطمئن

اصولی طور پر انہیں سب سے پہلے عظیم سے اس واقعے کے بارے میں دریافت کرنا چاہیے تھا مگر انہوں نے تو ایسا ظاہر کیا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہ حقیقت تھی کہ ہم پر ڈاکوؤں نے فائرنگ کی تھی اور نہ ہی انہوں نے ہمیں لوٹنے کی کوشش کی تھی لیکن یہاں سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر واقعی ایسا کوئی واقعہ پیش آیا ہوتا تو پھر بھی ایک باپ کو اپنے بیٹے کے معاملے سے اتنی ہی عدم دلچسپی ہوتی؟ بہر حال، مجھے حفیظ کپور کی یہ ادائپند نہیں آئی تھی!.....! تھوڑی ہی دیر میں گھریلو ملازم ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو حفیظ کپور اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔

”اکیبر! کبوتروں کو باجر ڈال دیا تھا؟“

”جی صاحب! چاروں برتن بھرے ہوئے ہیں۔“

اکبر نے جواب دیا۔

حفیظ کپور نے پوچھا۔ ”اور پانی کی کیا پوزیشن ہے؟“

”میں نے پانی بھی فل کر دیا ہے۔“ ملازم نے جواب دیا۔

”اکیبر بادشاہ! تم اور کوئی کام کرو یا نہیں لیکن پرندوں کے کھانے دانے کی طرف سے تم نے بھی غفلت نہیں برتنا۔“

حفیظ کپور نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”انسانوں کی طرح ان بے چاروں کے پاس خوراک کا ذخیرہ نہیں ہوتا اور نہ ہی ان کی جیب میں کوئی پیسے ہوتے ہیں کہ جب بھوک لگے تو کچھ خرید کر کھالیں۔ یہ اپنی ہر ضرورت کے لیے انسان کی طرف دیکھتے ہیں۔“

”اور انسان اپنی ہر ضرورت کے لیے اپنے مالک سے امید لگاتے رکھتا ہے۔“ میں نے بے ساختہ کہا۔ ”اگر انسان یہ چاہتا ہے کہ مالک اس کی ضروریات کا خیال رکھے تو انسان کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ مالک کی دوسری مخلوقات کو نظر انداز نہ کرے۔“

”سبحان اللہ!.....!“ حفیظ کپور نے تعریفی نظر سے میری طرف دیکھا۔ ”بہت گہری بات کی ہے تم نے۔ تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟“

”اسد علی۔“ میں نے بڑی رसान سے جواب دیا۔

حفیظ نے اکبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”چائے کے برتن اٹھا لو اور سعیدہ سے پوچھو کہ رات کے کھانے میں کیا بنا ہے؟“

”جی صاحب۔“ اکبر یہ کہتے ہوئے اپنے صاحب کے حکم کی تعمیل میں لگ گیا۔

مجھے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے حفیظ کپور

نے ”اکیبر بادشاہ“ کا نعرہ اپنے اسی ملازم کے لیے لگایا تھا۔ اپنے نوکروں کے ساتھ نرمی اور اہمیت کا یہ سلوک مجھے بہت اچھا لیکن ایٹ دی سیم ٹائم..... ایک بیٹے کے ساتھ باپ کا رویہ میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ لگتا تھا یا تو حفیظ کپور کو اپنے بیٹے عظیم کپور سے بڑی سنگین نوعیت کی شکایات تھیں یا پھر یہ شخص دہری شخصیت کا مالک تھا۔

اکبر برتن سمیٹ کر ڈرائنگ روم سے نکل گیا تو حفیظ کپور میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”بیٹا! تم تو بہت سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔ عظیم سے تمہاری دوستی کیسے ہو گئی؟“

اس کے آخری جملے میں استفسار سے زیادہ طنز چھپا ہوا تھا۔ میں پوچھ بیٹا نہ رہ سکا۔

”انکل! آپ نے ایسا کیوں کہا؟ کیا میں آپ کے بیٹے سے دوستی کے قابل نہیں ہوں.....؟“

”نہیں..... ایسی بات نہیں۔“ وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ”بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ تم مجھے کافی سنجیدہ اور بردبار لگے ہو اور عظیم..... خیر چھوڑو۔“ وہ بات کو بدلتے ہوئے بولے۔ ”امریکا میں تمہارا تعلق کس اسٹیٹ سے ہے؟“

”ٹیکساس۔“ میں نے جواب دیا۔

”ادھ اچھا۔“ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولے۔ ”ٹیکساس تو جہم میں لگ بھگ پورے پاکستان کے برابر ہی ہے۔ کافی بڑی اسٹیٹ ہے یہ۔“

”جی انکل! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ میں نے تائیدی انداز میں کہا۔

”اور وہاں کا موسم بھی بڑی حد تک کراچی جیسا ہی ہے۔“ حفیظ کپور نے کہا پھر پوچھا۔ ”ٹیکساس میں تم کہاں ہوتے ہو؟“

”رہائش بے سٹی میں ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”اور کالج لیک جیکسن میں۔“

”گڈ۔“ اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا پھر بتایا۔ ”میں نے بھی کچھ عرصہ امریکا میں گزارا ہے لیکن یہ پچیس تیس سال پہلے کی بات ہے۔“

”پچیس تیس سال پہلے تو میں اس دنیا میں آیا بھی نہیں تھا۔“ میں نے کہا پھر حفیظ کپور سے پوچھا۔ ”آپ کس سلسلے میں امریکا گئے تھے اور کس اسٹیٹ میں قیام کیا تھا؟“

”بس والد صاحب سے لڑائی ہوئی اور میں منہ اٹھا کر امریکا چلا گیا۔“ وہ ہنستے ہوئے بتانے لگے۔ ”اس زمانے میں امریکا جانا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا آج کل ہو چکا ہے۔“

ہوئے لہجے میں کہا۔ ”یہ اس کی مہربانی ہے ورنہ میری اتلی اوقات نہیں۔“

میں نے پوچھا۔ ”انگل اعظم کہاں چلا گیا؟“
”آپ کے سامنے ہی تو اٹھ کر گیا ہے۔“ حنیف نے جواب دیا۔ ”ادھر گھر ہی میں کہیں ہوگا۔“

”بھائی اوپر اپنے پورشن میں ہے۔“ علی نے بتایا۔
”علی! اسے فون کر کے یہاں نیچے بلاؤ۔“ حنیف پکڑنے علی سے کہا۔ ”اس کا دوست اور ہم سب کا مہمان یہاں بیٹھا ہے اور وہ اوپر اپنے کمرے میں گھسا بیٹھا ہے۔ فون پر مہربانی کی منت خوشامد میں لگا ہوگا۔ جب سے اس کی بیوی امریکا گئی ہے، یہ بولا یا بولا یا پھر رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے جنوں کی سی کہیں گم ہو گئی ہو۔“

حنیف پکڑنے یہ تمام تر الفاظ بڑے نارمل انداز میں ادا کیے تھے لیکن میں نے عظیم کے لیے ان کی فحش کو بڑا واضح محسوس کر لیا تھا۔ ان باپ بیٹے کے معاملات کو سمجھنے کے لیے دونوں کا نفسی انٹرویو بہت ضروری تھا۔ یہ تو میں اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ دونوں کے بیچ ایک خلیج حائل ہے جسے پائنے میں دونوں کوئی دھچکی نہیں رکھتے تھے۔
”وہ آ رہا ہے۔“ علی نے اعلان کرنے والے انداز میں بتایا۔

حنیف پکڑ اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”تم سب بھائی آپس میں گپ شپ کرو۔ میں تھوڑا آرام کروں گا۔ اب ڈنر پر ملاقات ہوگی۔“
بڑی عجیب صورت حال تھی۔ باپ کی آمد پر عظیم چپکے سے ڈرائنگ روم سے غائب ہو گیا تھا اور بیٹے کی آمد کی خبر سن کر باپ کو آرام کرنے کا خیال آ گیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کتر رہے تھے اور یہ کترانا دیدہ و دانستہ تھا۔ دونوں کے دلوں میں دوریاں پیدا ہو چکی تھیں۔

ان لمحات میں، میں نے اپنے آپ سے عہد کیا کہ اگر میں چند روز ان کے ساتھ رہا اور مالک نے مجھے موقع دیا تو عظیم پکڑ اور حنیف پکڑ کے درمیان تعلیق کی دی مضبوطی اور پائیداری قائم کر دوں گا جو علی پکڑ اور حنیف پکڑ کے بیچ میں نے دیکھی تھی۔ میں غلو صی نیت سے ایسا سوچ رہا تھا اور مالک..... نیٹوں کا حال جانتا ہے!

☆☆☆

ڈنر بڑا شان دار تھا۔ گھر کے کپے ہوئے تمام پکوان لذیذ اور مزے دار تھے۔ کھانے کے جو آئٹمز باہر سے

پھر مجھے اس لیے بھی کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ میں امریکن ایمپرسی کے تمام تقاضے پورے کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ والد صاحب کا اپنا چلتا ہوا بزنس تھا لہذا مجھے آسانی سے وزٹ ویزا مل گیا۔ میں گیا تو وزٹ ویزا پر تھا لیکن وہاں جا کر میں سلسلہ ہو گیا اور پورے چار سال تک وہاں کام کرتا رہا۔ جب امریکا اور امریکی کلچر سے دل بھر گیا تو میں واپس پاکستان آ گیا..... وہ سانس ہموار کرنے کے لیے متوقف ہوئے پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے یہ عرصہ امریکی ریاست ڈکوتا میں گزارا تھا۔“
”نا تھ یا سا ڈتھ؟“ میں نے پوچھا۔
”انہوں نے بتایا۔“ نا تھ ڈکوتا۔“

اسی لمحے اکبر نامی ملازم نے آ کر بتایا۔ ”صاحب! بکرے کی چائیں ہیں، آلو گوشت کا سالن ہے، مٹن پلاؤ ہے اور سبزی کی بھجیا بھی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ تم تھوڑا سا بارانی کی بھی پکڑ لو۔“ حنیف پکڑنے کہا۔ ”لیکن اس سے کہنا کہ چکن کئے اچھی طرح سینک کر دے اور دھاگے والے کیا پ بھی لے لیتا۔“

”ٹھیک ہے صاحب۔“ اکبر نے فرماں برداری سے کہا پھر پوچھا۔ ”روٹی لاؤں یا چائیاں؟“

”چائیاں اور نان دونوں چیزیں لانا ہیں۔“ حنیف پکڑ نے کہا۔ ”اسد صاحب بہت دور سے آئے ہیں۔ انہیں کھانے میں کوئی شکایت نہیں ہونا چاہیے۔“
”جی اچھا صاحب۔“ اکبر سر کو ایشیائی جنبش دیتے ہوئے ڈرائنگ روم سے نکل گیا۔

ادھر اکبر وہاں سے رخصت ہوا، ادھر ایک موٹا تازہ نوجوان ست روی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ میں اس نوجوان کو دیکھ کر چونک اٹھا تھا۔ اس کی لمبائی اور چوڑائی تقریباً ایک ہی جیسی تھی اور وزن میرے مختلط اندازے کے مطابق ایک سو تیس کلو گرام سے متجاوز ہی تھا۔ وہ گول منول گوشت کا پہاڑ بڑی محبت سے آ کر مجھ سے گلے ملا، میرا حال احوال پوچھا اور پھر جوش مصافحہ کرنے کے بعد ایک طرف جا بیٹھا۔ اس نوجوان کے انداز و اطوار میں بڑی شگفتگی پائی جاتی تھی۔ وہ عظیم کا چھوٹا بھائی علی پکڑ تھا۔

”علی! سب کو نمٹا دیا نا.....؟“ حنیف پکڑ نے اس سے پوچھا۔

”جی پاپا۔“ علی نے جواب دیا۔
”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔“ حنیف پکڑ نے ٹھہرے

منگوائے گئے تھے، وہ بھی لا جواب تھے۔ رات کو گیارہ بجے کے قریب میں عظیم کے گھر سے رخصت ہوا اور یہ وقت رخصت حفظہ پور نے مجھ سے وعدہ لیا کہ پہلا روزہ میں ان کے گھر پر ہی افطار کروں گا۔
”اوکے انکل! میں ضرور آؤں گا۔“ میں نے انہیں یقین دلایا۔

عظیم مجھے سیاہ ٹیوٹا کرولا میں پی سی چھوڑنے آیا۔ جب اس نے مجھے ہوٹل پر ڈراپ کیا تو مجھے یاد آیا کہ میں ابھی تک چالیس فون نمبرز والی لسٹ کی زیر دس نہیں کروا سکا تھا۔ میں نے جب اس کا ذکر عظیم سے کیا تو وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔

”ارے یار! افراتفری میں کچھ یاد ہی نہیں رہا۔ تم وہ پتھر مجھے دے دو۔ میں اس کی کاپی کروا کر کل تمہیں دے دوں گا۔“

میں نے مذکورہ کاغذ اس کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔
”اس پر چند لوگوں کے سیل فون نمبرز ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کے بھی پتے ٹھکانے کا سراغ مل جائے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔“ پھر میں نے اسے تھوڑی سی تفصیل بھی بتادی۔
”اسد! تم فکر نہ کرو۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ”یہ تو بہت چھوٹا سا کام ہے۔ میں تمہاری خوشی کی خاطر کسی نہ کسی کو ضرور ڈھونڈ نکالوں گا۔“

پھر وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر واپس چلا گیا۔
میں اپنے کمرے میں آیا اور دوش روم میں گھس گیا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد میں فریش اپ ہو کر بیڈ پر آ گیا پھر انکل سلطان کو فون کیا۔

ہمارے درمیان لگ بھگ ایک گھنٹا بات ہوئی۔ میں نے انکل سلطان کو اپنی دن بھر کی مصروفیات کے بارے میں پوری تفصیل کے ساتھ بتایا۔ انہوں نے کہا۔
”یہ عظیم بہت کام کا آدمی ہے۔ مجھے امید ہے، اس سے دوستی تمہارے لیے مفید ثابت ہوگی۔“

”جی انکل! میں بھی محسوس کر رہا ہوں۔“ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ پوری پور فیملی ہی بہت اچھی ہے۔“ مخلص اور سپورٹنگ.....
انکل نے مجھے بہت دعا بھی دیں اور کہا۔ ”جو سترہ شجر سے، امید بہار رکھ.....!“

میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اختتامی کلمات کے بعد ہمارے بیچ سیلوار رابطہ موقوف ہو گیا۔
میں نے سیل فون کو سائڈ ٹیبل پر رکھا ہی تھا کہ اس کی

گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون اٹھالیا۔ دوسری جانب عظیم کپور تھا۔

”ہیلو۔“ میں نے اس کی کال پک کرتے ہوئے کہا۔ ”عظیم! تم خیریت سے تو ہو نا.....؟“

”میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔“ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”برو! تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔“

میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔ ”ہاں، بتاؤ کیا خوش خبری ہے؟“

”تم نے مجھے چالیس سیل نمبرز کی جوسٹ دی ہے، میں نے اپنے سیل فون سے ان تمام نمبرز کو ٹرائی کیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”پھر.....؟“ میں نے سوال کیا۔
”ان میں سے ایک نمبر ایسے شخص کا ہے جسے میں ذاتی طور پر جانتا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ ”انتالیس نمبرز میرے سیل فون کی میموری کے لیے انجان تھے لیکن جیسے ہی میں نے چالیس واں نمبر ٹرائی کیا، میرے سیل فون کی اسکرین پر نزاکت شاہ کا نام ابھر آیا۔ یعنی وہ نمبر نام کے ساتھ میرے سیل فون میں فیز ہے۔“

”یہ نزاکت شاہ کون ہے؟“ میں نے سرسراہٹ ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔

”نزاکت شاہ کے بارے میں، میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“ وہ پھر سے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہی کہا تھا نا کہ تمہیں ایک ایسی ہستی کی تلاش ہے، یہ چالیس افراد کی نہ کسی حوالے سے مختلف اوقات میں جس سے وابستہ رہے ہیں؟“

”ہاں..... میں نے تمہیں یہی بتایا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔

”کیا تمہاری مطلوبہ ہستی کوئی خاتون ہے؟“ اس نے پوچھا۔
”ہاں..... ہاں.....“ میرے دل کی دھڑکن میں اضافہ ہو گیا۔

”کیا اس خاتون کا نام سلتی ہے.....؟“ عظیم نے استفسار کیا۔

”جے ساختہ میرا ہاتھ پکپکایا اور سیل فون ہاتھ سے پھسل کر بیڈ کے اوپر جا گر.....!“

”امدگوں حوصلوں اور اہوں کے بیچ رلائی۔ کبھی محبتوں اور چاہتوں کے مدھر گیت سنائی اس ناقابل فراموش داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ کریں

سستمبر 2017ء

224

سسپنس ڈائجسٹ



آرٹسٹ

سلیم انور

فنکار اگر اپنی فنکاری سے متاثر نہ کر سکے تو زندگی کے کسی مقام پر اسے پذیرائی نہیں ملتی مگر... یہاں پذیرائی سے بے پروا وہ ایک ایسی فنکارہ ثابت ہوئی جس کے فن نے انتہائی کنھن مراحل میں کسی دوست کے مانند اس کا ساتھ دیا۔ گویا وہ اور اس کا فن ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تھے۔

مصیبت اور بے بسی کے عالم میں ایک دور اندیش آرٹسٹ کا کارنامہ

کیے تھرائن اپنی بینک کی ملازمت سے زیادہ خوش نہیں تھی۔ وہ اس وقت تک اسے محض پوریت سمجھتی تھی جب تک اس کی ملاقات فریک گڈمین سے نہیں ہوئی۔
کیے تھرائن، گلف اسپرٹس، مس سی سی پی کے مارش لینڈ بینک میں پارٹ ٹائم کیشیئر تھی۔ اس کے کام کی وضاحتی شیٹ پر اس کی حقیقی پوزیشن کہیں بھی درج نہیں تھی۔ البتہ اس سے جزوقتی کیشیئر، سیکریٹری اور سلائی انچارج سب ہی کام لیا جاتا تھا۔ البتہ ایک کام کی اسے اجازت نہیں تھی.....

قرضوں سے متعلق درخواستوں کو پروسس کرنا۔

یہ کام براچ فبجریڈیوڈ ہیورڈ کا تھا جو کہ اس معاملے میں مکمل اختیار رکھتا تھا کیونکہ اسے اور کوئی کام زیادہ نہیں آتا تھا۔

کیئٹھرائن کی دفتہ داریاں تین حصوں پر مبنی تھیں۔ اول کسٹمرز کی شکایات اور معلومات کو ہینڈل کرنا اور ضرورت پڑنے پر کیشیئر کی حیثیت سے کام کرنا۔ دوم بینک فبجریڈیوڈ ہیورڈ کو صبح کے ٹائم کافی بروقت پیش کرنا اور اسے ٹینی بنانا اور سوم براچ فبجریڈیوڈ کو آفس سپلائیز فراہم کرنا اور ان کا آرڈر دینا۔ آفس سپلائیز میں کاغذ، پیپر کلپس، کیلنڈرز سے لے کر پرنٹر کے کارٹریجز سب ہی کچھ شامل تھا۔

بینک میں اپنے روزمرہ کے کام کے دوران کبھی بکھار کیئٹھرائن کو اگر موقع مل جاتا تو وہ ایک کام سے بے حد لطف اندوز ہوتی تھی۔ یہ کام وہ کافی کے وقتے یا لچ بریک کے دوران کیا کرتی تھی۔ بینک کے عقبی دفاتر اور ہال ویز کی جو دیواریں بھی لگی تھیں اب اس کی فطری صلاحیت کا منہ بولا ثبوت تھیں۔ تمام دیواریں تصویروں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان میں اسکیٹچز، لائن ڈرائنگز، پورٹریٹس، لینڈ اسکیپس اور ہر وہ شے شامل تھی جو تصور میں آسکتی تھی۔ یہ تصاویر ہینسل، چارکول، روشنائی اور حتیٰ کہ ڈائریکٹرز سے بنی ہوئی تھیں۔

کیئٹھرائن ایک آرٹسٹ تھی..... ایک فطری مصورہ! اور اگر اس کی تصویریں نظروں کو پہنچا لیتی تھیں تو اس سے زیادہ دل آویز اس کو ان تصویروں کو تخلیق کرتے ہوئے دیکھنا ہوتا تھا۔ وہ نہایت پرسکون انداز میں پوری درستی، مہارت اور مشائقی کے ساتھ بغیر کسی مشقت کے اپنے کام میں مگن رہتی تھی۔

کسی بھی پرانی کار، بائیکل یا فیلپوری ٹرک کا تفصیلی خاکہ یا بینک کی کھڑکی کے باہر موجود کسی بھی شے کا اسکیچ بنانا اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ وہ یہ اسکیچ صرف چند سیکنڈ میں تیار کر لیتی تھی۔ اس کے ہاتھ کاغذ پر حرکت کر رہے ہوتے تھے اور نگاہیں اس شے پر جمی رہتی تھیں۔

ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ اسے اس شے پر سے نگاہیں ہٹانا پڑتی ہوں۔ ورنہ اکثر وہ اپنا کام مکمل ہونے کے بعد ہی اس شے سے نظر ہٹاتی تھی۔

البتہ اسے ایک مسئلہ یہ تھا جس کا اکثر ذکر کیا کرتی تھی کہ وہ اپنی یادداشت کی بنیاد پر کسی چیز کی تصویر نہیں بنا سکتی تھی۔ اس کے لیے لازمی تھا کہ وہ جس شے کا اسکیچ بنانی ہو وہ اس کی نظروں کے سامنے واضح طور پر موجود ہوتا کہ وہ کاغذ پر اس کا بالکل صحیح اور مکمل خاکہ تیار کر سکے۔ ”اگر کوئی شخص جاگنگ کرتا ہو گا زمرے اور میں اس کا اسکیچ تیار کر لے گا فیصلہ کروں تو مجھے یہ امید کرنا ہوگی کہ وہ گر پڑے اور میرے سامنے ساکت پڑا رہے۔“ کیئٹھرائن نے ایک مرتبہ اپنے بینک کی ساتھیوں کو بتایا تھا۔

سچ بات یہ تھی کہ کیئٹھرائن اپنی مصوری کو سنجیدگی سے لیتی تھی۔ یہ اس کا مشغلہ اور اس کی شدید رغبت تھی۔ بینکنگ کا کاروبار خاص طور پر نوٹ پیڈز کے آرڈر کرنے کا کاروبار اس کے تصور یا اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھجانی کیفیت لانے کا قطعی کوئی سبب نہیں تھا۔

کم از کم وہ یہی سمجھتی تھی حتیٰ کہ وہ دن آن پہنچا جب فریک گڈ مین کی آمد ہوئی۔

یہ فردری کی ایک صاف ستھری سروج تھی..... وہ یہ صبح کبھی نہیں بھول پائے گی جب فریک گڈ مین سڑک پار کر کے لابی کے دروازوں میں سے گزرتا ہوا اس کی زندگی میں داخل ہوا۔

لیکن افسوس..... وہ اس کا دل لوٹنے نہیں آیا تھا۔ وہ تو مارش لینڈ بینک کے عہدہ اور باؤفا کسٹمرز کی جمع پونجی لوٹنے کے لیے آیا تھا۔

”ہر کوئی ساکت ہو جائے!“ فریک گڈ مین نے چیخے ہوئے حکم دیا۔ اس نے اپنا پستول نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں میں پہلے ہی مضبوطی سے تھام لیا تھا اور پورے منظر کو اپنی زد میں لیا ہوا تھا جبکہ اس کے دیگر دو ساتھی لابی کے پار ہال میں پھیل چکے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے ہتھیار نکال لیے تھے۔ ساتھ ہی کینوس کے خالی تھیلے بھی نکال کر کیشیئر خواتین کے چہروں کی جانب اچھالتے ہوئے انہیں نقدی تھیلوں میں بھرنے کا حکم دینے لگے۔ بینک میں موجود کسٹمرز کو انہوں نے فرش پر لیٹ جانے کا آرڈر دیا۔

سفید ٹائیکو سے مزین بڑے سے کمرے میں بلند آوازوں اور جھنجھکیاں اٹکامات کی گونج پر بینک فبجریڈیوڈ ہیورڈ تیزی سے اپنے دفتر سے باہر آ گیا۔ اس نے درشت انداز

میں اس ہلچل کو کھو رہا اور پھر جب اس نے اپنا حکم چلانے کی کوشش کی تو فریک گڈمین کے ساتھیوں میں سے ایک نے لورائی اس پر گولی چلا دی۔

بالآخر جب سچ و پکار قدرے محدود ہو گئی تو فریک گڈمین نے اپنا مطالعہ فوراً دہرا تا شروع کر دیا۔

”خالی تھیلوں کو کرنسی سے فوراً اور تیزی سے بھرنا شروع کر دو اور کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہ کرے اور نہ کسی سے بات کرنے کی کوشش کرے۔ جہاں تک الارم کے بین دبانے کی بات ہے تو.....“ یہ کہتے ہوئے فریک گڈمین کے ہونٹوں پر ایک عیارانہ مسکراہٹ ابھر آئی..... ”الارم سسٹم کی تاروں کے ساتھ ٹیلی فون اور بیوروٹی کیسروں کے تاری بھی ڈس کنیکٹ کیے جا چکے ہیں۔ اس لیے خواتین کیشیر الارم بین دبانے کی زحمت میں وقت ضائع نہ کریں اور تھیلوں میں نوٹ بھرتی رہیں۔ ہاں، تمام نوٹ بڑی مالیت کے ہونے چاہئیں، یہ بات دھیان میں رہے۔“

تمام خواتین کیشیر زاپنا کام تقریباً مناسی چکی تھیں کہ ان میں سے ایک نے جو اپنا تھیل سب سے پہلے بھر چکی تھی، اتفاق سے نگاہ اٹھا کر کیشیرائن کی جانب دیکھ لیا۔

اس مخصوص دن کیشیرائن سیکریٹری کی میز سنبھالے ہوئے تھی اور اس لیے اس ہلچل کے مرکز سے قدرے فاصلے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ البتہ وہاں سے ڈاکوؤں کے لیڈر فریک گڈمین کا چہرہ اسے بالکل صاف اور واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی عادت اور فطرت کے مطابق فریک گڈمین کے چہرے کی تصویر ساڑھے آٹھ بائی کیا اور انچ کے اسٹیشنری کے کاغذ پر بڑی تیزی اور مہارت سے بنانے میں مگن تھی۔

وہ شاید فریک گڈمین کی نظروں کی زد میں آنے سے بچ جاتی اگر وہ خاتون کیشیر ضرورت سے زیادہ وقت تک اسے ٹھنکی باندھے نہ دیکھ رہی ہوتی۔ فریک گڈمین تو پہلے ہی چوکنے انداز میں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا اور ہر ایک پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ اس نے جب اس خاتون کیشیر کی مسلسل توجہ کسی ایک جانب مرکوز پائی تو وہ الارٹ ہو گیا۔

اس نے خاتون کیشیر کی نظروں کا تعاقب کرتے

بہادری

تین دوست اپنی بہادری کے قصے بیان کر رہے تھے۔ پہلا دوست بولا۔ ”میں دس سال تک سائبریا کے برقانی علاقے میں رہا ہوں۔“ دوسرا بولا۔ ”میں پندرہ سال تک افریقا کے گھنے جنگلوں میں شیروں اور آدم خوروں کے ساتھ رہا تھا۔“

تیسرا بولا۔ ”دوستو بہادری میں ہوں۔ مجھے دیکھو! پورے بیس سال سے اپنی بیوی کے ساتھ رہا ہوں۔“

☆☆☆

مغربی فیشن کے دلدادہ ایک صاحب شدید گرمی اور جس کے باعث گھر میں صرف انڈریوز اور بنیان کے ساتھ ٹائی لگائے آرام کرسی پر براجمان تھے۔ ان کی اہلیہ نے پوچھا۔ ”اتنے کم لباس میں ٹائی کی جگہ لگانے کی کیا ضرورت تھی؟“ فرمانے لگے۔ ”نیک بخت کوئی مہمان آ گیا تو کیا نہ دکھاؤں گا۔“

☆☆☆

ایک پروفیسر صاحب ایک فرسٹ کلاس ہوٹل میں کافی پینے تشریف لے گئے۔ کافی دیر تک وہ گہری سوچ میں مستغرق گزار پیتے رہے۔ ویٹر بھی کافی لانا بھول چکا تھا۔ ویٹر کو کافی دیر بعد کافی لانے کا خیال آیا۔ وہ بھاگ بھاگ کافی لے کر آیا اور پروفیسر صاحب سے ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔ ”معاف کرنا سہی۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ یہ کافی ملائیشیا کی ہے اور لا جواب کافی ہے۔“ پروفیسر صاحب بولے۔

”ارے اتنی دور چلے گئے تھے شریف آدمی! میں بھی کہوں کافی اب تک کیوں نہ آسکی۔“ اطہر حسین، کراچی

اس کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

انہوں نے اشارہ پاتے ہی اطمینان کا سانس لیا اور لپک کر باہر سڑک پر نکل گئے۔

پھر جب فریک گڈ مین ان کے پیچھے دروازے کی جانب بڑھنے لگا تو اچانک رک کر پلٹا اور براہ راست کیتھرائن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ساتھ ہی اس نے ایک ہاتھ نیچے کیا اور اپنے کوٹ کی جیب چھتھپانے لگا۔

”میں اس عورت کی قدر کرتا ہوں جس میں پہل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔“ اس نے کیتھرائن سے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”عمدہ کوشش تھی!“

اور پھر وہ بھی پلٹ کر بینک سے باہر لپک گیا۔

ایک لمحے کے لیے کسی نے بھی اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی۔ بالآخر سینئر خواتین کیشیز میں سے ایک اپنے میل فون کی جانب دوڑی جبکہ دیگر بینک منیجر کے لیے بے حس و حرکت جسم کی جانب لپکے جو بدستور فرش پر موجود تھا۔ انہیں یہی محسوس ہوا کہ وہ مر چکا ہے اور اس حقیقت کی تصدیق بعد میں آنے والے تین درجن پولیس افسران کی فوج نے بھی کر دی۔

اس سے قبل بینک برانچ کا بیشتر اسٹاف یا تو اپنے ہاتھ مل رہا تھا، یا کھڑا کانپ رہا تھا یا ایک دوسرے کے شانے پر اپنا سر ٹکاے سکیاں لے رہا تھا۔ اس دوران عملے کی ایک نوجوان لڑکی کی توجہ کیتھرائن کی جانب مبذول ہو گئی جو ایک بار پھر اپنی میز پر پہنچ چکی تھی۔

وہ اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی بڑے غور سے بینک اسٹیشنری کی اس شیٹ پر نظریں جمائے ہوئے تھی جو اس نے اپنی میز پر سے اٹھائی تھی۔ اس کاغذ کا جائزہ لینے کے دوران اس کے ہونٹوں پر اطمینان بھری ہلکی سی مسکراہٹ طاری تھی۔

”کیتھرائن!“ اس نوجوان لڑکی نے پوچھا۔ ”آخر کیا ہے جس کے بارے میں تم اتنی گہری سوچ میں گم ہو؟“ کیتھرائن نے نظر اٹھا کر اس نوجوان ساتھی لڑکی کی جانب دیکھا اور پُر سکون لیکن قاتحانہ لہجے میں بولی۔ ”اس سٹیج کی کاربن کا پی ہے جو وہ ڈاکو اپنے ساتھ لے گیا ہے!“

ہوئے کیتھرائن کی جانب نگاہ سمجھائی جو بینک ڈکیت کے ایک شاندار پورٹریٹ کو فٹنگ ٹیچر دینے میں مگن تھی۔ اس پورٹریٹ کو ”بینک ڈکیت ان ایکشن“ کا عنوان دیا جاسکتا تھا۔

فریک گڈ مین نے بجلی کی سی سرعت کے ساتھ لابی اور ایڈمن ایریا کی درمیانی کڑی کی بنی ہوئی ریٹک پھلائی اور کیتھرائن کے سر پر پہنچ گیا۔ اس نے اپنے ریوالور کی نال کیتھرائن کی گولش ناک پر تان لی اور پورٹریٹ پر نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ”یہ مجھے دے دو!“

پھر اس نے اپنا دھیان اپنے عقب میں ہونے والی ایکٹیوٹی پر مرکوز کر لیا۔

کیتھرائن نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے وہ کاغذ اس کے حوالے کر دیا۔

”قابلِ تحسین!“ فریک گڈ مین نے پورٹریٹ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں میں تفریح کی ایک لہر سی چمکنے لگی۔ ”یہ دس بجے کے خبرنامے میں بہت زبردست رہتی!“

فریک گڈ مین کی ستائش کا یہ اظہار حقیقت کے لحاظ سے ناکافی تھا۔ اس لیے کہ اس نے اپنے ہاتھ میں جو کاغذ تھا ہوا تھا وہ پورٹریٹ اتنا ہی صاف اور شارپ تھا جیسے کہ کوئی بلیک اینڈ وائٹ فوٹو گراف ہو سکتا ہے!

فریک گڈ مین دیکھنے میں ایک عام سا آدمی تھا۔ اس کے سر کے بال اور چہرے کے نقش معمولی اور ناک قابلِ ذکر تھے۔ ان کے بارے میں بالکل صحیح تفصیل بیان کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ الفاظ قطعی ناکافی رہتے..... جبکہ دوسری جانب ایک تصویر!

فریک گڈ مین کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ یہ تصویر اس کے بنے بنائے کام کا ستیاناس کر سکتی تھی۔

اس نے مسکراتے ہوئے وہ پورٹریٹ اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور اپنے ریوالور کی نال لہراتے ہوئے بولا۔ ”میز سے پرے ہو جاؤ!“

پھر وہ لابی کی سمت پلٹ گیا جہاں اس کے دونوں ساتھی موجود تھے۔ جب اس نے ڈیوائسز عبور کیا اور دروازے کی سمت بڑھنے لگا تو اس نے سر کی جنبش سے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا جو بازوؤں میں رُم سے بھرے ہوئے تھیلے لٹکائے اور اپنے ہتھیار سنبھالے بے تابی سے



غلطی

اعترافِ سلیم

مجرم چاہے کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو... کہیں نہ کہیں غلطی ضرور کر جاتا ہے... وہ جو گھر کا چراغ تھی اپنے ہی گھر کو آگ لگانے والوں میں شامل ہو گئی پھر کیسے اپنا دامن جلنے سے بچا سکتی تھی۔ اس کی لاکھ پردہ داری کے باوجود تازنہ والوں نے قیامت کی نگاہ سے معاملات کی گہرائی کو دیکھ لیا تھا۔

دولت کے لالچ میں رشتوں کو فراموش کرنے والوں کا انجام

شہر کے اس حصے میں زیادہ تر ڈل کلاس لوگ رہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سرکاری نوکریاں کرنے والے، دکانیں چلانے والے اور روزی کی خاطر پورا دن محنت کرنے والے لوگ جن کے گھرانے کے مالی حالات کے گواہ تھے مگر اس محلے کے عین وسط میں محلے کی اکلوتی مسجد کے ساتھ ایک بہت خوبصورت گوتھی بھی تھی۔ محلے سے گزرتے ہوئے ہر شخص کی نگاہ اس گوتھی پر ضرور پڑتی تھی کیونکہ درمیانے درجے کے گھروں کے درمیان اس گوتھی کی شان و شوکت اور چمک دمک

ہر فرد کو حیران کر دیتی۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا۔ کوٹھی کے دونوں سیکھوٹی گارڈے ہوش پڑے تھے۔ کوٹھی میں لگے سیکھو رٹی کمرے آف تھے اور کوٹھی کا مالک میاں شبیر احمد اس وقت اپنے بیڈ روم میں ایک کرسی پر بندھا پڑا تھا۔ اس کے منہ پر شپ لگی ہوئی تھی اور اس کے سامنے اس کی دونوں بینیاں ایک صوفے پر اس حالت میں بیٹھی تھیں کہ ان کے جسم پر لباس نام کی کوئی شے نہ تھی۔ اس کی بیوی یہ دیکھ کر بے ہوش ہو چکی تھی۔ منہ پر نقاب چڑھائے دو آدمی ہاتھ میں ہسٹل پکڑے ان کے سر پر کھڑے تھے۔ تیسرا آدمی جو ان کا سر غصہ تھا، اپنی عجیب سی آواز میں بول رہا تھا۔

”آخری بار پوچھ رہا ہوں تجوری کا کوڈ کیا ہے؟ ورنہ ابھی تک تو صرف کپڑے اتارے ہیں۔“ میاں شبیر نے ہاتھ اٹھا کر اپنی شکست کا اعلان کیا۔ اس آدمی نے آگے بڑھ کر شبیر کے منہ سے شپ اتاری۔

”ہاں بول۔“ میاں شبیر نے جھکاتے ہوئے تجوری کا کوڈ بتا دیا۔ یہ جدید ڈیزائن کی تجوری تھی جس کا لاک توڑ نہیں جاسکتا تھا۔ اس شخص نے تجوری کھول دی۔ حیرت سے ان تینوں کا منہ کھل گیا۔ ان کے اندازے سے کہیں زیادہ سونا اور کروڑوں روپے کی رقم اس میں موجود تھی۔ انہوں نے ایک بیگ میں سونا اور پیسے ڈالے اور بیگ کی زپ بند کی۔ شکیب پانچ منٹ بعد ایک سوزو کی گلٹس محلے سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑ رہی تھی۔

☆☆☆

میاں شبیر کی شہر کی مین مارکیٹ میں کئی دکانیں تھیں۔ ماہانہ لاکھوں کے حساب سے کمانے والے میاں شبیر کے پاس کروڑوں کے حساب سے دولت کیوں ہے؟ اس کی وجہ چند لوگ ضرور جانتے تھے۔ میاں شبیر سود پر لوگوں کی چیزیں رکھتا۔ اس کے پاس روزانہ بڑے کاروبار کرپنے والے لوگ قرضہ لینے آتے تھے۔ وہ سونا اور مکان پر رقم دیتا۔ بینکوں کی نسبت میاں شبیر بہ آسانی لوگوں کو پیسے دیتا جس کی وجہ سے اس کے پاس کافی گاہک آتے تھے۔ میاں شبیر کی عمر چالیس سال سے اوپر تھی۔ اس کی دو بینیاں تھیں، سترہ سال کی زرینہ اور پندرہ سال کی زرینہ۔۔۔۔۔ میاں شبیر کی بیوی زرینہ اس وقت تمام خصوصیات تھیں جو امیر لوگوں کی بیویوں میں ہوتی ہیں۔ چالیس سال کی عمر میں بھی اس نے خود کو سنہال کر رکھا ہوا تھا اور کہیں سے بھی دو جوان بچیوں کی ماں نہیں لگتی تھی۔ وہ اپنے ارد گرد کے چھوٹے لوگوں کو منہ نہیں لگاتی تھی۔ بیگم کی تمام تر مخالفت کے باوجود میاں شبیر نے

گھر اپنے آبائی علاقے میں ہی بنایا تھا۔ اس وقت ان کے گھر میں پولیس کے اہلکار گھوم رہے تھے۔ ڈرائنگ روم میں انسپکٹر شہزاد پولیس والوں کے روایتی سوال پوچھ رہا تھا۔ ”آپ کو کسی پر شک ہے؟“

”آپ کی کسی سے دشمنی؟“ میاں شبیر کا کہنا تھا وہ یہ نہیں دیکھ سکے کہ ڈاکو۔۔۔۔۔ پیسے اور سونا کس چیز میں ڈال کر لے گئے ہیں جبکہ باقی ساری تفصیلات انہوں نے جزئیات کے ساتھ بیان کر دیں مگر اس سوال کا جواب زرینہ نے اچانک دے دیا کہ وہ بھروسے رنگ کا ایک بیگ تھا۔ زرینہ نے بس یہاں تک بتایا کہ جب انہوں نے زرینہ اور زرینہ کو باندھ کر برہنہ کر کے بعد انہیں ہوش نہیں رہا۔ گھریلو ملازمین بھی قہقہے سے گزر رہے تھے۔ دو گھنٹے بعد باہر آکر انسپکٹر شہزاد گاڑی میں بیٹھ گیا اور تمام صورت حال پر غور کرنے لگا۔ میاں شبیر کا کاڈ اثر رسوخ تھا اس لیے اس ڈکیتی کے بعد انسپکٹر کوئی فون موصول ہوئے۔ افسران کا پریشر بہت زیادہ تھا۔

”فاروق۔۔۔۔۔!“ اس نے باہر کھڑے سپاہی کو آواز دی۔ فاروق اس کے ماتحت تمام لوگوں میں سب سے زیادہ ذہین تھا۔ قریب آئے پر اس نے فاروق کو اندر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”کیا لگتا ہے؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”سرا کوئی گھر کا باندھ ملوث ہے۔ ڈاکو پوری طرح لوکیشن سے واقف تھے اور صرف ایک تجوری ہی اوپن کروائی اور باڈی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔“ فاروق نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

”گھر میں تمام لوگوں کے موبائل نمبر اور ڈیٹا نکلواؤ۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ تمام ملازمین کی تفصیل لو۔ شام تک سارے معلومات مجھے چاہیے۔“

☆☆☆

یہ اسی کوٹھی کے ایک کمرے کا منظر تھا۔ ہاتھ میں سادہ سا موبائل پکڑے وہ جلدی جلدی نمبر مل رہی تھی۔ ”کیا ہے کیوں میسج پر میسج کر رہے ہو؟“ وہ غصے سے بولی۔ ”مجھے کچھ مرواؤ گے اور خود بھی پھنسو گے۔ اب آرام کرو، تین چار دن کال مت کرنا۔“

”بتاؤ تو کسی پولیس کی قہقہے کہاں تک پہنچی؟“ دوسرے طرف سے وہی عجیب سی آواز آئی۔

”بعد میں بات ہوگی ابھی سارے بارہ بیٹھے ہیں۔“

”زرینہ۔“ باہر سے آواز آئی۔

”اچھا کوئی آ رہا ہے؟“ اس نے جلدی سے فون بند کر لیا اور باہر نکل گئی۔

☆☆☆

”ایک کام کرو۔“ شیخ زاد نے کہا اور فاروق کو سمجھانے لگا۔ دس منٹ بعد فاروق پولیس اسٹیشن سے روانہ ہو گیا۔ یہ دوسرے دن شام کی بات تھی فاروق نے تمام تر تفصیلات اس کے سامنے رکھ دیں۔

”یہ تو ٹیکس ہی حل ہو گیا سر جی۔“ فاروق مسکراتے ہوئے بولا۔

”کیا؟“ شہزاد نے چونک کر اسے دیکھا۔
”میاں شبیر کے بچکے پر دو بیکو رٹی گاڑ دی ہیں، اس رات دونوں ہی بے ہوش پائے گئے مگر ان کے سر پر نہ کوئی وار کیا گیا اور نہ ہی کسی اور طرح سے زخمی یا بے ہوش کیا گیا۔ ان کے بیان کے مطابق اس رات دونوں معمول کے مطابق چائے پی کر اپنی ڈیوٹی پر گئے تھے۔۔۔۔۔“
”اس کا مطلب ہے چائے میں بے ہوشی کی دوا تھی۔ اوہ یہ بات توجہ میں ذہن سے نکل گئی۔“ شہزاد نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”چلو آؤ۔“
دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پولیس اسٹیشن سے باہر آ گئے۔ آدھے گھنٹے بعد میاں شبیر کا باورچی زاہدان کے سامنے تھا۔ ”کب سے کام کر رہے ہو یہاں؟“ شہزاد نے سوالوں کا آغاز کیا۔

”جی پانچ سال ہو گئے ہیں۔“ زاہد بولا۔
 ”اچھا اس سے پہلے کہاں کام کرتے تھے؟“
 ”ملک سعید کی کوٹھی پر۔“ زاہد نے ایڈریس بتادیا۔
 ”اچھا تو اس رات تم نے سکیورٹی کارڈز کی چائے میں
 کیا ملا تھا۔“ فاروق نے اچانک سوال کیا۔

”کھک کیا سر..... میں نے کیا ملانا ہے۔ میں تو بس چائے بنا کر دے کر آ گیا تھا۔“ فاروق نے چند سوال گھما پھرا کر کیے مگر زہدا سے یہ قصور لگا۔ زہدا کا کہنا تھا کہ وہ چائے پیالیوں میں ڈال کر چند منٹ کے لیے واٹس روڈم کیا تھا اور کوئی اہم بات نہیں ہوئی تھی۔ فاروق اور شہزاد ابہر آ گئے۔

☆☆☆

میاں شبیر کے گھر ہونے والی ڈکیتی کو ایک ہفتہ گزر گیا مگر مجرموں کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ انپکسٹر شہزاد اس دن پھر سب لوگوں کے بیان دوبارہ پڑھ رہا تھا۔ ایک بیان پر وہ رک گیا۔ کوئی بات بار بار اس کے ذہن میں آ رہی تھی مگر اس کی

پرچا
نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچان نہیں ملتا۔ یجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچان ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پر چادستیا بنے ہو۔

☆ شہر اور علاقے کا نام -

☆ ممکن ہو تو یک اسٹال کا PTCL یا موبائل نمبر۔

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

0301-2454188 **ثمر عباس**

جاسوسی ڈائجسٹ پیلی کیشنز

سپنس، حاسوی، یاکیزه، سرگزشت

63-C فیۃۃ السینینش دیننس باؤسٹ اتھارٹی میں کوئی رہائشی

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

35802552-35386783-35804200

جی ڈی پی گروپ: jdpgroup@hotmail.com

”ہاں چلو آؤ ذرا میاں شیر کے گھر کا چکر لگا لیں۔“
اُدھے گئے بعد وہ میاں شیر کی ٹہلی کے سامنے بیٹھے تھے۔
”کیا ہوا انکسٹر صاحب کوئی خاص بات ہوئی ہے؟“
میاں شیر نے پوچھا۔

”جی ہاں، آپ کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے آیا تھا کہ
آپ کا مجرم پکڑا گیا ہے۔“ شہزاد مسکراتے ہوئے بولا۔
”کیا.....“ سب کے منہ کھل گئے۔ ”مگر کیسے
اور کب؟“ زئیرا بولی۔

”ابھی کچھ دیر پہلے..... امامیہ ٹاؤن کے ایک
گھر سے..... گلی نمبر پانچ اور مکان نمبر اٹھارہ.....“ شہزاد نے
جواب دیا۔

”مگر زین تو وہ گھر کب کا چھوڑ چکا ہے۔“ زئیرا کے منہ
سے بے اختیار نکلا۔

”اوہ بہت تیز ہیں آپ مسز شیر..... صرف گھر کا
ایڈریس بتانے سے آپ کو مجرم کا نام پتا چل گیا۔“ شہزاد نظریہ
لجے میں بولا۔

”سک کیا مطلب..... زئیرا اتم کیسے جانتی ہو اسے؟“
میاں شیر نے سخت لہجے میں پوچھا مگر زئیرا جواب دینے کی
پوزیشن میں نہیں تھی۔

”صرف بیگم صاحبہ ہی نہیں آپ بھی جانتے ہیں
سر..... کچھ دن پہلے دس تو لے سونا دے کر جو تین لاکھ کی رقم
لے گیا تھا سود پر..... صاحب نام بتایا تھا اس نے..... وہی
اصل میں زین ہے۔ آپ کی بیگم کا چھوٹا بھائی جو تین سال پہلے
جیل بھی جا چکا ہے۔“

☆☆☆

زئیرا کا تعلق ایک لوئر مڈل کلاس خاندان سے تھا۔ بے
حد حسین زئیرا ہمیشہ اونچے خواب دیکھتی تھی اور اس سے دو سال
چھوٹا زین بہن کا مکمل فرما بنہ دار تھا۔ زئیرا اٹھارہ سال کی تھی
جب باپ کے بعد ماں کا بھی انتقال ہو گیا تھا۔ گھر میں باپ کی
پنشن سے دونوں بہن بھائی گزارہ کرتے تھے۔ ماں کے
مرنے کے بعد زئیرا اتمام پابندیوں سے آزاد ہو گئی۔ اس نے
ایف اے کیا تھا۔ ایک پرائیویٹ دفتر میں ٹیلی فون آپریٹر کی
جاب کرنے والی زئیرا نے بہت جلد شکار بھانسنے شروع
کر دیے۔ لوگ اس کی معصوم شکل سے آسانی سے
دھوکا کھا جاتے پھر ایک دن ایم ڈی صاحب جو اس کی زلفوں
کے اسیر تھے، ان کی بیگم صاحبہ نے زئیرا کو آفس سے فارغ
کر دیا۔ زین بھی بری محبت میں رہ کر نشے اور شراب کی لت
میں پڑ چکا تھا۔ زئیرا نے بہت جلد میاں شیر کی ایک دکان

پر سیلز گرل کی نوکری حاصل کر لی اور اس بار خود مالک ہی
دھوکا کھا گیا۔

میاں شیر سے شادی کے بعد زئیرا نے خود کو کافی بدل
لیا۔ اس نے میاں شیر کو بس یہی بتایا کہ وہ یتیم ہے اور ایک
دو س ہاٹل میں رہتی ہے۔ اس دوران زین جو دو تین بار کچھ
ماہ کے لیے جیل کی ہو اکھا چکا تھا، ایک ڈپٹی کی واردات میں
پکڑا گیا۔ کافی عرصہ جیل میں گزارنے کے بعد جب واپس
آیا تو زئیرا کو تلاش کرنے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی۔ ساتھ ہی
اس نے بہن کو بلیک میل کرنا شروع کر دیا کہ وہ میاں شیر کو اس
کے ماضی کے بارے میں سب بتا دے گا۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے
چنگل میں پھنس گئی۔ پہلے دس تو لے دے کر اپنے ہی شوہر سے
سود پر دم دلائی پھر ڈپٹی کی واردات میں حصہ دار بن گئی۔ وہ
ایک سستا موپائل اور دم لے کر بڑی بیٹی زرینہ کے کمرے میں
بیٹھ کر زین سے رابطہ کرتی تھی۔

☆☆☆

زئیرا ایک سائڈ پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔ ”زین گرفتار
نہیں ہوا اب اس کا ایڈریس بتا دیں مسز شیر۔“ زئیرا نے ہار
مانتے ہوئے ایڈریس بتا دیا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ
تھا۔ زین کو اس کے دونوں دوستوں سمیت گرفتار کر لیا گیا
اور میاں شیر کو اس کی ساری دولت واپس مل گئی۔ میاں
شیر نے زئیرا کو کھلے دل سے معاف کر دیا۔ اس شام
شہزاد اپنے آفس میں بیٹھا تھا جب فاروق اندر داخل ہوا۔

”سر! ایک سوال پوچھنا ہے۔“ وہ بولا۔
”یہی نا کہ آخر مجھے کیسے پتا چلا بیگم زئیرا گھر کی بھیدی
ہے؟“ شہزاد مسکراتے ہوئے بولا۔

”جی۔“ فاروق نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
”بیگم زئیرا کا کہنا تھا جب ان کی بیٹیوں کو باندھ
کر رہ نہ کیا گیا تب وہ بے ہوش ہو گئی تھیں اور انہیں اس وقت
ہوش آیا جب مجرم بھاگ چکے تھے اور میاں شیر کو زینہ وغیرہ
نے کھول دیا تھا..... لیکن جب میں نے میاں شیر سے
پوچھا کہ مجرموں نے پیسے اور سونا کس چیز میں ڈالے ہیں تو ان
کے بچائے زئیرا بیگم نے جواب دیا کہ ایک بھورے رنگ کے
بیگ میں..... تجھی مجھے شک ہوا اور میں نے تمہیں بیگم صاحبہ کی
تفصیل جاننے پر لگا دیا۔ کیس حل ہو گیا۔“

”ٹھیک کہتے ہیں سر، مجرم چاہے جتنا ذہین کیوں نہ ہو،
کوئی نہ کوئی غلطی ضرور کرتا ہے۔“ فاروق مسکراتے ہوئے بولا
اور سیلیوٹ مار کے باہر چلا گیا۔

”میں اس بے حجابی کو پسند نہیں کرتا۔ اگر کپڑوں سمیت پانی میں اتر جاؤں تو پیسنے کے لیے دوسرے کپڑے نہیں ہیں۔“ مالک بن زغر جس سے وہ بہت مانوس ہو گئے تھے، بہت کہا لیکن وہ نہ مانے۔ آخر یہ تجویز رکھی گئی کہ چشمے سے پانی لے کر درختوں کے جھنڈ میں چلے جائیں اور وہاں نہا کر یہی کپڑے پہن لیں۔ جب مصر پہنچیں گے تو نئی پوشاک خرید کر پہنا دی جائے گی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے چشمے سے پانی پیرا اور درختوں کے جھنڈ میں چلے گئے۔ ان کے پاؤں میں رسی

اللہ کے ایک حلیل القدر پیغمبر کی سوانح حیات کے سبق آموز پہلو

حضرت یوسف علیہ السلام

رضوانہ صاحبہ

اللہ رب العالمین نے تمام انسانوں کی اصلاح کے لیے نہ صرف مختلف پیغمبر دنیا میں بھیجے کہ وہ اپنے رب کا پیغام حق لوگوں تک پہنچائیں بلکہ... ان پیغمبروں کی تمام زندگی بھی عملی طور پر اسی حق گوئی کی تفسیر بنادی گئی... جیسے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا ہر لمحہ کٹھن آزمائشوں اور صبر و استقامت کی اعلیٰ مثال بن کے بنی نوع انسان کے لیے سبق آموز ٹھہرا... کیونکہ آپ کے لیے کڑی آزمائشوں کا سلسلہ تو بچپن سے ہی شروع ہو چکا تھا کہ جب آپ کے بھائیوں نے آپ کو مصر کے بازار میں پہنچایا اور بچپن کا وہ خواب کہ جس میں آپ کی عظمت کی بشارت دی گئی اور گیارہ ستاروں نے آپ کو سجدہ کیا... پھر دھیرے دھیرے وقت نے ثابت کیا کہ خوابوں کی تعبیر کا ایسا سچا علم آپ کو عطا کیا گیا جس کے ذریعے نہ صرف زلیخا کے دیے گئے جہان سے نکلنے میں کامیاب ہوئے بلکہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی نکلنے کا راستہ نکلا اور آپ کی تمام دعاؤں کو قبولیت بخشی گئی... سبحان اللہ۔

دوسرا حصہ



باندھ کر اس کا سرا حانفتوں کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

مالک بن زغر آپ کی اس شرم و حیا پر حیران ہو رہا تھا۔ اس کی حیرانی اس وقت اور بڑھ گئی جب غسل کر کے واپس آئے اور اس نے ان کے جسم پر نئے کپڑے دیکھے۔

”تمہارے پاس کپڑے تو تھے نہیں پھر یہ نئے کپڑے کہاں سے آ گئے؟“

”یہ کپڑے آپ لوگوں نے نہیں رکھے تھے؟“

”نہیں۔“

”پھر مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں نے نہانے کے بعد پیٹھ پھیری تو میرے کپڑے وہاں موجود نہیں تھے۔ ان کی جگہ یہ نئے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ میں سمجھا آپ لوگوں نے رکھے ہوں گے۔“

مالک بن زغر سر سے پاؤں تک کا پ گیا۔ یہ کوئی عام بچہ نہیں ہو سکتا۔ نہانے کے بعد حسن و جمال بھی ایسا گھبراہٹ کا تھا کہ نظریں نہیں پھریں تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا مالک بن زغر غلام ہے اور یوسف اس کے آقا۔

”اے غلام سچ تا تیری حقیقت کیا ہے؟“

”اگر سچ سنا چاہتے ہو تو سچ یہ ہے کہ میں اپنے رب کے سوا کسی کا غلام نہیں۔ جو لوگ یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ میں ان کا غلام ہوں، وہ جھوٹ بول رہے تھے۔ وہ میرے مالک نہیں میرے بھائی تھے۔ مجھ سے حسد کرتے تھے۔ ان کے حسد ہی نے انہیں یہ راہ سمجھائی کہ وہ مجھے کنوئیں میں پھینک دیں اور میں وہیں مرھک جاؤں۔ یہ تو میری قسمت تھی کہ میں آپ لوگوں کے ہاتھ لگ گیا اور میری جان بچ گئی۔ آپ نے میری قیمت ادا کی ہے اس لیے اب تو میں آپ کا غلام ہی ہوں۔ جو چاہیں میرے ساتھ سلوک کریں۔“

مالک بن زغر ان باتوں سے متاثر ہوا۔ سمجھ گیا کہ یہ لڑکا کسی اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ یہ خیال بھی آیا کہ اسے اپنا بیٹا بنا لیں لاکھوں روپے کا لالچ تھا جس نے فوراً دامن پکڑا۔ اپنے گناہ سے چھٹکارا پالینے کے لیے یہ جواز بھی فوراً ذہن میں آیا کہ اگر یہ حقیقت کنعان ہی میں کھل جاتی تو میں اسے اس کے گھر تک پہنچا دیتا لیکن اب بہت وقت گزر گیا۔ انسانوں کی منڈی چند قدم پر ہے۔ وہاں پہنچنے ہی لوگ ٹوٹ پڑیں گے۔ ایسا حسین غلام اس سے پہلے کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ بیویاں یوں میں میری ساکھ بھی بڑھ جائے گی کہ میں کیسے اچھے غلام لاتا ہوں۔ اس کے بعد بھی مصر آیا تو میرا مال کھڑے کھڑے بک جایا کرے گا۔

یہ قافلہ اس رات مصر کے باہر چشمے کے پاس پڑاؤ کیے رہا۔ مالک بن زغر نے حضرت یوسف علیہ السلام کی رسیاں کھول دیں اور انہیں خوش رکھنے کے لیے مزے مزے کی باتیں کرتا رہا۔

رات کے کسی پہر میں قافلہ روانہ ہوا۔ ابھی دن پوری طرح بیدار نہیں ہوا تھا کہ یہ قافلہ مصر میں داخل ہوا۔ اللہ اکبر! کسے معلوم تھا کہ اس قافلے میں ایک نبی زادہ شامل ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پڑپوتا ہے اور غلام کی حیثیت سے فروخت ہونے جا رہا ہے۔

دروازہ شہر پر کھڑے محافظوں نے ایک ایک اونٹ کا جائزہ لے کر اندر جانے دیا۔ اس اونٹ کو کچھ کرٹھک لگے جس پر حضرت یوسف، مالک بن زغر کے ساتھ بیٹھے تھے۔

”یہ لڑکا کون ہے؟“

”غلام ہے، فروخت کے لیے لایا ہوں۔“

”یہ تو کس سے بھی غلام نہیں لگتا۔ کسی بھدی شکل والے کا بیٹا بھی نہیں لگتا۔“ محافظ نے مالک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”غلام تو ہر طرح کے آتے ہیں۔“

”کتنی قیمت لوگ اس کی؟“

”غلام گاہ میں آ جانا۔ ابھی تو مجھے بھی نہیں معلوم کتنی قیمت لوں گا۔“

”اگر میں اسے یہیں خرید لوں اور تمہیں غلام گاہ تک نہ جانے دوں؟“

”فزعوں کے دربار میں میری شکایت جائے گی۔ یہ کون سا طریقہ ہے کسی کو روکنے کا۔“

”میرا جی تو یہی چاہتا تھا کہ ایسا ہی کروں لیکن کیا کروں اسے میں بھی غلط سمجھتا ہوں۔ بہر حال اس دروازے سے آج

تک یکڑوں غلام گزرے ہوں گے لیکن میں نے ایسا غلام اس سے پہلے نہیں دیکھا۔“
مصر پہنچتے ہی قافلے میں شامل تاجر اپنی اپنی اجناس لے کر ادھر ادھر پھیل گئے مالک بن زغر حضرت یوسف علیہ السلام کو
نے کر ایک سرائے میں چلا گیا۔

دروازہ شہر سے لے کر سرائے تک کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا لیکن سرائے میں پہنچتے ہی مالک پر یہ عقدہ کھل گیا کہ پورے شہر
میں حسن یوسف کے چرے پھیل چکے ہیں۔

اسے سرائے پہنچے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سرائے کے باہر لوگوں کی بھیڑ جمع ہونے لگی۔ یہ لوگ حضرت یوسف علیہ السلام کو
ایک نظر دیکھنے کے مشتاق تھے۔ مالک کے تجارتی ذہن نے کمائی کا ایک بہترین ذریعہ دھونڈ لیا۔ اس نے بہت معمولی سی ایک
رقم مقرر کر دی کہ یہ رقم ادا کرو، یوسف کو قریب سے دیکھو اور چلے جاؤ۔
یہ سلسلہ کئی دن تک چلتا رہا۔

یہ شہر جہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو لایا گیا، مصر کا دار السلطنت رمیس تھا۔ جغرافیائی حیثیت سے اس کا جائے وقوع
مشرق کی جانب دریاے نیل کے قریب تھا۔

شہر کے ایک ایک گھر میں چرے چرے ہو رہے تھے کہ کنعان کی طرف سے ایک قافلہ آیا ہے۔ اس قافلے میں ایک غلام بھی
ہے جو فروخت کے لیے آیا ہے۔ اس کا مالک اس کے چہرے پر نقاب ڈالے رہتا ہے کہ اس کے لاثانی حسن کو کسی کی نظر نہ لگ
جائے۔ لوگ قیمت ادا کر کے اس کے حسن کا دیدار کرتے ہیں۔ جو اس غلام کو دیکھ آئے تھے، وہ قدرت کی کرشمہ ساز یوں کے
گمن گار رہے تھے۔

ہوتے ہوتے یہ چرے شاہی خاندانوں تک بھی پہنچے۔ ان گھروں میں ایک گھر مصری افواج کے شاہی افسر ”قوطیخار“
کا بھی تھا۔ یہ شخص فرعون مصر کے بعد دوسرا مرتبہ رکھتا تھا اور عزیز مصر کہلاتا تھا۔

یہودی روایات کے مطابق عزیز مصر کی بیوی کا نام زلیخا جبکہ بعض اسلامی روایات میں راعیل بتایا گیا ہے البتہ قرآن
پاک میں صرف ”عزیز کی بیوی“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ زلیخا لفظ زلیخہ اور زلیخا سے مشتق ہے جس کے معنی ہسلنا
یا دروازے کو بند کرنا ہے۔ ہو سکتا ہے بعد میں واقعے کی نسبت سے روایات میں زلیخا کا لفظ استعمال کیا گیا ہو۔ اہم اسے لیب
بھی کہہ سکتے ہیں۔

قوطیخار عزیز مصر ایک دن فرعون کے دربار سے اپنے محل میں آیا۔ کینیزوں اور غلاموں کے جھرمٹ سے گزرتا ہوا
خواب گاہ میں پہنچا تو زلیخا کو معمول سے زیادہ خوش دیکھا۔

”تم اسی طرح خوش رہو۔ پھر بھی بات کیا ہے، کیوں اتنی خوش ہو چ“
”میں نے سنا ہے ایک کنعانی غلام آ کر ٹھہرا ہے۔ اس کی خوب روٹی کے چرے عام ہو رہے ہیں۔ دیکھنے والے کہتے ہیں
کوئی فرشتہ ہے جو زمین پر اترا آیا ہے۔ میں نے سوچا ہے میں بھی اسے دیکھنے جاؤں۔“

”تم عزیز مصر کی بیوی ہو۔ ایک معمولی غلام کو دیکھنے جاؤ گی؟“
”یہ مت بھولے کہ میں بھی ایک حکمران کی بیٹی ہوں۔ مجھے معلوم ہے یہ بے بندش بہت سے مواقع پر ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔“
”میں نے تم پر پابندی نہیں لگائی لیکن میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔“

”کیا سوچ رہے ہیں۔ آپ کے سوچنے سوچنے وقت گزر جائے گا۔ اسے کوئی اور لے کر چلتا بنے گا۔“
”ایسا نہیں ہوگا۔ میں ابھی دربار سے آ رہا ہوں۔ بادشاہ نے اس غلام کے مالک کو پیغام بھجوادیا ہے کہ وہ ایک غلام سے اس
طرح دولت کماتا بند کر دے اور اس غلام کی باقاعدہ ٹیلائی کا اعلان کرے۔ شاید کل تک اسے غلام گاہ میں پہنچا دیا جائے۔“
”یہ تو آپ نے اور بھی بُری خبر سنائی۔ اسے تو غلام گاہ سے کوئی بھی خرید کر لے جائے گا۔ میں تو اسے دیکھنے سے ہی
مکئی۔ دیکھتی تو سہی کہ کوئی انسان کتنا خوبصورت ہو سکتا ہے۔“

زلیخا کی شادی کو کئی سال ہو گئے تھے۔ وہ ابھی تک اولاد سے محروم تھی۔ عزیز مصر نے اس کی اداسی کو دور کرنے کے
لیے کئی مرتبہ چاہا تھا کہ وہ کسی کی اولاد لے کر پال لے لیکن زلیخا کی غیرت کو یہ گوارا نہیں تھا۔ زلیخا کا اشتیاق دیکھ کر عزیز
نے ایک مرتبہ پھر یہ پیشکش کی۔

”اگر اس نوعمر غلام کو ہم خرید لیں اور اسے اپنا بیٹا بنالیں تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟“

”یہ فیصلہ تو اسے دیکھنے کے بعد ہی کر سکوں گی۔ اگر وہ واقعی اتنا خوبصورت ہے جتنا کہا جا رہا ہے تو مجھے آپ اپنا ہم خیال بھیجے گا۔“

”پھر کل تک انتظار کرو۔“

”نیلای کی کیا ضرورت ہے۔ اسے براہ راست کیوں نہیں خرید لیتے؟“
”مصر میں بہت سے لوگ اس کی خریداری کے مشتاق ہیں۔ اگر میں نے خرید لیا تو جانفتوں کے طوفان اٹھ کھڑے ہوں گے۔“

”پھر آپ بولی دینے میں پیچھے نہ رہیے گا۔“

”سنائے فارم نام کی ایک ریش زادی خجروں پر دولت لاد کر لائی ہے۔ سرائے کے سامنے پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔ نیلای کا اعلان سننے ہی نيلام گاہ پہنچ جائے گی۔“

”آپ کو اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا تمام زور لے کر نيلام گاہ میں جائیے گا۔“
مالک بن زغر نے نیلای کا اعلان کر دیا۔ تمام خریداروں کے لیے اذن عام تھا۔ جس کی بولی زیادہ ہوگی یوسف اس کے حوالے کر دیے جائیں گے۔

مصر میں یہ پہلا موقع تھا جب کسی غلام کے لیے نیلای ہو رہی تھی۔
مقررہ دن جب نیلای کا میدان سجا تو مالک نے ایک بڑا قافلین بچھا کر ایک کرسی ڈال دی جس پر یوسف علیہ السلام کو بٹھا دیا گیا۔ جو صرف اس وقت اٹھائی جاتی تھی جب نیلای کا آغاز ہو۔

میدان میں ہجوم اکٹھا ہوتا جا رہا تھا۔ کہتے ہیں اس ہجوم میں ایک بڑھیا بھی شامل تھی جو اپنے ہاتھ سے کاتے ہوئے سوت کا ایک لٹچا لے کر آئی تھی اور یہ سمجھے ہوئے تھی کہ اس کے بدلے حضرت یوسف علیہ السلام کو خرید جاسکتا ہے۔

نیلای کا آغاز ہونے ہی والا تھا کہ شاہی فرمان آ گیا۔ ”جب تک عزیز مصر نيلام گاہ میں نہ پہنچ جائیں، نیلای شروع نہ کی جائے۔“

ہجوم شور مچا رہا تھا کہ نیلای شروع کی جائے لیکن جیسے ہی یہ اعلان ہوا لوگوں کے چہروں کی رونق ماند پڑ گئی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اب وہ یوسف کو نہیں خرید سکیں گے۔ بہت سے لوگ اس آرزو میں کھڑے رہے کہ یوسف کے چہرے سے نقاب ہٹے اور وہ ان کا دیدار کر سکیں۔

زینچا کا اشتیاق ویدنی تھا جبکہ عزیز مصر نہایت اطمینان سے تیار ہو رہا تھا جیسے اسے کوئی جلدی نہ ہو۔

”آپ نے شاید یہ طے کر لیا ہے کہ اس غلام کو کوئی اور خرید لے۔“

”یہ تم نے کیسے سوچ لیا۔“

”آپ کو تو جلد سے جلد نيلام گاہ میں پہنچنا چاہیے۔ کوئی آپ کے انتظار میں بیٹھا رہے گا؟“

”ہاں، انہیں بیٹھنا پڑے گا۔ میں شاہی فرمان بھجوا چکا ہوں۔ میرے پیچھے بغیر نیلای کا آغاز نہیں ہوگا۔“

”اس کے باوجود آپ کو جلدی کرنی چاہیے۔ آپ کہہ رہے تھے بادشاہ بھی اس غلام کا مشتاق ہے۔ اگر وہ وہاں پہنچ گیا؟“

”پھر مجبوری ہوگی۔ مجھے پیچھے ہٹنا پڑے گا لیکن مجھے یقین ہے میں اسے اپنے لیے مانگوں گا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔“

”یہ وقت ہی کیوں آئے۔ آپ کو پہلے پہنچنا چاہیے۔“

”بس میں تیار ہو گیا۔“

فارم کے خچر دولت سے لدے تیار کھڑے تھے اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے سے نقاب اٹھنے کا انتظار کر رہی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ عزیز مصر کے پہنچنے سے قبل نقاب اٹھنا محال تھا۔

منادی نے آواز لگائی۔

”کوئی ہے جو اس بڑے حسب نسب والے غلام کو خریدے اور کون ہے جو اس عقل مند غلام کو خریدے۔“

منادی کی آواز اس بات کی علامت تھی کہ عزیز مصر نيلام گاہ میں آچکا ہے۔ مالک بن زغر نے حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے سے نقاب الٹ دیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے مالک سے کہا تم میری بولی یہ کہہ کر گاؤ۔ ”ہے کوئی جو اس غریب الوطن مسافر کو

مالک نے یہی کہہ کر آواز لگائی اور بولیاں لگنی شروع ہو گئیں۔

نقاب لٹتے ہی رئیس زادی فارحہ کی نظر حضرت یوسف علیہ السلام پر پڑی تو جیسے سکتہ ہو گیا۔ یہ خیال ہی دل سے نکل گیا کہ وہ یوسف کو خریدنے آئی تھی۔ وہ تو خود ان کے ہاتھوں بک چکی تھی۔ لوگ بڑھ چڑھ کر بولیاں لگا رہے تھے اور وہ خاموش کھڑی تھی۔ دولت سے لدے اس کے چہرہ اپنی مالکن کے اشارے کے منتظر کھڑے رہے۔

بولیاں لگتی رہیں اور بالآخر عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

فارحہ کو ہوش تو اس وقت آیا جب حضرت یوسف علیہ السلام کا سودا ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ حضرت یوسف علیہ السلام کو جہاں پہنچانا چاہتا تھا پہنچا دیا۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام کو یقین ہو گیا کہ وہ فردخت ہو چکے تو بے اختیار باپ کی یاد آئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کسی پکارنے والے نے پکارا۔ اس آواز کو صرف حضرت یوسف علیہ السلام سن سکے۔

”اے یوسف! دل چھوٹا مت کر۔ تیرے خدا نے تیرے لیے بہتر انتظام کر رکھا ہے۔ یہ مخلوق جو آج تجھ کو خریدنے کے لیے جمع ہوئی ہے اور تجھے غلام بنانا چاہتی ہے، میں عنقریب ان سب کو تیری غلامی میں دے دوں گا اور یہ سب تجھ کو جھک جھک کر سلام کریں گے۔“

عزیز مصر نے بھاری قیمت دے کر حضرت یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کا کاملہ کا اظہار کر دیا تھا۔ اس نے بتا دیا تھا کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ ایک مرتبہ صرف بیس درہم میں کوادیا، دوسری مرتبہ حضرت یوسف علیہ السلام کے وزن کے برابر مشک، ریشم اور چاندی کے ساتھ علیحدہ علیحدہ وزن کر کر خرید گیا۔

عزیز مصر نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اپنی سواری پر سوار کر کے گھر کی طرف چلا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی غلام کو نہیں کسی صاحب عزت کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔ اس کے دل میں خدا نے حضرت یوسف علیہ السلام کی محبت ڈال دی۔ گھر تک پہنچتے پہنچتے حضرت یوسف علیہ السلام اس کی آنکھوں کا تار اور دل کے مالک بن چکے تھے۔

اس زمانے میں مصری خود کو دنیا کی بہترین مہذب اور متقدم قوم سمجھتے تھے اور بدوی و صحرائی قبائل کو نہایت حقارت سے دیکھتے اور اپنے شہروں میں ان کے ساتھ اچھوت کی طرح معاملہ کرتے تھے۔ انہی قبائل میں سے ایک قبیلہ نسل ابراہیمی کی یادگار کنعان میں آباد تھا۔ یہاں مدینیت کا نام و نشان تک نہ تھا۔ شکار پر ان کے رزق کا مدار تھا۔ بکریوں کے گلے ان کا دھن دولت تھے۔ ایسے ماحول میں یہ قدرت ہی کی معجز نمائی تھی کہ کوئی عام مصری نہیں، وزیر سلطنت عزیز مصر انہیں اکرام و احتشام کے ساتھ اس نیت سے اپنے ساتھ لے جا رہا ہے کہ وہ انہیں اپنا بیٹا بنائے گا۔ یوسف کے پروردگار کا یہی ان سے وعدہ تھا۔

عزیز مصر گھر پہنچا تو زلیخا سے پاؤں تک آراستہ رابا انتظار بنی بیٹھی تھی۔ اسے یہ خبر مل چکی تھی کہ اس کے شوہر نے وہ غلام خرید لیا ہے۔ غرور سے اس کی گردن تنی ہوئی تھی۔ جسے کوئی نہیں خرید سکا اسے میرے میاں نے خرید لیا لیکن جو نبی عزیز مصر، حضرت یوسف علیہ السلام کو لے کر اس کے سامنے پہنچا اس کی تہی ہوئی گردن جھک گئی۔ اپنا سنگھار خاک و دھول نظر آنے لگا۔ چاند تھا کہ زمین پر اترا آ تھا۔ روشنی تھی جس نے جسم کا روپ دھار لیا تھا۔ اس بدوی (حضرت یوسف علیہ السلام) کے پاس کچھ نہیں تھا لیکن سب کچھ تھا۔ زلیخا کے پاس سب کچھ تھا مگر کچھ نہیں تھا۔ اگر تھا تو یہ غرور کہ اس نے اس غلام کی قیمت ادا کی ہے۔ اس کے نفس نے اسے دھوکا دیا کہ دولت سے سب کچھ خرید ا جاسکتا ہے۔

زلیخا کا دل بے اختیار ان کی طرف کھنچا۔ اس احساس نے دل میں شور مچا دیا کہ یہ غلام بتانے کے لائق نہیں۔ میرا میاں اسے غلام بنا کر لایا ہے، غلام بنا کر رکھے گا۔ یہ ایسا نہیں ہے کہ اسے بارصوبت سے آ شکا کیا جائے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ عزیز مصر کی قلب ماہیت پہلے ہی ہو چکی ہے۔

”اس کو عزت سے رکھو۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ ہم کو فائدہ بخشے یا ہم اس کو اپنا بیٹا بنالیں۔“ یہ سنتا تھا کہ زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کا ہاتھ پکڑا اور اپنے پاس بٹھالیا۔

ابن الحنفی ابو عبیدہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ لوگوں میں سب سے زیادہ فراست و ذہانت والے اشخاص دو موقعوں پر دو شخص گزرے ہیں۔ ایک عزیز جب اس نے بیوی کو کہا کہ اس یوسف کا رہن بہن اچھا رکھو، شاید

یہ ہمیں نفع دے یا ہم اس کو بیٹا بنالیں اور وہ لڑکی جس نے اپنے باپ پیغمبر حضرت شعیب سے عرض کی اے ابا جان اس (موسیٰ) کو کام پر رکھ لیجئے کیونکہ جن کو آپ کام پر رکھیں گے یہ ان میں سب سے زیادہ طاقتور اور امانت دار ہے۔ قرآن کہتا ہے۔ ”اس طرح ہم نے یوسف کے لیے اس سر زمین میں قدم جمانے کی صورت نکالی اور اسے معاملہ فہمی کی تعلیم دینے کا انتظام کیا۔ اللہ اپنا کام کر کے رہتا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں اور جب وہ اپنی پوری جوانی کو پہنچا تو ہم نے اسے قوت فیصلہ اور علم عطا کیا۔ اس طرح ہم نیک لوگوں کو جزا دیتے ہیں۔“

عزیز مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ غلاموں کا معاملہ نہیں کیا بلکہ اپنی اولاد کی طرح عزت و احترام کے ساتھ رکھا اور اپنی ریاست، دولت و ثروت اور گھریلو زندگی کی تمام ذمے داریاں ان کے سپرد کر دیں اور ان سب کا امین بنادیا۔

زلیخا اس صورت حال سے بہت خوش تھی۔ وہ خود یہ چاہتی تھی کہ یوسف اس گھر میں غلام کی طرح نہ رہے۔

یہ گھر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے امن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ عزیز مصر ان کی دیانت داری سے بہت خوش تھا لیکن ابھی آزمائش کی ایک گھڑی اور تھی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی جوانی کا عالم تھا۔ حسن و خوبی کا کوئی ایسا پہلو نہیں تھا کہ جو آپ کے جسم اطہر میں مجسم نہ ہو گیا ہو۔ زلیخا دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا مقام و مرتبہ بھول گئی۔ اس کی آنکھیں ربخ روشن کا تعاقب کرنے لگیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام فہم و ذکی تھے۔ زلیخا کی آنکھوں کا مطلب خوب سمجھ رہے تھے۔ جب سے آپ پر جوانی آئی تھی، زلیخا کی نیت کا نور صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ مالکن تھی۔ اسے روک بھی نہیں سکتے تھے۔ گھر چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتے تھے۔ بس یہ کوشش کرتے رہے کہ کوئی ایسا قدم نہ اٹھئے جس سے زلیخا کی حوصلہ افزائی ہو۔ کوشش کرتے تھے کہ زلیخا سے آسانا سامنا نہ ہو لیکن ایک گھر میں رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں تھا۔

زلیخا کی حالت بدیں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ وہ ان پر پروانہ دار بنارہی تھی۔ بہانے بہانے سے انہیں اپنے پاس بلاتی۔ وہ انکار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ خاوندہ نبوت کا جہنم و چراغ اور منصب نبوت کے لیے منتخب بھلا کیسے اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔ فحاشی میں مبتلا کیسے ہو سکتا تھا۔

وہ ان پر دوسرے ڈالنی رہی۔ انہیں درغلزانی کی کوشش کرتی رہی لیکن ان کے پائے استقامت میں جنبش نہ آسکی۔ کئی مرتبہ انہوں نے سوچا کہ زلیخا کی شکایت عزیز مصر سے کریں لیکن اپنی حیثیت دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ عزیز مصر بھلا ان کی بات پر کیسے یقین کر لے گا۔

ان کی خاموشی نے زلیخا کے حوصلے بڑھا دیے۔ دل میں چاہت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی شامل ہو گیا۔ اب یہ اس کی انا کا مسئلہ بن گیا کہ ایک معمولی غلام اس کی بات ماننے کو تیار نہیں۔ وہ خند میں آ گئی۔ حیا اور فطرت نسوانی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تہیہ کر لیا کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ زبردستی سے پیش آئے گی۔

ایک روز جب عزیز مصر باہر گیا ہوا تھا، زلیخا نے کنیزوں، لونڈیوں کو دور کر دیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو بلا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا اور اپنے بستر کی طرف اشارہ کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا کہ زلیخا کے بستر کے سرہانے جو بیت رکھا ہے، اس پر زلیخا نے کپڑا ڈال دیا ہے۔ وہ اتنی بے قابو ہوئی تھی کہ اپنی زبان سے دعوت گناہ دینے لگی۔ یہ وقت سخت آزمائش کا وقت تھا۔ شامی خاندان کی عورت اور وہ بھی محبوب نہیں بلکہ عاشق، سولہ گناہ، بے حجاب ادا نہیں، دروازے بند راز کھل جائے تو مالک خود ذمے دار۔ اسے خوش کر کے ترقی کے اور زیادہ مواقع۔ تمام دنیاوی دولت قدموں میں آسکتی تھی۔ تمام حالات سازگار تھے لیکن اس پسیدہ عصمت نے پہننے کے بجائے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

”پناہ بخدا..... میں اور اس کی نافرمانی کروں جس کا اسم جلال ”اللہ“ ہے اور وہ تمام کائنات کا مالک ہے اور کیا میں اپنے اس مربی ”عزیز مصر“ کی امانت میں خیانت کروں جس نے مجھے غلام نہ رہنے دیا مجھے عزت عطا کی۔“

”تم کس عزیز مصر کی بات کر رہے ہو۔ وہ جو بد صورت بھی ہے اور عمر میں مجھ سے بڑا بھی۔ تم جوان ہو اور خوبصورت بھی..... آ جاؤ، مجھے شاد کام کرو۔ میں تمہیں مالا مال کر دوں گی۔“

”تم کس کی بیوی ہو۔ اگر میں ایسا کروں تو ظالم کہلاؤں گا۔ ظالموں کا انجام جہنم ہے۔“

”یہاں کوئی دیکھنے والا ہے یہ دیکھو میں نے شامی دیوتا کی آنکھیں ڈھانپ دی ہیں۔“

”میں اپنے خدا کی آنکھیں نہیں ڈھانپ سکتا۔ وہ ہر جگہ ہے ہر وقت دیکھتا ہے۔“

”مجھے تمہاری ان باتوں سے سروکار نہیں۔ مجھ سے اب ممبر نہیں ہوتا۔ اس سے پہلے کہ عزیز مصر آئے تو مجھے شاد کام ل۔“
 ”اور پھر سیلا یا یوسف کو اس عورت نے جس کے گھر میں وہ رہتے تھے اس کے نفس کے معاملے میں اور دروازے نہ کر دیے اور کہنے لگی میرے پاس آ۔ یوسف نے کہا پتاہ بخدا بلاشبہ وہ (عزیز مصر) میرا مربی ہے جس نے مجھ کو عزت بخشی۔ بلاشبہ ظالم قلاح نہیں پاتے اور البتہ اس عورت نے یوسف سے ارادہ بد کیا اور وہ بھی ارادہ کرتے اگر اپنے پروردگار کے برہان کو نہ دیکھ لیتے۔ اس طرح ہوتا کہ ہٹائیں ہم اس سے برائی اور بے حیائی کو۔ بے شک وہ ہمارے غلط بندوں میں سے ہے۔“ (سورۃ یوسف)

”برہان رب“ سے مراد وہی نصیحت ہے جو حضرت یوسفؑ نے زلیخا کو کی تھی یا اس کی برائی کے سوال کا جواب دیا تھا یعنی میں عزیز مصر کی امانت میں خیانت نہیں کر سکتا۔
 بعض مفسرین نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ حضرت یعقوبؑ نظر آئے تھے جس کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام رک گئے۔ بعض نے کہا فرشتہ ظاہر ہوا تھا۔ بعض نے یہ بھی لکھا ہے بت پر پردہ دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کو عبرت حاصل ہوئی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو دو چیزوں نے روکا۔ ایک اللہ کا تصور، دوسرے عزیز مصر کے احسان کی احسان شناسی۔

جب حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھ لیا کہ یہ عورت ماننے والی نہیں تو آپ دروازے کی طرف دوڑے تاکہ دروازہ کھول کر باہر نکل جائیں۔ زلیخا انہیں پکڑنے کے لیے ان کے پیچھے بھاگی اور پیچھے سے حضرت یوسف علیہ السلام کا کرتہ پکڑ لیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نہ رکنے اور کرتے کا دامن زلیخا کے ہاتھ میں رہ گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دروازہ کھولا تو عزیز مصر کو باہر کھڑے دیکھا۔ دراصل عزیز مصر اسی وقت پہنچا تھا۔ دروازے پر دستک دینے والا تھا کہ دروازہ کھل گیا لیکن اس عالم میں کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھی کمرے میں تھے اور زلیخا بھی۔

”یوسف اور وہ (زلیخا) آگے پیچھے دروازے کی طرف بھاگے اور اس نے پیچھے سے یوسف کا کرتہ (کھینچ کر) پھاڑ دیا دروازے پر دونوں نے عزیز مصر کو موجود پایا۔“

مفسرین کے مطابق زلیخا کا چچا زاد بھائی بھی دروازے پر موجود تھا۔ عزیز مصر ساری صورت حال کو بھانپ گیا تھا کہ اندر کیا ہو رہا تھا اور دروازہ کیوں بند کیا گیا تھا۔

زلیخا کو اپنا انجام صاف نظر آ رہا تھا کہ اب بات کھل گئی ہے۔ الزام اسی پر آئے گا۔ اب وہ خود کو بچاتی یا یوسفؑ کو اس نے ایک پاک شخص پر تہمت دھروی۔ آگے بڑھی اور رونی صورت بنا کر اپنے شوہر کے سامنے فریاد کناں ہوئی۔
 ”ایسے شخص کی سزا قید خانے کی ہو یا دردناک عذاب کے سوا کیا ہو سکتی ہے جو تیرے اہل کے ساتھ برا ارادہ رکھتا ہو۔ یہ یوسف ہی ہے جس نے مجھ پر بری نظر ڈالی۔ مجھے ناپاک کرنا ہی چاہتا تھا کہ پکڑا گیا۔ اس وقت اچھا ہوا کہ آپ آگئے ورنہ میں تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتی۔“

حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی صفائی پیش کی۔ ”یہ اس کا بہتان ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ خود اس نے میرے ساتھ برا ارادہ بد کیا تھا مگر میں نے کسی طرح نہ مانا اور بھاگ کر باہر نکل آنا چاہتا تھا کہ سامنے آپ آگئے تو اس نے یہ جھوٹ گھڑ لیا تاکہ میں آپ کی سزا کا مستحق بنوں۔ اگر یہ سچی ہے تو سچی بات کیوں نہیں کہتی۔“

زلیخا کا چچا زاد بھائی ان حالات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ جس وقت دروازہ کھلا یوسفؑ آگئے تھے یعنی دروازہ انہوں نے کھولا۔ زلیخا پیچھے ہی اور اس کے ہاتھ میں یوسفؑ کے دامن کا کپڑا بھی تھا۔
 ”یہ تمہارے ہاتھ میں کپڑا کیسا ہے؟“

”یہ یوسف کے دامن کا کپڑا ہے جو بھاگتے میں میرے ہاتھ میں آ گیا۔“
 ”یہ کپڑا سامنے کی طرف سے پھٹا ہے یا پیچھے کی طرف سے۔ اگر پیچھے کی طرف سے پھٹا ہے تو یوسف سچا ہے زلیخا جھوٹی ہے۔“
 ”یہ کیا بات ہوئی۔ دامن تو کہیں سے بھی پھٹ سکتا ہے۔“

”اس کا مطلب یہ ہے کہ یوسف نے تمہارے ساتھ زبردستی کرنا چاہی اور اس دوران دامن پھٹ گیا؟“
 ”بالکل یہی بات ہے۔“

اگر یہی بات ہے تو تم نے اپنا بچاؤ تو کیا ہو گا؟“

”میں نے اپنا بچاؤ کیا تھا۔ اسی لیے تو یوسف کا ارادہ پورا نہیں ہوا۔“
 ”اگر بچاؤ کیا تھا تو تمہارا نہ تو کپڑا نہیں سے پھٹا اور نہ کوئی خراش آئی اور نہ شاید کمرے کی کوئی چیز ادھر سے ادھر ہوئی جبکہ یوسف مرد تھا۔ تم سے زیادہ طاقتور تھا۔ تمہارے سارے کپڑے پھاڑ سکتا تھا۔“
 ”تم میرے بھائی ہوتے ہوئے یوسف کی طرف داری کر رہے ہو۔“
 ”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں طرف داری کر رہا ہوں۔“
 ”یہ طرف داری نہیں تو اور کیا ہے۔ جب میں کہہ رہی ہوں تو تمہیں یقین کر لیتا چاہیے۔ ان معاملوں میں عورت ہی کی بات مانی جاتی ہے۔ ظالم مرد ہی ہوتا ہے۔“

اب یہ سب دروازے سے ہٹ کر کمرے میں داخل ہو چکے تھے۔ تمام چیزیں اسی طرح رکھی ہوئی تھیں البتہ بستر کے سرہانے رکھے بت پر ایک بڑی چادر پڑی ہوئی تھی۔ زلیخا کے بھائی نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔

”اس بت پر یہ چادر کس نے ڈالی ہے۔“
 ”مجھے کیا خبر۔ یہ حرکت بھی اسی ظالم کی ہوگی۔ یہ نہیں چاہتا ہوگا کہ دیوتا کو میری حالت کی خبر ہو۔“ اب زلیخا گھبرا گئی تھی۔
 ”یوسف تو مصری مذہب کا قائل ہی نہیں، اسے اس بت سے کیا لینا دینا۔“ پھر وہ محض حضرت یوسف علیہ السلام سے مخاطب ہوا۔ ”کیا یہ تم نے کیا تھا؟“

”جی نہیں۔ مجھے جب انہوں نے کمرے میں بلایا تو اس بت پر کپڑا پڑا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ دیکھو میں نے بت کی آنکھیں ڈھانپ دی ہیں۔ اب ہمیں کوئی دیکھنے والا نہیں۔ انہیں یاد ہوگا کہ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں اپنے اللہ کی آنکھیں بند نہیں کر سکتا۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ پھر میں یہ کام کیسے کر سکتا ہوں جو تم مجھ سے چاہتی ہو۔“
 ”یہ جھوٹ بول رہا ہے۔“ زلیخا نے کہا۔ ”بت پر کپڑا تو میں نے اس لیے ڈال دیا تھا کہ کہیں یہ اسے نقصان نہ پہنچا بیٹھے۔“
 ”ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ کپڑا تم نے نہیں اس نے ڈالا ہے۔ تمہاری تضاد بیانی تو کچھ اور کہہ رہی ہے زلیخا۔“
 ”وہ میں بھول گئی تھی۔ اب ذکر نکالتا ہوں مجھے یاد آیا۔ میں بھلاہٹ پر کپڑا کیوں ڈالنے لگی تھی۔“

عزیز مصر اس بحث سے تنگ آ گیا تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ بات زیادہ پھیلے۔ اس نے معاملے کو رفع دفع کرنے کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھمایا۔

”یوسف جے تم ہی ہو اور اس عورت کے معاملے سے درگزر دو۔ اگر بات یہاں سے نکلی یا تم نے باہر جا کر کسی سے کہا تو میری شہرت پر دھچک لگ جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے جس اپنے عہدے سے ہاتھ دھو بیٹھوں۔“
 ”مجھے آپ کی عزت عزیز ہے۔ میں یہ بات بھی زبان پر نہیں لاؤں گا۔ یہ میری مالکن ہیں۔ شیطان نے انہیں بہکا دیا تھا۔ انہیں خود احساس ہو جائے گا کہ یہ غلطی پر تھیں۔ میں نے تو اپنے ظالم بھائیوں کو معاف کر دیا ان کی تو مہربانیاں میرے ساتھ رہی ہیں۔ میں انہیں معاف کرتا ہوں۔“
 اس کے بعد وہ زلیخا سے مخاطب ہوا۔

”جو کچھ تم سے ہو گیا اس کے لیے معافی کی خواستگار ہو اور آئندہ کے لیے توبہ کر لو۔“
 قرآن پاک نے ان تمام تفصیلات کو نہایت اختصار سے بیان کر دیا ہے۔

”کہنے لگی اس شخص کی کیا سزا ہے جو تیرے اہل کے ساتھ برائی کا ارادہ رکھتا ہو مگر یہ کہ قید کروا جائے یا دردناک عذاب میں مبتلا کیا جائے۔ یوسف (علیہ السلام) نے کہا، اسی نے مجھ کو میرے نفس کے بارے میں پھسلا یا تھا اور فیصلہ کیا عورت ہی کے گھرانے کے ایک شخص نے اگر جبراً من یوسف... سامنے سے چاک ہے تو عورت سچی ہے۔ ہمیں کو دیکھا تو پیچھے سے چاک تھی کہا بے شک! اسے عورت ہے تیرے مکرو فریب سے ہے۔ بلاشبہ تمہارا کمر بہت بڑا ہے یوسف تو اس معاملے سے درگزر کرو اور اسے عورت تو اپنے گناہ کی معافی مانگ۔ تو بلاشبہ خطا کار ہے۔“

معاملہ یہاں رفع دفع ہو گیا تھا لیکن گھر کے ملازموں سے یہ بات چھپی نہ رہ سکی۔ ان کے ذریعے سے یہ بات باہر نکلی اور شاہی خاندان کی عورتوں میں اس کے چرچے ہونے لگے۔

”عزیز مصر کی بیوی کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ اپنے غلام پر فریفتہ ہو گئی۔ اتنے بڑے مرتبے کی عورت اور غلام سے اختلاط کا ارادہ۔“
 ایک دن زلیخا کے خاندان کی دو عورتیں اس سے ملنے آئیں اور کید کید کر حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں

معلوم کرنے لگیں۔

زلیخا کے کانوں تک باتیں پہنچ رہی تھیں کہ عورتوں میں چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں لیکن جب ان عورتوں نے براہ راست حضرت یوسف علیہ السلام کا نام لے دیا تو اسے حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔

”وہ عورتیں پوچھ رہی تھیں۔“ تمہارا غلام کیا واقعی خوبصورت ہے؟“

”کیا تمہیں نہیں معلوم۔ اس کی خوبصورتی کا چرچا تو پورے مصر میں ہوا تھا جب وہ فروخت ہو رہا تھا۔“

”کیا وہ اتنا خوبصورت ہے کہ تم اپنا مرتبہ بھول گئیں؟“

”اگر تم بھی دیکھ لو تو تمہارا بھی وہی حال ہو جائے جو میرا ہوا۔“

”یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ کوئی کتنا بھی خوبصورت ہو، ہمیں اپنی ناموس کا خیال ہے۔“

”تم کیا سمجھتی ہو ناموس کا خیال مجھے نہیں؟“

”سننے میں تو یہی آیا ہے۔“

”کچھ بھی نہیں تھا۔ بس اتنا ہوا کہ میں اس کے حسن کو دیکھ کر بے خود ہو گئی۔“

”یہ سب بہانے ہیں۔ کوئی ایسا حسین نہیں ہوتا اور کوئی ایسے بے خود نہیں ہو جاتا۔“

دراصل ان عورتوں کو خود ہی شوق ہو گیا تھا کہ وہ حضرت یوسف کا دیدار کر لیں۔ ایک جذبہ شوق ان کے دلوں میں بھی جاگ چکا تھا اور اب وہ زلیخا کو یاد کر رہی تھیں کہ وہ حضرت یوسف کو ان کے سامنے لے آئے اور بالآخر وہ اس پر کامیاب ہو گئیں۔

”اگر تم دیکھنا ہی چاہتی ہو کہ وہ کتنا خوبصورت ہے اور اسے دیکھ کر تمہارا کیا حال ہوتا ہے تو کسی روز آ جاؤ، میں اسے تمہارے سامنے لے آؤں گی۔ تم مجھے طے دینا چھوڑ دو گی۔“

ان عورتوں نے دوسری عورتوں کو بتایا۔ ان میں عمارتین کی بیویاں بھی شامل تھیں۔

زلیخا نے ان عورتوں کو اپنے گھر مدعو کیا۔ جب وہ دسترخوان پر بیٹھیں تو زلیخا نے ان عورتوں کے ہاتھوں میں ایک ایک

چھری اور یکو دے دیے کہ جب یوسف سامنے آئے تو تم اس کیس کو کھو کاٹنا۔

زلیخا نے حضرت یوسف علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ باہر آئیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام حکم کی تعمیل میں باہر آئے۔ سب عورتیں

جمال یوسف کو دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ بے اختیار یکاڑا اٹھیں۔ یہ آدی نہیں نور کا بتلا ہے۔ کوئی کہنے لگی فرشتہ ہے انسان نہیں۔

وہ یہ باتیں کرنے میں ایسی جھوٹیں کہ انہیں یہ یاد ہی نہیں رہا کہ وہ کبھی پر چھری پھیر رہی ہیں یا اپنی انگلیاں تراش رہی

ہیں۔ حسن یوسف پر نظریں ایسی چھیں کہ اپنی انگلیاں کاٹ بیٹھیں۔ یہ زلیخا کی زبردست تحفہ تھی۔ جتنے طے اسے ملے تھے

سب کا جواب تھا۔ جو حالت اس کی تھی، اسی میں سب مبتلا تھیں۔

”تم نے مجھ کو مطمئن کر رکھا ہے اور میرا طماعت کا نشانہ بنایا ہوا ہے۔ اب بتاؤ میرے یوسف کو دیکھ کر تمہارا کیا حال

ہوا؟ اب بتاؤ کہ میرا اس سے عشق بے جا تھا؟“

”اور جب (اس معاملے کا چرچا پھیلا) تو شہر کی بعض عورتیں کہنے لگیں دیکھو عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈالنے

لگی کہ اسے رجمالے۔ وہ اس کی چاہت میں دل ہار گئی۔ ہمارے خیال میں تو وہ صرف بدچلتی میں پڑ گئی۔ پس جب عزیز کی

بیوی نے ان عورتوں کے مکر کو سنا تو ان کو بلا بھیجا اور ان کے لیے مسندیں آراستہ کیں اور ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کر دی۔

پھر یوسف سے کہا ان سب کے سامنے نکل آؤ۔ جب عورتوں نے دیکھا تو اس کی بڑائی کی قائل ہو گئیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ

کاٹ لیے اور یکاڑا اٹھیں یہ تو انسان نہیں ہے، ضرور ایک فرشتہ ہے، بڑے مرتبے والا فرشتہ۔ (عزیز کی بیوی) بولی تم نے دیکھا

یہ ہے وہ آدی جس کے بارے میں مجھے تم طے دیتی تھیں۔“ (سورۃ یوسف)

جب زلیخا نے دیکھا کہ ان عورتوں کی انگلیوں سے خون جاری ہے اور وہ حسن یوسف میں محو ہیں۔ گویا قائل ہو چکی ہیں

کہ میرا اس سے عشق بے جا نہیں تھا تو بے پروا ہو کر کہنے لگی۔

”میں نے اس کا دل قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا مگر میں یہ کہہ دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہنا نہ مانا تو میں

اسے قید میں ضرور ڈالوں گی۔“

وہ دوسرے لفظوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کو دھمکا رہی تھی کہ قید کی سختیوں سے ڈر کر وہ اس کا کہنا مان لیں لیکن حضرت

یوسف علیہ السلام کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ ان عورتوں کا تریاچہ تر تھا۔ وہ انہیں اپنی جانب مائل کرنے کے لیے

یہ بتانا چاہتی تھیں کہ ہم تیرے حسن کے اس قدر متوالے ہیں کہ تیری صورت دیکھ کر ہوش و حواس جاتے رہے اور ہاتھوں کو زخمی کر لیا۔ وہ انہیں بھی انتہائی قصور وار سمجھ رہے تھے جتنا زلیخا کو۔ انہیں تو ان عورتوں کی طرف سے بھی خطرہ ہو گیا تھا۔

وہ اس خطرے کو بھانپتے ہوئے جوان کے گرد منڈلانے لگا تھا، اللہ تعالیٰ کے حضور دست یہ دعا ہوئے۔

”خدا یا! جس بات کی جانب یہ عورتیں بلا رہی ہیں اس کے مقابلے میں مجھے قید میں رہنا زیادہ پسند ہے۔ اگر تو نے میری مدد نہ کی اور مجھ کو ان مکار یوں سے نہ بچایا تو عجب نہیں کہ میں ان کی جانب مائل ہو جاؤں اور نادانوں میں بن جاؤں۔“

حضرت یوسف علیہ السلام کا اندیشہ غلط نہیں تھا۔ زلیخا یہ دھمکی دے چکی تھی کہ انہیں داخل زندان کر کے دم لے گی۔ اب وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر اس دھمکی کا کیا اثر ہوا ہے۔ اس نے موقع دیکھ کر انہیں اپنے پاس بلایا۔ حضرت یوسف علیہ السلام اس کا حکم نہیں ٹال سکتے تھے لیکن محتاط بھی ہو گئے تھے۔ ڈرتے ڈرتے اس کے حضور پہنچے لیکن دروازے سے لگ کر کھڑے ہو گئے کہ کہیں زلیخا پہلے کی طرح پھر دروازہ بند نہ کر لے۔

”آؤ یوسف! مجھ سے شرم کیوں رہے ہو۔ یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔“

”میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ کے پاس بیٹھنے کی جسارت کیسے کر سکتا ہوں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔ آپ کو جو کہنا ہے کہیے۔“

”میں نے تو تمہیں بھی غلام نہیں سمجھا۔“

”یہ آپ کی بڑائی ہے لیکن میں ہوں تو غلام۔ آپ کے شوہر نے مجھے قیمت دے کر خریدا ہے۔“

”اگر میرا کہنا مان لو تو جو تنے میں خریدے گئے ہو، اس سے زیادہ کے مالک بن سکتے ہو۔ تم نے دیکھ لیا کہ جو عورتیں مجھے مطعون کرتی تھیں، وہ بھی میری ہم خیال ہو چکی ہیں۔ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں۔ مجھے شاد کام کرو اور انکار کر کے میرے غضب کا نشانہ نہ بنو۔ میں تو تمہیں خاصا متعل منہ سمجھتی تھی۔ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ میری پیشکش کو ٹھکرا رہے ہو۔“

”میرا جواب اب بھی وہی ہو گا جو میں پہلے دے چکا۔“

”یعنی انکار؟“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ غصے سے اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ ”میں کہہ چکی ہوں، میں تمہیں حوالہ زندان کر دوں گی۔ اس گھر میں میرا حکم چلتا ہے۔ کیوں اپنی جان کے دشمن بنتے ہو۔“

”جس کام کے لیے تم مجھے بلا رہی ہو اس کے مقابلے میں مجھے قید پسند ہوگی۔“

”تم نے زندان کا نام سنا ہے، دیکھا نہیں ہے۔ جس حسن پر ناز کر رہے ہو، وہ کھلانے ہوئے پھول کی طرح نظر آنے لگے گا۔“

”مجھے ان دھمکیوں سے سروکار نہیں۔ میں ہرگز آپ کی بات نہیں مانوں گا۔“

”تمہیں اگر یہ زعم ہے کہ عزیر تمہاری حمایت کرے گا جیسے کہ وہ پہلے کر چکا ہے تو اس گھمنڈ میں مت رہنا۔ وہ میرے حکم سے باہر نہیں ہے۔“

”مجھے کسی سے امید نہیں۔ میرا اللہ میرے حق میں جو بہتر سمجھے گا، وہ کرے گا۔“

”میں ایک دن کا وقت تمہیں اور دیتی ہوں۔ اس کے بعد مجھے جو کرنا ہوگا، وہ کر گزروں گی۔“

”ایک دن بعد بھی میرا جواب یہی ہوگا۔“

زلیخا نے ایک کے بجائے دو دن انتظار کیا۔ اس دوران وہ اپنے شوہر کو خلاف معمول خوش کرنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ پھر اس نے یوسف علیہ السلام کو بلا بھیجا اور ان کے سامنے وہی سوال دہرایا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے وہی جواب دیا جو وہ پہلے دے چکے تھے۔ زلیخا نے ایک مرتبہ پھر ان کے سامنے جیل کا نقشہ کھینچا۔ گھنگو کے دوران اس کا پیش انتہا کو پہنچ گیا تھا۔

وہ ان کی طرف سے مایوس ہو چکی تھی۔ اب اس کے مقام اور مرتبے کا تقاضا تھا کہ وہ ان کو سزا دے۔ اسے یہ بھی خیال رہا ہوگا کہ شاید زندان کی صعوبتیں حضرت یوسف علیہ السلام کو جھکا دیں۔ ابھی تو تمام عیش و آرام انہیں حاصل ہے اس لیے اپنی بات پر اڑے ہوئے ہیں۔

معراج کی حدیث میں آیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا..... میں یوسف پر سے گزرا تو دیکھا ان کو نصف حسن عطا کیا گیا ہے۔ علامہ سیکی وغیرہ اس کے معنی بیان کرتے ہیں کہ حضرت آدم کو جو حسن ملا تھا، اس کا نصف حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا تھا۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا روئے اقدس بجلی کی طرح چمکتا تھا اور جب کوئی عورت ان کے پاس آتی تو وہ اپنے چہرے کو ڈھانپ لیتے اور اکثر اوقات اپنے چہرے پر نقاب ڈال کر رکھتے۔ اسی وجہ سے جب حضرت یوسف علیہ السلام زلیخا کی مدعو عورتوں کے پاس سے گزرے تو عورتوں نے بھی زلیخا کو ان کی محبت میں معذور سمجھ لیا تھا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کا کیسا اثر ہوا تھا اور زلیخا نے بڑے ناز سے کہا تھا۔

”یہ ہے وہ جس کے بارے میں تم مجھے ملامت کرتی تھیں۔“

زلیخا کی انادار خود پرستی نے اسے اکسایا کہ غلام ہوتے ہوئے جس آدمی نے اس کا حکم نہ مانا، وہ اسے سزا دلوائے۔ اس نے عزیز مصر کو بھڑکایا۔

”جس نے آپ کی بیوی کی عفت کو انداز کرنے کی کوشش کی اسے آپ نے اتنی آسانی سے معاف کر دیا۔ اسے توحید میں ہونا چاہیے۔ سب اسے پاک دامن سمجھ رہے ہیں اور مجھے لعن طعن کر رہے ہیں۔ رسوائی تو میری ہو رہی ہے۔ اگر اسے سزا ملے تو کم از کم لوگ یہ تو کہیں گے کہ یوسف غلطی پر تھا اس لیے موجب سزا ہوا۔“

عزیز مصر حضرت یوسف علیہ السلام کی صداقت کی تمام نشانیوں کو دیکھ چکا تھا، اس کے باوجود زلیخا کی یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ وہ یوسف کو سزا دلوا کر زلیخا کو رسوائی سے بچا سکتا ہے۔ زلیخا کی رسوائی خود اس کی رسوائی تھی۔ یوسف کو اگر ایک مدت کے لیے زندان میں بند کر دیا جائے تو یہ معاملہ لوگوں کے دلوں سے محو ہو جائے گا اور یہ چرچے بند ہو جائیں گے۔

عزیز مصر کے لیے کیا مشکل تھا۔ کوئی مقدمہ چلائے بغیر حضرت یوسف علیہ السلام کو زندان میں ڈال دیا۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے ”موضح القرآن“ میں تحریر فرمایا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے اپنی دعا کے ساتھ چونکہ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مجھے ان کی بے حیائی کی دعوت کے مقابلے میں زندان زیادہ پسند ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں عورتوں کے کمر سے بچالیا مگر قیدان کی قسمت میں مقدر کر دی۔

حضرت شاہ صاحب کی اس بات کو تو یہ کرنے کے لیے ایک دوسرے محقق مفسر نے ایک حدیث کا حوالہ بھی دے دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص خدا سے دعا مانگا کرتا تھا۔ ”اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں“ نبی اکرمؐ نے سنا تو فرمایا۔ ”بلا مصیبت کیوں مانگتا ہے۔ اس سے عافیت کا طالب کیوں نہیں ہوتا۔“

حضرت شاہ عبدالقادر کی محققانہ خدمات اپنی جگہ لیکن اس مصیبت کے موقع پر حضرت یوسف علیہ السلام یہی کہہ سکتے تھے کہ میں ان عورتوں کی بے حیائی کے مقابلے میں زندان کو پسند کرتا ہوں۔

عزیز کی بیوی اور گھر کی مالک نے خوشامد و چاپلوسی کی کون سی راہ اختیار نہیں کی جس سے یوسف کو رام کیا جاسکے پھر اس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی اور انہوں نے بھی اپنے اپنے داؤ گھات استعمال کیے مگر پھر بھی ناکامی رہی۔ آخری درجہ اس آزمائش کا یہ تھا کہ زلیخا نے دھمکی دی، یا تو مجھے شاد کام کر ورنہ قید خانے میں ڈالا جائے گا۔ اس روشنی میں حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ کہنا کہ میں زندان کو ترجیح دیتا ہوں قید کی طلب نہیں بلکہ استقامت اور عزیمت کا مظاہرہ ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ یہ دھمکی میرے ارادہ حق اور خدا دی کو باطل نہیں کر سکتا۔

بہر حال حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل بھیج دیا گیا۔ ایک بے خطا کو مجرم بنا دیا گیا صرف اس لیے کہ زلیخا کا جرم چھپ جائے اور لوگوں میں یہ تاثر عام ہو جائے کہ یوسف نے ہی زلیخا کو بہکانا چاہا تھا جس کی وجہ سے وہ قید کر دیا گیا۔

گناہوں کی جگہ سے دور چلے جانا یہ بھی نصیحت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قید کو مقدر بنا کر حضرت یوسف علیہ السلام کو اس برائی سے بچالیا۔

یہ عجیب افتاد تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام زندان میں تھے لیکن اپنے رب کو یاد کرتے تھے اور اس کی رضا پر خوش تھے۔ دعوت تبلیغ کی بھی امید کی کیونکہ وہاں اور قیدی بھی تھے۔

حضرت یوسف علیہ السلام نبی زادے تھے۔ اسلام کی تبلیغ ان کے خون میں تھی پھر خدا نے ان کو بھی نبوت کے لیے جن لیا تھا۔

”جب وہ بن رشد کو پہنچا تو ہم نے اس کو فیصلے کی قوت اور علم عطا کیے۔“

صاحب قصص الانبیاء نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے۔

”اور جب وہ (یوسف) اپنی عمر کی تھی (یعنی بلوغت) کو پہنچ گئے تو ہم نے ان کو نبوت اور دانائی عطا کی۔“

دین حق کی اشاعت ان کی زندگی کا نصب العین تھا۔ جیل میں موجود قیدی جب ان کے حسن ظاہری اور حسن سیرت سے متاثر ہوئے تو ان کے پاس پرندوں کی طرح آ کر بیٹھنے لگے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے باقاعدہ تبلیغ کا آغاز کر دیا۔ ان کا پیغام وہی تھا جو حضرت ابراہیم حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کا تھا۔

جب قیدی آپ کے پاس آ کر بیٹھتے تو آپ انہیں پیغام حق دیتے۔
 ”ہمیں لائق نہیں کہ ہم کسی چیز کو خدا کے ساتھ شریک بنائیں۔ خدا کا ہم لوگوں پر بھی اور دوسروں پر بھی فضل ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔ میرے جیل خانے کے رفیقو! بھلا بناؤ تو کسی جدا جدا آقا اچھے یا ایک خدائے یکتا وغالب۔ جن چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو، وہ صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں۔ خدا نے ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ سن لو کہ خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ اس نے فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ یہی سیدھا دین ہے۔“

”میں نے ان لوگوں کی ملت کو اختیار نہیں کیا جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کے بھی منکر ہیں۔ میں نے اپنے باپ داداوں یعنی ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہ السلام کی پیروی کی ہے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔“

”میرے رفیقو! اللہ ایک ہے۔ اسی کا نام توحید ہے۔ اس کا ماننا ہی اصل ایمان ہے۔ تم بتوں کی پرستش چھوڑ دو کہ یہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا ہے جو سخت گناہ ہے۔ اللہ ہی ہر چیز کا مالک ہے، اسی کی پرستش کرو۔ اسی سے مدد مانگو، اسی کا سہارا ڈھونڈو۔“

یہی ان کا پیغام تھا جو وہ مختلف پیرایوں میں قیدیوں کے سامنے دہرا رہے تھے۔
 مصری مختلف دیوتاؤں کی پرستش کرتے تھے اور ان سب سے بلند ”آمن راع“ تھا یعنی سورج دیوتا نیز مصریوں میں الوہیت آ میز شاہی کا تصور بھی پوری طرح نشوونما پا چکا تھا اور تا جدار ان مصر نے ہم خدا کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ ان کا لقب ”فاراع“ اسی لیے ہوا کہ وہ ”راع“ یعنی سورج دیوتا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔ پھر یہی فاراع عربی میں جا کر فرعون ہو گیا۔
 قیدیوں نے فرعون کے بارے میں بھی سوال کیا کہ جب ہمارا بادشاہ سورج دیوتا کا مظہر ہے تو پھر ہم سورج دیوتا کے ساتھ ساتھ فرعون کی پرستش کیوں نہ کریں۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے بے خوفی سے بادشاہ کے بارے میں بھی زبان کھولی۔
 ”کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خدا کی ذات میں خود کو شریک کرے اور نہ کوئی اس کا مظہر ہو سکتا ہے۔ اللہ کی صفات ہی اس کا مظہر ہیں۔ تمہارے بادشاہوں نے اپنی شاہی کو برقرار رکھنے کے لیے الوہیت آ میز شاہی کا تصور دے دیا اور خود کو خدا کا مظہر ورنہ وہ بھی اسی طرح خدا کے بندے ہیں جس طرح میں اور تم۔ وہ سخت گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ تم لوگ اگر مجبور بھی ہو تو بھی دل سے یہ پست سمجھو کہ وہ خدا ہیں۔“

یہ باتیں نہایت سچ تھیں لیکن وہ اس نرمی سے بیان کر رہے تھے کہ کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس ان کی نرم گفتاری اور علمیت کے چرچے ہونے لگے۔
 آپ کی علمیت کے چرچے جب قید خانے کے داروغہ تک پہنچے تو وہ بھی آپ سے ملنے کا مشتاق ہوا اور آپ کی مجلس میں آ کر بیٹھنے لگا اور چند ہی روز میں آپ کا گردیدہ ہو گیا۔
 یہ سب اللہ کی طرف سے تھا جو ان کے ساتھ ہوتا جا رہا تھا۔ اللہ راہیں نکال رہا تھا۔
 تورات کے الفاظ یہ ہیں۔

”قید خانے کے داروغہ نے سب قیدیوں کو جو قید میں تھے حضرت یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں دے دیا اور جو کچھ وہ کرتے تھے اسی کے حکم سے کرتے تھے اور داروغہ سب کاموں کی طرف سے جو اس کے ہاتھ میں تھے، بے فکر تھا اس لیے کہ خداوند اس کے ساتھ تھا اور جو کچھ وہ کرتا، خداوند اس میں اقبال مندی بخشتا۔“

(جاری ہے)

ماخذات

قصص القرآن۔ قصص الانبیاء۔ توریت۔ پہلے نبی سے آخری نبی تک

حقدار

آصف ضیاء احمد

ہر معاشرہ اپنے رسم و رواج کو پروان چڑھا کر فخر محسوس کرتا ہے... وہ بھی ہندو معاشرے میں ایسے زندان کی قیدی تھی جس سے وہ چاہنے کے باوجود نہیں نکل پارہی تھی لیکن... ایک دن دروازہ کھلا رہ گیا اور پھر اس کی پرواز اونچے آسمانوں پر قابل دید تھی۔ کیونکہ مکافات کا عمل انتہائی چابک دستی سے اپنے فرائض انجام دے کر سب کو حیران کر دیتا ہے۔

رشتوں اور احساسات کے پیو پار اور جذبات کے مابین معرکہ آرائی

کر بتائے کہ عنقریب وہ باپ بننے والا ہے۔ اس کے سونے آگن میں بھی بہار آنے والی ہے۔ شادی کے اتنے برسوں بعد آج اسے سرتیا بہت اچھی لگی۔ ورنہ وہ اسے جلی کٹی سانے سے باز نہیں آتا تھا۔ زبان سرتیا کے پاس بھی تھی

چندو آج بڑے اچھے موڈ میں گھر سے نکلا تھا۔ آج اس کی گھر والی سرتیا نے اسے ایسی خوشخبری سنائی تھی کہ اس کے قدم زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ اس خبر کا وہ برسوں سے انتظار کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا سارے سنسار کو چھوڑ چھوڑ کر



لیکن وہ صبر و تحمل سے اس لیے کام لیتی تھی کہ شوہر کے گھر کی چار دیواری کے علاوہ اس کا اور کہیں ٹھکانا نہیں تھا۔ نہ ماں باپ کا سایہ تھا نہ کوئی ماں چاہتا تھا۔ اس لیے آسپو پنے کے علاوہ اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔ زار و تظار رونے کے بعد اپنا سارا غصہ اپنی مری ہوئی ماں پر نکالتی کیونکہ جھوٹ اور غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے اس کی ماں لیلادتی نے چندو کو گھیرا تھا۔ سارا کیا دھرا اسی کا تھا۔

سرتیانے جیسے ہی جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، لیلادتی اس کے بیاہ کے سنے دیکھنے لگی لیکن باوجود کوشش کے کوئی بر ہاتھ نہیں لگ رہا تھا کیونکہ لیلادتی کے پاس نہ دان و بیج تھا اور نہ کنیا دان کے لیے پھونٹ کوڑی تھی۔ بیٹی کی منہ زور جوانی دیکھ کر اس کا کمزور دل دہلا جا رہا تھا۔ چندو اس کے محلے کے قریبی جیسی اسٹینڈ پر اکثر و بیشتر اسے نظر آتا لیکن جان پہچان اس وقت ہوئی جب وہ اچانک افرا تفری میں اس کی ٹیکسی کے نیچے آ کر مرتے مرتے بیچی۔ چندو نے فوراً سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ پانی پلایا اور پانچ سو روپے سے اس کی مٹھی گرم کر دی تاکہ وہ اپنی ٹوٹ پھوٹ ڈاکٹر سے معج کروالے لیکن لیلادتی کو تو خراش تک نہیں آتی تھی۔ اس لیے وہ بیسیدھے اس کے بٹے میں چلے گئے۔ اس روز سے چندو اسے بہت اچھا لگنے لگا اور اس نے فوراً چندو کو اپنا بیٹا بنالیا اور اسے اپنے گھر آنے کا بیوتا بھی دے ڈالا۔

چندو کے لیے لیلادتی نے گھر کا دروازہ کھولا تو اس کی بیٹی سرتیانے دل کی گھڑی کھول دی اور چندو اس میں دراندہ وارد اخل ہو کر سرتیا کے سن کے سنگھاسن پر براجمان ہو گیا۔ سرتیا بھی کول، پھیل جھیلی اور سبک مین نقش کی مالک تھی۔ یہ سانولی سلونی الھنڈاری چندو کے دل کو ایسی بھائی کر اس نے فوراً اپنی ماں بہن کو راضی کر کے لگن منڈپ سجایا۔ لیلادتی زمانہ ساز صورت تھی۔ اسے یقین تھا کہ چندو نہ صرف سرتیا کو نہیں دیکھا بلکہ اس کے ساتھ اس نے وہ گھر بھی دیکھا جس میں دونوں ماں بیٹی رہائش پذیر تھیں۔ لیلادتی نے اپنے چار ملنے والوں میں یہ بات پھیلار بھی تھی کہ اس کا آنجہاں شوہر مرنے سے پہلے یہ گھر اپنی اکلوتی بیٹی کے نام کر گیا ہے۔ جب یہ بات چندو کی سماعت سے نکلانی تو اس کا دل بار بار باغ ہو گیا۔ سورگ کی اس سندری کے ساتھ لاکھوں کا گھر بھی ہاتھ لگ رہا تھا۔ اس نے شادی میں دیر نہیں لگائی۔ یوں چندو منہ بولے بیٹے سے لیلادتی کا جوانی راجا بن گیا۔

سرتیا اور چندو کے لیے ہر دن ہولی اور ہر رات دیوالی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ وہ

خواب خرگوش سے اس وقت جاگا جب سرتیا کے چاہے تانے کی اولادیں گھر میں اپنا اپنا حصہ مانگنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ چندو کو پتہ لگ گئے۔ اس نے ساس کو بے بھاؤ کی ستانی۔ ایسی ایسی رنگ برنگی بولیوں سے نوازا کہ لیلادتی اور سرتیا کے جدوہ طبق روشن ہو گئے۔ مکان فروخت ہونے کے بعد جو چھوٹی سی رقم ہاتھ لگی تھی، اس میں اس نے کچھ اپنا پیسا شامل کر کے دہلی کے نواحی علاقے مہرولی میں آدھا پلاٹ خرید کر اپنا کچا کچا گھر بنالیا تھا۔ جو اگر بہت اچھا نہیں تو بہت برا بھی نہیں تھا۔ اس چھوٹے سے مکان میں وہ اپنی ماں، ایک چھوٹی بہن سرلا اور اپنی بیوی سرتیا اور ساس کے ساتھ رہ رہا تھا۔ لیلادتی کو بھی وہ محض اس لیے برداشت کر رہا تھا کہ لیلادتی کے ہاتھ میں ہر مہینے اپنے مرحوم شوہر کی پنشن آتی تھی۔ وہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ساس سے میٹھا میٹھا بولتا۔ اس روز بیوی اور ساس کے لیے اس کے منہ سے کوئی کالی نکلتی اور نہ کوئی سخت بات۔ اس دن وہ وقت سے پہلے بیدار ہو کر پہلے اپنی ٹیکسی کی صفائی کرتا اور پھر ساس کے پیچ چھو کر اس کا آئینہ داہلے اور بڑے مان سان کے ساتھ ساس کو اپنے برابر بٹھا کر ٹیکسی کو غلط کر کے کہتا۔

”چل میری گلیڈن۔“ لیلادتی بینک جا کر انگوٹھا لگا کر جیسے ہی پیسا حاصل کرتی، چندو اسی وقت اس کے سر پر اپنا دست شفقت پھیر کر رقم اپنی جیب میں رکھتا اور پھر اس کے مہینے بھر کے لیے بس اتنا جیب خرچ دیتا کہ وہ بمشکل اپنا پان تمباکو پورا کر پاتی۔ سرتیا کے ہاتھ تو دمڑی بھی نہیں لگتی لیکن دونوں ماں بیٹی کے ہونٹوں پر مہر لگی ہوئی تھی کیونکہ چندو دن کے جوڑے سے سرتیا کو بیاہ کر لایا تھا۔ اس لیے چندو پوری دیدہ دلیری کے ساتھ ساس کی پنشن پر قبضہ کرتا اور پھر ان دونوں پر ہی غراتا۔ ہاں البتہ چندو کی ماں اور بہن اسے سمجھاتے کہ وہ ان دونوں کے ساتھ اچھا نہیں کر رہا ہے لیکن چندو اپنی ماں اور بہن کو بھی ایسی جھاڑ پلاتا کہ ان کے حلق سے آواز ہی نہیں نکلتی۔ ماں کو اس کی بیماریاں، دواؤں اور ڈاکٹر کی لمبی چوڑی فیس کا طعنہ دیتا اور سرلا کو کہتا۔

”تیری شادی کر کے تجھے بھی تو گھر سے نکالنا ہے۔ تیرے گونے میں دینے کے لیے بھی تو پیسا چاہیے مجھے۔ یا تجھے بھی سرتیا کی طرح خالی ہاتھ رخصت کر دوں۔ ہر کوئی چندو کی طرح جی دار نہیں ہوتا جو بغیر دان و بیج کے لڑکی کو اپنالے۔“

اس کی طعن آمیز باتوں سے جہاں لیلادتی اور سرتیا کا جگر جھلنی ہوتا، وہیں اس کی اپنی ماں اور بہن بھی چپ

ہو جاتیں کیونکہ حقیقت بھی یہی تھی کہ گھر کے تمام اخراجات کا دار و مدار صرف اور صرف چندو کے گاندھوں پر تھا۔ وہ ساری رات ٹیکسی چلاتا اور پوچھنے گھر کو لوٹتا اور پھر تھکا ہارا اپوں سوتا کہ اس کے سر ہانے ڈھول بھی پیٹا جائے تو اس کی آنکھ نہ کھلے۔ ہر شادی شدہ جوڑے کی طرح اس نے اور سرتا نے بھی اولاد کے سنے دیکھے تھے۔ ننھی منی قلعاریوں کو سننے کے لیے ان کے کان ترس گئے تھے لیکن سرتا کی گود ہری نہ ہو سکی۔ اسی اثنا میں اس نے اچھا سا بڑا کچھ کر سلا کی شادی کر دی۔ سرلا کی شادی کے بعد اس کی ماں پر لوک سدھاری اور پھر فوراً بعد لیلاؤ کی کا بھی اتم سے آگیا۔ گھر چھوٹا سا ہی سہی لیکن جب اس میں رہنے والے ہی کم ہو گئے تو گھریوں بھائیں بھائیں کرنے لگا جیسے ویران بیاباں۔ گھر کی نموشی دونوں کو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ اولاد کی کمی کو وہ دونوں اب کچھ زیادہ شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ سرتا کے دل میں تو یہ خوف سا گیا تھا کہ کہیں چندو اولاد کے لیے دوسری شادی نہ کر لے۔ تمام ڈاکٹروں اور وید حکیم سے مایوس ہونے کے بعد وہ مندروں اور سادھو سنتوں کے پاس پھیرے لگانے لگی۔ تیرتھ یا ترائی کر ڈالی لیکن سوکھی ڈال ہی نہ ہو سکی۔

اس کی پرار تھنائیں جاری تھیں اور پھر اوپر والے کو اس پر ایسا ٹوٹ کر رحم آ یا کہ وہ اور چندو خوشی سے نہال ہو گئے۔ پہلے پہل تو چندو کو یقین ہی نہیں آیا لیکن دس جماعتیں اس نے بھی پڑھی تھیں۔ سرتا کی میڈیکل رپورٹ دیکھ کر اسے یقین آ گیا کہ دوھاتا کو اس پر اور سرتا پر دیا آگئی۔ اس نے اسی خوشی میں سارے محلے میں جھگوانا کہ پر ساد اور مٹھائی بانی اور پھر حسب معمول شام ہوتے ہی اپنی ”گلبدن“ کو لے کر نکل کھڑا ہوا۔ دہلی کی چوڑی چٹکی سڑکوں پر گلبدن فرائے بھرتی رہی۔ مہرولی سے کنٹ پیلس، نظام الدین، قروں باغ، چاندنی چوک، ایلیکا بازار، سارے مقامات اور اسٹاپ گلبدن کے بھی دیکھے بھالے تھے اور چندو کے بھی۔ پنچروں سے کرائے وصول کرنے کے بعد اس نے اپنی ساری رقم گنی۔ ایک طمانیت بھری اور پرسکون سانس لی اور گھر واپس ہونے کے لیے ٹیکسی اشارتیں... کرنے ہی والا تھا کہ اچانک ایک خوبصورت عورت اس کی ٹیکسی کے قریب آئی اور نہایت شیریں اور شائستہ انداز میں گویا ہوئی۔

”ٹیکسی خالی ہے؟“ عورت کا نرم و نازک لہجہ اور اس کی سندر تا دیکھ کر چندو دم بخود ہو گیا۔ لفظ ”نہیں“ اس کے منہ سے نہ نکل سکا۔ لعاب وہن نکلتے ہوئے اس نے بغیر

زبان ہلائے گردن کے اشارے سے عورت کو پنچر سیٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا اور ٹیکسی اشارت کر دی۔ راستے میں مطلوبہ مقام معلوم کیا۔ جس علاقے میں اسے جانا تھا اس علاقے میں مکمل سکوت اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ٹیکسی سبک رفتاری سے دوڑ رہی تھی۔ عورت کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق اس نے ٹیکسی ایک عالی شان بنگلے کے سامنے روک دی۔ عورت نے اپنا بھاری بھر کم پرس اور ہاتھ میں پکڑا ایچی بکس اٹھایا اور پھر اپنی رہنمائی فنی سازی کا آئینل سنبھالتی ہوئی ٹیکسی سے اتری اور کرایہ دینے کے لیے پرس کی زپ کھولی لیکن معاس نے اپنا ہاتھ روک کر مستفسر نہ انداز میں چندو کی طرف دیکھا اور اپنی ترنم ریز آواز میں سوال کیا۔

”ٹیکسی والے..... کیا نام ہے تمہارا؟“

چندو نے نہایت مؤدب لہجے میں جواب دیا۔ ”جی چندو نام ہے میرا۔“

”ہوں.....“ عورت نے ہنکاری بھری اور پھر بولی۔ ”اگر میری واپسی تک ٹھہر سکتے ہو تو منہ مانگا کرایہ دوں گی۔ بلکہ تمہاری مانگ اور سوچ سے بھی زیادہ دوں گی۔“

چندو کا من جھوم اٹھا۔ آج کی کمائی بھی اور دونوں کی بہ نسبت زیادہ ہوئی تھی اور آج ہی یہ شری متی بھی اس پر مہربان ہو رہی تھی۔ اسے لگا یہ سب اوپر والے کی کرپا سے ہو رہا ہے۔ جوتھا مہمان اس کے گھر آ رہا ہے، اس کے دم قدم سے پھیسی اس پر مہربان ہو رہی ہے۔ اس نے بغیر سوچے ”ہاں“ کہہ دیا۔ عورت چہپا کے کے ساتھ گیٹ کھول کر اندر چلی گئی۔ چندو اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر پیڑ پار کر لیٹ گیا اور مدھم سروں میں گنگنائے لگا۔ ”ٹیکسی حسین آج بہاروں کی رات ہے۔“ اپنے گائے ہوئے گانے سے وہ خود ہی لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک بنگلے کے اندر سے ایک نسوانی چیخ کی آواز ابھری۔ چندو کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ آواز اسی عورت کی ہے جس نے یہاں اسے روک رکھا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ پہلے تو وہ ہچکچایا پھر ہمت کر کے ٹیکسی سے اتر ا اور اندر داخل ہو گیا۔

راہداری طے کرنے کے بعد اس کمرے کے قریب جا کر ٹھیک کر کھڑا ہو گیا جس کی کھڑکی سے روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ صرف اسی کمرے میں روشنی تھی۔ باقی پورا بنگلا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دروازہ کھڑا ہوا تھا۔ چندو نے دروازے کی جھری سے آنکھ لگا دی اور پھر اس کی آنکھوں نے وہاں جو کچھ دیکھا وہ سب اس کے لیے ناقابل یقین تھا۔

کھلی آنکھوں سے اس کی حرکات و سکنات کو دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک طویل جمائی لے کر وہ سر سے مخاطب ہوئی۔
 ”چندو ہاتھ منہ دھو لو۔ میں بھونج لگاتی ہوں۔“ چندو نے ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے اسے کھانے کے لیے منع کیا اور استہزائیہ لہجہ میں بولا۔

”وہی اپنی شکل کی طرح دال بھیجی بنائی ہوگی۔ کل میں تجھے ”دہلی میٹ کارنز“ لے چلوں گا۔ کچھ تو زبان کا سواو بدلے گا۔“ اس کی اس بات پر سرتا چوکنے بغیر نہ رہ سکی۔ کیونکہ چندو اسے اسی وقت باہر لے جاتا تھا، جب کوئی مونی اسامی کرائے کے علاوہ بھی ٹکڑی رقم اس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اس نے وضاحت طلب نظروں سے شوہر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”چندو! کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور۔ یہ ایٹھی جوتو نے ابھی الماریں میں رکھی ہے، لگتا ہے کوئی تیری میٹھی سی بھول گیا ہے اور تو اپنا مال کچھ کر گھر لے آیا۔ تب ہی اتنا خوش ہے اور اسی لیے میری دعوت کر رہا ہے۔“

چندو غرایا۔ ”آئندہ تیری زبان پر ایٹھی کا ذکر نہ آنے پائے۔ ورنہ تیرا وہ حشر کروں گا کہ دنیا دیکھے گی اور کسی سکھی سٹیبل کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اگر میرا کہنا نہ مانا تو تجھ سے ہر سمبند ختم کر کے دیس نکالا کر دوں گا۔ تجھے باہر کھانا کھلانے اس لیے لے جا رہا تھا کہ آج تو نے مجھے شہہ شہہ سٹاکر میرا دل جیت لیا۔ اپنے آنے والے بچے کی خوشی میں تجھے کھانا کھلانے لے جا رہا ہوں..... سچی؟“ سرتانے سہمی آہی نگاہوں سے شوہر کو دیکھا اور اپنے بستر پر لیٹ گئی لیکن آنکھوں کا مرکز وہی الماری تھی جس میں چندو نے ایٹھی رکھی تھی۔

☆☆☆

چندو روزانہ گھر سے نکلنے سے پہلے الماری کا لاک چیک کرتا۔ الماری کی چابی اپنی جیب میں رکھتا اور پھر باہر کی راہ لیتا۔ آج کل تو اتارے ہا کر سے اخبار خرید کر بھی پڑھ رہا تھا۔ سرتیا اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔ وہ منتظر تھی کہ کسی دن الماری کی چابی اس کے ہاتھ لگے تو وہ ایٹھی کھول کر دیکھے لیکن چندو اس معاملے میں انتہائی گھاگ تھا کہ ایک دن سرتیا کو میلے پٹڑے دھونے کے لیے دیے تو پتلون کی جیب سے چابی نکالنا بھول گیا۔ سرتیا کے لیے یہ سنہری موقع تھا۔ اس نے ترنت الماری کھولی اور ایٹھی نکال کر الٹ پلٹ کرنے لگی۔ ایٹھی مقل تھی۔ وہ الٹ پلٹ کر کے اس کا بغور معائنہ کر رہی تھی۔ بالوں میں سے اپنا میز پین کھینچا اور کی

اس کا دل پوری رفتار سے دھڑک رہا تھا۔ وہ سرتیا پاپینے میں نہا گیا تھا۔ اپنے منہ سے نکلنے والی فتح کو بے وقت تمام اس نے روکا اور اپنے تھر تھراتے ہوئے وجود کو لے کر ایک تاریک کونے میں سمٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے بہت قریب سے کوئی گزرا۔ پھر گھٹ کھولے اور گاڑی اسٹارٹ کرنے کی آواز آئی۔ جانے والے نے گیٹ بند کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ گاڑی انتہائی تیز رفتاری کے ساتھ پھٹنے سے نکلی اور ہوا سے باتیں کرنے لگی۔

چندو نے کافی دیر سے روکی ہوئی سانس خارج کی اور اطراف میں نظریں ڈالتا ہوا کمرے میں داخل ہو گیا۔ کمرے کے اندر کا منظر انتہائی دہشت ناک تھا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر سرایت کر گئی اور وہ ایک جھرجھری لے کر رہ گیا۔ وہاں اسے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا لیکن آدمی حاضر دماغ اور موقع شناس تھا۔ جو کام اسے کرنا تھا، وہ کر کے جس طرح خاموشی سے آیا تھا، اسی طرح نکل گیا۔ یہ رات اس کے جیون میں حقیقتاً بھاریں لے کر آئی تھی۔ اس کی کایا ہی پلٹ گئی۔ اس کی گلبدن اب مہرولی کی طرف رواں دواں تھی۔ وہ جلد سے جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ اسے یقین تھا سرتیا آج بھی بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولے گی کیونکہ اس کی میٹھی نیند میں غفل جو پڑتا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر مسلسل کھٹ کھٹ کی آواز سے سرتیا کی آنکھ کھل گئی۔ اپنے بستر پر سے وہ ہڑ ہڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سال خوردہ سی تپائی پر رکھی ہوئی میٹھی پٹی ناٹم پیس پر نظر ڈالی اور خود کلامی کے انداز میں منمنائی۔ ”چندو تجھ سے بھگوان سمجھے۔ سارا دن کھسا توڑتا ہے اور رات ہوتے ہی روزی روٹی کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔ خود تو دن میں اپنی نیند پوری کر لیتا ہے لیکن مجھ ابھاکرں پر تو آرام حرام ہے۔“

”یہ کہتے ہوئے اس نے طوعاً و کرہاً دروازہ کھولا لیکن چندو کو دیکھتے ہی وہ چونک پڑی۔ روزانہ کی طرح اس کے چہرے پر نہ ٹھکن کے آثار تھے اور نہ اضطحال اور پریشانی کا نام و نشان تھا۔ آنکھوں سے خوف ضرور مترشح تھا لیکن چہرہ ایک انجانے جذبے کے تحت دک رہا تھا۔ ہاتھ میں دبے ہوئے ایٹھی کیس کو سینے سے لگائے وہ سرتیا کو دھکپٹتے ہوئے اندر داخل ہوا۔ سرتیا ”ارے..... ارے“ کرتی رہ گئی۔ اندر آتے ہی اس نے دروازے کی چٹنی چڑھائی اور دوڑ کر ایٹھی کو الماری میں رکھ کر اسے لاک کر دیا۔ سرتیا اب بھی کچھ نہیں سمجھ پائی تھی۔ کچی نیند میں سے اٹھی تھی۔ بس اپنی اودھ

ہول میں ڈالنے کی ناکام کوشش کی۔ وہ اچھی پر تھکی ہوئی اپنے کام میں منہمک تھی کہ اچانک اسے اپنے عقب میں آہٹ محسوس ہوئی۔ آنکھ اٹھا کر دیکھا تو چندو اس کے سر پر کھڑا خنوار نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ سریتا ایک لمحے کے لیے کانپ سی گئی۔ حلق خشک ہو گیا۔ چندو آگے بڑھا اور مشتعل لہجے میں بولا۔

”تو باز نہیں آئے گی۔ تجھے چین نہیں آئے گا۔ جب تک دیکھ نہیں لے گی۔ آ..... آج میں تجھے دکھاتا ہوں کہ اس میں کیا ہے لیکن ہمیشہ کے لیے اپنے ہونٹ سی لیتا۔ ورنہ پل میں سارے سمندھ توڑ گھر سے نکال دوں گا۔“

سریتا نے وحشی ہرنی کی طرح گردن ہلائی اور وہاں سے نکل جانا چاہا لیکن چندو نے اپنی ٹانگ سے اس کا راستہ روکا اور پھنکارتے ہوئے کہا۔ ”جا کہاں رہی ہے۔ رک اور دیکھ کہ اس میں کیا ہے۔ تو تو اپنی ماں کے گھر سے کچھ نہیں لائی تھی لیکن میری آنے والی اولاد دیکھتی تھی بھاگی وان ہے۔ اس کے سنار میں قدم رکھنے سے پہلے میرے گھر میں بن رہے لگا۔“

یہ کہتے ہوئے اس نے شرٹ کی جب سے چابی نکالی اور اس کا لاک کھولا۔ ایک زبردست کھٹکے کے ساتھ اچھی کھل گئی۔ چندو نے جب مکمل طور پر کھولا تو سریتا کے دیدے باہر کی طرف اہل پڑے۔ سونے کے ٹھوس زیورات اور بسکٹ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہے تھے۔ اس کے علاوہ نقد رقم کی کئی گٹدیاں ترتیب سے رکھی ہوئی تھیں۔ سریتا سانس لیتا ہی بھول گئی۔ یہ سب دیکھ کر اس کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ بدقت تمام اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”یہ..... یہ سب کیا ہے اور تجھے کہاں سے ملا؟“ چندو نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”یہ سب اوپر والے کی کرپا ہے۔ اس کے دینے کے انداز نرا لے ہیں۔ بس اب ہمیشہ کے لیے منہ پر قفل ڈال لیتا۔ مجھ سے بھی اب اس بارے میں کوئی سوال مت کرنا۔ بس یہ سمجھ لے کہ نہ تو نے کچھ دیکھا نہ سنا۔ نہ میں نے کچھ دکھایا نہ بتایا۔ اگر میری مرضی کے خلاف گئی تو.....“ اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے سریتا رزق ہوئی آواز میں بولی۔

”تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ کیا میری مت ماری گئی ہے جو میں باہر جا کر ڈھنڈورا پیٹوں گی مگر چندو چور دروازے سے آیا ہوا دھن جس طرح آتا ہے، اسی طرح جاتا ہے۔ آگے تو جاناے اور بھگوان جانے۔“ یہ کہتے ہوئے

وہ جلدی سے وہاں سے کھسک گئی۔ چندو نے ہلہ لی۔ اچھی بند کی اور اسے پھر سے الماری میں رکھ کر الماری لہ مقفل کر دیا۔ اس وقت وہ گہری سوچ میں مشغول تھا۔ چہرے پر انجمن کے آثار تھے۔ ذہن میں ایک بنگامہ بپا تھا کہ اس بلیک مٹی کو وائٹ میں کس طرح تبدیل کیا جائے۔ دور دور تک کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اوپر والا اس پر کچھ ایسا مہربان ہوا کہ نہ صرف راستے کھلتے چلے گئے بلکہ منزل خود چل کر اس کے پاس چلی آئی۔ ان ہی دنوں مہاراشٹر کے ایک دیہی علاقے سے اسے اپنے چچا کے دیہات کی خبر ملی۔ چندو کے اس چچا نے شادی نہیں کی تھی۔ چندو اپنے یار دوستوں میں بیٹھ کر ہمیشہ اس بات کا چرچا کیا کرتا تھا کہ اس کا یہ چچا کروڑوں کی دولت کا مالک ہے اور اس کے مرنے کے بعد سب کچھ اس کے ہاتھ لگنے والا ہے۔ اب بی بی کے بھانجیوں چچا اس طرح ٹوٹا کہ اسے اپنے کنوارے چچا کا کرپا کر مرنے کے بعد اس نے جی جان سے اس بات کی تشہیر کی کہ اسے اپنے سوگد باشی چچا کی کافی دولت ہاتھ لگی ہے۔

اچھی میں ملنے والی دولت کی ساری کا لک دھل گئی۔ سب اجلا اجلا ہو گیا اور اس کے ساتھ چندو کے نصیب بھی ایسے جنگمگے کہ لوگ آشفتہ بدندان رہ گئے۔ اسی دوران سریتا نے ایک بچی کو جنم دیا۔ چندو ہواؤں میں پرواز کرنے لگا۔ اپنے نام کی نسبت سے اس نے بیٹی کا نام چاندنی رکھا تھا۔ چاندنی نے آنکھیں کھولتے ہی دولت کی ریل پیل دیکھی۔ چندو بیٹی کی آنکھیں بھی میلی نہ ہونے دیتا۔ بیوی اور بیٹی کو اس نے سونے میں پیلا اور چاندنی میں سفید کر دیا تھا۔ اب وہ ایک ٹرانسپورٹ بیٹی کا مالک تھا۔ اس کی ٹیکسیاں اور بسیں دہلی اور اس کے قرب و جوار میں دوڑتی پھر رہی تھیں۔ اپنی بیٹی کا نام اس نے اکھٹی لاڈلی بیٹی کے نام پر ”چاندنی ٹرانسپورٹ“ رکھا تھا۔ اس کی دولت سالوں اور ہفتوں کے حساب سے نہیں بلکہ ہفتوں اور دنوں کے حساب بڑھ رہی تھی اور وہ چندو کی کسی ڈرائیور نہیں بلکہ سیٹھ چندو بن گیا تھا۔

اب سریتا سوچی سمجھی گھریلو عورت نہیں بلکہ مسز سریتا چندو تھی۔ چاندنی کا بچپن سونے کے گہوارے میں بھول رہا تھا۔ خوشیاں یوں برس رہی تھیں جیسے ساون کی تھڑی لگتی ہے۔ چھوٹے سے مکان میں جیون بسر کرنے والا یہ کنبہ اب دہلی کے ایک پوش علاقے میں رہائش پذیر تھا۔ گھر کے ہر فرد کے لیے علیحدہ علیحدہ گاڑی مخصوص تھی۔ گھر کے چھوٹے بڑے کاموں کے لیے ملازموں کی ایک فوج تھی

جو مالکوں کا حکم بجالانے کے لیے ہر گھڑی تیار رہتی۔
 انٹیش بدلتے ہی چند اور سرتیا کا حلقہ احباب بھی بدل
 گیا۔ اب وہ اپر کلاس لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا پسند کرتے
 تھے۔ کچھ اسی طرح چاندنی کے ساتھ بھی تھا۔ وہ کسی غریب
 یا کتر سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔ اس گھر کے
 نوکروں کو بھی اپنی جوتی کی نوک پر رکھتی۔ ماں باپ اس کی
 ہر حرکت پر دل و جان سے غارتھے۔

☆☆☆

دن اور رات ایک دوسرے کے عقب میں تیزی
 سے دوڑ رہے تھے۔ چاندنی کا شباب چودھویں کے چاند کی
 یاد دلا رہا تھا۔ اس کے سحرانہ حسن کو جو دیکھتا، وہ دیکھتا ہی
 رہ جاتا۔ کچھ قدرتی حسن کچھ دولت کی فراوانی، ایسا نوٹ
 کے روپ برسا کہ جب کالج میں قدم رکھا تو نو جوان لڑکے
 ہی نہیں بلکہ عمر پروفیسرز صاحبان کو بھی اپنی گزری جوانی یاد
 آگئی لیکن چاندنی ادائے بے نیازی سے ان کے پاس سے
 یوں گزرتی جیسے وہ لوگ بے جان پتھر کے مجسمے ہوں۔
 سہیلیاں اور یوایے فرینڈز کا انتخاب بھی کرتی تو پہلے ان کا
 ڈیٹا ضرور چیک کرتی۔ اس کے فرینڈ سرکل کا ہر فرد اگر کروڑ
 پتی نہیں تو لکھ پتی ضرور تھا۔ بڑے اور اونچے گھرانوں کے
 لوگ اسے بہو بنانے کے خواب دیکھ رہے تھے لیکن سب کو
 مایوسی ہاتھ لگی کیونکہ چند اور سرتیا اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے
 باہر بھیجے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

چاندنی بذات خود بھی علم کی شیدائی تھی۔ ہر سال ٹاپ
 کرتی تھی۔ شادی بیاہ کے الجھاوے میں پھنسنے کے لیے وہ
 قطعی تیار نہیں تھی لیکن انسان لاکھ مقدر کا سکندر کبھی ہوتا ہی
 ہے جو اوپر والا چاہتا ہے۔ اس کی اکڑی ہوئی گردن کا تناؤ
 اس روز ختم ہوا جس روز انٹیش نے اسے منہ نہیں لگایا۔ اسے
 پہلی بار احساس ہوا کہ دنیا کی اس بھیڑ میں وہ بھی ایک عام
 سی لڑکی ہے۔ اس کی خوبصورتی اور سندر کا کو بھی نظر انداز کیا
 جاسکتا ہے۔ اس کے من میں ایک آگ سی بھڑک اٹھی اور
 وہ سرتیا پاؤں میں جل کر راکھ ہو گئی۔ انٹیش سے ملنے اور اسے
 پانے کا جذ بہ دل ہی دل میں پروان چڑھنے لگا۔ انٹیش سے
 اس کی ملاقات اپنی ننھی پریا کی سالگرہ میں ہوئی تھی۔ جب
 پرپانے انٹیش سے اس کا تعارف کروا یا تو اس نے ایک نگاہ
 غلط انداز اس پر ڈالی اور آگے بڑھ کر لیکن جب سکیت میچ
 پر انٹیش نے اپنی آواز کا جادو جگایا تو اسے یوں محسوس ہوا
 جیسے زمین کی گردش تھم گئی ہو۔ دریا اور سمندر کا پانی اپنی جگہ
 ساکت ہو گیا ہو۔ اس کے دل کی ہر دھڑکن سے انٹیش

انٹیش کی آوازیں آنے لگیں۔ اب پرپانے کے قریب آ کر اس
 نے انٹیش کے بارے میں جانکاری چاہی تو پرپانے نے معنی خیز
 نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
 ”نورانی خیر تو ہے۔ کہیں یہ گانگ آپ کا دل تو نہیں
 لے اڑا۔“

چاندنی نے ایک جھپٹی ہوئی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔
 ”نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے تو بس یوں ہی
 پوچھ لیا تھا۔“

پرپانے آنکھیں منکاتے ہوئے جوابا کہا۔ ”میں
 تمہاری بچپن کی ہم جولی ہوں۔ یوں ہی تو آج تک تم نے
 کسی کے بارے میں نہیں پوچھا۔“ چاندنی کی شرکیں
 آنکھیں کچھ اور جھک گئیں اور وہ لا جواب ہوئی۔ پرپانے
 دوبارہ انٹیش کے پاس لے گئی۔ دوران گفتگو میں ہی انٹیش
 نے اسے بتایا کہ وہ میڈیکل کے دوسرے سال میں ہے اور
 اپنی بوڑھی وادی کے ساتھ رہتا ہے۔ ساتھ ہی اس نے
 جب اپنے رہائشی علاقے کا نام لیا تو چاندنی سانس لینا ہی
 بھول گئی۔ اسے پتا تھا کہ وہاں انتہائی غریب اور مزدور پیشہ
 لوگ رہتے ہیں۔ اس قسم کی بستیوں سے تو وہ اپنی کار لے کر
 گزرتا بھی پسند نہیں کرتی تھی لیکن جسے وہ اپنے سن مندر کا
 دیوتا بنانا چاہ رہی تھی، وہ ان ہی بستیوں کا پروردہ تھا۔ وہ دل
 تھام کر رہ گئی۔ پہلی بار دل چلا بھی تو کس کے لیے جس کے
 پاس نہ کوشی تھی، نہ کار۔ پہلے پہل تو اس نے اپنے اس ضدی
 اور ہٹ دھرم دل کو مٹانے کی کوشش کی۔ لیکن آخر کار اسے
 اپنی شکست تسلیم کرنا پڑی کیونکہ دل ناواں بار بار انٹیش سے
 ملنے کی تمنا کر رہا تھا۔

اپنی قیمتی کار لے کر وہ اپنی کوشی سے نکل کھڑی ہوئی۔
 وہاں جا کر اسے اپنی کار ایک جگہ روکنا پڑی کیونکہ انٹیش
 کے گھر تک پہنچنے کے لیے جو تنگ گلی جاری تھی، کار وہاں سے
 گزری نہیں سکتی تھی۔ اس کے پائے نازک پتھر لیے راستے
 سے گزرنے کے بعد انٹیش کے دروازے تک پہنچ ہی گئے۔
 انٹیش اسے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ بے اختیار اس کے منہ سے
 نکلا۔ ”آپ یہاں؟“ چاندنی نے ایک بھر پور مسکراہٹ
 کے ساتھ کہا۔

”جی میں..... لیکن آپ مجھے دیکھ کر یوں گھبرا کیوں
 گئے۔ کیا میرا آنا اچھا نہیں لگا؟“

انٹیش نے حواسوں پر قابو پاتے ہوئے اپنے مخصوص
 لہجے میں کہا۔ ”نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ بس آپ کو
 دیکھ کر مجھے غائب کا ایک شعر یاد آ رہا ہے..... سناؤں؟“

اس کی ایک ہی رٹ تھی۔ ”شادی کروں گی تو ایش سے
ورنہ زندگی بھر کنواری رہوں گی۔“

دونوں میاں بیوی کی راتوں کی نیندیں اڑ گئیں۔ سختی
نری، پیار محبت سے سمجھایا۔ دھمکی دھونس سے بھی کام لیا لیکن
عشق سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اسی اثنا میں چندو کے ایک
دوست نے چاندنی کے لیے ایک رشتہ دکھایا۔ لڑکا کوئی خاص
پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن ایک مل اور کا بیٹا تھا۔ باپ کافی
عرصے پہلے مر چکا تھا۔ ماں اور بہن اس کے لیے لڑکی تلاش
کر رہے تھے۔ چندو کا دوست دونوں ماں بیوی کو چندو کی کٹھی
پر لے آیا۔ دونوں ماں بیوی چاندنی کو دیکھتے ہی فدا ہو گئیں
اور فوراً اس کا ہاتھ مانگ لیا۔ چندو اور سرتا بھی فوراً تیار
ہو گئے کیونکہ مگر کے لوگ تھے۔ سارے شہر میں واہ واہ
ہو جاتی کہ سیٹھ چندو نے اپنی بیٹی کی شادی کتنے اونچے
گھرانے میں کی ہے۔

چاندنی کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو اس کے ہوش
اڑ گئے۔ وہ روئی گڑ گڑائی بہت سرخ۔ بیٹی کی آہ وزاری
دیکھ کر سرتا کی ممتا پھڑ پھڑا کر رہ گئی۔ اکلوتی نازوں سے
پلی بیٹی بھی فوراً شوہر کے سر ہو گئی کہ مل اور کا بیٹا جس کا نام
سدرشن تھا، لاکھا امیر کبیر بھی لیکن جب ہماری چاندنی کو پسند
ہی نہیں ہے تو پھر ایسے بیاہ سے فائدہ۔ ہماری بیٹی ہمیشہ روئی
رہے گی۔ نہ بابا نہ، مجھے نہیں کرنا ہے ابھی اپنی بیٹی کی
شادی۔ بس سدرشن کی ماں بہن آئیں تو انہیں صاف انکار
کر دینا۔ بیوی کی گریہ وزاری دیکھ کر چندو کی پدرانہ محبت
نے بھی جوش مارا۔ لیکن اپنے جذبات پر قابو رکھتے ہوئے
اس نے صرف اتنا کہا۔ ”اچھی فی الحال انکار اور اقرار کا
سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں رشتوں کو میں اچھی طرح
دیکھوں گا، پرکھوں گا پھر فیصلہ کروں گا۔“

بات کچھ دنوں کے لیے ٹل گئی اور سب کچھ راہ
راست پر آ گیا لیکن چاندنی کے قدم پھر بکنے لگے۔
یونیورسٹی کے بہانے نکلتی اور ایش کے گھر پہنچ جاتی۔ اس کی
اس حرکت سے ایش بھی پریشان ہو جاتا۔ سمجھا بھگا کر اسے
واپس جانے کے لیے مجبور کرتا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ
ان دونوں میں جو بطنائی حد بندی ہے، اسے وہ کبھی نہیں پار
کر سکے گا۔ وہ بھی اپنی جگہ سولی پر لٹکا ہوا تھا کیونکہ چاندنی کو
وہ بھی دل کی گہرائیوں سے چاہنے لگا تھا لیکن اسے اپنی
مجبوریوں کا بھی احساس تھا۔ چاندنی آج پھر شام ہوتے ہی
گھر سے نکل کھڑی ہوتی تھی۔ چندو اور سرتا بہت بے چینی
سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ٹھیک رات کے گیارہ بجے

اس نے اجازت طلب نظروں سے چاندنی کو دیکھا۔ چاندنی
نے پلکیں جھپکاتے ہوئے نہایت لگاؤ سے جواب دیا۔
”ایش صاحب! میں غالب کا صرف ایک شعر سننے
کے لیے نہیں آئی ہوں۔ بلکہ آج تو آپ کو غالب کی پوری
غزل سنانی ہوگی۔“

ایش نے وضاحت طلب انداز میں اسے دیکھا اور
مستفسر ہوا۔ ”کوئی غزل؟“

چاندنی نے اپنی مترنم آواز میں کہا۔ ”اے دل نادان
تجھے ہوا کیا ہے۔ آخر اس درد کی دوا کیا ہے“ ایش کے دل
کی دھڑکنیں زبردور ہو گئیں۔ دونوں پر سب کچھ عیاں ہو چکا
تھا۔ اب کہنے سننے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ ایش نے
چاندنی کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھا اور چاندنی کو
اپنے خستہ حال صوفے پر بٹھادیا۔ چاندنی کو یوں محسوس ہوا
جیسے کسی راج کمار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر تخت شاہی پر بٹھادیا
ہو۔ ایش کے ہاتھ کلس پا کر اس کے دل کی کلی کھل اٹھی۔
اس نے جذبات سے مغلوب ہو کر ایش کے کاندھے پر سر
رکھ دیا۔ ایش نے سرگوشیاں انداز میں کہا۔

”چاندنی سیلف پور کنٹرول۔ اندر دادی ہیں۔“

چاندنی ہوش میں آ گئی۔ ایش سے جڑی اسے ہر چیز
اچھی لگ رہی تھی۔ اس لیے دادی بھی اسے بہت اچھی لگیں۔
اس کے گھر میں بزرگ نام کی کوئی چیز تھی ہی نہیں۔ اس لیے
دادی کا وجود اس کے لیے نعمت سے کم نہیں تھا۔ دادی کے
مشفقانہ انداز نے اس کا دل جیت لیا۔ اس روز وہ گھرونی تو
اس کے ہونٹوں پر ایک گیت بچل رہا تھا۔ چندو اور سرتا بھی
اسے دیکھ کر چونکے ضرور لیکن کچھ کہا نہیں۔ چاندنی اپنے بیڈ
روم میں جا کر اپنے پڑھنے بیڈ پر لیٹ کر مشغول کے پینے
دیکھنے لگی جہاں صرف وہ تھی اور ایش تھا۔

☆☆☆

چندو اور سرتا بیٹی کے انداز و اطوار دیکھ کر دل ہی دل
میں سہجہ جارہے تھے۔ غیر معمولی جج دج کے ساتھ وہ کسی
دوست یا سہیلی کے گھر جانے کے لیے کہہ کر نکلتی۔ ماں یا باپ
سے اجازت بھی لیتی۔ لیکن کئی بار اس کا جھوٹا کھل کر سامنے
آ گیا۔ اب دونوں نے اس پر سختی شروع کر دی تھی۔ چندو
نے اپنے ذرائع سے پتا چلایا تو ساری بات کھل کر سامنے
آ گئی۔ ماں باپ نے اپنے طور پر اسے سمجھانے بھجانے کی
کوشش کی۔ دنیا کی اونچ نیچ، بستی اور بلندی کا فرق بتایا۔
تنگدستی اور غربت کتنی بُری بلا اور بیماری ہے، امیری اور
غریبی کی کیا تفریق ہے..... بیٹی پر اچھی طرح واضح کیا لیکن

اس کی گاڑی پورچ میں پکی تو دونوں کی جان میں جان آئی۔ عزت داد پر لگی ہوئی تھی۔ اس لیے اونچی آواز میں باز برس بھی نہیں کر سکتے تھے۔ بیٹی کی ڈھٹائی اور سرکشی سے اچھی طرح واقف تھے۔ دونوں نے فی الفور اس وقت تو خون کا گھونٹ لی لیا لیکن باہمی مشاورت سے دونوں میاں بیوی نے یہ طے کیا کہ اب جو کچھ کرنا ہے، بہت جلد کرنا ہے۔ اگر اس معاملے میں تاخیر کی تو سانپ نکل جائے گا اور وہ فقط لکیر کو سینے رہیں گے۔

دونوں کا دھیرج اور صبر جواب دے چکا تھا۔ بیٹی کے اگلا قدم اٹھانے سے پہلے چند دنوں فوراً عملی قدم اٹھایا۔ وہ دوسری صبح سریتا کو کچھ بتائے بغیر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ آج وہ اشیش سے ملاقات کر کے اس کا منہ اپنی دولت سے بند کر دے گا۔ سکوں کی جھنکار اور نوٹوں کی سرسراہٹ سن کر ہی وہ پاؤں اٹھا کر نکل پڑا اور جیسے ہی چاندنی اس کے حصار محبت سے آزاد ہوگی، وہ فوراً اس کی شادی سدرشن سے کر دے گا۔ اسی سلسلے میں اسے آج سدرشن اور اس کی ماں سے بھی ملاقات کرنی تھی۔ چند اس وقت کافی دل گرفتہ، ملول اور مضطرب تھا۔ اس کی منزل اشیش کا گھر تھا۔ جیسے ہی وہ اس کے علاقے میں داخل ہوا، اس کے اعصاب پرچ ساٹاری ہو گیا۔ دل ہی دل میں بیٹی کو صلواتیں سناتے بغیر نہ رہ سکا۔ گاڑی روک کر آس پاس کے لوگوں سے اشیش کا پتا پوچھتے پوچھتے وہ اس کے دروازے پر پہنچ ہی گیا۔ لوگ اس کی گاڑی کو اور اسے متحس اور حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ چند کو دستک دینے کی ضرورت نہیں پیش آئی کیونکہ محلے کے چھوٹے بچوں نے پہلے ہی اشیش کو خبردار کر دیا تھا۔۔۔۔۔

اشیش بھیا! تمہارے گھر ایک گاڑی والے بہت بڑے صاحب آئے ہیں۔“

اشیش کو کسی بات کا کوئی علم نہیں تھا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ چند پر نظر پڑے ہی وہ بھونچکا رہ گیا۔ چند نے فوراً بھانپ لیا کہ یہی اشیش ہے۔ وہ کن اکھیوں سے اسے دیکھتے ہوئے اطراف میں بھی نظر دوڑا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ یہاں آ کر سخت کوفت محسوس کر رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو تنگ رہے تھے لیکن خاموش تھے۔ چند ہلکا سا تھکنا تھا تو اشیش یوں چونکا جیسے خواب سے جاگا ہو۔ اس نے چند کو اندر چلنے کی پیشکش کی۔ دونوں اندر داخل ہوئے۔ صوفہ چیمز پر بیٹھے ہوئے چند نے طائرانہ نظر درود پوار پر ڈالی تو دیوار پر لگی

ایک تصویر کو دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا۔ تصویر پر کاغذ کے پھولوں کا پار پڑا تھا۔ چند بغیر پلکیں جھپکائے تصویر کو تنگ رہا تھا اور اشیش چند کو تنگ رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کا مہمان تو تصویر پر سے نظریں ہی نہیں ہٹا پارہا تو اس بار اس نے ہلکا سا تھکنا تھا کہ خود ہی بولنا شروع کیا۔ وہ دھیمی اور غمگین آواز میں گویا ہوا۔

”انکل ایہ میری سو رگ باشی ماں ہے۔ میں جب بہت چھوٹا تھا تب ہی ان کا دیہانت ہو چکا تھا۔“

اوه..... اچھا..... اچھا..... کہتے ہوئے چند اپنی نفست پر سنبل کر بیٹھ گیا اور اپنی توجہ تصویر پر سے ہٹاتے ہوئے اشیش سے استفسار کیا۔

”تمہارے علاوہ گھر میں کون کون ہے؟“ اشیش نے اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے فوراً کہا۔

”جی میں اور میری دادی ہیں۔ میں ابھی دادی ماں کو ملا کر لاتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے اٹھا اور متصل کمرے میں چلا گیا۔ چند کی نظریں پھر تصویر پر جا کر تنگ گئیں۔ اس کے چہرے پر غور و فکر کی ان گنت لکیریں پہلی ہوئی تھیں۔ چند لمحوں بعد ہی اشیش اپنی دادی کو لے کر وارد ہوا۔ یوڑھی ضعیف خاتون کو اشیش سہارا دے کر لایا تھا کیونکہ ان دنوں وہ بیمار تھیں۔ منستے، ہنسنا کے بعد چند ان سے کرید کرید کر ان کے ماضی کے بارے میں استفسار کرتا رہا اور پرانے وقتوں کی سادہ لوح عورت نہایت سادگی سے اس کے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔

اشیش نے بچن میں جا کر چند کی خاطر تواضع کے لیے چائے پانی کا انتظام کیا اور میز سجادی۔ دادی اور چند میں کیا باتیں ہوئیں، وہ بالکل بے خبر تھا۔ چند یہاں آیا تھا صرف چند لمحوں کے لیے لیکن وہ اشیش کی دادی کے ساتھ جو گفتگو ہوا تو اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ چائے پی کر اس نے خالی کپ میز پر رکھا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

”اب میں چلوں گا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے دادی کے پیچھے چھوٹے اور اشیش سے ہاتھ ملا کر نکل گیا۔ تنگ اور پیچیدہ گلیوں کو عبور کر کے وہ اپنی پہنچائی کار کے قریب پہنچا تو محلے کے تنگ دھڑنگ بچوں کا ازو حام اس کی کار کو گھیرے ہوئے تھا۔ وہاں سے نکل کر چند گھر جانا چاہتا تھا لیکن پھر فوراً ہی اس نے ارادہ بدل دیا اور اپنی گاڑی کا رخ سدرشن کی کوٹھی کی طرف موڑ دیا۔ اس کی گاڑی جب کوٹھی کے پورچ میں جا کر رکی تو اس کے سوا گت کے لیے سدرشن کے علاوہ اس کی ماں اور بہن بھی موجود تھیں۔ سدرشن بھی نہایت نفیس

دراز تھی۔ آنکھوں سے آنکھیں اور تفکرات جھانک رہے تھے۔ چندو نے گھر میں داخل ہوتے ہی بیوی کو آواز دی۔ شوہر کی آواز پر وہ یوں اچھلی جیسے بچھونے ڈنک مارا ہو۔ دل دھکڑ پڑ کر رہا تھا۔ پتا نہیں آج اسے اور اس کی بیٹی کو کیا کچھ سننے کو ملے لیکن شوہر کا کھلا کھلا چہرہ دیکھ کر ایک پُر سکون سانس لی۔ باپ کی آواز سن کر چاندنی بھی چونک گئی۔ ماں اسے پہلے ہی خبردار کر چکی تھی کہ آج فیصلے کا دن ہے اور اس کا باپ سیٹھ چندو دل دونوں لڑکوں سے ملاقات کر کے فوراً شادی کا مہورت نکال کر آئے گا۔ آنے والا وقت کیا دکھائے گا یہ سوچ سوچ کر چاندنی کا دل پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔ اسے سو فیصد یقین تھا کہ اس کا باپ سونے چاندنی کا دلدادہ اور روپے پیسے کا متوالا ہے۔ اگر دولت غلامت میں بھی پڑی ہے تو وہ اسے دانتوں سے پکڑ کر اٹھا لے گا۔ چھوڑے گا نہیں۔ اس لیے اس کا دوش یقیناً سدرن کو ہی پڑے گا۔ جبکہ وہ سدرن کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتی تھی۔

اپنے بیٹے سے اللہ کر وہ اسی اڈھیر بن میں پھولے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے کمرے سے اُٹتی تو دیکھا کہ چندو بیوی کے ساتھ نشست گاہ کی طرف جا رہا ہے۔ وہ بھی دبے قدموں چلتی ہوئی کمرے کی عقی کھڑکی سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی کا پٹ ہلکا سا کھول کر بھری سے کان لگا دیے۔ گھر کے اس حصے میں کسی کی آؤک جادک بھی نہیں تھی اس لیے نوکر چاکر کی نظروں میں آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ اب وہ بے خوف و خطر ہو کر ماں باپ کی کھسر پھسر سننے لگی۔ دونوں پہلے پہل تو آہستہ آہستہ سرگوشیاں انداز میں بولتے رہے اس لیے چاندنی کے لیے کچھ نہ بڑا لیکن بتدریج ان دونوں کی آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ اب وہ صاف طور پر ماں باپ کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ اس کی ماں شوہر کے بالکل قریب بیٹھی تھی اور مسلسل سوالات کی یلغار کر رہی تھی۔ ابھی اشیش کے بارے میں پوچھتی تو ابھی سدرن کے بارے میں لیکن چندو کے ہونٹ سلے ہوئے تھے۔ وہ غلامی گھورے جا رہا تھا۔ چاندنی کو اس وقت باپ کی خاموشی بہت کھل رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سکوت، یہ خاموشی کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہو۔ اس وقت وہ انتہائی اذیت سے گزر رہی تھی۔ بے تاب دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی۔ بالآخر چندو کی بھاری بھر کم آواز کمرے میں گونجی۔

”سریتا! تجھے وہ رات یاد ہے جب میں سونے کے

سوٹ میں لمبوس ان کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی ج جوج بتا رہی تھی کہ وہ کہیں باہر جا رہا تھا لیکن سیٹھ چندو کی اس اچانک آمد نے اس کے قدم روک دیے تھے۔ قیمتی ساز و سامان سے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر چندو نے حسب عادت اچھتی ہوئی نگاہ چاروں طرف دوڑائی۔ یہاں پر بھی ایک بڑے سے پورٹریٹ پر جا کر اس کی نظریں ٹھہر گئیں۔ بے ساختہ چونکتے ہوئے اس نے اشیش کی ماں سے پوچھا۔

”بہن جی! یہ کس کا پورٹریٹ ہے؟“

اشیش کی ماں کلماد پوی نے روہائی آواز میں جواب دیا۔ ”بھائی صاحب! یہی تو ہیں میرے شوہر اور اشیش کے ڈیڈی۔ انہیں کینسر جیسا موزی مرض کھا گیا۔ بس اب تو یہ دو بچے ہی ان کی نشانی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی پر غم آنکھوں کو اپنی ساڑی کے آچل سے پونچھنے لگی۔

اس تصویر کو دیکھنے کے بعد چندو وہاں زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکا۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس آرام دہ اور پیش قیمت صوفے پر کسی نے کانٹے بچھا دیے ہوں۔ گھبرا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ کلماد پوی نے اسے یوں اٹھتے دیکھ کر فوراً کہا۔

”ہائے بھائی صاحب! بغیر جل پان کیے تو میں ہرگز آپ کو نہیں جانے دوں گی۔ پہلی بار آپ کے شہہ قدم ہمارے گھر آئے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بیٹی کو شہو کا دیا۔ ”راگنی! جلدی سے دوڑ کر شہو کا کا سے کہو کہ انکل ناشا ہمارے ساتھ ہی کریں گے۔“

چندو نے سختی سے انکار کرتے ہوئے اپنے قدم باہر کی طرف بڑھا دیے۔ تینوں ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھنے لگے۔ اب ان کے چہرے اداس اور لٹکے ہوئے تھے۔ چندو تیز رفتاری سے وہاں سے نکل کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور گاڑی فرائے بھرتی ہوئی کونجی سے نکل گئی۔ اب بھی اس کی منزل اس کا اپنا گھر نہیں بلکہ اس وقت اس کی گاڑی اس کے ایک دوست کے گھر کی طرف رواں دواں تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹا دوست سے گفت و شنید کر کے جب وہ وہاں سے نکلا تو اس کے چہرے پر طمانیت اور سکون کی پرچھائیاں تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی ساری بے قراری اور بے چینی ختم ہو گئی ہو اور اس نے صحیح وقت پر رخ فیصلہ کر لیا ہو۔ اب وہ انتہائی مطمئن انداز میں گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ چہرے پر اطمینان بھری مسکراہٹ تھی۔

☆☆☆

اپنے بھاری بھر کم وجود کو لے کر سریتا صوفے پر نیم

زپورات اور نقد رقم سے بھری ہوئی ایک اٹیچی لے کر گھر میں داخل ہوا تھا؟“ سرتا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ”ہاں“ کہا اور بولی۔

”چند وہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔ وہیں سے تو ہمارے جیون میں بدلاؤ آیا تھا۔ تو نے سچ کہا تھا کہ دینے والے کے انداز نرالے ہوتے ہیں۔“ چندو نے ایک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ معنی خیز انداز میں کہا۔

”سرتا! صرف دینے کے انداز نہیں اوپر والے کے لینے کے انداز اس سے زیادہ نرالے اور اونکے ہوتے ہیں۔“ سرتا نے متعجب لگا ہوں سے شوہر کو دیکھا اور بولی۔ ”میں کچھ سمجھی نہیں۔“

چندو نے ایک گہری سانس لی اور بولا۔ ”آج میں تجھے ایک ایسی سرگزشت ایسی کھاتا سنانے جا رہا ہوں کہ آئندہ تجھے مجھ سے کوئی استفسار کوئی سوال نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ دولت کس کی تھی، کس طرح ہمارے پاس آئی اور اب کس طرح ہمارے پاس پہنچ رہی ہے۔ یہ سب کارگیری اس کرتا رہا ہے۔ جس نے اس سارے سنسار کو پیدا کیا ہے۔ تو نے بھی درست ہی کہا تھا کہ دولت جس راستے سے آئی ہے، اسی راستے سے چلی جائے گی۔“

سرتا نے ہنر بڑا کر گھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کیا کیا..... اصل مالک کو پتا چل گیا کہ اس کے دھن سے بھری اٹیچی ہمارے پاس ہے۔ ہائے بھگوان! اب کیا ہوگا۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ آج تم دونوں لڑکوں میں سے کسی کا انتخاب کر کے آئے ہو گے اور ہم جلدی سے اپنی بیٹی کے ہاتھ پیلے کر کے چین کی سانس لیں گے لیکن تم نے تو کہا ہی ہی دوسری چیخوڑی۔“

چندو کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ صوفے کے کشن کا سہارا لے کر وہ اور پھیل کر بیٹھ گیا۔ سگریٹ جلائی اور ایک لمبا کش لیا اور دھوئیں کے مرغولوں کو گھورتے ہوئے بولا۔

”بس اب درمیان میں کچھ نہ بولنا۔ میں بولوں گا اور تو سنے گی۔ اٹیچی میں ملنے والا دھن، میرے کاروبار کے ذریعے اس دھن کی بڑھوتری، ہماری بیٹی چاندنی اور اس کی شادی اور یہ دونوں لڑکے آئیں اور سدرشن..... سب ایک ہی کڑی کے حصے ہیں۔ قصہ دراصل کچھ یوں ہے کہ اس رات ایک سندری جو بالکل پرپوں کے مافوق تھی، میری ٹیکسی میں بیٹھی اور منزل پر پہنچنے پر ٹھہرنے کے لیے کہہ کر ایک سنسان اور غیر روشن جنگل میں داخل ہوئی۔ چند لمحوں بعد مجھے اس عورت کی چیخ سنائی دی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس

دیران جنگل میں داخل ہو گیا۔ بلکا تو تاریک تھا لیکن جس کمرے میں روشنی تھی، میں نے ادھر کا رخ کیا اور دروازے کی جھری سے اپنی آنکھیں اور کان لگا دیے۔ اندر کا منظر مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس حینہ نازنین کے سامنے سفید شرٹ اور بلیک پنٹ میں ملبوس ایک بینڈم شخص کھڑا ہوا تھا۔ عمر کوئی تیس بیس کے قریب ہوگی۔ وہ اس عورت سے مخاطب تھا اور انتہائی درشت لہجے میں کہہ رہا تھا..... جب تک میری ڈیمانڈ نہیں پوری کر دی گی میں تمہارے فوٹو گراف اور خطوط نہیں دوں گا۔ عورت لرزیدہ آواز میں اس سے جرم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ گڑگڑاہٹ تھی۔ اٹیچی کھول کر اسے رام کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی تجوری سے فی الحال انتہائی نکال سکی ہے۔ باقی وہ بعد میں دے دے گی۔ لیکن اس شخص کے سینے میں دل کی جگہ شاید پتھر تھا۔ وہ ڈرا بھی نہیں بچ رہا تھا۔ عورت بلبلاتا کر اپنے ننھے ننھے بچے کی دہائی دے رہی تھی کہ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو اپنی ساس کے پاس چھوڑ کر آئی ہے اور اس کا شوہر انتہائی شریف اور باادفا انسان ہے۔ تم میرے ہتھے بستے گھر کو نہ خراب کرو۔ اس شخص نے ایک استہزائیہ ہتھ لگایا اور کہا..... مسز امریتا اگر وال! بہت سستی چھوٹ رہی ہو۔ میرے خبری نے تو میرے کان میں سرگوشی کی ہے کہ سیتھ اگر وال کر ڈھنچی آدی ہے۔ پھر کیوں تجوی کر رہی ہو۔ تیری نازک کلائی..... اسی لیے تو مرد ڈی تھی کہ سیتھ کی ساری دولت کا تحنیہ تجھے یاد آ جائے لیکن تو تو یوں چپنے لگی جیسے تو نے مجھے پہلی بار دیکھا ہے۔ بھول گئی اپنے محبوب کو اپنے پریمی کو جس کی ایک نظر کے لیے تو ترستی تھی۔ کالج کی ساری لڑکیاں تجھ پر رشک کرتی تھیں کہ راجن گپتا تجھے پسند کرتا ہے اور تو بھی اپنے بھاگ پر ناز کرتی تھی۔ کیا سب برین واٹس کر دیا؟ مجھ سے بڑا دھن دان ہے تا تیرا بھتی۔ اس کا دھن سہتی دیکھ کر تیرے ماتا پتا نے مجھے ٹھکرایا۔

”امرتا ناگن کی طرح پھنکاری اور انگارے چباتے ہوئے بولی..... جھوٹ کہہ رہے ہو تم۔ میرے ڈیڈی نے تمہارے بارے میں چھان بین کی تو پتا چلا کہ تم انتہائی بیڈ کریکٹر کے انسان ہو۔ عورت، جوا اور شراب کے رسیا۔ محنت مشقت اور کمنا دھانا تم سے ہوتا نہیں ہے اور اپنے پرکھوں کی دولت پر غیاشی کرتے پھرتے ہو۔ میرے ڈیڈی کو جو تمہارے بارے میں رپورٹ ملی تھی، وہ غلط بھی نہیں تھی۔ بھگوان کا شکر ہے کہ میری شادی تم سے نہیں ہوئی۔ ورنہ ساری عمر روتے روتے ہی گزر جاتی۔ تم تو میرے شوہر

چھوٹی سی بات

☆ بد صورت چہرہ بد صورت دماغ سے بہت بہتر ہے۔
☆ وقت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں انسان اپنا ماضی، حال، مستقبل دیکھ سکتا ہے۔
☆ کامیابی ان کے قدم چومتی ہے جنہیں کامیابی کا یقین ہوتا ہے۔
☆ خوش اخلاقی پر کچھ خرچ نہیں ہوتا بلکہ وہ آپ کا وقار بڑھا دیتی ہے۔
☆ آسمان اس پرندے کا نہیں جس کے پر بڑے ہوں، آسمان اس پرندے کا ہوتا ہے جس میں قوت پر واز ہے۔
☆ بارش جیتے کی جلد کو بھگو سکتی ہے مگر اس کے دھبے دھو نہیں سکتی۔

سرسلر: وزیر محمد خان - بل ہزارہ

میں غلٹی لگائے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب راجن گیتا بالکل میرے قریب سے گزرا۔ وہ خود بھی اتنا حواس باختہ تھا کہ اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ اس بلڈنگ میں اس کے اور امریتا کے علاوہ بھی کوئی ہے۔ حتیٰ کہ دولت سے بھری اس اپنی کو بھی اٹھانا بھول گیا جس کے کارن اس نے اتنا بڑا پاپ کیا۔ جب وہ گاڑی لے کر نکل گیا، تب میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گپے اور کرنی سے بھری ہوئی وہ اپنی اٹھائی اور گلبدن کو فرائے سے بھاگتا ہوا وہاں سے نکل بھاگا۔ تو مجھ سے پوچھ پوچھ کر تھک گئی لیکن میں نے یہ راز تجھ پر آشکار نہیں کیا کیونکہ مجھے پتا تھا کہ عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں۔ تو اگر منہ سے بھاپ بھی نکالتی تو بات پھیلنے دیر نہیں لگتی اور پھر پولیس مجھے دھرنی لیتی۔ امریتا مرڈر کیس کا اس وقت میڈیا میں خوب چرچا تھا۔ پولیس قاتل کی یو سوسپٹی پھر رہی تھی۔ امریتا کا شوہر بیش اگر وال کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ کافی اثر رسوخ والا اور با اثر آدمی تھا، اگر پولیس ذرا سا بھی سراغ پالیتی تو کھینچا تانی میری بھی ہوتی۔ اس وقت ہمارے گھر میں... ٹی وی تو تھا نہیں اس لیے میں روزانہ اخبار خرید کر اس کیس کی تفصیل پڑھا کرتا تھا۔ بہر حال پولیس کے ہاتھ راجن گیتا کی گردن تک نہیں پہنچ سکے کیونکہ وہ بظاہر راجن گیتا کے ایک دوست کا تھا جو ان دنوں ملک سے باہر تھا۔ اس لیے چند

کے چرنوں کی دھول بھی نہیں ہو۔ کہاں وہ کہاں تم.....
توبہ... چھی..... میں بھی کتنی مورکھ اور نادان تھی۔ جو تجھے جیسے لوفر کو اپنا ہار سنگھار مان کر اپنا سب کچھ دان کرنا چاہتی تھی۔ تیری پوجا کرتی تھی اگر تو مجھے بلیک میل کر کے اپنا اصلی روپ نہ دکھاتا تو ساری زندگی رہا کی آگ میں جلتی رہتی اور اپنے ماتا پتا کو کوئی رہتی۔ میرے باپ نے تو مجھے ایک سکھی سنسا دیا ہے۔ میں اپنی گھر گشتی میں بہت خوش ہوں۔ اشیش کی پیدائش کے بعد ہماری خوشیاں اور بڑھ گئی ہیں لیکن تجھ جیسے لیرے نے میرا جیون نرک بنا رکھا ہے۔ ایک عرصے سے میں اپنے شوہر کی محنت کی کمائی تیری نذر کر رہی ہوں۔ اس کے ساتھ بے وفائی کر رہی ہوں۔ اب یہ سب میرے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔ تو ایک پیٹ پھٹا کر شمس ہے۔

”غمے کی شدت سے اس کی ناک کے نتھے پھڑک رہے تھے۔ خوبصورت آنکھیں چمچمچم برسی رہی تھیں۔ گلابی گال سرخ ہو گئے تھے۔ اتنا کچھ کہنے کے بعد اس نے دیوار کا سہارا لیا اور اپنا چہرہ چھپا کر آواز کے ساتھ رونے لگی۔ راجن نامی وہ شخص اب بھی ڈھنکائی سے اس سے رقم بڑھانے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ امریتا نے مشتعل اور کھیلے لہجے میں کہا۔ اب تک تو اپنی عزت اور اپنا گھر بچانے کے لیے میں تجھے بہت کچھ دیتی رہی ہوں لیکن ابھی اسی لمحے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ تو ایسا ناگ ہے جو مسلسل دودھ پیتا رہے گا اور مجھے ڈنٹا رہے گا۔ اس لیے آج اس قصے کو میں ختم کر دیتی ہوں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا بڑا سا پرس کھولا اور اس میں سے نیلا جھلملاتا ہوا خنجر نکالا جس کا پھل بجلی کی روشنی میں آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ نرم و نازک ہاتھوں میں خنجر ایک لمحے کے لیے کھپکھپایا لیکن پھر اس نے خنجر پر اپنی گرفت مضبوط کی اور راجن گیتا کی طرف بڑھی اور چاہا کہ اس پر وار کرے لیکن راجن نے پوری طاقت سے اس کے ہاتھ سے خنجر چھینا اور اس پر یوں جھپٹا جیسے شکاری اپنے شکار پر چھینچا ہے۔ اور..... اور..... پھر اچانک وہ سب ہو گیا جسے سوچ کر آج بھی میرے رونٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سندرتا کی وہ صورت ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔ اس کی ساکت اور بے نور آنکھیں چھت کو گھور رہی تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اس کے مکتونی حسن کو دیکھ کر اپنی سدھ بدھ بھول گیا تھا لیکن اس کی لاش اور گاڑھا گاڑھا سرخ خون دیکھ کر اپنے ہوش و حواس سے ہی بیگانہ ہو گیا۔

مہینوں اس کیس کا غفلت رہا پھر اس کے بعد گزرتے ہوئے وقت نے اس کیس کی فائل کا خدات کے ڈھیر تلے بادی۔ معاملہ جہاں سے شروع ہوا تھا، وہیں جا کر ختم کیا۔ ساری بات ایک بھولی بری کہانی بن گئی۔

”میں نے سارے زور کہوں کو خفیہ طریقے سے پکھلا کر اور پھر اسے فروخت کر کے اپنے نئے کاروبار کی بنیاد رکھی۔ کیش کو بھی مارکیٹ میں آہستہ آہستہ لایا۔ ان ہی دنوں کھام گاؤں والے چاچا کا دیہات ہو گیا۔ یہ میرے لیے گولڈن چانس تھا۔ میں نے سب کے سامنے اور دوست احباب میں اس بات کی تشہیر کی کہ میرا چاچا چونکہ کنوارا تھا اس لیے اس کی ساری دھن دولت کا میں اگلوٹا وارث ہوں۔ لوگ میرے نصیب پر رشک کرنے لگے۔ حالانکہ حقیقت تو یہ تھی کہ چاچا گاؤں میں ایک چھوٹا سا مکان اور ایک دو ایکڑ زمین چھوڑ کر مرا تھا۔ ہمارے دھن دان بننے کا سارا دار و مدار ہمیشہ اگر وال اور امریتا اگر وال کی دولت پر تھا۔ اگر اس رات راجن گپتا بھاگتے وقت وہ اپنی اٹھالیٹا تو شاید آج بھی ہم مہرولی کے اس چھوٹے سے مکان میں بیٹھے ہوتے۔ میں آج بھی نیکی چلا رہا ہوتا اور ہماری چاندنی جو عشق محبت کے گیت الاپ رہی ہے، وہ بھی روزی روٹی کے چکر میں کہیں چھوٹی موٹی ملازمت کر رہی ہوتی لیکن بھگوان کی دیا سے اگر وال خاندان کا پیسا ہمیں ایسا راس آبا کر کاروبار میں دن بدن ترقی ہوتی چلی گئی۔ گزرے ہوئے کل کی پرچھائیں بھی ہم نے اپنی بیٹی پر نہیں پڑنے دی۔ جیون کے سارے سکھ ہمارے اور ہماری بیٹی کے قدموں میں آن گرے تھے لیکن آج مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اوپر والے نے مجھے صرف اس پیسے کا رکھوالا بنایا تھا۔ مجھ سے کھن محنت بھی اس لیے کروائی کہ اس دولت کی بڑھوتری ہوتی رہے اور سے آنے پر حذر تک اس کا حق پہنچا دوں۔ آج جب میں اشیش کے گھر میں داخل ہوا تو برسوں بعد پھر وہی چہرہ میرے سامنے تھا۔ دیوار پر اسی عورت کی تصویر لٹک رہی تھی۔ یعنی امریتا اگر وال کی جو میری آنکھوں کے سامنے قفل ہوئی تھی۔ جب اشیش نے بتایا کہ یہ تصویر اس کی ماں کی ہے تو میری بوٹی بند ہو گئی۔ چیک اور کیش یہ سوچ کر لے گیا تھا کہ اپنی دولت میں اشیش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذن کر دوں گا اور وہ خود بخود میری بیٹی کا پیچھا چھوڑ دے گا لیکن وہاں جا کر پتا چلا کہ اصل ادھکاری تو میرے سامنے کھڑا ہے۔ کنگال تو دراصل میں خود ہوں۔ میرے پاس تو صرف بیٹی ہے۔ باقی ساری دولت تو اشیش کی ہے۔ پھر بتائیں

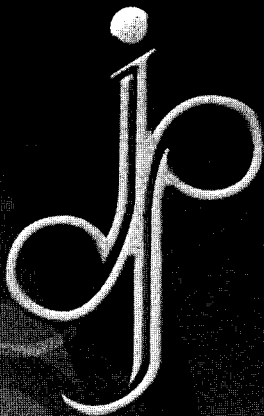
اسے کیا دیتا اور کیا بولتا۔ اس کی بوڑھی دادی سے کرید کرید کر اگر وال پر پیوار کے باغی کے بارے میں سوالات کرتا رہا۔ وہ انتہائی معصوم اور بھولی بھالی پرانے وقتوں کی عورت ہے۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں چھپایا۔ اپنے دکھ درد بیان کرتے ہوئے کھلے لفظوں میں یہ بات عیاں کر دی کہ اشیش جب بہت چھوٹا تھا، کسی نے اس کی بہو کو قتل کر دیا تھا۔ قتل کا معما آج تک حل نہ ہو سکا۔ یہی تم اس کے بیٹے ہمیشہ اگر وال کو چاٹ گیا۔ اس کے مرتے ہی گردش دوران نے ان کے گھر کا رخ کر لیا۔ ہمیشہ کا بزنس، کوشی اور بے شمار دولت اس کا بزنس یا رنر ہڑپ کر گیا۔ اشیش اور اس کی دادی نے بہت سخت دن گزاریے ہیں لیکن اشیش کی دادی نے ہمت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے پوتے کو پڑھایا لکھایا۔ اسے اچھے سسکا کر دیے۔ بہت ہونہار اور بھلا لڑکا ہے۔ بہت جلد میڈیکل کی پڑھائی مکمل ہو جائے گی۔ آگے کے لیے ابھی کچھ سوچا نہیں ہے۔ گیت سنگیت کا بھی دیوانہ ہے کیونکہ اس کی آواز بڑی مدھر اور لوج دار ہے۔ اس لیے شو بڑا والے بھی اسے بار بار کال کر رہے ہیں۔“

بولتے بولتے چند سانس لینے کے لیے رکا اور دہلی ہوئی سانس خارج کرتے ہوئے پھر گفتگو کا سلسلہ ہوار کیا اور بیوی کو مخاطب کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”سرتیا! نیلی چھتری والے کی لیلادیکھ، کیسے ابد اور عجیب و غریب کھیل ہیں اس کے، بس میں تو یہی کہوں گا کہ جب تیری کارگیری رے کرتا رہ، سمجھ نہ آئے یا تیری بدلے رنگ ہزار۔“

سرتیا کی آنکھیں حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ لمحہ بہ لمحہ اس کا اضطراب اور بے قراری بڑھ رہی تھی۔ چند دم لینے کے لیے رکا تو اس کی بے چینی میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔ ”ابھی کچھ اور بھی باقی ہے؟“

چندو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گونج دار آواز میں جواب دیا۔ ”ہاں ابھی بہت کچھ باقی ہے۔ تجھے اس دورگہ دنیا کی نیہنگیاں دکھاؤں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر خاموش ہو گیا۔ سرتیا کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔ وہ شوق اور دلچسپی سے ایک ایک لفظ سن رہی تھی۔ اس لیے بے چین تھی کہ چند پھر زبان کھولے۔ چندو اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ اس لیے اس نے پھر سے اپنے ذہن میں واقعات کو ترتیب دیتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا اور بولا۔

”اب تجھے تصویر کا دوسرا رخ دکھاتا ہوں۔ تجھے پتا ہے نا کہ میں ذرا سن موٹی قسم کا آدمی ہوں۔ جو سن میں



جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

ایک ادارہ، چار ماہانہ مطبوعات

دنیا بھر میں

خدمات

اور مصنوعات

کی موثر تشہیر کے لیے

جاسوسی ڈائجسٹ سسٹمز ڈائجسٹ ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت

مالیاتی امور سے لے کر گہرائی میں جاننے والی معلومات کے فوائد کا انتخاب

جنہیں ہر روز نظم کے لاکھوں قارئین ملحق ہوتے ہیں



جہاں جہاں اردو پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں یہ رسائل باقاعدگی سے پہنچتے ہیں

C-63 فیئر ٹو ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

نمبر: 35804200, 35802552 (92-21) فیکس: 35802551 (92-21) ای میل: group@hotmail.com

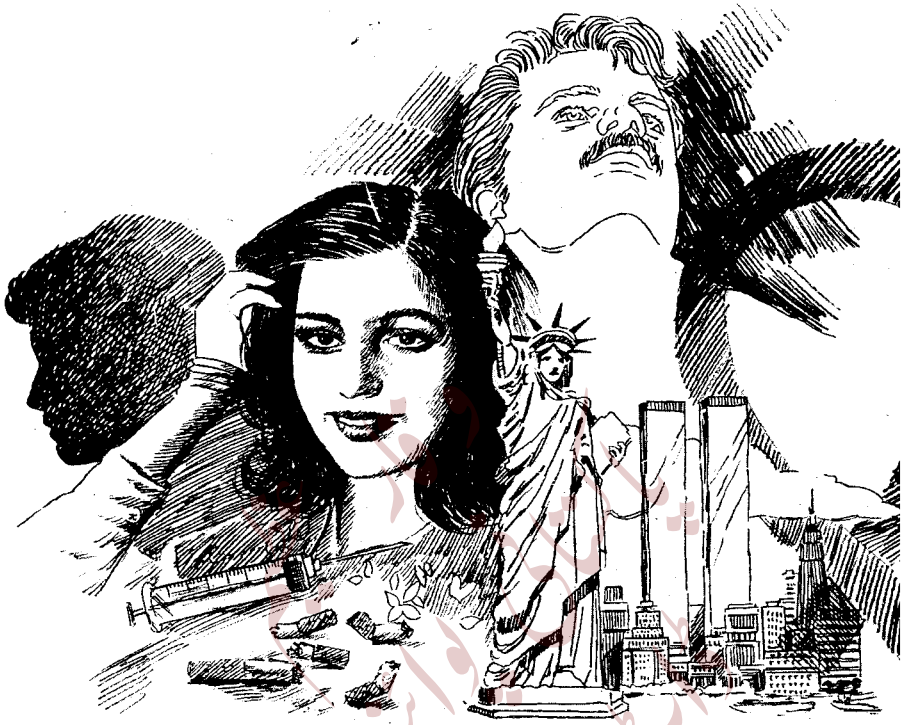
سا جاتی ہے وہ ضرور کر کے رہتا ہوں۔ بس دل نے صدای کہ چلتے چلتے سدرش کی فیملی کے بھی درشن کرلوں۔ یہ سوچ کر گاڑی ”سدرش بھون“ کی طرف موڑ دی۔ بڑی عالیشان کوٹھی ہے۔ سارا گھر انا مجھے دیکھ کر پھول کی طرح کھل اٹھا۔ ان کا رکھ رکھاؤ اور سجاؤ دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ وہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ میں چاندنی اور سدرش کے بیٹا کی تاریخ پکی کرنے آیا ہوں لیکن میں نے فوراً ان کی غلط فہمی دور کر دی کہ میں تو یوں ہی گھومتے پھرتے ادھر اٹکلا ہوں۔ بہر حال ان لوگوں نے بھرپور طریقے سے میرا سواگت کیا۔ کشاں کشاں ڈرائنگ روم میں لے کر گئے۔ صوفے پر بیٹھے ہی معاً میری نگاہ سامنے دیوار پر لگے پورٹریٹ کی جانب اٹھی اور اٹھی ہی رہ گئی۔ سانس سینے میں ہی اکٹ گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے قاتل راجن گپتا کا پورٹریٹ تھا۔ میں نے اپنے حواس مجتمع کرتے ہوئے لڑکھائی آواز میں استفسار کیا..... کیونکہ ہمارے ہیں جن کا پورٹریٹ اتنے آدرسان کے ساتھ آپ نے اپنے ڈرائنگ روم میں لگا رکھا ہے؟ بہت کچھ سمجھ تو میں بھی گیا تھا لیکن جان کر انجان بن کر سوال داغ دیا۔ سدرش کی ماں کملا دیوی نے اپنی پُرم آنکھوں کو ساڑی کے آچل سے گڑتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا..... بھائی صاحب یہی تو ہیں سدرش کے سوگد باشی پتا راجن گپتا۔ کینسر کا مرض ایسا لگا کہ ان کی جان ہی لے لٹلا۔ اب تو بس ان کی نشانی میرے یہ دو بچے ہیں۔ اس نے سدرش اور اپنی بیٹی راگنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں اب بھی اس پورٹریٹ کو گھورے جا رہا تھا۔ بالآخر کملا دیوی میرا انتہاک اور محویت دیکھ کر سمجھ گئی کہ میں راجن گپتا کو جانتا ہوں۔ وہ مستغفر ہوئی..... بھائی صاحب کیا آپ میرے آنجنابی پتی سے مل چکے ہیں۔ میں بری طرح شپٹا گیا۔ دل و دماغ کے پردہ تصور پر صرف ایک تصویر چل رہی تھی۔ امریتا کی خون میں لتھری ہوئی لاش اور راجن گپتا کا خونخوار چہرہ اور خون آلود جگر۔ میرا سارا وجود ٹھنڈے پینے سے شرابور تھا۔ بدقت تمام میں نے زبان کھولی اور بولا..... شاید کہیں دیکھا ہے لیکن یاد نہیں آ رہا کہ کہاں دیکھا ہے۔ دراصل اس عمر میں یادداشت بھی تو ساتھ نہیں دیتی ہے۔ کملا دیوی فوراً بولی..... جی ہاں درست کہہ رہے ہیں آپ ڈرائنگ روم کی تزئین و آرائش دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی لیکن مجھے وہاں سانس لینا بھی دو بھر ہو رہا تھا۔ اس لیے میں فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اشتداد دیکھ کر وہ سب بے چین ہو گئے۔ کملا دیوی نے بولکھلا کر کہا..... ارے بھائی صاحب! آپ

ابھی تو آئے ہیں، پہلی بار آپ کے شہ قدم ہمارے گھر آئے ہیں۔ بغیر آؤ بھگت کے ہم آپ کو کبھی نہیں جانے دیں گے۔ پھر اس نے پاس بیٹھی ہوئی بیٹی کو ٹھوکا دیتے ہوئے تھکسانہ لہجے میں کہا..... راگنی! شامو کا کا سے کہو کہ اگلے ہمارے ساتھ ہی ناشتا کریں۔ لیکن لڑکی کے اٹھنے سے پہلے ہی میں کھڑا ہو گیا اور بغیر کسی تاخیر کے فوراً باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ان بھجوں کی آنکھوں میں نہ صرف حیرانی بلکہ مایوسی بھی تھی۔ چہرے بری طرح لٹک گئے تھے۔ میں وہاں سے اٹھ کر اپنے جرنلٹ دوست اجیت کپور کے گھر پہنچا۔ شہر میں کس جگہ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہو چکا ہے اسے سب خبر ہوئی ہے۔ سدرش کے بارے میں پوچھنا تھوڑی تو اس نے سارا ڈیٹا میرے سامنے رکھ دیا۔ بیٹا پورا پورا باپ پر گیا ہے۔ سر سے جیر تک قرضوں میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک نمبر کا نمکا اور کھٹو ہے۔ بیٹی بھی آرام طلب اور نت نئے فیشن کی دلدادہ ہے۔ اپنے سارے مسائل کا حل ان کے پاس یہ ہے کہ سدرش کی کسی دولت مند گھرانے میں شادی ہو جائے تاکہ ان کے سارے دلدر دور ہو جائیں۔ اسی لیے وہ ہمارے گھر رشتہ کرنے کے لیے بے تاب ہیں۔“

سریتا پتھر کی بت بنی ساری کتھان رہی تھی۔ شوہر کے خاموش ہوتے ہی وہ چونگی اور ایک طویل سانس لے کر بولی۔ ”ہائے چند حالات اور واقعات تو کیساری کون (ثالث) بنایا ہے اور کس طرح اصل ہتھار کو سامنے لا کر مجرم اور پالپی کے خاندان کو ذلیل و خوار کیا ہے۔ اگر آج حقیقت کا پتا نہیں چلتا تو یقیناً تم نے میری سنتے نہ اپنی بیٹی کی مانتے اور سدرش کے خاندان پر اپنی بیٹی اور دولت کی بلی چڑھا دیتے۔ کتنا بڑا انانے کر رہے تھے تم اپنی بیٹی کے ساتھ۔ وہ شاید تمہیں معاف کر دیتی لیکن بھگوان تمہیں بھی نہ معاف کرتا۔ بہر حال اب تو آئیے کی طرح ہر بات صاف و شفاف ہے۔ پھر اب کیا فیصلہ کیا ہے؟“

چندو نے اپنی نشست چھوڑتے ہوئے ایک طویل انگڑائی لی اور مطمئن لہجے میں بولا۔ ”ارے بھئی! ہم کیا اور ہمارے فیصلے کیا۔ یہ بیوگ ہے فیصلے تو اوپر والا ہی کرتا ہے جس کا مال ہے ہمیں اسے ہی لو لانا ہے۔ بلکہ ہم تو بیاج میں اسے اپنی سندھ، موٹیل اور انمول بیٹی بھی دے رہے ہیں۔“

باپ کی زبانی ساری کہانی اور خصوصاً آخری جملے سن کر اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلکانے لگے۔ قسمت کے ستارے یوں بھی مسکراتے ہیں، اسے معلوم نہ تھا۔



سوانگ

جمالِ دست

انسانی دماغ جہاں حقیقت میں حیرت انگیز کارنامے انجام دیتا ہے وہاں انسان کو محض خیالات کے گھوڑے پر بٹھا کر انتہائی بلندیوں پر بھی لے جاتا ہے۔ جیسا کہ اس نفسیاتی مریض نے ایک دلچسپ سوانگ بھرا اور لوگوں کو حیران کر دیا۔

روپ بدلتے لوگ اور حالات بدلتے لمحات کا انوکھا انداز

ٹی فٹر لکھا ہوا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے ان دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے سر ہلا دیے۔
مارگریٹ اور اس کا پانچ سالہ بیٹا چارلی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کا نو عمر بیٹا ڈیرک اسپتال لے گیا۔

ریٹائرڈ اسکول ٹیچر فرین ویلنگٹن جب اسپتال کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسی لمحے سنہرے بالوں والی ایک جوان عورت کمرے سے باہر نکل رہی تھی۔ اس عورت نے سفید رنگ کا لیب کوٹ پہنا ہوا تھا جس کے نیم فیک پر ڈاکٹر

پر لیٹا ہوا تھا اور اس کی ایک ٹانگ پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔
 ”ارے مس ویلٹائن!“ مارگریٹ نے اس پر نگاہ پڑتے ہی حیرت کا اظہار کیا۔ ”کیا عمدہ سر پرانز ہے۔“
 ”مریض کا کیا حال ہے؟“ فرین ویلٹائن نے ڈیرک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ ڈیرک نے قدرے شرماتے ہوئے کہا۔ ”بس ڈیڈی مجھے میری موٹر سائیکل بدستور اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دیں گے تو بہت اچھا ہے گا۔“
 ”تمہاری خواہش اور تمہارے لیے گڈ لک!“ فرین یہ کہہ کر اس کے چھوٹے بھائی کی طرف ٹھوم گئی۔ ”تمہیں یہاں دیکھ کر خوشی ہوئی، چارلی۔ بعض اوقات اسپتال کی انتظامیہ چھوٹے بچوں کی اسپتال میں آمد کے بارے میں سخت رویہ اختیار کر لیتی ہے۔“

”ڈاکٹر فشر نے ہمیں چارلی کے اپنے بھائی کی عبادت کے لیے آنے کی اجازت دے رکھی ہے۔“
 مارگریٹ نے بتایا۔

”یہاں کمرے میں آتے ہوئے پیری اس سے بڑبھڑ ہوئی تھی۔“ فرین نے کہا۔ ”اسے پہلے بھی یہاں نہیں دیکھا۔“

”وہ بڑے غضب کی شے ہے۔“ ڈیرک نے اپنی آنکھیں منکاتے ہوئے تبصرہ کیا۔

”کیا وہ استھیا لوجسٹ ہے؟“ فرین نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ ”بغیر کسی دوا کے مریض کو بے ہوش کر دیتی ہے؟“
 ”آپ بہتر سمجھ سکتی ہیں کہ میرے کہنے کا کیا مطلب تھا!“ ڈیرک نے مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر وہ دونوں ہنس دیے۔

”زیادہ خوش نہی میں جلتا مت ہو، یک مین۔“
 ڈیرک کی ماں مارگریٹ نے کہا۔ ”اس کے ہاتھ میں شادی کی انگوٹھی موجود تھی۔“
 ”میں نے تو نہیں دیکھی۔“

”وہ اس لیے کتم اس کی نیلی آنکھوں کے سحر میں کھوئے ہوئے تھے۔ میری نگاہ اس کی انگوٹھی پر اس وقت پڑی تھی جب اس نے سرج تمہارے بازو میں داخل کی تھی اور تمہارا خون نکال رہی تھی۔“

”کیا اور بھی ٹیسٹ ہونے ہیں؟“ فرین نے پوچھا۔
 مارگریٹ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”ہمیں بتایا گیا ہے کہ شاید کل تک وہ ڈیرک کو اسپتال سے ریلیز کر دیں گے۔“
 ”میرا خیال تھا کہ اس قسم کے کام عام طور پر تریس کیا

کرتی ہیں..... جیسے انجکشن لگانا، ٹیسٹ کے لیے خون لینا، دوا پلانا وغیرہ وغیرہ!“
 ”ڈاکٹر فشر نے بتایا کہ وہ یہ کام خود کیا کرتی ہے۔ جب ہم نے اسے دیکھا تو وہ دونوں مرتبہ تھپائی آئی تھی۔“
 یہ سن کر فرین اپنی ٹھوڑی کھجانے لگی اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”مجھے اس ڈاکٹر کے بارے میں مزید کچھ بتاؤ۔“

مارگریٹ نے اس بات پر شانے اچکا دیے۔ ”اس کے متعلق میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتی۔ البتہ وہ عمدہ ڈاکٹر لگتی ہے۔“
 ”لیکن اسے صحیح سنائی نہیں دیتا۔“ کسن چارلی نے تبصرہ کیا۔

فرین یہ سن کر پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی۔ ”کیا؟“
 ”وہ میرے ٹیڈی بیئر پر کھڑی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کا نام پکارا لیکن اس نے میری آواز نہیں سنی۔ مجھے اس وقت تک انتظار کرنا پڑا جب تک وہ چلی نہیں گئی۔ تب میرے ٹیڈی بیئر کو اس سے چھٹکارا ملا۔“

فرین نے جھک کر چارلی کے ٹیڈی بیئر کا بغور جائزہ لیا جو اس نے اپنے ہاتھوں میں دبوچا ہوا تھا۔ ”اسے زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ اب تو ٹھیک ہے نا؟“ اس نے پوچھا۔
 چارلی نے سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ”جی میڈم! بس ذرا سا جھک گیا ہے۔ وہ سپر پاد کا حامل ہے۔“
 ”میرا بھی یہی اندازہ تھا۔“ فرین نے چارلی کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور سیدھی کھڑی ہو گئی۔ پھر ان لوگوں سے معذرت کرتے ہوئے کمرے سے باہر آ گئی۔

کورڈوڈر میں پہنچ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور اپنی بیٹی لوسی کو فون کیا جو کانڈاؤنی شرف بھی تھی۔
 پندرہ منٹ بعد لوسی وہاں آں پہنچی۔

”میں اس طرح وارد ہونے پر معذرت چاہتی ہوں۔“ لوسی نے مارگریٹ سے کہا پھر اس کے بیٹے سے بولی۔ ”تمہاری ٹانگ کیسی ہے، ڈیرک؟“

”اب تو بہت بہتر ہے، شرف!“
 ”ماما! کیا آپ ایک منٹ کے لیے باہر آ سکتی ہیں؟“
 لوسی نے فرین سے کہا۔

باہر کورڈوڈر میں پہنچ کر لوسی نے اپنی ماں سے کہا۔
 ”آپ نے فون پر مجھے جو کچھ بتایا تھا، کیا اس بارے میں آپ پُر یقین ہیں؟“

”لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ وہ اصلی ڈاکٹر نہیں ہے؟“
 مارگریٹ نے فرین سے پوچھا۔
 ”پہلے تو میں اس بارے میں پریقین نہیں تھی۔ پہلا
 شب تو چارلی کی بات پر ہوا تھا۔“
 ”کس بات پر؟“

”یہی کہ چارلی کے اس کا نام پکارنے پر اس نے
 کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اس کا اصلی نام
 نہیں تھا!“

”تو میں نے اسے پکڑوانے میں مدد کی ہے؟“ ننھے
 چارلی نے پوچھا۔
 ”ویل..... کیا تمہیں معلوم ہے کہ کسی شے کی تصدیق
 کرنے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟“
 ”نہیں میڈم۔“

”اس کا مطلب ہے کہ ہاں، تم نے اسے پکڑوانے
 میں مدد کی ہے ا“

”ننھا چارلی یہ سن کر خوشی سے تالیاں بجانے لگا۔
 مارگریٹ بدستور اچنبھے میں تھی۔ اس کی تیوریوں پر
 ابھی تک بل پڑے ہوئے تھے۔ اس سے رہانہ گیا اور وہ بول
 پڑی۔“

”تمہیں سب سے پہلے اس پر شبہ کس بات پر ہوا تھا؟“
 ”مجھے تمہاری بات پر شبہ ہوا تھا!“
 ”میں نے ایسی کیا بات کہہ دی تھی جو تمہیں اس پر
 شک ہو گیا تھا؟“

”مارگریٹ نے حیرت سے کہا۔
 ”تم نے کہا تھا کہ جب وہ عورت سرج سے ڈیرک کا
 خون لے رہی تھی تو تم نے اس کے ہاتھ میں شادی کی انگوٹھی
 دیکھی تھی..... یاد ہے؟“

”ہاں..... تو پھر؟“
 ”ایک اصلی ڈاکٹر یا نرس اس قسم کے کام کرتے
 ہوئے ہاتھوں میں ڈسپوزیبل دستانے لازمی پہنے رکھتا ہے
 اور دستانوں کی موجودگی میں انگلی میں پہنی ہوئی انگوٹھی نظر
 نہیں آ سکتی تھی۔“

فرین نے وضاحت کی۔
 مارگریٹ نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔
 ”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ واقعی تم بہت ہوشیار اور ذہین ہو،
 فرین!“

فرین نے اس ستائش پر ننھے چارلی کی طرف دیکھا
 اور اسے آنکھ مارتے ہوئے بولی۔ ”سپر پاور کا حامل صرف
 تمہارا ٹیڈی بیئر ہی نہیں ہے اور لوگ بھی ہیں۔“

”اور پھر کمرے میں ان سب کے قہقہے گونجنے لگے۔

”میرا یقین پختہ ہے جیسی تو میں نے اس معاملے کو
 چیک کرنے کے لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔“ فرین نے
 جواب دیا۔ ”میرے خیال سے ہمارا اقدام نرسوں کے اسٹیشن
 کی طرف ہونا چاہیے۔“

ان دونوں نے پہلے فلور نرس سے بات کی جس نے
 انہیں پرسونیل آفس سے رابطہ کرنے کو کہا۔
 وہاں انہیں ڈاکٹر ٹیری فشر کی تصویر دکھائی گئی۔ تصویر
 میں نظر آنے والی عورت درمیانی عمر کی تھی۔ اس کے بال اور
 آنکھیں دونوں سیاہ رنگ کے تھے۔

”دس منٹ بعد مختلف ہالز میں گشت کرتے ہوئے انہیں
 سنہرے بالوں والی ڈاکٹر فشر دکھائی دے گئی۔ فرین نے تو
 اسے پہلے ہی دیکھا ہوا تھا۔ انہوں نے اسے گھیر لیا اور پوچھ
 گچھ شروع کر دی۔

”منوں بی میں سچ سنائے آ گیا۔
 شیرف لوسی ویلفائن سنہری زلفوں والی عورت کو اپنے
 ہمراہ لے گئی۔ فرین داہس ڈیرک کے کمرے میں آگئی اور
 ان لوگوں پر حقیقت آشکار کر دی۔

”تو وہ ایک بہر و پیا تھی؟“ مارگریٹ کا منہ حیرت
 سے کھلا رہ گیا۔
 ”حقیقت میں وہ یہاں اسپتال کی ایک مریضہ
 ہے..... نفسیاتی وارڈ کی مریضہ۔“ فرین نے کہا۔ ”اس نے
 شیرف کے رد و بدو اعتراف کیا ہے کہ وہ ہمیشہ سے ایک ڈاکٹر
 بننا چاہتی تھی۔“

”کیا کسی ڈاکٹر کا سواگت بھرا جرم نہیں ہے؟“
 ”یقیناً جرم ہے۔ جیسی تو شیرف اسے اپنے ہمراہ
 پولیس اسٹیشن لے گئی ہے۔“ فرین نے جواب دیا۔
 ”وہ اسپتال میں ہر کسی کو بے وقوف بنانے میں کس
 طرح کا مایاب ہوئی؟“

”ویل، حقیقی ڈاکٹر فشر تھی ہے اور فی الحال چھٹی پر
 ہے۔ اس عورت نے ہمیں بتایا کہ وہ اپنے وارڈ کے فلور سے
 چپکے سے کھسک کر باہر آگئی تھی اور اسے اسٹاف کے لاکرز
 میں ڈاکٹر فشر کا لیب کوٹ رکھا ہوا مل گیا۔ اس کے بعد وہ
 ڈاکٹر فشر کا لیب کوٹ پہن کر راولڈنڈ کرتی رہی جیسے کہ وہ جانتی
 ہو کہ وہ کیا کر رہی ہے۔“

پھر فرین، ڈیرک کی جانب متوجہ ہوئی۔ ”جب
 اس نے تمہیں سرج کی سوئی چھوٹی تھی تو تمہیں تکلیف
 ہوئی تھی؟“

”بہت زیادہ۔“ ڈیرک نے جواب دیا۔

ذرا سی بات

ناہید سلطانہ اختر

بات اگرچہ ذرا سی ہی تھی مگر... رسوائی نے اس کا جہاں تک پہنچا کیا اتنا اس کا قصور نہ تھا جبکہ... ظلم ڈھانے والے بھلا کب یہ سوچتے ہیں کہ ہماری ذرا سی غلط روش سے کسی کے گھر میں آگ لگ سکتی ہے اور جب کسی کو عین بہاروں میں کانٹوں پر چلنے کے لیے مجبور کر دیا جائے تو... تازیست ان کانٹوں کی چبھن اس کے تعاقب میں دوڑے چلی جاتی ہے اور دوسری طرف ظالم یہ بھول جاتے ہیں کہ خدا کی رسی اگر ڈھیلی ہے تو وہ وقت ان کی توبہ کے لیے مقرر کر دیا گیا ہے لیکن افسوس... کیسی توبہ اور کس کا تائب ہونا... جب قسمت میں یہ نیکی نہ لکھی ہو تو طرح طرح کی بیماریاں اور آزمائشیں انہیں اس طرف سوچنے کا موقع ہی نہیں دیتیں۔ حتیٰ کہ وہ انہی ادیتوں میں مبتلا رہ کر اپنے انجام کو نہ پہنچ جائیں... وہ بھی خوب صورت خواب آنکھوں میں سجائے پیدا دیس اتری تھی مگر ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں بے کردھتکار دی گئی کیونکہ وہ ایک بدکردار عورت بنادی گئی تھی... جبکہ نیک کردار لوگ بھی زندگی میں کبھی سکون نہ پاسکے۔

انتہائی معمولی بات اور زیست کی کشن راہوں پر مشکل امتحانات سے

گزرنے والی ایک عورت کے صبر کی داستان





وہ ایک خط!

گناہ اور بے رحمانہ خط!

اس ایک تحریر کی چند سطروں نے شاہینہ کی بیاض زندگی کے تمام جلی اور روشن حروف پر سیاہی پھیر دی تھی۔

وہ ایک خط جس کا حرف حرف جھوٹ کی زہرناکی میں ڈوبا ہوا تھا، اس کی زندگی کی تمام چائیوں کو نگل گیا تھا۔

بے وقری کا دکھ اس نے تجانی نہیں جھلا تھا۔ اس کی بیٹی علیہ نے بھی اس دکھ کی اذیت سہی تھی!

اس چند سطری تحریر کو لکھنے والا کوئی بہت ہی پاپی اور بے ضمیر شخص تھا جس نے ایک لمحے کو بھی یہ نہیں سوچا کہ اس کی جلائی یہ دیاسلائی کسی کی پوری زندگی کو جسم کر سکتی تھی۔ لکھنے والے نے تو شاید اسے ٹھیل ہی سمجھا تھا مگر اس ٹھیل نے شاہینہ کو جیتے جی برزخ میں ڈال دیا تھا!

☆☆☆

شبِ عروسی گزر گئی تھی۔

شاہینہ فجر کی اذان کے ساتھ ہی بستر سے اٹھ بیٹھی تھی۔ نماز کی بروقت ادائیگی کم عمری سے اس کا معمول رہی تھی۔ امی نے اپنے تمام بچوں کو سوچ و فتنہ نماز کا پابند رکھا تھا۔ فجر کی اذان سے کچھ پہلے ہی وہ ہولے ہولے سب کو نام بے نام پکارنا شروع کر دیتیں۔ ”اٹھ جاؤ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔“ فجر کی اذان کے ساتھ ہی یہ امی کا ان سب کے لیے گویا مشترکہ اعلامیہ ہوتا۔ آگے پیچھے سب اٹھ جاتے اور یوں گھر میں فجر کی اذان کے ساتھ ہی چہل پہل ہو جاتی۔ وضو کے بعد لڑکے ابا کے ساتھ محلے کی مسجد کا رخ کرتے۔ لڑکیاں امی کے ساتھ اپنے اپنے مصلے پر کھڑی ہو جاتیں۔ مصلے بٹے ہوئے تھے۔ نیلا ٹھنڈی امی کا، سبز مسجد نبوی کی شبیہ ولا سپنہ آپا کا، چاکلیٹی پھول یونوں کے حاشیہ والا شاہینہ کا اور کاہی سادہ محراب والا روبینہ کا۔ اب صرف فجر کی نماز باقاعدگی اور نہایت خشوع و خضوع سے پڑھتے باقی تو جیسے استغفر اللہ انہیں معاف تھیں۔ امی باوجود کوشش کے انہیں باقی چار نمازوں کا پابند نہ کر سکتی تھیں۔

”صبح لگوالی ہے حاضری۔“ وہ کہتے۔

غیمت تھا کہ وہ ایک وقت تو حاضری لگوا لیتے تھے۔ ورنہ وہ نہایت دیندار سے آدمی تھے۔ لڑکپن میں اپنے دوستوں کے بہکائے میں آکر گھر سے بھاگ لینے کے بعد وہ زمانے کی بہت سی آلائشوں کا شکار ہو گئے تھے۔ امی سے ان کی شادی ایک حادثہ ہی کی جاسکتی تھی ورنہ کہاں ایک

دیندار گھرانہ اور کہاں دنیاوی آلائشوں میں الجھا ایک نوجوان جس کے بارے میں رشتہ کروانے والوں نے امی کے گھر والوں سے یہ غلط بیانی کی تھی کہ سینتالیس کے فسادات میں وہ اپنے گھر والوں سے بچھڑنے کے بعد رمل کھل کر بڑا ہوا تھا۔ پانا جنہیں پانچ جوان بیٹیوں کے فرض سے سبکدوشی کی غلت تھی، زیادہ چھان بین میں نہ پڑے۔ رشتہ بتانے والے کی بات کا اعتبار کیا اور امی کو سادگی سے ابا کے عقد میں دے دیا۔

ابا کے جو ہر توشادی کے بعد بتدریج کھلے!

مگر شاہینہ امی کو جو زبان پر حرف شکایت لائے بغیر ساری زندگی ابا کے ساتھ گزار گئیں۔ بھوک بھی سہی، ابا کی مار بھی جو ہمیشہ ہی بلاوجہ بلا سبب ہوتی۔ ابا پیٹ کے ایسے کپکپے تھے کہ برسوں بعد جا کر تو اپنے خاندان کے بارے میں بتایا جو دور افتادہ ایک شہر میں شرفاء کا خاندان تھا۔ امی کا ان لوگوں سے رابطہ ہوا تو انہوں نے امی کو بڑی مکریم دی مگر ابا کی شخصیت میں جو بگاڑ اور فساد غلط صحبت سے آچکا تھا، وہ مرتے دم تک ان کے ساتھ رہا۔ صحبت نے پورا اثر دکھایا تھا مگر اولاد کچھ باپ کی طرف سے خاندانی اثر سے اور کچھ امی کی تربیت کے طفیل ابا سے بالکل مختلف نکلی۔ شریف، دیندار اور ان آلائشوں سے قطعی طور پر برہنہ جن میں ابا گرفتار تھے۔ بیٹے چاروں نہایت سعادت مند، محنتی اور ایماندار..... بیٹیاں نیک، حیا پرور اور گھر دار۔

چاروں بھائیوں نے مل جل کر کاروبار کر رکھا تھا جس میں اللہ نے ان کی نیک نیتی اور ایمانداری اور امی کی دعاؤں کے سبب بہت برکت دی تھی۔ جتنی تنگدستی امی نے شوہر کے غیر ذمے دارانہ رویے کے باعث دیکھی تھی، بیٹوں کے کاروبار کے باعث اب اتنی ہی خوشحالی تھی گھر میں۔ دو بیٹوں کی شادی ہو چکی تھی، سپنہ آپا امی کے خاندان ہی میں بیاہی گئی تھیں۔

شاہینہ کے لیے ایک غیر خاندان سے رشتہ آیا۔ لڑکے کی دو بہنیں تھیں دونوں شادی شدہ۔ بھائی اکلوتا تھا، بہت پہلے والدین کے انتقال کے بعد بھائی دونوں بہنوں کو باوجود یہ کہ دونوں ہی اس سے بڑی تھیں، سرپرست بن کر ان کے گھر بار کا کیا تھا۔ اپنا گھر تھا، سرکاری نوکری تھی۔ کوئی بڑا عہدہ نہ تھا مگر عزت سے گزارہ ممکن تھا۔ رشتہ امی کی ایک جاننے والی کے توسط سے آیا اور اس نے لڑکے کی شرافت اور اس کے گھرانے

میکے والوں کی دعاؤں اور آنسوؤں کی رم بھم میں رخصت ہو کر سرسراں پہنچے۔ اس کی تندوں اور دیگر سرسراںی رشتے داروں نے کتنے ہی شگون پورے کیے۔ سرسراں کی دلہیز پر اس کے پاؤں دودھ سے دھلائے گئے۔ جس محبت اور وقار سے اس کے میکے والوں نے اسے وداع کیا تھا۔ اس نے سرسراں میں بھی اس کی قدر و منزلت بڑھا دی تھی۔

شاہینہ خوش تھی۔ ساجد اسے خاصا ذمے دار سا آدمی لگا تھا، گزشتہ شب اسے رخصت کرا کے اپنے گھر لے آنے کے بعد وہ تا دیر مختلف کاموں میں مصروف رہا تھا۔ بطور شگون اس کے ساتھ بھجوا یا جانے والا کھانا رشتے داروں کے ہاں بھجوانے، بہنوں، ان کے بچوں اور شادی میں شرکت کے لیے دور دراز علاقوں سے آئے مہمانوں کے لیے آرام کا بندوبست کرنے کے بعد ہی وہ کمرائے عروسی میں آیا تھا۔

”اکیلا مردہوں اس لیے سارے کام مجھ ہی کو دیکھنے پڑتے ہیں۔“ کمرے میں دیر سے آنے پر اس کے لہجے میں عذر خواہی تھی۔

شاہینہ سے اس نے کوئی لمبے چوڑے وعدے وعید نہیں کیے بس اتنا کہا۔ ”میری پوری کوشش ہوگی کہ تم اس گھر میں خوش رہ سکو۔“

شاہینہ جس کا بچپن امی کو نہایت سخت زندگی گزارتے ہوئے دیکھتے گزارا تھا، بڑی صابر اور کم کوی لڑکی تھی۔ اسے ساجد کا یہ سادہ سا عہد بھی خدا کی عنایت لگی۔ صبح فجر کے وقت اس کے اٹھتے ہی وہ بھی جاگ گیا۔

”کیا ہوا؟“

”نماز کا وقت ہو گیا ہے۔“

”اچھا اچھا۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔ ”میں گیزر آن کرتا ہوں۔“

اسے اچھا لگا کہ کل تک غیر ایک شخص کے لیے وہ اتنی اہم ہو گئی تھی کہ اس کے نیند سے بیدار ہوتے ہی وہ بھی جاگ گیا تھا اور اب اس کے لیے گرم پانی کا بندوبست کرنے کو گیزر آن کرنے اٹھ گیا تھا۔

نہا دھو کر اس نے کمرائے عروسی کے ایک گوشے ہی میں نماز ادا کی۔ وہ دو کپ چائے بنالایا۔ ایک اس کے لیے دوسرا اپنے لیے۔

”چائے کے ساتھ کچھ لوگی؟“

”نہیں۔“

”ویسے میں ویسی، انگریزی ہر طرح کا ناشتا بھی

کی نجابت کی ایسی پرتا شیر تصویر کشی کی کہ شاہینہ کے گھر والوں کا دل ٹھک گیا۔ ابا کا انتقال ہو چکا تھا، بھائیوں نے امی سے صلاح چاہی۔ امی نے اپنی شادی کے نتیجے میں اپنے بڑوں کے بچے سے یہی سیکھا تھا کہ اولاد کے رشتے ناتے کرتے ہوئے مال دولت نہیں، دینداری اور خاندان دیکھا جائے اور اس سلسلے میں اچھی طرح چھان بین کر لی جائے۔ شاہینہ کے لیے آنے والے رشتے کے بارے میں بھائیوں نے جہاں جہاں سے پوچھ گچھ کی، یہی پتا چلا کہ شریف خاندان ہے۔ لڑکے میں کوئی اخلاقی عیب نہیں۔ مالی طور پر بہت مستحکم نہ سہی تو کمزور بھی نہیں، گھر آنے والی لڑکی کو خوش رکھ سکتا ہے۔ والدین کے انتقال کے بعد اسی نے دو بڑی بہنوں کو ان کے گھر بار کا کیا تھا، نو جوانی ہی میں کاندھوں پر آڑنے والی ذمے داریوں کے باعث مزاج محکمانہ ہونے کی خبر بھی ملی مگر یہ کوئی عیب نہ تھا۔ سب سر جوڑ کر بیٹھے تو یہی اتفاق ہوا کہ مرد کا محکم مزاج ہونا کوئی بری بات نہیں، مرد دنگ ہی اچھا لگتا ہے۔

لہذا ہاں ہو گئی۔

شادی کی تاریخ طہرنے کے بعد شاہینہ کے اپنے گھر میں دو دو حالتی ماہ تک شادی کی تیاریوں کا وہ غلط رہا کہ ہر دن پر روز عید اور ہر رات پر شب برات کا گمان ہوتا۔ امی، بہنیں، بھائی سب نہایت مسرور تھے۔ شادی کی تیاریوں میں بھائیوں کی فیاضی و دیدنی تھی، جھیز کی تیاری کے لیے انہوں نے ماں بہنوں کو پیسے کی کھلی چمچی دے رکھی تھی۔ ہر روز خریداری ہوتی، ہر روز فریبی رشتے دار گھر آتے جاتے اور رات گئے تک گھر میں جگہ رکتی۔ کبھی خالہ زاد بہنیں رہنے کو آ جاتیں، کبھی ماموں زاد بہنیں ہاتھ بٹانے کو آ جاتیں یہی تائیا کی بیٹیاں گھر کی رونق بڑھانے آ جاتیں، کبھی چھوٹی زاد بہنیں جھیز کی تیاریاں دیکھنے آ جاتیں۔ شادی کی تقریب کے لیے شہر کے ایک بڑے اور مہنگے میرن ہال کی بکنگ کروائی گئی تھی۔ شادی کی ضیافت میں شامل کھانوں میں بھائیوں نے خاصے تنوع کا اہتمام سوچ رکھا تھا۔ پیسا ہوا اور دل کھلا تو اسے خرچ کرنے کی تدبیریں خود ہی سوچنے لگی ہیں۔

شاہینہ کا جھیز دیکھنے والوں کی آنکھیں گرما گیا۔ جس نے دیکھا تعریف کی اور یہی کہا۔ ”بھائی ہوں تو ایسے.....“

شادی نہایت شان سے ہوئی۔

چھٹی رات شاہینہ کے لیے خوشیوں بھری رات تھی،

بنا سکتا ہوں۔“

”ناشتا امی کے ہاں سے آئے گا۔“

”کیوں؟“ وہ چونکا۔

”ریت ہے..... پہلے دن ناشتا میکے سے آتا ہے۔“

”یاد آیا۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”میں بھی

لے کر گیا تھا اپنی بہنوں کے گھر مگر..... تمہارے گھر والے

تکلیف نہ کریں تو اچھا ہے۔“

”منع کر سکتے ہیں تو کر دیں۔“

”نئی نئی سسرال ہے، بڑا نہ مان جائیں۔“

”تنا تو یہ تھا کہ آپ کسی کے اچھا بڑا ماننے کی پروا

نہیں کرتے۔“ شاہینہ نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”جب اصول کی بات ہو..... یہ روایت کا معاملہ

ہے۔“

ساجد کی بہنیں، ان کے بچے اور دوسرے مہمان

جاگے تو وہ دونوں بہت سی باتیں کر چکے تھے۔

امی کے ہاں سے خاصا پُرکلف ناشتا وافر مقدار میں

بجھوایا گیا تھا۔ مزید اہتمام کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ تاہم

ساجد مہمانوں کی خاطر داری میں لگا رہا۔ ناشتے کے بعد دلہا

دلہن کو تھوڑی سی دیر کو تخلیہ میسر آیا پھر شام کو دعوت و لیمہ کا

باہلہ لالچ گیا۔ دعوت و لیمہ میرج ہال میں ہونا تھی مگر

انتظامات کی نگرانی خود ساجد ہی نے کرنا تھی۔ شاہینہ کو بھونپی

پارلر بھی پہنچانا تھا۔ وہاں اس کی آراستگی کے بعد گھر پھر گھر

سے میرج ہال۔

”میں دیکھ رہی ہوں سارے کام آپ ہی کو کرنا

پڑ رہے ہیں۔“ شاہینہ نے اس سے آہستگی سے کہا۔

”میرے کام ہیں تو میں ہی کروں گا نا۔“ وہ اس کی

دلے کی بھاری بھر کم پوشاک اور زیورات کے ڈبوں سے

بھرا اٹھایا اٹھاتے ہوئے بولا۔

شاہینہ نے تو ابا کو کبھی بھی ایسی ذمے داری کا مظاہرہ

کرتے نہ دیکھا تھا بلکہ وہ تو اپنے گھر میں مہمان ہی بنے

رہتے تھے۔ پانی بھی پینا ہوتا تو امی کو آواز لگاتے۔

”زرینہ! ایک گلاس پانی تو پلانا۔“

جب تک جیسے امی ان کی بندی بے دام بنی رہیں۔

گاڑھے سالے میں بیٹنے گوشت کے پارچے، گرما گرم

پھلکے، کھڑے چاول، ٹھنڈا پانی..... امی ان کے لیے ہر روز

ایک نیا کھانا بناتیں۔ کھانے کی ترکیبوں کی ایک کتاب

منگو کر رکھ لی تھی انہوں نے گھر میں، اسی میں سے دیکھ دیکھ

کرت نئی ترکیبیں آزماتیں۔ شاہینہ کو کتاب دیکھنے کی

ضرورت نہ تھی بلکہ اسی کو کیا سپنہ آ پا اور روپینہ کو بھی..... امی

کی تربیت نے انہیں عمدہ کھانا پکانا سکھادیا تھا۔ امی کبھی

تھیں۔ ”مرد کے دل کو جانے والا راستہ اس کے معدے

سے ہو کر جاتا ہے۔“

”ہمارے ابا کا معدہ بہت بڑا ہے۔ دل کو جانے والا

راستہ ہلاک رکھتا ہے۔“ بھائی مذاقاً کہتے۔

”شرم نہیں آتی باپ کے لیے ایسی بات کرتے ہو۔“

امی آنکھیں دکھاتیں۔

”ارے میری پیاری، میری سادی ماں..... تم جیسی

بیوی تو اللہ ہر مرد کو دے۔“ بھائیوں میں سے کوئی امی کو پیار

سے اپنی باتوں میں سیٹھ کر اپنا سر بصد عقیدت ان کے

شانے یا باڈو سے لگا دیتا۔

”خوشامدی ٹٹو۔“ امی پیار سے ہاتھ جڑتیں۔

”ارے تمہاری نہیں تو پھر کسی کی خوشامد کریں گے۔

کیا ابا کی جو بھی منہ بھی نہیں لگاتے۔“

”ارے بیٹا! ان کی اپنی زندگی اپنوں سے بچھو کر

ایسی ہی گزری ہے نا..... ان بے چارے کو پتا ہی نہیں محبت

کیا ہوتی ہے۔“

”معاف کرنا امی، آپ نے تو ساری زندگی انہی

سے محبت کی..... بس چلتا تو مجسمہ بنا کر پوجنا شروع

کر دیتیں۔“

”ہاں، گمنام نہ ہوتا تو شاید ایسا ہی کرتی۔“ امی

اعتراف کرتیں۔

اسی لیے ابا کی موت کے بعد امی دنوں یا مہینوں نہیں

برسوں اداس رہیں بلکہ اب بھی تھیں۔ جہاں ابا کا ذکر ہوتا

ان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ اٹھتے بیٹھتے ان کی

معفرت کی دعا کرتیں۔ ایسی شوہر پرست عورت مرد کو

قسمت سے ملتی ہے جو شوہر کی سختیاں جھیل کر بھی اس کی

زندگی میں اس کی خیر کی اور موت کے بعد معفرت کی

دعا میں مانگے جو بلا سب شوہر کی مار کھا کر بھی حرف شکایہ

زبان پر نہ لائی ہو۔

شام کو تقریب و لیمہ میں بھی ساجد دلہا بن کر دلہن لے

پہلو میں بیٹھا رہنے کے بجائے میزبان بنا مہمانوں کی

پذیرائی میں مصروف رہا۔ شاہینہ کے گھر والوں کی اس لے

غیر معمولی کرجوشی سے خاطر داری کی۔ کھانے کے دوران

ایک ناگ سے کھڑا ویرز کو خود ہدایات دیتا رہا تاہم گام

بگا ہے وہ آج پریشانی شاہینہ کے پاس بھی حاضری دیتا رہا۔

اس کی نگاہوں میں شاہینہ کے لیے غیر معمولی دار و عمل گل

دھوکا نہیں حقیقت تھی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔
”یہ کیا ہے؟“ اس نے ایک کاغذ مسہری پر پھینکتے ہوئے درشت لہجے میں کہا۔

”کیا ہے؟“ اس نے مسہری پر پڑے کاغذ کو یوں دیکھا جیسے وہ کاغذ نہیں کوئی بلا تھی جو اچانک ہی اس کے بستر عروسی پر وارد ہو گئی تھی۔
”زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں۔“ وہ غرایا۔ اس کے بگڑے تیور کسی طوفان کا پیش خیمہ دکھائی دیتے تھے۔

”کچھ بتا تو چلے۔“ وہ بھونچکا تھی۔
”بڑھواسے اور شرم ہو تو ڈوب مرو۔“ وہ جوکل رات سے ابھی کچھ دیر پہلے کمرائے عروسی سے باہر جانے تک اسے پسندیدگی اور محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا تھا، اب اسے نفرت اور حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنی انگلی بستر پر پڑے کاغذ کی جانب اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

شاہینہ نے بستر پر پڑا کاغذ اٹھایا اور ساجد کو اندیشہ بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کاغذ اپنی نگاہوں کے رو برو کر لیا۔ ایسا کیا تھا اس مڑے مڑے سے کاغذ میں جس نے اس کے نئے نوے طے شوہر کو اس قدر برافروختہ کر دیا تھا۔

نہایت خوش خط اور پختہ تحریر تھی۔ شاہینہ جوں جوں اس کاغذ پر درج عبارت پڑھتی گئی، اس کی سانس کی لے دھبی ہوتی چلی گئی۔

لکھنے والے نے ساجد کو بنام مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔

”ساجد صاحب۔ السلام علیکم۔
سبھ میں نہیں آتا آپ کو شادی کی مبارک باد دی جائے یا غلط لوگوں میں آپ جیسے شریف آدمی کے پھنس جانے پر آپ سے اظہارِ ہمدردی کیا جائے۔

جس گھر میں آپ نے شادی کی ہے، ایک بچہ گھرا ہے۔ ان لوگوں کا ماضی نہایت شرمناک ہے۔ افسوس کہ آپ ان کے اجلے لباس، چمکتی چڑی باتوں اور پیسے کی ریل ٹرین سے دھوکا کھا گئے۔ سارا حرام کا پیسا ہے۔ انہوں نے دنیا کے دکھانے کو کاروبار کر رکھے ہیں مگر یہ کالے دھندوں والے لوگ ہیں۔ ان کے مرد بھی خراب ہیں اور عورتیں بھی۔

جس لڑکی سے آپ نے شادی کی ہے، وہ بھی اچھے کردار کی نہیں ہے۔ ہم بہن بیٹیوں والے لوگ ہیں، کیا

محبت تھی۔ اس کے انداز و اطوار میں ویسی ہی بے قراری تھی جیسی کسی بچے کو اپنا من پسند کھلونا پا کر اسے بار بار دیکھنے اور اپنے سے جدا نہ کرنے کی ہوتی ہے!

دعوت و پیر نصف شب تک جاری رہی، گھر لوٹے لوٹے ڈھائی بج گئے۔ دونوں بہنوں، بہنوئیوں اور ان کے بچوں کے علاوہ باقی سب مہمان میرج ہال ہی سے اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ بہنیں، ان کے شوہر اور بچے بھی بس چوٹی کی دعوت تک مہمان تھے پھر انہیں بھی اپنے اپنے گھر چلے جانا تھا۔

شاہینہ کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جا رہی تھیں۔ اسے کمرائے عروسی تک پہنچا کر وہ پھر باہر چلا گیا تھا۔ ”میں ذرا دیکھ لوں کہ سب لوگ آرام سے لیٹ گئے ہیں کہ نہیں۔“ اس کی مراد بہنوں، ان کے شوہروں اور ان کے بچوں سے تھی۔ شاہینہ کا ٹھکن سے برا حال تھا۔ انتظار کا پارا نہ تھا۔ زہرات، میک اپ اور ولے کا بھاری جوڑا اتار کر اس نے ہلکا سا جوڑا پہنا اور کبل اوڑھ کر بستر پر لیٹ گئی۔ کمراس کے بدن سے آشتی امٹن اور حتا کی تھک جھیر میں ملی شینل فانیو پر فیوم اور مسہری کے چہار اطراف تھی گلاب کی لڑیوں کی باسی پڑتی خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ وہ خوش تھی۔ دعوت و پیر میں ساجد نے اس کے گھر والوں کو کتنی سکرم دی تھی۔ بار بار امی کے پاس آ کر بڑی سعادت مندی سے ان کے پاس ذرا ہی دیر کو سہی، بیٹھتا رہا تھا۔ بھائیوں کے ساتھ اس کا رویہ نہایت گرجوٹی کا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے اس کی نگاہوں میں محبت اور وارفتگی ہلکورے لیتی رہی تھی۔ وہ خوش تھی کہ رازِ ہمار زندگی اس مقام پر آٹھرا تھا جو کسی بھی لڑکی کی من چاہی منزل ہوتی ہے۔ اس منزل پر پہنچ کر وہ نہایت مطمئن تھی۔ ٹھکن سے چور بدن کے ساتھ وہ بستر پر لیٹی تو آٹھ لگ گئی۔ جھینر میں ملے کوریا کے ڈبل پلائی زرم و ملائم کبل نے ایسی حدت بہم پہنچائی کہ وہ گردو باںہیا سے بے خبر ہو گئی۔

تسکین بخش حدت ایک جھٹکے سے کبل اس کے اوپر سے کیچنے جانے سے ٹھنڈک میں بدلی تو اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ساجد مسہری کے نزدیک کھڑا نہایت غنیمت و غضب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے اپنی بصارت پر دھوکے کا گمان ہوا۔ وہ نگاہیں جو شام بھر اسے محبت، گرجوٹی، وارفتگی اور لالچاٹ سے دیکھتی رہی تھیں یکایک اتنے غنیمت و غضب بلکہ نفرت میں کیونکر ڈوب سکتی تھیں بھلا!

میں ان کی شرافت اور سعادت مندی کی مثالیں دی جاتیں۔ ماں ہی نہیں اس باپ کے سامنے بھی ہاتھ باندھتے کھڑے رہتے جس نے بھی ان کی پروا ہی نہ کی تھی۔ سعادت مند اولاد کے طفیل اب اس گھر میں خوشحالی تھی۔ فراوانی تھی جسے دیکھ کر اپنوں میں سے بعض خوش ہونے والے تھے تو بعض حاسدین بھی تھے۔

بھائیوں میں اعظم سب سے بڑا تھا بھر عام، اس کے بعد ہاشم آخر میں دائم۔ تین بہنوں میں سیدہ آپا سب سے بڑی تھیں پھر شاہینہ اور اس کے بعد روبینہ۔

اعظم اور عام کی شادی ہو چکی تھی۔ دونوں بیویوں غیر خاندانوں سے آئی تھیں۔ اسی کی خواہش تو یہی تھی کہ اپنے خاندان کی لڑکیاں ان کے گھر آئیں، رشتے بھی طے کر دیے تھے، دونوں بیٹوں کے لیے بہن کی بیٹیاں مگر کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے کہ بدخواہوں کی بدخواہی کی وجہ سے رشتے جڑنے سے پہلے ہی ٹوٹ گئے۔ امی تو کہتی تھیں حاسدوں کی نظر لگ گئی جو نہ صرف بٹنے رشتے ٹوٹے بلکہ اصل رشتوں میں بھی ایسی دراڑ پڑی کہ خالہ کے گھرانے سے تعلقات نہایت کشیدہ ہو گئے۔ اعظم اور عام کی شادی خاندان سے باہر غیر لوگوں میں کرنا پڑی۔ دونوں کی بیویاں عیش کر رہی تھیں۔

اپنی زندگی کے تلخ اور تکلیف دہ تجربے کے پیش نظر امی نے بیٹوں کے ساتھ تینوں بیٹیوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کرنا اور اپنے پیروں پر کھڑا کر دینا ضروری سمجھا تھا۔ لڑکی کے مقدر کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ امی نے کبھی سوچا تھا بھلا کہ ان کا مقوم ایسے آدمی سے جڑے گا۔ عورت تعلیم یافتہ اور ہنرمند ہو تو وہی مصوبت تو نہیں اٹھاتی جیسی خود امی نے ابا جیسے بد کمناؤ، غیر ذمے دار اور صرف اپنی ذات کے حصار میں جبرے خود غرض شوہر کے ساتھ کافی تھی۔ ساری زندگی بال بچوں کی بنیادی ضرورتوں سے بھی انہوں نے لالچ برتی تھی۔

سیدہ آپا نے بی اے، بی ایڈ کے بعد ایک اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ ان کی شادی دور پار کے گھر اپنے ہی رشتے داروں میں ہوئی تھی شادی کے بعد ان کے میاں نے ان کی ملازمت چھڑوا دی تھی۔ اب آپا گھر اور بچے سنبھالتی اور بس۔

شاہینہ نے بھی بی اے کے بعد بی ایڈ کیا تھا اور ایک سرکاری اسکول میں نوکری کر لی تھی۔ نہایت سادہ پسند، کم گو اور امی کی طرح صابر و شاکر تھی۔ کوئی زیادتی کرتا تو چپ

بتائیں کہ اس لڑکی کے پھمن کہا ہیں۔ کس کس کے ساتھ اسے گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہے۔ اللہ معافی! دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ لڑکی آپ سے وفا نہیں کرے گی۔

ویسے آپ کو رشتہ کرنے سے پہلے ان لوگوں کے بارے میں چھان بین ضرور کر لینی چاہیے تھی۔ خیر اب بھی کچھ بگڑا نہیں ہے۔ آپ مرد ہیں، برے لوگوں سے جتنی جلدی ممکن ہو اپنی جان چھڑائیں اور عزت بچائیں۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ اپنی شناخت ظاہر کرنے سے قاصر ہوں۔ راہ اللہ آپ کو یہ معلومات دے رہا ہوں، امید ہے کم لکھے کو زیادہ سمجھیں گے۔ ان لوگوں سے جان نہ چھڑائی تو ان کی اصلیت ظاہر ہونے پر آپ بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔ خدا آپ کی مدد کرے۔

والسلام
خیر اندیش!

شروع تا آخر مکمل تحریر پڑھنے کے بعد شاہینہ نے ساجد کی طرف دیکھتے ہوئے سرودھی آواز میں کہا۔ ”یہ آپ کو کس نے دیا؟“

”مجھے کسی نے نہیں دیا۔“ وہ بھبھکا۔ ”تعمیم بھائی کو گیٹ کے پاس پڑا ملا ہے۔“

تعمیم، ساجد کے بڑے بہنوئی کا نام تھا۔

”اور انہوں نے اسے پڑھ بھی لیا ہے۔“ ساجد نے شہینہ کو گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ سب جھوٹ ہے۔“

”تو سچ کیا ہے؟“ وہ اس کے ہاتھ سے کاغذ جھپٹ کر اسے نفرت سے دیکھتے ہوئے غرایا۔

وہ دم بخود اس کا منہ دیکھنے لگی۔

سچ کیا تھا، وہ خود جانتی تھی۔ وہ سب لوگ جانتے تھے

جو اسے اور اس کے گھر والوں کو جانتے تھے۔ یہ سچ تھا کہ ابا

کچھ اچھے آدمی نہیں تھے مگر اس کی ماں تو ایک نیک صفت اور

شوہر پرست عورت تھی جس نے ایک بے رحم اور غیر ذمے

دار مرد کے ساتھ نہایت صبر و شکر اور قناعت کے ساتھ زندگی

نہائی تھی۔ اسی صبر و شکر اور قناعت کا ثمر تھا شاید کہ اللہ نے

اسے نیک اور سعادت مند اولاد سے نوازا تھا۔ بیٹے باپ

کے برعکس نہایت متحمل مزاج اور فرض شناس..... بیٹیاں ماں

کی طرح نیک طینت اور گھر دار۔ قدرت نے ہاتھ تھام لیا

تھا۔ بیٹوں نے زیرو سے معاشی زندگی شروع کی تھی۔ مسلسل

لگن، محنت اور دیانت سے ہیر و من گئے تھے۔ خاندان بھر

کمرے کے کھلے دروازے میں ساجد کی دونوں بہنیں پہلو بہ پہلو آکھڑی ہوئی تھیں۔ شاہینہ نے انہیں مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے بھائی تک آ پہنچیں۔

”جب یہ کہہ رہا ہے اپنے گھر والوں کو بلا تو بلاؤ۔“ ان میں سے ایک نے شاہینہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سب سوچتے ہوں گے۔“ وہ سراپیمہ ہو رہی تھی۔

”صبح تک انتظار کر لو ساجد۔“ دوسری بہن نے بھائی سے کہا۔

”نہیں..... میں انتظار نہیں کر سکتا..... ساری زندگی سراٹھا کر چلا ہوں۔ تمہارے شوہر نے یہ خط پڑھ لیا ہے۔ وہ اوروں کو بھی بتائیں گے۔ میں لوگوں سے نظریں چرا کر نہیں جی سکتا۔“ ساجد کے لیے غم و غصہ جھلک رہا تھا۔

شاہینہ کی آنکھوں میں آنسو اُڑ آئے۔ ”میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ یہ سب جھوٹ ہے۔“

”سانا نہیں میں نے کیا کہا۔“ ساجد نے آنکھیں نکالیں۔ ”اپنے گھر والوں کو بلاؤ اور یہاں سے اپنا بوریا بستر سیٹو۔“

”پلیز!“ شاہینہ گڑ گڑائی۔

”پلیز ولیز کچھ نہیں۔“ ساجد نے چٹکی بجائی۔ ”جاؤ یہاں سے..... تمہارے ساتھ میرا گزارہ نہیں ہو سکتا۔“

”ای صدے سے مرجائیں گی۔“ وہ روہاکی ہو رہی تھی۔

”انہیں مری جانا چاہیے۔“ ساجد نے نہایت بے رحمی سے کہا۔

اتنے بے رحم تو ابابھی نہ تھے جنہیں اپنے پرانے سبھی ظالم کہتے تھے۔

”آپ سمجھائیں نا انہیں۔“ شاہینہ نے بے چارگی سے دونوں مندوں کو دیکھا۔

”آپ صبح کہہ رہی ہیں، صبح تک انتظار کر لو ساجد۔“

پہلی بہن نے دوسری کی بات دہرائی۔

”کوئی انتظار نہیں..... آپ دونوں کو معلوم ہے میں جب کوئی فیصلہ کر لیتا ہوں تو کر لیتا ہوں..... میں نے اسے طلاق دی۔“ اس نے اپنی انگلی شاہینہ کی طرف اٹھائی۔

شاہینہ کا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔

”میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔“

شاہینہ نے اسے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔ اس کا دل

چاپ سہ جاتی۔ بیمار پڑتی تو..... آہ نہ کراہ۔ امی کہتیں۔

”شاہینہ کی بیماری کا پتا تو اس وقت چلتا ہے جب چاپ چاپ بستر پر پڑ جاتی ہے۔“ شاہینہ کو اکثر لڑکیوں کی طرح زیادہ بولنے کی عادت بھی تھی۔ زیادہ گھومنے پھرنے کی شوقین بھی تھی۔ اسکول سے گھر اور گھر سے اسکول۔ زمانہ طالب علمی میں بھی اس کا یہی معمول رہا تھا۔ نوکری کے بعد اسکول بس کی سہولت میسر آئی تھی۔ ڈرائیور گھر کے گیٹ سے اسے اٹھاتا اور واپسی پر گیٹ کے سامنے ہی ڈراپ کرتا۔ اسکول میں اس کی ساسی لڑکیاں بھی کھار اکٹھے شاپنگ کا پروگرام بناتیں تو اسے بھی ساتھ چلنے کی دعوت دیتیں مگر وہ معذرت کر لیتی۔ شاپنگ کے لیے جانا ہوتا تو وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ ہی جاتی۔ اس کے اسکول کی ساسی کہتیں۔ ”کیسی عجیب لڑکی ہو تم۔ شاپنگ بھی گھر والوں کے ساتھ..... یار بندے کو کچھ پرسل چیزیں بھی تو خریدنا ہوتی ہیں۔“

”سینہ آلا دیتی ہیں۔“ وہ جوابا کہتی۔

”بہت پھر ڈبو!“

”بس عادت ہے..... مجھے بازاروں میں زیادہ گھومنا پھرنا اچھا نہیں لگتا۔“ وہ مسکرا کر کہتی۔

”دیکھیں گے..... جب شادی ہو جائے گی تو میاں جی کے کپڑے بھی تم ہی کو خریدنے پڑا کریں گے۔“

”میں ایسے میاں جی سے شادی ہی نہیں کروں گی۔“

وہ کہتی۔

”دیکھیں گے۔“

خاندان میں شاہینہ کے جوڑ کا کوئی رشتہ نہیں تھا۔ باہر رشتہ کرنا پڑا۔ اس کی شادی ابا کے انتقال کے تقریباً تین سال بعد ہوئی تھی۔ بھائیوں نے اسے نہایت دھوم دھام اور عزت و وقار سے اپنے گھر سے رخصت کیا تھا۔ سارا خاندان اس کی شادی میں شریک ہوا سوائے خالہ کے گھرانے کے جن سے اعظم اور عاصم کے رشتے ٹوٹ جانے کی وجہ سے کشیدگی ہوئی تھی۔ امی نے اسے اپنی دعاؤں کے حصار میں رخصت کیا تھا مگر زندگی کے اس نئے سفر کے دوسرے ہی دن ناؤ منجہ دار میں ڈوب لگی تھی۔

”اپنے گھر والوں کو بلاؤ اور ان سے کہو تمہیں آکر لے جائیں۔“ اس کا شریک سفر کہہ رہا تھا۔

”نہیں!“ وہ کانپ کر رہ گئی۔

”میں گندگی اور ذلت کا یہ نوکر ساری زندگی اپنے سر پر رکھ کر نہیں چلنا چاہتا۔“ ساجد نے اسے نہایت تحارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

ہے، سر پکڑے، ہارے ہوئے جوار یوں کی طرح بیٹھے تھے۔ بھاد میں جلے پاؤں کی بجلی بنی کبھی ایک تو کبھی دوسرے کمرے میں پھر رہی تھیں۔ چھوٹی بہن ہر اس شایہ کا منہ تنک رہی تھی۔ شایہ کے آنسو نہ ٹھہر رہے تھے۔ کسی بیوہ کی طرح اجازت اور سوگوار وہ نیم جان سی بیٹھی تھی۔ ابھی تو اس کے بدن میں الجھن کی مہک اور ہاتھوں سے حتا کی خوشبو بھی باقی نہ ہوئی تھی۔ ابھی تو اس کے بالوں میں موتیا کے سمجھروں کی خوشبو بھی تھی۔ ہنستے ہنستے گھر پر اچانک یہ ایسی افتاد پڑی تھی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ کنواری ہی بیٹھی رہتی۔ گا ہے بگا ہے امی کے منہ سے بے اختیار نکلنے والی درد انگیز کراہ شایہ سمیت گھر کے دیگر افراد کے رنج و ملال میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔

اپنے بد بخوار اور دشمن کی تلاش میں ان سب کا دھیان بار بار خالہ کے گھرانے کی طرف جارہا تھا جن سے اعظم اور عاصم کے رشتوں کے ٹوٹنے پر کشیدگی ہوئی تھی۔

”ارے ظالمو! میری بیٹی کا گھر بگڑوانے سے پہلے یہ تو سوچ لیا ہوتا کہ تمہارے اپنے گھر میں ہمیں، بیٹیاں ہیں۔“ امی ٹھہلا رہی تھیں۔

شایہ کو اپنی ذلت کا دکھ مارے دے رہا تھا۔ خط لکھنے والے نے کس قدر بے ہودہ اور رکیک الزام لگایا تھا اس پر۔ غیر مردوں کے ساتھ گھومنا پھرتا تو کچاد تو خاندان کے مردوں سے بھی فاصلہ رکھتی تھی۔ وہ دل گرفتہ تھی کہ یہ جھوٹا، گھناؤنا اور گھٹیا الزام نہ جانے زندگی کے کس موڑ تک اس کا تعاقب کرے گا۔

مہر کی رقم زیادہ نہ تھی۔ دو دن بعد تحریری طلاق نامہ بھی وصول ہو گیا۔ مہر کی رقم اور جہیز بھی واپس بھجوا دیا گیا۔ شایہ کے آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ سسرال میں آباد ہونے سے پہلے ہی وہ برباد ہو گئی تھی۔ اپنے پرایوں نے دانتوں میں انگلیاں دبائیں تھیں۔ پیٹھ پیچھے جتنے منہ تھے اتنی باتیں!

”ارے بھی کوئی بڑی بات ہوگی ورنہ ایک رات کی دلہن کو کون یوں فارغ کرتا ہے۔“

”خط کا تو ہونا نہ لگتا ہے۔ بات کچھ اور ہی ہے۔“

”خود کچھ ایسا ویسا ہی ہوگا جو شہر نے دوسرے ہی دن چلتا کیا۔“

”ایک گناہ خط پر اتنا بڑا قدم کون اٹھاتا ہے بھلا آخر لڑکے والوں کی بھی تو جگ ہنسی ہوئی ہوگی۔“

سب اپنے آپ کو تماشا کون بناتا ہے۔“

تماشا تو شایہ بنی ہوئی تھی۔ عزیزوں، رشتہ

جیسے ساکت ہونے لگا تھا۔

”نہیں..... پلیز نہیں۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی اور ایک ہی جست میں بستر سے اتر کر اس کے قدموں میں جا گری۔ ”آپ کو اللہ کا واسطہ۔“ وہ اس کے قدموں میں پڑی دونوں ہاتھ جوڑے سر کو عقی رخ پر جھکائے اسے رحم طلب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

”شایہ بیگم! میں نے تمہیں تین طلاقیں دیں۔“ وہ رعوت سے بولا۔

شایہ کو یوں لگا جیسے وہ گھٹا ٹوپ اندھیاریوں میں ڈوب گئی تھی..... موت شاید اس سے زیادہ تکلیف نہیں دیتی ہوگی!

”ای..... امی جی..... امی جی.....“ وہ ہر تکلیف، ہر دکھ بٹالینے والی ماں کو پکار رہی تھی۔

”اس کے گھر والوں کو فون کریں اور کہیں لے جائیں اسے۔“ ساجدی آواز اسے کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔

صرف ایک رات!

ایک رات سہاگن رنہ کر وہ مطلقہ بھی ہو گئی تھی..... بنا کسی خطا کے..... بغیر کسی غلطی کے!

اذیت کی اذیت تھی!

وہ اس اذیت کا کرب سہہ نہیں پار رہی تھی۔

ایک روز قبل ایجاب و قبول کے دو بول اس کا مقوم ایک غیر شخص سے ننھی کر گئے تھے اور ایک دن بعد ہی اس شخص نے ایک ہی جملے کی تین مرتبہ تکرار سے اس بندھن کو یکا یک نہایت بے رحمی سے توڑ دیا تھا!

کاغذ کے ایک ٹکڑے پر بکھرا جھوٹ اڑھے کی طرح اس کی ساری زندگی کو نکل گیا تھا۔

☆☆☆

قیامت تنہا اسی پر نہ ٹوٹی تھی، پورے گھرانے پر! شادی کا گھر ماتم کدہ بن گیا تھا۔ امی، بہن، بھائی، بھاد میں سب دم بخود تھے۔ اپنے دکھ سے زیادہ یہ فکر مارے دے رہی تھی کہ دنیا کو منہ کیونکر دکھائیں گے۔ مارتے کا ہاتھ پکڑا جاتا ہے، کہتے کا منہ کس نے پکڑا ہے۔ جتنے منہ ہوں گے اتنی ہی باتیں..... کون یقین کرے گا اس بات کا کہ کسی دشمن کے گناہم خط نے یہ فساد پھیلا یا تھا۔ شادی کے دوسرے ہی دن کون طلاق دیتا ہے بیوی کو جب تک کوئی بہت ہی بڑی بات نہ ہو۔

ای غش پہ غش کھار ہی تھیں۔ بھائی رنج و الم کی تصویر

لیو جی ہے، کیا..... ڈیوورس کی صورت میں بھی؟“ مشورہ دینے والی ساتھی سے ایک دوسری ساتھی نے پوچھا۔
 ”یقین سے تو نہیں کہہ سکتی مگر میرا خیال ہے ملتی ہوگی..... شاید تم خود یا تمہارے گھر سے کوئی اسکول فون کر کے میڈم یا پھر آفس کلرک سے معلوم کر لے۔“
 مسز ابراہیم بولیں۔
 ”اوکے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

وہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی کاش! بدنامی کے اس داغ کے بجائے اسے بیوگی کی عدت گزارنی ہوتی!

☆☆☆

ستم بالا لے ستم وہ امید سے ہو گئی۔ عورت پہلی بار ماں بننے جا رہی ہو تو اس کے پاؤں زمین پر نہیں رہتے۔
 ہواؤں میں اڑنے لگتی ہے۔ ماں بننے کا خیال ایسے سرخ روٹی بھنسا ہے مگر وہ تو شرم سے زمین میں گڑی جاتی تھی اور تو اور گھر میں اپنے خونی رشتوں سے نظریں نہ ملا پاتی۔
 بھادجوں سے اپنا بدن اور نگاہیں چراتی۔ دل ہی دل میں سوچتی لوگ تو یہی سمجھتے ہوں گے کہ وہ میکے میں کچھ التا سیدھا کر کے سسرال گئی تھی تبھی تو شوہر نے دوسرے ہی دن چلتا کیا۔ عدت کا دورانیہ بھی طویل ہو گیا تھا، شریعت کے مطابق وضع حمل تک۔

اس کا خدشہ بے جا نہ تھا، اس کے امید سے ہونے کی خبر پر اپنے پراپوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو چکی تھیں۔
 ”اے کچھ نہ سنا..... شاید ماں بننے والی ہے۔“
 ”گڑ بڑ لگتی ہے۔“
 ”کی کی کی۔“

”اب پتا چلا کہ شوہر نے دوسرے دن ہی میکے کیوں چلتا کیا..... بھی پتا چل گیا ہوگا نا اسے۔“
 ”تو بہ تو بہ! کنسنے میں کسی معصوم اور شریف لگتی تھی۔“
 ”شوہر کوئی مرد بچہ تھا جس نے دوسرے کا گند اپنے سر پر اٹھانے کے بجائے دوسرے ہی دن فارغ کر دیا۔“
 گھر میں بھادجیں اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتیں۔ ایک روز سہینہ آپا میکے آئیں تو امی سے بولیں۔
 ”آپ کے داماد بھی چمکے لگانے سے چوکتے نہیں۔“

”کیوں کیا ہوا؟“ امی نے تشویش سے پوچھا۔
 ”میں نے انہیں شاید میکے پر کیلکٹ ہونے کا بتایا تو کہنے لگے کیا تمہاری بہن یہ حقہ لینے ہی گئی تھی ایک دن کے لیے سسرال۔“

امی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔ ”کیا کریں

داروں، دوستوں، ملنے جلنے والوں کبھی کو پتا چل گیا تھا جتنی کہ اس کے اسکول بھی خبر جا پہنچی۔ اسکول میں اس کی ساتھی تو اس گمان میں تھیں کہ وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ دو تیس کھانے اور سیر سپاٹے کرنے میں مصروف ہوگی۔ یہ خبر پہنچی تو اس کی ایک ہم پیالہ، ہم نوالہ ساتھی نورین نے اسے فون کیا۔ دوبارہ اسکول نہ جانا ہوتا تو شاید شاہینہ اس کی کال ریسیو ہی نہ کرتی مگر اب تو نوکری جاری رکھنے کے لیے اسے بہر حال اسکول جانا تھا۔
 ”کیا حال ہے شاہینہ؟“ نورین کے لہجے میں احتیاط تھی۔

”زندہ ہوں۔“
 ”برامت منانا..... ایک خبر سنی ہے۔“
 شاہینہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔
 ”میر کرو۔“
 ”نہیں آتا میر نورین..... نہیں آتا۔“
 ”یار! ہم لوگ تو اسٹاف روم میں بات کر رہے تھے کہ..... ایک گمنام خط پر تو کوئی بھی سمجھدار آدمی اتنا بڑا قدم نہیں اٹھاتا..... یا تو وہ شخص سنا لیکو تھا یا پھر..... کوئی ایسی بات بھی جو اسے لگ گئی۔“
 ”تم تو مجھے اتنے عرصے سے جانتی ہو نورین۔“
 شاہینہ کو صفائی دینی پڑی۔

”ہاں ہاں..... میرا یہ مطلب نہیں تھا..... اچھا خیر..... اسٹاف میں سے کچھ لوگ تم سے ملنے کے لیے تمہارے گھر آنا چاہ رہے تھے۔“
 ”آجائیں۔“ اس نے بادل ناخواستہ کہا۔
 وہی ساتھی جو چند دن قبل ہی زرق برق کپڑوں میں ملبوس اس کی شادی کی تقریب میں آئی تھیں، پرسر دینے والے انداز میں اس سے ملنے آئیں۔ ان کی نگاہوں میں تاسف اور ہمدردی کے ساتھ معنی خیزی بھی تھی۔
 ”اسکول کب آؤ گی؟“ ایک ساتھی نے پوچھا۔
 اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، ایک اور ساتھی نے پہلی کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی تو یہ عدت میں ہوں گی۔“

”اپنی ارنڈ لیو کیوں ضائع کر رہی ہو..... پچھلی چھٹی کینسل کراؤ اور عدت لیو کے لیے ایلانی کر دو..... عدت کے لیے خصوصی چھٹی ملتی ہے۔“ ایک کہنہ مشق ساتھی نے مشورہ دیا۔

”مسز ابراہیم! شوہر کی ڈتھہ کی صورت میں تو عدت

ہی نہیں بگاڑا تھا، ان کے سارے گھر ان کے پیٹھ میں چھرا گھونپا تھا۔ زندگی میں دکھ، سکھ کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ خوشی اور غم ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں شاہینہ کی بربادی کا دکھ ایسا دکھ تھا کہ اس سے ملنے والی کلفت کو بڑی سے بڑی راحت بھی دل سے محو نہ کر پاتی!

☆☆☆

شوہنی قسمت شاہینہ کے ہاں ولادت قبل از وقت ہی ہو گئی۔ وہ ایک بیٹی کی ماں بنی تھی۔ بچی کی قبل از وقت ولادت نے بھی لوگوں کو منہ جوڑ کر باتیں بتانے کا موقع فراہم کیا۔

ساجد کو بچی کی ولادت کی خبر بھجوائی گئی تو اس نے نہایت سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ شاہینہ کی آنکھیں لگی رہیں۔ اسے یقین تھا ساجد بچی کو دیکھنے ضرور آئے گا، آخر اس کی اولاد تھی۔ اس کا اپنا خون..... اپنی اولاد سے کون بے رخی برتا ہے۔ اباء، امی کے معاملے میں کیسے ہی عالم سہی، بچوں سے انہیں بہت محبت تھی۔ ان کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتے تھے۔

ساجد نے انتہائی سگدی دکھائی۔ وہ نہ صرف بچی کو دیکھنے نہیں آیا بلکہ اس نے کہا۔ ”میرا اس سے کوئی تعلق نہیں، اسے میرا نام بھی نہ دیا جائے۔“

شاہینہ ڈٹ گئی۔ یہ اس کا نہیں اس کی بیٹی کی عزت کا معاملہ تھا۔

”وہ آئے یا نہ آئے..... بچی اسی کی ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے باپ کا نام نہ دیا جائے۔“ شاہینہ نے کہا۔ ساجد کے رشتے داروں میں سے بھی کوئی بچی کو دیکھنے نہیں آیا۔ اسپتال سے بچی کی پیدائش کا سرٹیفکیٹ لینے ہوئے ولایت کے خانے میں ساجد کا نام لکھوایا گیا۔ شاہینہ کو اب نہ لوگوں کی استہزاء نہ لگا ہوں کی پروا تھی نہ ان کی الٹی سیدھی باتوں کی۔ اسے علینہ کی صورت جھنکے کا بہانہ مل گیا تھا۔ اس بچی کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کسی بھی حد تک جاسکتی تھی۔

☆☆☆

چھٹی ختم ہونے کے بعد شاہینہ نے دوبارہ اسکول جانا شروع کر دیا۔ ابتدائی چند دن ٹھنکے تھے۔ بچی کو گھر میں چھوڑ کر اسکول جانا اور وہاں اکثر ساتھیوں کی چھٹی ہونی لگا ہوں کا سامنا کرنا یقیناً مشکل تھا لیکن دھیرے دھیرے وہ دونوں باتوں کی عادی ہو گئی۔ بچی کو اپنے گھر والوں کے آسے پر گھر میں چھوڑ کر جانے اور ساتھیوں کی چھٹی ہونی لگا ہوں کا

پٹا..... کسی سے کچھ کہنے سننے کے نہیں رہے، ہم لوگ..... مجھے تو روہینہ کی فکر تھائی جاتی ہے۔ اتنی بدنامی اور رسوائی کے بعد کون رشتہ لینے آئے گا ہمارے گھر۔“

”امی! شاہینہ ایسی کب ہے۔“

”یہ تو تم کہہ رہی ہو اور میں جانتی ہوں..... اپنا ایمان دوسروں کے دل میں ڈالنا بہت مشکل ہے۔“

”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔“

شاہینہ پر ماں بہنوں کا یہی اعتماد تھا جو اس کڑے وقت میں اس کا سہارا اور تسلی کا موجب بنا ہوا تھا۔ امی کی موجودگی نعمت غیر مترقبہ تھی۔ جب جب وہ یاس و ناامیدی کے اندھیروں میں ڈوبنے لگتی، امی کا وجود اس کے لیے روشنی کا مینار بن جاتا۔

اس کی ناگہاں بربادی امی کے لیے ان کی زندگی کا سب سے بڑا دکھ بن گئی تھی۔ انہیں اپنی بہن اور اس کے بچوں سے جن سے ان کا نہایت قربت کا رشتہ تھا، شدید نفرت ہو گئی تھی۔ انہیں سو فیصد شک اپنی بہن کے گھرانے پر تھا۔

”خدا انہیں بھی ان کی بیٹیوں کی طرف سے ایسے ہی بے گل کرے جیسے انہوں نے مجھ بیوہ کو کیا ہے۔“ امی کلپ کلپ کر کہتی تھیں۔

اگرچہ خالہ اور ان کے سارے گھرانے کا یہ کہنا تھا کہ ان کا بہن کے گھرانے سے رنجش اور اختلاف اپنی جگہ لیکن شاہینہ کا گھر برباد کرنے کی کمرہ حرکت ان کے گھرانے سے کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا مگر امی اور دیگر اہل خانہ کو یقین تھا کہ یہ حرکت انہی میں سے کسی کی بھی بلکہ وہ سب تو نہایت وثوق سے کہتے تھے کہ اس گناہ مکتوب کی تحریر ہو ہو خالہ کی بڑی بیٹی کی تحریر لگتی تھی۔ خالہ کے گھر تک شاہینہ کے گھر والوں کی اس قسم کی باتیں مشترک جاننے والوں کے توسط سے پہنچتی رہتی تھیں۔

خالہ جن کا اپنی بہن کے گھر سے تعلق تقریباً نوٹ ہی چکا تھا اپنے گھرانے پر شک کے جانے کی خبریں سن کر نہایت دل گرفتگی سے کہتیں۔ ”اگر میں نے یا میرے کسی بچے نے شاہینہ کے گھر میں آگ لگا لی ہو تو خدا میرے اپنے آگے بھی ایسا ہی لائے۔“

واللہ اعلم بالصواب!

شاہینہ کے گھر والوں کے دل سے شک کسی صورت رفع نہ ہونے پاتا۔ امی قسم کھا بیٹھی تھیں کہ جیتے جی ان دشمنوں کا منہ ہرگز نہ دیکھیں گی جنہوں نے انھیں شاہینہ کا گھر

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے براہِ حاصل کریں اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ نامہ
(بشمول رجسٹرڈ ذاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے

امریکا، نیپال، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ذاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے

بہرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ: شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹینس وینس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 021-35895313 فکس: 021-35802551

سے محبت کی لہر کبھی کروٹ نہ لیتی ہوگی؟“
”علیہ کا اس سے کوئی رشتہ نہیں امی..... علیہ صرف میری بیٹی ہے۔“ شاید یہی دل سے کہتی۔

امی کو اب باقی دو بیٹوں اور روبینہ کے رشتوں کی بھی فکر ملتی تھی۔ بیٹوں کا تو خیر کوئی مسئلہ نہ تھا۔ ارادے کی دیر ہوتی ہے، اپنے معیار کی یا معیار سے کم لڑکی مل ہی جاتی ہے۔ اصل مسئلہ لڑکی کے لیے اچھا بر ملنے کا ہوتا ہے۔ اچھا تو ساجد بھی تھا۔ رشتہ کرانے والی نے وہ تعریفیں کی تھیں کہ خدا کی پناہ مگر ایسی اچھی کو لے کر انسان چائے کیا کر جس نے ایک شریف گھرانے کو اپنی انانیت پسندی سے ایسا گھاؤ لگا دیا تھا کہ تکلیف جاتی نہ تھی۔ امی بظاہر ہنستی بھی تھیں بولتی بھی تھیں۔ زندگی کے سارے ہی معمولات جاری تھے مگر شاہینہ کی طرف سے ان کے دل کو جو زخم لگا تھا، وہ مسلسل ٹھیس دے جاتا تھا۔ شاہینہ کو دیکھتیں تو کلیجہ منہ کو آتا۔ ”کیسے کاٹے گی یہ پہاڑی جوانی۔“ امی کے دل کو یہ فکر چائے جاتی۔

اپنی اس فکر کا اظہار شاہینہ پر کر تھیں تو وہ کہتی۔ ”آپ میری فکر نہ کیا کریں..... میرے پاس علیہ ہے۔“
”پٹیاں سدا تھوڑی پاس رہتی ہیں۔ انہیں دوسرے گھر بھی جانا ہوتا ہے۔“ امی کہتیں۔

”میں علیہ کی شادی ایسے لڑکے سے کروں گی جو گھر داماد بن کر رہے۔“ شاہینہ کہتی۔

”برسوں کا سفر ہے..... ابھی تو علیہ بچی ہے۔ کب بڑی ہوگی، کب اس کی شادی کا موقع آئے گا اور..... اس وقت تک؟“ امی مجسم سوال بن جاتیں۔ پھر دل گرفتگی سے کہتیں۔ ”عورت اکیلے زندگی نہیں گزار سکتی۔“
”آپ ہیں نا امی میرے ساتھ۔“

”میں بھلا کب تک؟ ایک دن تو جانا ہے۔“
”ایسی باتیں نہ کیا کریں۔“
”حقیقت سے آنکھیں تو نہیں چرائی جاسکتیں..... میرے بعد کیا ہوگا تمہارا؟“ امی کو فکر ستانی۔

”فکر کیوں کرتی ہیں..... اول تو اللہ میرے اور علیہ کے سروں پر آپ کا سایہ قائم دائم رکھے..... پھر بھائی ہیں نا امی..... ماشاء اللہ چار چار۔“

”اللہ انہیں جیسا رکھے..... بیٹوں کی سعادت مندی سے مجھے کوئی گلہ نہیں مگر ان کی بیویوں کا مجھے بھرپور سنا نہیں..... جب تک میں ہوں، تب تک خاموش ہیں۔ میں نہ رہی تو رنگ دکھائیں گی۔“

امی دیکھتی تھیں، شادی شدہ بیٹے علیہ سے لاڈ کرتے

توان کی بیویوں کے ماتھوں پر مل پڑنے لگتے تھے۔

”اللہ مالک ہے امی۔“

”ہاں، وہ تو ہے ہی سب کا مالک..... ایک وہی تو ہے جس پر انسان کا بھروسہ بھی نہیں ٹوٹتا۔ وہی سہارا دیتا ہے انسان کو۔“

واقعی وہی سہارا دیتا ہے انسان کو..... ورنہ حادثہ اتنا شدید تھا کہ شاہینہ جیسی لڑکی کے تو پرچے اڑ گئے ہوتے۔ اسی نے سہارا دیا، اسی نے حوصلہ بخشا جو وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے قابل ہوئی..... ورنہ شروع میں اس کا کیا حال تھا، وہی جانتی تھی۔ دل، دماغ، قویٰ سب جیسے مظلوم ہی تو ہو گئے تھے۔ بہر حال اب وہ جی رہی تھی..... علیینہ کے لیے!

☆☆☆

علینہ بڑی ہونے لگی۔ ہاشم کی شادی اعظم کی سسرال کی ایک لڑکی سے ہو گئی۔ شاہینہ کی شادی کے سچے تجربے کے بعد امی انجان لوگوں میں رشتے ناتے کرتے ہوئے ڈرنے لگی تھیں۔ اعظم کے سسرال والے غیر ضرور تھے مگر انجان نہیں۔ روہینہ کا رشتہ بھی امی جانے بوجھے لوگوں ہی میں کرنا چاہتی تھیں۔ حالانکہ جانے بوجھے لوگوں میں رشتے جوڑنے پر یہ عزت تو نہیں ہوتی کہ حالات آپ کی مرضی کے موافق رہیں گے۔ قریبی رشتوں میں بچوں کی شادیاں کرنے والے بھی بعض اوقات بری طرح ڈسے جاتے ہیں۔ ہاشم کی شادی کے کچھ ہی عرصے بعد گھر کی اکائی میں دراڑ پڑنے لگی۔ غزلی کی لڑکی تھی۔ علیحدہ گھر لے کر صرف اپنے شوہر کے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ امی نے بھاری دل کے ساتھ ہاشم کو علیحدہ رہنے کی اجازت دے دی۔ جب دوسرے کا ساتھ رہنے کو دل نہ چاہے تو مارا مارا ساتھ رہنے پر مجبور کرنے سے فائدہ اویسے بھی گھرا ب چھوٹا پڑنے لگا تھا۔ شاہینہ، علیینہ اور روہینہ امی کے ساتھ ان کے کمرے ہی میں رہتیں۔

علینہ جیسے بچے بچیاں جنہیں اوائل عمر ہی میں کسی محرومی کی جذباتی سانچے کا سامنا ہو جائے، عموماً اپنے ہم عمر بچوں کی نسبت زیادہ حساس اور سمجھدار ہوتے ہیں۔ بہت سی باتیں اپنے بڑوں کے بتائے بغیر خود ہی سمجھ جاتے ہیں..... تمام جزئیات سمیت نہ سبھی کتنا ہی تھی۔ علیینہ سمجھدار بچی تھی کسی کے بتائے بغیر یہ ہی سمجھتی تھی کہ کوئی ایسی بات تھی جو اس کی ماں اور نھیاں والے بھولے سے بھی اس کے باپ کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ وہ اگر مر گیا ہوتا تو ایسا نہ ہوتا، جی تو

گھر میں اس کا نام لیا جاتا، کبھی تو اس کا تذکرہ ہوتا۔

ایک روز اس نے امی سے پوچھا۔ ”نانو! شانی، مانو اور روشی کے بابا کی طرح میرے بابا اس گھر میں کیوں نہیں رہتے؟“

شانی، مانو اور روشی پیار کے نام تھے اعظم اور عاصم کے بچوں کے۔

امی پہلے تو علیینہ کے اس سوال پر دھک رہ گئیں پھر انہوں نے اسے آہستہ سے سمجھایا۔ ”بیٹا تمہارا باپ عالم آدمی تھا۔ اس نے تمہاری ماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا..... وہ اتنا بے رحم تھا کہ تمہاری پیدائش کے بعد ایک دفعہ بھی تمہیں دیکھنے نہیں آیا۔“

اس کے بعد علیینہ نے کبھی کسی سے اپنے باپ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا..... اپنی ماں سے بھی نہیں۔ باپ کا لفظ اس کی زندگی سے گویا خارج ہو گیا تھا۔ شاہینہ حیران ہوتی کہ چھوٹی سی بچی میں اتنی سمجھ، اتنا شعور کیونکر آ گیا تھا۔ اس کی اپنی ہمت نہ ہوتی علیینہ سے اس موضوع پر بات کرنے کی..... کیا پوچھتی کیا بتاتی اسے!

☆☆☆

وقت اچھا ہو یا بُرا، ہمتا نہیں چلتا جاتا ہے۔

شاہینہ کو یہ لگتا جیسے کل ہی کی تو بات تھی جب علیینہ اس کی زندگی میں آئی تھی۔ اب علیینہ اسکول بھی جانے لگی تھی۔ روہینہ کی شادی ہو گئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ علیینہ کی دیکھ بھال میں روہینہ نے جس طرح امی کا ساتھ دیا تھا، شاہینہ اس پر روہینہ کی ہمیشہ ممنون رہتی تھی۔ امی کے بچوں میں بس اب دائم ہی رہ گیا تھا جس کی شادی ہوئی تھی۔ امی کو بلڈ پریشر کا عارضہ تو برسوں سے تھا، اب دیگر عوارض بھی لاحق ہو گئے تھے۔ آئے دن بیمار پڑ جاتیں۔ شاہینہ کو ان کی بیماری کی جو فکر ہوتی سو ہوئی خوف زیادہ آتا۔ خدا نخواستہ امی نہ ہوئیں تو وہ اور علیینہ کیا کریں گی؟ کس کے سہارے زندگی گزاریں گی؟ اللہ کے بعد امی ان دونوں کے لیے بہت بڑی سپورٹ تھیں۔ امی کو خود بھی احساس تھا کہ وہ اپنی طبعی زندگی کا بہت بڑا حصہ گزار چکی تھیں۔ اب تو جو وقت مل رہا تھا، اللہ کی ہر یابی تھی اور شاید شاہینہ اور علیینہ کے لیے۔ اس لیے امی اب بھی بکھار دہی زبان سے شاہینہ سے کہنے لگی تھیں۔ ”کوئی شریف آدمی مل جائے تو ہاتھ تمام لو۔“

”ملا تو تھا ایک شریف آدمی امی جی۔“ شاہینہ سچی سے کہتی اور اب یہ بات وہ علیینہ کے سامنے بھی کہنے سے نہ چوکتی۔ چھپانے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ ایک نہ ایک دن تو اسے

میرے بچے اتنے کینے نہیں کہ اپنی بیٹی جیسی بھانجی کے گھر میں آگ لگاؤں۔“

گمراہی کو بہن کی بات کا جیسے جی کبھی اعتبار نہ آسکا۔ یہی حال باقی گھروالوں کا اور خود شایینہ کا بھی تھا۔ ”ان کے سوا اور کس سے ہے ہماری دشمنی۔“ وہ سب کہتے۔ امی یہی گمان اپنے دل میں لیے اس دنیا سے گئیں کہ شایینہ کا گھر ان کی بہن اور ان کے بچوں نے بگاڑا تھا۔ انہوں نے بچوں کو خالہ کے گھرانے سے کبھی تعلق بحال نہ کرنے کی قسم دے رکھی تھی۔ سودوئوں گھرانوں میں سخت قسم کی قطع تعلقی تھی۔ خالہ اور ان کے گھر والے امی کے مرنے پر بھی نہیں آئے۔

بسا اوقات کسی کسی باتوں پر وہ انمول رشتے ٹوٹ جاتے ہیں جن کا نعم البدل ممکن نہیں ہوتا۔

ساجد سے اپنے ایک روزہ رشتے کے بارے میں شایینہ اکثر نہایت ملال سے سوچتی۔ ”ایسا ناپائیدار رشتہ کہ آنا فنا ختم ہو گیا۔“

مگر اس رشتے کا ثمری تو تعلیق تھی جس کے سامنے شایینہ کو ہر رشتہ پیچ لگنا تھا۔ عجب تعلق تھا..... دل سے بڑا..... روح میں اترا..... علیہ اسے اپنی دوست، ہمدرد، ہماراز سبھی کچھ محسوس ہوتی..... اس نے سوچ رکھا تھا کہ علیہ سے چھپائے کی نہیں۔ مناسب وقت پر اسے سب کچھ بتادے گی..... وہ سب کچھ جو حقیقت تھی..... وہ کرب ناک حقیقت جو جو یک کی طرح اس کی زندگی کو اندر سے چاٹ گئی تھی..... چاٹ رہی تھی!

☆☆☆

امی کے بعد شایینہ کو اس گھر سے جس میں وہ اتنے برس رہتی آئی تھی، غیریت کا احساس ہونے لگا تھا۔ بھائی اچھے تھے، امی کے بعد بھی اس کا اور علیہ کا پہلے ہی کی طرح خیال رکھتے مگر بھادو جوں کے تہہ کچھ اور ہی کہنے لگے تھے۔ دونوں آنکھوں ہی آنکھوں میں باتیں کرتیں، چھوٹی چھوٹی باتوں پر علیہ کو بھی کبھی کبھی اس بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کر کشد کہ شایینہ کو رنج ہوتا۔ جی چاہتا علیہ کو لے کر کہیں اور چلی جائے..... مگر کہاں..... ایکلی عورت اور بڑی ہوتی ایک بچی کا ساتھ..... شہر کے حالات خراب..... زمانہ بڑا..... امی ٹھیک کہتی تھیں۔ ایکلی عورت کے لیے زندگی گزارنا آسان نہیں۔ بھائیوں کے ساتھ رہنے میں کچھ کلفتیں تھیں تو کچھ آسانیاں بھی۔ سب سے بڑی بات تو وہ تحفظ تھا جو اسے اس گھر سے علیحدہ رہنے کی صورت میں کہیں اور نہ حاصل ہو سکتا

ساری بات معلوم ہونا ہی تھی اور جب اس قصے میں اس کی اپنی کوئی خطا، کوئی دوش ہی نہ تھا تو وہ علیہ کے سامنے چور کیوں بنی رہتی۔

امی کی محنت دن بہ دن کرتی چلی گئی۔ دائم کے لیے ایک لڑکی پسند کر لی گئی تھی۔ بات بھی ہوئی تھی مگر شادی کے لیے دائم دو سال کی مہلت چاہتا تھا۔ شایینہ نے امی کے گھر کے نزدیک ہی ایک رہائشی اسکیم میں دو کمروں کا ایک فلیٹ بک کر لیا تھا۔ اپنے گھر کی چھت بہت بڑی عایت ہوتی ہے۔ امی کے گھر میں بھائیوں کے ساتھ اس وقت تک تو گزارا ہو رہا تھا جب تک امی بیٹھی تھیں بعد میں جانے کیا حالات ہوئے۔ بھادو جیں تو اب بھی ناک بھوں چڑھانے سے نہ چوکتی تھیں۔ بھائی اچھے اور ماں کے فرمانبردار نہ ہوتے تو شاید اتنا عرصہ اس گھر میں اس کا اور علیہ کا رہنا بھی ممکن نہ ہوتا۔

شایینہ اندر سے بہت دکھی، ٹوٹی ہوئی، پارہ پارہ تھی۔ گھر ٹوٹنے سے بڑا الیہ عورت کے لیے کوئی اور نہیں ہوتا اور وہ بھی اس طرح سے! اکثر وہ دل ٹکا نظر اس کی چشم تصور میں آکھڑا ہوتا۔ شادی کا دوسرا دن، خوشبوؤں میں بسا کمرائے عروسی اور صرف ایک دن قبل جڑنے والا رشتہ ایک گمنام خط کی بنیاد پر رخت رخت! تعلیم کے بل بوتے پر وہ اپنے پیروں پر نہ کھڑی ہوئی ہوتی تو اس سانچے کے بعد کیا کرتی! کیا بھائی بھادو جوں کی دست نگرین کر زندگی گزارتی۔

اور اس گمنام خط لکھنے والے کی آج تک شناخت نہ ہو سکی تھی، بس قیاس اور اندازے ہی تھے۔ امی نے تو قسم کھا رکھی تھی کہ جیسے جی ان لوگوں کے منہ نہ دیکھیں گی جن پر اس فیصلے کا انہیں اور گھروالوں کو شبہ تھا!

☆☆☆

ہوا بھی بچی!

امی نے مرتے دم تک ان لوگوں کا منہ نہیں دیکھا۔ حالانکہ شایینہ کی طلاق کے بعد رشتے داروں اور ملنے جلنے والوں کے ذریعے یہ بات خالہ کے گھرانے تک بھی پہنچ گئی تھی کہ شایینہ کی سسرال میں اس گمنام خط کا شہر بہن اور ان کے بچوں کو ابھنی کے گھرانے پر تھا مگر وہ قسم اٹھا کر کہتی تھیں کہ ان کی طرف سے ایسی ذلیل حرکت کسی نے نہیں کی۔ خالہ تو یہاں تک کہتی تھیں کہ اگر ان کے گھرانے سے کسی نے ایسی حرکت کی ہو تو مرتے دم کلمہ نصیب نہ ہوا نہیں۔ اب اس سے بڑی یقین دہانی اور کیا ہو سکتی تھی۔ خالہ کہتیں۔ ”بہن کے اور میرے بچوں کے رشتے نہ ہو سکتا اور بات ہے مگر میں یا

”تسلیم کرے یا نہ کرے، ہو تو تم اسی کی اولاد۔“

”چھوڑیں امی! کوئی ادب بات کریں۔“

”میری طرف دیکھو۔“

علیہ چونک کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔

”یہ بھی نہیں پوچھو گی کہ وہ کون ہے؟..... کہاں رہتا ہے؟ کیا کرتا ہے؟“ شاہینہ نے کہا۔

”جس شخص سے مجھے کوئی دلچسپی ہی نہیں، اس کے بارے میں، میں یہ سب کچھ کیوں پوچھوں۔“

”بیٹا! تمہیں دلچسپی ہو یا نہ ہو..... معلوم ہونا چاہیے۔“

”کیوں! کیوں معلوم ہونا چاہیے؟“

”تم ساری زندگی میرے پاس تھوڑی رہو گی.....

دوسرے گھر بھی جانا ہے..... وہ لوگ پوچھیں گے تم سے

تمہارے باپ کے بارے میں..... انہیں بتانے کے لیے

تمہیں معلوم ہونا چاہیے۔“

”کہہ دوں گی میرا باپ میری پیدائش سے پہلے ہی

مر گیا تھا۔“ علیہ کے لہجے میں سختی تھی۔

”مرے ہوؤں کے بارے میں بھی جانتا چاہتے ہیں

لوگ۔“

”ادھواں! آپ ابھی سے کیوں فکر مند ہو رہی ہیں؟

جب وقت آنے لگا دیکھا جائے گا۔“

”مجھے تمہاری ابھی سے فکر رہنے لگی ہے۔ دعا کرتی

ہوں تمہارے لیے اچھے لوگ ملیں..... میری بدبختی کا سایہ

بھی نہ پڑے تم پر۔“ شاہینہ کی آنکھوں میں آنسو اُڑا آئے۔

علیہ نے اپنے دو بچے کے پلو میں ماں کے آنسو

جذب کر لیے۔ اسے ماں سے پیار تو تھا ہی۔ جس طور اسے

زندگی گزارتے دیکھا تھا، اس سے اس کے دل میں ماں کی

قدر و منزلت دو چند ہو گئی تھی۔ کمال کا صبر و برداشت تھا اس

میں۔ علیہ کی گمانیاں کبھی بھی ایسی جیتی جاتی ہوتی تھیں کہ جانی

تھیں جنہیں سن کر اس کی ماں کا غصے میں آ جانا لازم ہوتا

لیکن ایسے موقع پر بھی علیہ نے ماں کو بہت تحمل دیکھا

تھا۔ بڑی سے بڑی رنجیدہ کرنے والی بات کو بھی وہ خاموشی

سے لپی جاتی بلکہ بھی بھی علیہ کو طش آ جاتا تھا۔ ”امی! آپ

جواب کیوں نہیں دیتیں؟“

”جواب دینے سے کیا ہوگا..... بات اور بڑھ

گی..... ان کا تو یہ گھر ہے، ہماری مجبوری ہے کہ ہم یہاں رہ

رہے ہیں۔“

”کب تک برداشت کریں گی آپ؟“

تھا۔ دوپہر کو علیہ کی اسکول وین خود شاہینہ کے گھر پہنچنے سے پہلے آ جاتی۔ اسے اطمینان رہتا کہ علیہ گھر میں ایکی نہیں ہوگی۔ پھر اس کی نوکری بھی۔ ملازمت کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں۔ ملازم کی مجبوریوں سے اسے سروکار نہیں ہوتا۔ کبھی چھٹی کے بعد کوئی اضافی ڈیوٹی لگ جانی، کبھی میٹنگ دیر تک چلتی۔ بھی ڈائریکٹر ریٹ جانا ہوتا، بھی کسی کو لیگ کے ہاں خوشی غمی میں جانا پڑ جاتا۔ بھائیوں سے علیہ ہر گز رہنے کی صورت میں زندگی کے ان تمام لازم معمولات سے کیونکر عہدہ برآ ہو سکتی تھی وہ۔ سوعافیت بھائیوں کے ساتھ رہنے اور بھادجوں کے ناروا طرز عمل کو برداشت کرنے ہی میں تھی!

☆☆☆

علیہ کالج میں تھی جب شاہینہ نے اسے پہلی بار اپنی

زبان سے اس سانچے کی تفصیل بتائی جس نے محض اس کی

زندگی ہی تباہ نہیں کی تھی، علیہ کو بھی باپ کے زندہ ہوتے

ہوئے باپ سے محروم کر دیا تھا۔ وہ چپ چاپ سنی رہی اور

سب کچھ سننے کے بعد اس نے کہا۔ ”آپ نے کچھ نہیں

کیا؟“

”کیا کرتی؟“

”شوٹ کر دیا چاہیے تھا۔“

”کسے؟“ شاہینہ نے ہنر بڑا کر بیٹی کو دیکھا۔

”اسی کو جس نے آپ کی زندگی برباد کی۔“

”وہ تو تمہارا باپ تھا بیٹی۔“

”تو کیا ہوا..... ایسے باپ کا مر جانا بہتر ہے۔“

شاہینہ بے یقینی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اس نے

تو اتنے برس اس خوف میں گزار دیے تھے کہ اپنے باپ کی

طرح کہیں علیہ بھی اس سے اپنا رشتہ ختم کرنے نہ ٹھہری

ہو جائے جو ہر حال میاں بیوی کے رشتے کی طرح نازک،

بودا اور بے یقین تو نہیں تھا مگر دوری پیدا ہو جانا بھی بعید از

قیاس نہ تھا۔

”ایک بات بتاؤ۔“ شاہینہ نے علیہ سے کہا۔

”جی امی..... پوچھیے۔“

”تمہارا بھی جی نہیں چاہتا اپنے باپ سے ملنے یا

اسے دیکھنے کو؟“

”کس باپ کی بات کر رہی ہیں امی..... اس کی جس

نے مجھے اپنا نام ہی دینے سے انکار کر دیا۔ اس کا صاف

مطلب تو یہی ہے تاکہ اس نے مجھے اپنی اولاد ہی تسلیم نہیں

کیا۔“

ہو جاتے ہیں۔ کہاں کہاں اور کتنا خرچ کرنا پڑتا ہے یہ کوئی ہم سے پوچھے۔ ”دائم کی بیوی بھی پیچھے نہ رہتی۔

”ایک بیٹی کے تو آدی سو خرچے اٹھالے جب چار چھ بچے ہوں تو پتا چلتا ہے۔“

علینہ کے استہلال میں کوئی اچھی چیز دیکھ کر کزنز بھی اس کا دل بڑا کرنے میں پیچھے نہ رہیں۔

”علینہ! یہ کلر تھیں بالکل سوٹ نہیں کر رہا ہے۔“

”کیا ضرورت تھی اتنا مہنگا جوتا خریدنے کی.....“

اتنے پیسوں میں تو اتوار بازار سے سہلے اور آئی کے لیے کئی چلیں خرید لیتیں۔“

”جو خوبصورت ہوں وہ برانڈ کا سمیٹکس کے بغیر بھی اچھے لگتے ہیں۔“

یونیورسٹی کے پہلے سیمسٹر میں جب علینہ کی کلاس ایک تفریحی دورے پر جا رہی تھی، ایک کزن نے کہا۔ ”کیا

ضرورت ہے تفریحی دورے پر جانے کی..... واپسی میں دیر ہوگی تو تمہاری کلاس فیلوز کے تو اماں اباک پر کرنے آئیں گے، تمہارے لیے شاہینہ آئی بے چاری کہاں اکیلی خوار

ہوتی پھرے گی۔“

دوسری کزن بولی۔ ”ہاں علینہ..... جب تم لوگ

واپسی پر یونیورسٹی پہنچو گے اور انٹی اکیلا تمہیں لے آئیں گی تو تمہاری فرینڈز یہ بھی تو پوچھیں گی کہ تمہارے ابو کیوں نہیں آئے تمہیں لے۔“

اس قسم کی باتیں شاہینہ کا دل بھی دکھاتی تھیں، علینہ کو بھی رنجیدہ کرتی تھیں۔ سوشائیز اس نوع کے ماحول میں

رہتے ہوئے علینہ کی شادی جس دن خوشی ہو جائے گا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی حالت دودھ کے چلے کی سی تھی جو

چھاپہ بھی پھونک کر پیتا ہے۔ اس کی اپنی زندگی کا لوح اس کے سامنے تھا۔ کوئی بات نہیں تھی تو بھی برا چاہنے

والوں کی چند سطروں نے اس کی زندگی خاکستر کر کے رکھ دی تھی۔ علینہ کے معاملے میں تو یہی بہت خوفناک بات تھی کہ

اس کے باپ نے اسے اپنا نام ہی دینے سے انکار کر دیا تھا اور یہ بات خاندان کے سب لوگوں کو معلوم تھی۔ شاہینہ فکر

مند ہوئی کہ جب علینہ کی شادی کا مرحلہ آئے گا تو وہ پیام دینے والوں کو اس کے باپ کے بارے میں کیا بتائے گی۔

وہ جانتی تھی کوئی بھی غلط بیانی اور پردہ پوشی اس سلسلے میں ناروا ہوگی۔ مجھوت جلد یاد پر عمل ہی جاتا ہے۔

☆☆☆

یونیورسٹی میں تعلیم کے دوران علینہ کی اپنے ایک ہم

”جب تک یہاں رہتا ہے۔“

”اور یہاں کب تک رہتا ہے؟“

”جب تک ہمارا اپنا گھر نہیں ہوتا۔“

شاہینہ کو فلیٹ کا قبضہ مل جانے کے بعد علینہ ایسے مرقعوں پر کہتی۔ ”اب تو ہمارا اپنا گھر بھی ہے امی..... آپ

نے اسے کرائے پر کیوں چڑھا دیا؟“

”یہاں ہم محفوظ ہیں بیٹا۔“

”اپنے گھر میں تو ہم زیادہ محفوظ ہوتے امی۔“

”نہیں بیٹا..... کوئی مرد نہیں ہے ہمارے ساتھ.....“

عورت کی حفاظت کے لیے کسی مرد کا ساتھ ہونا ضروری ہوتا ہے..... تمہیں ساتھ لے کر میں اکیلے گھر میں نہیں رہ سکتی۔“

”جب ہم دونوں وہاں ہوں گے تو گھر اکیلا کیسے ہوگا؟“

”مجھے باہر بھی تو آنا جانا پڑتا ہے۔ تمہیں اکیلے چھوڑ نہیں سکتی اور ہر جگہ تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتی۔ یہاں

پرائیمنٹان تو ہوتا ہے کہ تم گھر میں اکیلی نہیں ہو۔ لوگ ہیں تمہارا خیال رکھنے کو۔“

”میں بچی نہیں ہوں اب..... اپنا خیال رکھ سکتی ہوں۔“

”اب ہی تو تمہارا زیادہ خیال رکھنے کی ضرورت ہے میرے بچے۔“

☆☆☆

علینہ یونیورسٹی میں تھی۔ شاہینہ کی خواہش تھی کہ اس کی تعلیم مکمل ہوتے ہی اس کی شادی ہو جائے۔ بھادجوں اور

اب تو ان کے بچوں کے رنگ ڈھنگ بھی اسے مجبور کر رہے تھے کہ وہ شاہینہ کی شادی سے قبل بھائیوں کے گھر سے علیحدہ

ہو جاتی۔ اس گھر میں دوسرے درجے کی شہری کی حیثیت سے رہتے ہوئے وہ علینہ کی شادی کا معاملہ اس خود مختاری

اور احترام کے ساتھ نہ مناسکتی تھی جو علینہ کی زندگی کے اس اہم ترین معاملے کا حق تھا۔ یہاں تو وہ اس کے لیے کوئی

اچھی چیز بھی خرید لاتی تو کچھ اس نوعیت کے تبصرے اور طنزیہ فقرے شروع ہو جاتے۔

”علینہ! تمہاری اماں کو تو فضول خرچی کا شوق ہے۔“

ایک بھادج بھتی۔

”ہاں بھی کہیں اور جو نہیں خرچ کرنا پڑتا..... نہ

کھانے پینے کا خرچ نہ بجلی، گیس کا بل..... نہ کسی کو لینا دینا۔“

دوسری بھادج فرماتیں۔

”میاں صاحب تو بیسا ہاتھ میں تمہارے بے فکر

جماعت سے ایسی ذہنی ہم آہنگی ہوئی کہ آخری سیکسٹر میں وہ اپنا رشتہ دینے کو اپنے والدین کو لانے کے لیے بغداد ہو گیا۔

حالات نے شاہینہ اور علیہ کو ایک دوسرے کا دوست، ہمراز اور غمگسار بنادیا تھا۔ علیہ اپنی کوئی بات ماں سے راز نہ رکھتی تھی۔ راحیل سے اس کی دوستی اور ذہنی ہم آہنگی کا معاملہ بھی اس کے علم میں تھا۔ چنانچہ جب راحیل اپنے والدین کو علیہ کے گھر والوں سے ملوانے پر بغداد ہوا تو شاہینہ نے علیہ سے کہا۔ ”دیکھو بیٹا! یہ وہ وقت ہے جس سے میں تمام زندگی ڈرتی رہی ہوں۔ میں نے تم سے کوئی بات چھپائی نہیں ہے۔ جو میرے ساتھ تمہارے باپ نے کیا وہ تمہارے علم میں ہے۔ راحیل اور اس کے والدین ہی نہیں جو بھی تمہارا رشتہ لے کر آئے گا تمہارے باپ کے بارے میں ضرور جانتا جائے گا۔“

”کہہ دیجیے گا مر گیا۔“

”اتنا آسان نہیں ہے یہ کہہ دینا..... جھوٹ کے پاؤں ہوتے ہیں اور لوگ بال کی کھال نکالنا جانتے ہیں۔“

”آپ پریشان نہ ہوں، میں اسے انکار کر دوں گی۔“

”یہ مسئلہ کامل نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا ہے؟“

”کہیں نہ کہیں تو تمہاری شادی کرنی ہے..... تمہیں رسک لینا ہوگا۔“ شاہینہ کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

”کیا رسک ای؟“

”تمہاری عمر میں مجھے اپنی ڈائری میں عمدہ اشعار اور دل کو چھو لینے والے اقوال اور نثر پارے نوٹ کر لینے کا شوق تھا۔ پتا نہیں وہ کوئی نظم تھی یا نثر پارہ لیکن اس کا مفہوم آج برسوں بعد بھی میرے دل کو لگتا ہے۔“ شاہینہ نے توقف کیا۔ علیہ جو انتہا کم سن رہی تھی اس کے توقف پر کچھ بے چین سی ہوئی۔ شاہینہ جیسے اپنی یادداشت کے جبر دوں سے جھانک رہی تھی۔ ”اگر تم کسی کو چاہتے ہو تو خود کو اس کے بارے میں ہر خوف و خطر سے بے نیاز ہو کر اسے آزاد چھوڑ دو۔ اگر وہ تمہارا ہے تو کبھی بھی جانے، پلٹ کر تمہاری ہی طرف آئے گا اور اگر نہ آئے تو اپنے دل کو اس یقین پر غم نہ لو کہ وہ بھی تمہارا تھا ہی نہیں۔“

علیہ ٹھٹھکی ہانڈے ماں کو دیکھ رہی تھی، اس کی بات سن رہی تھی۔

”سمجھ میں آئی میری بات؟“ شاہینہ نے پیار سے

”ہے۔“

علیہ کا سر چھوا۔

”بات واقعی بہت خوبصورت ہے ای لیکن.....“

”لیکن؟“

”میں..... یہ نہیں سمجھ پائی کہ.....“

”مر؟“

”کہہ یہ میرے اور راحیل کے معاملے میں کیسے اپنی منٹ کی جانی چاہیے۔“ علیہ نے الجھی الجھی نگاہوں سے

ماں کو دیکھا۔

”میرے بچے۔“ شاہینہ نے علیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ دیکھتا ہو کہ کوئی شخص ہمارے ساتھ کتنا غلط اور سچا ہے تو اس پر اپنی تمام کمزوریاں کھول دو۔ اگر وہ تمہارے ساتھ غلط ہے اور صحیح معنوں میں تمہیں چاہتا ہے تو وہ تمہاری کمزوریوں سے آگاہ ہو کر زیادہ کھلے دل سے تمہیں قبول کرے گا۔“

”لیکن ای! ہر ایک کو تو اپنی کمزوریاں نہیں بتانی جاتیں۔“ علیہ نے کہا۔

”ٹھیک کہتی ہو..... ہر ایک کو اپنی کمزوری بتا کر انسان خود کو مزید کمزور کر لیتا ہے لیکن جب کسی کو آزمانا مقصود ہو تو یہ رسک لینا پڑتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے میں.....“ علیہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی مگر ماں ہونے کے ناتے شاہینہ اس کی ادھوری بات کو پوری طرح سمجھ گئی۔

”ہاں، میرا وہی مطلب ہے جو تم سمجھی ہو۔“ شاہینہ نے کہا۔ ”پہلے تو تم دونوں اپنے آپ کو اچھی طرح ٹٹو لو کہ کیا واقعی تم دونوں ایک دوسرے کے لیے اتنے سنجیدہ ہو کہ زندگی بھر کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ چاہتے ہو..... جذباتی فیصلے پائیدار نہیں ہوتے۔“

”ای! ہماری عمر کے لوگ تو جذباتی فیصلے ہی کرتے ہیں۔“

”ایسی بات نہیں..... میں نے دیکھا ہے، آج کی نوجوان نسل اپنے بڑوں سے زیادہ ہوشیار اور سمجھدار ہے..... وجہ شاید یہ ہے کہ انہیں فہم و شعور دینے کے ان گنت ذرائع موجود ہیں۔ لہذا آج کے بچے اپنے بڑوں کے مقابلے میں زیادہ سوچ سمجھ کر فیصلے کرتے ہیں۔“

”اچھا طے، یہ فیصلہ ہو جانے کے بعد کہ راحیل کا فیصلہ جذباتی نہیں..... پھر؟“

”تمہیں اپنے بارے میں بھی یہ یقین کرنا ضروری

”آپ ٹھیک کہتی ہیں..... باقی دی دے دوسری بات کیا سیکھی آپ نے زندگی سے؟“

”دوسری بات!“ شایینہ نے ایک گہری سانس کھینچی۔ ”ہم ساری زندگی اپنے زخموں کو سینے سے لگائے ان کی دھن چپ چاپ سہتے رہتے ہیں۔ اپنی کمزوریوں کے دوسروں پر غائب ہو جانے کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم سے بھی بڑی بڑی کمزوریوں اور دکھوں والے لوگ بیٹھے ہیں زندگی کی راہ میں..... تو پھر خود کو کیوں چھپایا جائے..... کیوں خود کو راندہ درگاہ سمجھا جائے۔“

”آپ بہت بہادر ہیں امی۔“ علیہ نے ماں کو محبت اور احترام سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کبھی نہیں بیٹا..... وقت اور حالات نے ہمت دی ہے..... میں یہ ہمت اور حوصلہ تمہیں ٹرانسفر کرنا چاہتی ہوں..... تم راجیل سے بات کرو..... دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔“

”کوشش کروں گی امی۔“

”کوشش نہیں، تمہیں بات کرنی ہے..... خوش قسمتی کی دستک والا قصہ سنا ہے تم نے؟“

”نہیں۔“

”کہتے ہیں قسمت کا مارا ایک کابل الوجود شخص اپنے گھر میں بیٹھا اپنی قسمت کو روکتے ہوئے اچھے دنوں کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک اس کے گھر کے بند دروازے پر دستک ہوئی۔ کابل تو تھا، اس نے اٹھ کر دروازہ کھولنے کے بجائے دوسری دستک سننے کا انتظار کیا۔ جب دوبارہ دستک نہ سنائی دی تو بیٹھے ہی بیٹھے پوچھا کون؟ باہر سے جواب آیا خدا حافظ..... خوش قسمتی دوبارہ دستک نہیں دیتی۔“

”واہ امی واہ! آپ کو بھی کیسے کیسے قصے، کہیں کہیں باتیں یاد ہیں۔“ علیہ نے مسکراتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

”زندگی کی عطا ہے میرے بچے۔“ شایینہ نے جو ایک جوان بیٹی کی ماں اور جہانگیرہ عورت تھی، کہا۔

☆☆☆

اللہ راستے یوں ہی آسان کیا کرتا ہے۔

راجیل کا رومل علیہ کے لیے خیرت انگیز تھا۔ اس نے تو راجیل کو ڈرتے ڈرتے اس طرح حقیقت سے آگاہ کیا تھا۔ وہ اسے نفرت، اٹھیک یا عھارت سے دیکھنے کے بجائے نہایت محبت اور احترام سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”آئی ایم سوپڑی علیہ کے میں نے اپنے لیے تم جیسی لڑکی کو پسند کیا۔“

علیہ نے اسے بے یقینی سے دیکھا..... کیا وہ سچ کہہ

”او کے..... پھر؟“

”پھر اسے بتا دو۔“

”کیا؟“ علیہ نے سناستہ چوکی۔

”وہی جو میں نے تمہیں، تمہارے باپ کے بارے میں بتایا ہے۔“

”بہت مشکل ہے امی۔“ علیہ گھبرا کر بولی۔

”بتانا تو پڑے گا..... ہم نہیں بتائیں گے تو لوگ بتائیں گے..... اور جب لوگ بتائیں گے تو بات بگڑے گی..... اس کا اعتبار جائے گا..... وہ ہرٹ ہوگا اور جوابادہ تمہیں ہرٹ کرے گا..... بعد کے رونے سے بہتر ہے میرے بچے کہ پہلے رو کر صبر کر لیا جائے۔“

”امی! بہت مشکل ہے۔“

”لیکن اس مشکل سے گزرنا ضروری ہے اور اس مشکل سے گزر کر ہی یہ پتا چلے گا کہ وہ تمہارے بارے میں کس حد تک سنجیدہ اور قلم ہے۔“

”اور اگر وہ پیچھے ہٹ گیا تو؟“

”تو سمجھ لیتا کہ اسی میں بہتری تھی۔“

”ایک بات کہوں؟“

”ہاں بولو۔“

”آپ اس سے مل کر خود بتا دیں اسے یہ سب کچھ۔“

”میرے سامنے شاید وہ اس طرح کل گزری ایکٹ نہ کر سکے جیسے تمہارے سامنے..... تمہیں اس کاری ایکشن دیکھنا چاہیے کہ وہ شکستہ ہوتا ہے یا..... تمہارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔“

”اگر وہ شکستہ ہوا اور اس نے یہ بات یونیورسٹی میں پھیلا دی تو؟“

”یہی تو اس کی آزمائش ہوگی۔“

”نہیں امی..... میں اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتی۔“

”کبھی تو لیتا ہی پڑے گا..... میں نے زندگی سے دو باتیں سیکھی ہیں..... خطرے سے ڈرنے سے بہتر ہے اس کا سامنا کرنا..... برسوں میں اسی بات سے ڈرتی رہی ہوں کہ جب تمہاری شادی کا مرحلہ آنے کا تو ان لوگوں کو جہاں تمہارا رشتہ ہو رہا ہوگا، میں تمہارے باپ کے بارے میں کیا بتاؤں گی لیکن ابھی کچھ عرصہ پہلے ہی اللہ نے میرے دل میں یہ بات ڈال دی کہ خواہ کچھ بھی ہو، میں کوئی جھوٹ نہیں بولوں گی..... حقیقت نہیں چھپاؤں گی..... جو بات ہے وہ بتا دوں گی..... تمہاری شادی نہ ہو تا اس عذاب سے بہتر ہے جو شادی کے بعد بات کھلنے پر ملے۔“

مختصر ساکنیہ اور افراد کنہ نہایت مہذب سے لوگ تھے۔
رائیل کی والدہ مشرقی شہار کی کم گوسی خاتون اور والد
باتونی، خوش مزاج مگر نہایت منکسر۔

”بہن! ہم سادہ سے لوگ ہیں۔ اللہ نے ہمیں ہماری
ضرورت کی ہر نعمت عطا کر رکھی ہے۔ اللہ کی مہربانی سے بیٹا
ہمارے گھر میں ہے، بس ایک بیٹی چاہیے۔ خاندان میں
میری طرف بھی اور اس کی امی کی طرف سے کھراٹوں میں
بھی بیٹیاں موجود ہیں مگر ہم نے رائیل سے کہہ رکھا تھا کہ
زندگی تم نے گزار لی ہے لہذا اگر خاندان کی بچیوں میں یا
خاندان سے باہر بھی کوئی لڑکی پسند آجائے تو بے تکلف ہمیں
بتا دینا۔ ہم پہلے تمہاری پسند ہی کو ترجیح دیں گے۔ اس نے
اپنی ماں کو اپنی پسند سے آگاہ کر دیا۔ بس اسی لیے میں
اور میری بیوی سوالی بن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے
ہیں۔“ رائیل کے والد نے اپنی آمد کا مدعا اختصاراً مکرراتے
مناظر کن انداز میں بیان کیا کہ شاہینہ کا دل اللہ کی شکرگزاری
کے احساس سے بھر آیا۔ خدا جانے کون سی نیکی تھی اس کی یا
جننی ماں کی کوئی دعا لگ گئی تھی کہ اتنے مہذب، منکسر اور
خوشحال والدین اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے اس کی بیٹی کا
رشتہ لینے اس کے گھر آ پہنچے تھے۔ پہلی منزل پر واقع اپنے
چھوٹے سے فلیٹ کی کھڑکی سے شاہینہ نیچے پارکنگ لاٹ
میں کھڑی ان کی نئے ماڈل کی لٹکارے مارنی گاڑی دیکھ
چکی تھی۔ رائیل اور اس کے والدین کے بلبسات، طرز
نشت اور بات چیت سے عیاں تھا کہ وہ خاندانی لوگ
تھے۔

منگھو کے دوران رائیل کے والد نے اپنے حسب
نسب اور ترقی رشتے داروں کا ذکر کیا تو ان کی نجابت کی
تصدیق ہو گئی۔

پہلی ہی نشست میں رائیل اور اس کے والدین پر
شاہینہ کا دل ٹھک گیا۔

”بس اب تمہوے ہی دن ہیں اس کی گریجویشن مکمل
ہونے میں۔“ رائیل کے والد نے بیٹے کو پوری شفقت سے
دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میری اور اس کی ماں کی خواہش ہے کہ
گریجویشن مکمل ہوتے ہی ہم اس کی شادی کر دیں۔“

”ایسا ہے بھائی؟“ شاہینہ نے کچھ کہنا چاہا۔

”بہن! آپ رائیل کی نوکری کی فکر مت کیجیے گا۔“

میرا اپنا بڑا ہے، یہی سنبھالے گا۔ میں تو اب بوڑھا ہو رہا
ہوں۔“ رائیل نے بو والد نے شاہینہ کا تدبذب دیکھ کر قطع
کلامی کی۔

”نہیں نہیں بھائی! مجھے نوکری کی فکر نہیں۔۔۔۔۔ میں
بڑی قناعت پسندی عورت ہوں اور سبکی بات میں نے علیہ
کو بھی سکھائی ہے۔ روزی دینے والا تو اوپر بیٹھا ہے اور
ہماری تمام ضرورتوں سے آگاہ ہے۔“ شاہینہ نے کہا۔
”بالکل بالکل۔“ رائیل کے والد نے مگر بجوشی سے
تائید کی۔

”میرے اور علیہ کے سر پرست میرے بھائی
ہیں۔ میں چاہتی ہوں آپ لوگوں کی ان سے بھی ملاقات
ہو جائے تاکہ ان کو گلہ نہ ہو۔“
”بہت مناسب۔“

شاہینہ نے پہلو بدلا اور گاہیں فرش کے رخ پر کرتے
ہوئے نہایت حزم و احتیاط سے بولی۔ ”آپ لوگوں نے
علیہ کے والد کے بارے میں سوال نہیں کیا؟“

علیہ نے ہڑ بڑا کر ماں کو دیکھا۔ یہ کیا بات کر رہی
تھیں وہ!

”ضرورت نہیں سمجھی بہن۔ رائیل کو ہم نے بچپن سے
یہ تربیت دی کہ بات جو بھی ہو سکتی ہو، والدین سے مت
چھپاؤ۔۔۔۔۔ آگے خیر ہی خیر ہے۔۔۔۔۔ لہذا یہ اپنی ہر بات بڑے
اعتماد کے ساتھ ہم دونوں سے شیئر کرتا ہے۔ آپ بالکل
پریشان نہ ہوں، یہ دیکھا ہے یہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔ الحمد للہ
مجھے اللہ نے یہ صلاحیت ودیعت کی ہے کہ میں لوگوں سے مل
کر ایک ہی ملاقات میں اندر باہر سارا حال پڑھ لیتا
ہوں۔۔۔۔۔ میں آپ سے مل کر مطمئن ہوا ہوں۔ مجھے کوئی
سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے لیے بس اتنا کافی
ہے کہ آپ علیہ بیٹی کی والدہ ہیں۔۔۔۔۔ آپ کی عزت ہماری
عزت ہے۔“

شدت جذبات سے شاہینہ کا تمام وجود لرز رہا تھا۔
کہانیوں، افسانوں اور فلموں میں تو ایسی پویشتر ہوتی ہیں مگر
حقیقی زندگی میں یہ صورت حال اسے شدید جذباتی کیفیت
سے دوچار کر گئی تھی۔ علیہ اس کے پاس آ بیٹھی۔

”میں۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ کہ۔۔۔۔۔ میری بدبختی کا
سایہ بھی میری بچی پر پڑے۔“ شاہینہ نے رقت آمیز لہجے
میں کہا۔

”اللہ پر بھروسہ رکھیں بہن۔۔۔۔۔ بدبخت تو وہ ہوتے
ہیں جو دوسروں کی بہن بیٹیوں کو اپنے گھر لاکر انہیں ستاتے
اور ان پر ظلم کرتے ہیں۔“ رائیل کے والد نے اپنے سینے پر
ہاتھ رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ”انشاء اللہ آپ کی بچی ہماری
بیٹی بن کر رہے گی۔“

کو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت۔۔

شاہینہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ راحیل کے والدین اسی دنیا کے پاس تھے یا کسی اور دنیا سے آئے تھے۔ احساسِ تشکر سے دورانِ نماز بھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہ چھوٹی۔

”شکر ہے پیارے رب۔“

”شکر ہے میرے مولا۔“

وہ خوفزدہ بھی نہ تھی۔ چپکے چپکے خدا سے دعا کرتی کہ کسی بدخواہ کو کوئی شرارت نہ سونچے اور اگر سوچے بھی تو خدا راحیل اور اس کے والدین کو بدگمانی سے محفوظ رکھے۔

تقریب کے انتظامات راحیل کے والدین نے کیے۔ مقامی ہوٹل میں نکاح کی تقریب ہوئی۔ شاہینہ اپنے ہی لوگوں کے چہروں پر دکھاوے کی مسکراہٹ اور آنکھوں میں طنز، رنج و حسد ڈالتے دیکھ رہی تھی۔ ان کی مسکراہٹ کھری نہ تھی۔ ”دیکھنا کیا انجام ہوتا ہے۔“

شاہینہ حسنِ انجام کی دعا کر رہی تھی! امی کہا کرتی تھیں چہرہ داروں کے پرے پرے کا خدا..... وہ بے پر ہی تو تھی..... ساجد نے اس کے پال و پر اس بے دردی سے کاٹے تھے کہ وہ طاقت پر دوازے سے محروم ہو کر عین گہرائیوں میں جا گری تھی۔ خدا ہی تھاجس نے اسے ان عین گہرائیوں سے دوبارہ اٹھایا تھا۔ علیہ جس کے مستقبل کے لیے وہ دن رات فکر مند رہا کرتی تھی، اس کے لیے رب انسانوں کو فرشتے بنادے گا، شاہینہ نے سوچا بھی نہ تھا!

☆☆☆

راحیل اور علیہ کا آخری سمسٹر مکمل ہوتے ہی راحیل کے گھر والوں نے رخصتی کا تقاضا کر دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ جہیز میں ایک سوئی بھی نہیں لے کر جائیں گے۔ ”علیہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔ میرے پاس جو کچھ ہے اسی کا ہے۔“ شاہینہ نے کہا۔

”راحیل بھی ہمارا ایک ہی بیٹا ہے بہن۔ ہمیں اللہ نے جو بھی دیا ہے، اس کا اور اس کی بیوی اور بچوں ہی کا ہے..... گھر میں زیادہ سامان جمع کرنے سے کیا فائدہ۔“

”بیٹی کو خالی ہاتھ رخصت کروں گی تو لوگ کیا کہیں گے۔“

”لوگوں کی پروا نہ کریں بہن..... ایک کان سے میں دوسرے سے نکال دیں۔ زندگی ہماری ہے..... ہم لے لیں..... ہماری مرضی جس طرح سے چاہیں۔“

شاہینہ کا دل بیک وقت ناقابلِ بیان خوشی اور دوسووں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا!

☆☆☆

راحیل اور اس کے والدین کے ساتھ اگلی نشست میں جو شاہینہ کے اپنے ہی گھر میں ہوئی، شاہینہ کے بھائی اور بھابیوں بھی موجود تھے۔ بھائیوں کے ساتھ بھابیوں کو شامل کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ بعد میں باتیں نہ بنائیں، گو باتیں پھر بھی بنائی گئیں جو شاہینہ کے کانوں تک بھی پہنچیں مگر راحیل اور اس کے والدین کی طرف سے طے اعتماد کے باوجود شاہینہ ان باتوں سے پریشان تو ضرور ہوئی مگر قدرے کم۔ دل ہی دل میں وہ اللہ سے دعا گوئی کہ علیہ کو اس کی اپنی بد نصیبی کی آج بھی نہ پہنچے۔

دوسری نشست میں راحیل اور اس کے والدین سے ملاقات اور بھائیوں کے اطمینان کے بعد شاہینہ نے راحیل سے علیہ کے رشتے کے لیے ہامی بھری۔

”بہن! اگر آپ اتفاق کریں تو مگنی کے بھائے بچوں کا نکاح کر دیا جائے یا پھر آپ کے حسبِ سہولت بچی کو رخصت کرالیں گے۔“ راحیل کے والد نے کہا۔

”میں اپنے بھائیوں سے مشورہ کر لوں؟“ شاہینہ نے جواب دیا۔

”ضرور۔“

بھائیوں کو اعتراض نہ ہوا مگر خاندان میں چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں۔

”ارے دونوں ساتھ پڑھتے تھے۔ شاہینہ کی بیٹی نے لڑکے کو چھٹا لیا ہوگا۔“ سینہ گزٹ کی یہ سرخی خاندانِ بھر میں عام ہو رہی تھی۔

”اللہ جانے شاہینہ نے لڑکے والوں کو کیا جھوٹی سچی سنائی ہوگی۔“

”اچھا! اسی لیے شاہینہ بیٹی کو لے کر بھائیوں سے الگ ہوئی تھی۔“

”جب لڑکے والوں کو اصلیت پتا چلے گی تو دیکھنا وہ کیا کرتے ہیں۔“

نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ راحیل کے والد نے شاہینہ سے کہا۔ ”آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، تقریب کا سارا انتظام ہم خود کریں گے۔“

”نہیں بھائی! آپ لوگ میرے سہمان ہوں گے۔ انتظام میں کروں گی۔“ شاہینہ نے کہا۔

”میں نے آپ کو بہن کہا ہے۔ بھائی کے ہوتے بہن

شاہینہ جس کو بتاتی، وہ حیران ہوتا اور اس کے دل میں شک کا بیج بونے کی کوشش کرتا۔ ”اچھی طرح اطمینان کر لو..... ابھی بھی وقت ہے، بیٹی تمہارے اپنے گھر میں ہے..... کہیں فراڈ نہ ہوں یہ لوگ۔“

”لگتے تو نہیں۔“

”معاف کرنا، لگتے تو تمہارے سرال والے بھی نہیں تھے۔“

”اللہ نہ کرے..... اللہ نہ کرے جو یہ دیے ہوں۔“

شاہینہ بہم کر سوچتی۔

برات، ولیمہ سارے انتظامات راحیل کے والد ہی نے کیے۔

”بار اللہ انسان ایسے بھی ہوتے ہیں!“ شاہینہ حیران ہو، ہو کر سوچتی۔

انتہائی حیران کن اور شاہینہ کو سرتاپا لرزادینے والے لمحے وہ تھے جب راحیل کے والد نے کہا۔ ”بہن! علیہ بیٹی کے والد کا ایڈریس دے سکتی ہیں آپ مجھے؟“

شاہینہ کیوں لگا جیسے قیامت کہیں قریب ہی تھی۔

کیا دوسرا لمحہ ہونے جا رہا تھا!

”کیوں بھائی؟“ شاہینہ کو اپنی ہی آواز کیسرا اجنبی محسوس ہوئی۔

”میں انہیں شادی کا کارڈ بھجوانا چاہتا ہوں۔“

”اس شخص نے علیہ کے حوالے سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رکھا بھائی۔“ شاہینہ دلیر لہجے میں بولی۔

”بہن تو اپنے حصے کا کام کر دیں۔“

”معاف کیجئے گا بھائی..... جس بیٹی کو اس نے اپنا نام ہی دینے سے انکار کر دیا اس کی شادی سے کیا بچہ ہی ہوگی بھلا اسے۔“

”پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ کارڈ اسے پہنچے۔“

سمجھانے تھا۔ شاہینہ زیادہ متعجب بھی نہیں کر سکتی تھی۔

مجبوراً ساجد کا پتا بتانا پڑا۔ خدا جانے وہ اب وہاں رہتا بھی ہوگا کہ نہیں۔ بعد میں راحیل نے علیہ کو بتایا کہ اس کے والد دعوت نامہ پہنچانے کے لیے خود گئے تھے مگر ساجد نے شاہینہ کے کہنے کے مطابق دلچسپی ظاہر نہیں کی تھی بلکہ علیہ سے اپنا رشتہ ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

”ہر انسان کی زندگی میں پہلا مرد اس کا باپ ہی ہوتا ہے راحیل مگر میں تو ایسے کسی رشتے سے واقف ہی نہیں۔“

تھا۔

”بہن! اس شخص میں تو مجھے مروت نام کو نہیں دکھائی دی۔ آپ کے اور علیہ کے ساتھ تو اس نے جو کیا سو کیا، میں تو اس کے گھر مہمان کی حیثیت سے گیا تھا۔ اس نے مجھے گھر کے اندر لے جا کر بھانے تک کی تکلیف گوارا نہیں کی۔“

وہ تو مجھے نہایت ہندیز اور جاہل آدمی لگتا ہے۔“

راحیل کے والد نے شاہینہ کو بتایا۔

”جاہل تو نہیں ہے بھائی..... ایم کام کر رکھا ہے۔“

”بعض پڑھ لکھے بھی تو جاہل ہوتے ہیں بہن۔“

راحیل کے والد غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ گزشتہ برسوں جوں جوں شاہینہ کے تجربہ حیات میں اضافہ ہوا تھا، اسے یقین آ گیا تھا کہ ساجد ایک پڑھا لکھا جاہل تھا جس نے ایک گم نام خط کی چند سطروں پر نہ صرف اس کی زندگی برباد کر دی تھی بلکہ خود اپنا گھر بھی برباد کیا تھا۔ اس بے وقوف اور جذباتی شخص کو اتنا تو چاہیے تھا کہ اس خط کے مندرجات کی توثیق کرتا۔ جرم ثابت ہوئے بغیر تو کوئی عدالت بھی سزا کا فیصلہ نہیں سناتی!

علیہ کی شادی ہو گئی اور نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ تمام انتظامات راحیل کے والد نے کیے۔ شاہینہ کے لیے یہ خواب جیسی صورت حال تھی۔ شاید یہ اس کے صبر کا انعام تھا جو اس کی اولاد کو مل رہا تھا۔ امی کہا کرتی تھیں، انسان کے نیک اور بد اعمال کے اثرات اس کی تین نسلوں تک جاتے ہیں۔

علیہ سرال چلی گئی اور خوش باش بھی رہنے لگی مگر شاہینہ کے دل کو نہ جانے کیوں دھوکا سا لگ رہتا کہ کہیں کوئی بدخواہ اس کے گھر کو تیلی نہ دکھادے۔ علیہ اس کے اس خدشے سے لاعلم نہ تھی، سودہ اس سے کہتی۔ ”امی! آپ پریشان نہ ہوا کریں..... ایسا کچھ نہیں ہوگا..... راحیل اور ان کے کئی ڈیڑی بہت اچھے ہیں۔“

”پتا اسی سے تو ڈر لگتا ہے کہ ہمارے اپنے نہیں پھر بھی اتنے ہمدرد، اتنے اچھے کیوں ہیں۔“

”میری ماں! آپ کا مسئلہ یہ ہے کہ ایک غلط انسان کے غلط رویے نے انسانوں پر آپ کا اعتماد دردم برہم کر کے رکھ دیا۔ اب آپ کو انسانوں کا اعتبار کرتے مشکل ہوتی ہے۔“

”شاہینہ تم ٹھیک کہتی ہو۔“

”اعتبار بحال کر لیں۔“

”تم اتنی بڑی بڑی باتیں کیسے کرنے لگی ہو؟“

”جب سے میں بڑی ہوئی ہوں۔“ علیہ مسکرائی۔

”ایک بات بتاؤ۔“

”پوچھیں۔“

”سچ کچ بتانا۔“

”میں نے کبھی جھوٹ بولا ہے آپ سے۔“

”کبھی باپ کا خیال آتا ہے تمہیں؟“

”ہاں۔“

علیہ کا جواب شاہینہ کو دم بخود کر دینے کو کافی تھا۔

”کئی محسوس کرتی ہو اس کی؟“

”نیور!“

شاہینہ نے چونک کر اسے دیکھا کہ اس کے دو

مختصر جوابوں میں اتنا تضاد کیوں تھا!

علیہ نے اپنی بانہیں ماں کے گلے میں حاصل کر دیں

اور اس کا رخسار محبت اور احترام سے چوم کر بولی۔ ”میں نے

کبھی اپنی زندگی میں اس شخص کی کمی محسوس نہیں کی امی.....

ہاں البتہ یہ ضرور سوچا کہ وہ کیسا بے رحم آدمی تھا جس نے

میری اتنی اچھی ماں کی زندگی برباد کر دی۔“

شاہینہ نے متاثرہ نظروں سے علیہ کو دیکھا اور اس

کا چہرہ اپنے دلوں ہاتھوں میں لے کر بولی۔ ”تم نہ ہوتیں تو

واقعی میری زندگی برباد ہوگئی ہوتی میرے بچے! تم نے مجھے

جینے کی امک دی..... تم نے مجھے جینا سکھایا، تم میرے لیے

زندگی کا دوسرا نام بن گئیں میری جان۔“

علیہ فرط محبت میں ماں سے لپٹ گئی۔

☆☆☆

علیہ کے لیے اتنے اچھے لوگوں کا مل جانا ہی شاہینہ

کے لیے کچھ کم حیرانی کی بات تھی کہ شادی کے کچھ ہی عرصے

بعد اس سے بھی زیادہ حیران کن بات ہوئی۔ علیہ نے اسے

بتایا۔ ”رائیل کے ڈیڈی آپ کے سابقہ شوہر کے خلاف

مقدمہ دائر کروانے جا رہے ہیں میری طرف سے۔“

”کیسا مقدمہ؟“ شاہینہ نے اسے ہڑبڑا کر دیکھا۔

”ایڈی! ایڈی میری ماں۔“ علیہ نے ماں کو

گھبراتے دیکھ کر اسے تسلی دینے کی کوشش کی پھر مسکراتے

ہوئے بولی۔ ”اعتراض خطا کا مقدمہ۔“

”کیا مطلب؟“ شاہینہ چونکی۔

”رائیل کے ڈیڈی کہتے ہیں اسے عدالت میں تسلیم

کرنا پڑے گا کہ تم اس کی بیٹی ہو۔“

”بیٹا رشتوں کی ڈور تو دل سے بندھی ہوتی ہے.....

جب کوئی شخص اولاد سے اپنا رشتہ ماننے پر ہی آمادہ نہ ہو تو

خواہشات

خواہشات انسان پر غلبہ پالیں تو انسان سیدھے رستوں کی پہچان کھودیتا اور غلط راستوں پر چلنے والوں کو فقط رسوائی اور جگ ہنسی ملتی ہے۔

ظالم امتحان

کوئی مانے یا نہ مانے، ہم سب کی نہیں گے کہ بچہ پیدائش کے وقت صرف اس لیے روتا ہے کہ اب اسے اس عالم دنیا میں نازل ہونے کی پاداش میں کئی امتحان دینے پڑیں گے۔ تعلیمی امتحان غالباً واحد مصیبت ہے جو بتا کر آتی ہے۔ جوں جوں امتحان کا وقت قریب آتا جاتا ہے، نبض کی رفتار تیز اور سانسیں اکھڑنا شروع ہو جاتی ہیں جیسے وقت نزع آن پہنچا ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہماری موت کا ٹائم ٹیکل نہیں دیا ورنہ بندہ ہر وقت الٹی گنتی گنتا رہتا۔ موت تو خیر سب کو آتی ہے مگر جیسے کا کیا کیجیے جس میں ہر گھڑی امتحان ہو۔ ویسے بھی روز جینا روز مرنا خاصا مشکل کام ہے۔ امتحان کے دنوں میں ان لوگوں پر خاص غصہ آ رہا ہوتا ہے جو گدھے گھوڑے سب کچھ کر سوراہے ہوتے ہیں۔ یہ غصہ رفتہ رفتہ حسرت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور پھر حسرت یوں شعر میں ڈھل جاتی ہے۔

ہم راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں

جب سارا عالم سوتا ہے

گھبراؤ نہیں

ایک آدمی پریشانی کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس آیا اور کہنے لگا۔ ”ڈاکٹر صاحب غضب ہو گیا میری بیوی نے غلطی سے پیٹرول پی لیا ہے اور اب حالت یہ ہے کہ سارے گھر کے اندر دوڑتی پھر رہی ہے۔ پلیز کچھ کیجیے۔“

”گھبراؤ نہیں.....“ ڈاکٹر نہایت اطمینان سے بولا۔ ”مکان کے سب دروازے بند کر دو

جب پیٹرول ختم ہو جائے گا تو خود بخود رک جائے گی۔“

مرسلہ: دوزیر محمد خان۔ بھل ہزارہ

عدالت اس پر لٹھیاں تھوڑی برسائے گی منوانے کے لیے۔“
”مقدمہ دائر ہو جائے پھر آپ دیکھتی جائیے۔“
”ویسے مجھے تمہارے سرال والوں پر حیرانی ہوتی ہے۔“

”کیوں؟ حیرانی کس لیے؟“
”سب کچھ جاننے کے بعد بھی انہوں نے خوش دلی سے رشتہ کیا۔ شادی کے تمام مصارف چرچا کیے بغیر خود اٹھائے۔ پھر تمہارے باپ کو شادی میں انوائٹ کرنے کا پتہ اور اب.....!“
”ای! اوہ بہت ڈیسنٹ آدمی ہیں..... بہت کھلے دل کے..... ہر ایک کے کام آنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ شاید اسی لیے اللہ نے ان کے کاروبار میں اتنی برکت دی ہے۔ میں راحیل سے کہتی ہوں تم بہت خوش قسمت ہو کہ تمہیں اللہ میاں نے اتنے اچھے باپ دیے ہیں۔“
”بے شک..... راحیل کی ماں بھی اچھی ہیں بیٹا۔“
”وہ تو بولتی کم ہیں، سختی زیادہ ہیں امی..... ہیرا خاتون ہیں۔“

☆☆☆

ساجد کے خلاف علیہ کی طرف سے مقدمہ دائر کرنے سے قبل راحیل کے والد نے شاہینہ کو بھی اعتماد میں لیا۔
”بھائی! میری تو زندگی جیسے تیسے گزرتی..... علیہ کو خدا نے آپ کے جیسے فرشتہ صفت لوگ دے دیے..... اب اس کی پہچان راحیل ہے اور آپ کا خاندان..... اس شخص نے تو اپنی اولاد کو اس وقت اولاد نہیں سمجھا جب علیہ کو اس کی ضرورت تھی، اب کیا سمجھے گا۔“
”اس کا تو باپ بھی سمجھے گا۔“ راحیل کے والد نے نہایت دوڑتی سے کہا۔

”لیکن اب اس کا فائدہ کیا..... میری زندگی لوگوں سے نظریں جھکا کر اور علیہ کی باپ کے ہوتے ہوئے بھی بن باپ کی رہ کر گزرتی گئی۔“

”غلط گزرتی..... آپ جیسی پڑھی لکھی اور سمجھدار خاتون کو تو ایسے بے رحم آدمی کو اسی وقت کورٹ میں ٹھیکٹ لیتا چاہیے تھا..... میں سمجھتا ہوں کسی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی زندگی سے کھیلے..... میں اسے کیلنا ہی سمجھتا ہوں..... بغیر کسی بڑی وجہ کے ایک بے قصور عورت کو طلاق دے دینا کہاں کی مردانگی ہے..... میں تو ایسے مردوں

کو جانوروں سے بھی بدتر سمجھتا ہوں..... معاشرے کو ایسے جانوروں کو لگام دینے کی ضرورت ہے بہن..... میں نے وکیل صاحب سے ڈسکس کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کورٹ میں آپ کو بھی آنا پڑ سکتا ہے۔“
”مجھے!“ شاہینہ چونکی۔

”جی۔“

”میرے اپنے لوگ نہیں گے بھائی۔“
”یہی تو اصل مسئلہ ہے..... لوگوں کے ہنسنے کی فکر میں ہم اکثر اپنی ساری زندگی روتے ہوئے گزار دیتے ہیں..... لوگوں کی پروا کیوں بہن۔“
”اپنی عزت کی وجہ سے۔“

”انسان اپنی عزت، اپنے وقار کے لیے ہی تو عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے تاکہ انصاف ملے، عزت بحال ہو..... مجھے تو زیادتی کرنے والوں کی گردن دبوچنے میں مزہ آتا ہے بہن..... الحمد للہ ہمیشہ سرخرو ہوا ہوں..... علیہ اب آپ ہی کی نہیں میری بھی بیٹی ہے، میرے خاندان کی عزت ہے..... میں چاہتا ہوں وہ اور اس کے بچے نظریں جھکا کر نہیں سر اٹھا کر بنیں..... بس آپ دعا کریں کہ ہم جس نیت، مقصد اور مشن کے ساتھ عدالت میں جا رہے ہیں خدا ہمیں اس میں سرخرو کرے۔“

شاہینہ کو احساس ہوا کہ راحیل کے والد کا یہ غیر متوقع اور غیر معمولی اقدام اس لیے تھا کہ ان کے بیٹے کی اولاد پر کوئی انگشت نہا کرے لیکن کیا ضمانت تھی اس امر کی کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہی ہو جائیں گے!

☆☆☆

علیہ کی جانب سے باپ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا گیا۔ عدالت نے ساجد کی طلبی کا پروانہ جاری کر دیا۔ ساجد نے پروانہ طلبی کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اس جیسے سمجھنڈی مگر بوڑھے لوگوں کا بچی دتیرہ ہوتا ہے۔ وہ عدالت کو اپنا گھر سمجھتے ہیں جہاں والدین کے انتقال کے بعد دو بہنوں کا کفیل بن کر ان کے مزاج میں خود سری اور نام نہاد مطلق العنانی نفوذ کر جاتی ہے۔ وہ عدالتی معاملات کو بھی اپنی خود سری کے تابع سمجھتے ہیں۔

عدالت کی جانب سے بار بار پروانہ طلبی جاری ہونے کے باوجود عدالتی حکم کی تعمیل نہ ہونے پر عدالت نے ساجد کے نام پروانہ طلبی اخبار میں شائع کر دیا۔ اسے عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ عدالت میں اس نے شاہینہ اور اس کے خاندان کے خلاف وہ مودعاں کیں کہ شاہینہ،

تھے۔ علیہ نے عدالت میں وہی کہا تھا جو انہوں نے اسے سمجھایا تھا۔

کری انصاف پر بیٹھنے ج نے علیہ کو دیکھا۔
”ج صاحب! میری ماں بائیس سال سے صلیب پر لٹکی ہوئی ہے، اسے اس صلیب سے اتارنے میں مدد کیجیے۔“ علیہ نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ج کے سامنے کرتے ہوئے نہایت جذباتی لہجہ میں کہا۔ یہ الفاظ اسے راجیل کے والد سے نہیں اپنے دل سے ملے تھے۔

عدالت نے مدعیہ اور مدعا علیہ کے ڈی این اے ٹیسٹ کا حکم جاری کر دیا!

☆☆☆

محاذ اٹھارٹی نے ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹ عدالت میں جمع کرا دی۔

عدالت نے مقدمے کا فیصلہ علیہ کے حق میں جاری کر دیا۔

علیہ حجت مئی تھی۔

گو اس کی جیت کا اس کے پتھر دل باپ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ جس سردمہری سے عدالت میں آیا تھا، اسی سردمہری سے واپس بھی گیا۔ شاہینہ نے کوئی معذرت، علیہ سے باپ ہونے کے ناتے محبت کا اظہار کیے بغیر! کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ پتھر دل اور انسانی جذبات سے عاری اور ان کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔

بہر حال شاہینہ سرخرو ہو گئی تھی۔ علیہ کے سامنے۔ اس کے شوہر اور سسرال والوں کے سامنے۔ اپنے خاندان والوں کے سامنے۔ اور معاشرے کے سامنے! اس کی سرخروگی ساجد علی کے نہیں، اس گناہ خط لکھنے والے دشمن کے خلاف بھی تھی جس نے یہ نہیں سوچا تھا کہ اس کی تحریر کردہ چند سطروں سے ایک بے قصور اور بے گناہ عورت کس اذیت اور درد کا شکار ہو سکتی تھی۔ یہ تو خدا کی مہربانی تھی۔ ماں کی دعا۔ قسمت کی بات۔ اس کے صبر کا ثمر اور علیہ کی محرومی کا انعام کہ راجیل اور اس کے فرشتہ صفت والدین سے ناتا جڑ گیا تھا ورنہ۔۔۔۔۔!

ورنہ سے آگے بے شمار اندیشے تھے۔ ان گنت خطرے۔۔۔۔۔ اندھی کھائیاں اور مہیب سائے! شاہینہ کے خاندان والے ہر لڑکی کا نصیب علیہ کی قسمت کی طرح گلنے کی تمنا کرنے لگے تھے۔

☆☆☆

کبھی کبھی رنجش اور صدمے میں انسان ان دوستوں

راجیل اور اس کے گھر والوں کے سامنے شرم سے زمین میں گڑ گئی لیکن راجیل کے والد نے کہا۔ ”پریشان نہ ہوں بہن۔۔۔۔۔ عدالت میں یہی ہوتا ہے۔ مجرم اپنا جرم چھپانے کو اپنے وکیل کے ذریعے وہ دہ باتیں کرتا ہے جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ہمیں اور آپ کو پریشان نہیں ہونا، ڈٹے رہنا ہے بس۔“

شاہینہ کے اپنے خاندان والے محض ہورے تھے۔ ”یہ شاہینہ کو کیا سوچھی برسوں بعد۔۔۔۔۔ مٹی کو اللہ نے عزت سے اس کے گھر بار کا کر دیا تھا۔۔۔۔۔ چاہے تھا کہ شکر ادا کرتی اور باقی زندگی اللہ اللہ کرتی۔ مٹی کو عدالت میں کھڑا کر دیا، یہ بھی نہ سوچا کہ غلامت میں پتھر پھینکو تو جھینٹے اپنے ہی دامن پر پڑتے ہیں۔ جو بات دلی بھی دلی ہی رہنے دیتی۔۔۔۔۔ اور حیرت تو علیہ کے سسرال والوں پر ہے۔ وہ یہ سب کچھ کیسے برداشت کر رہے ہیں۔ غلامت کا نوکر اس پر اٹھایا لیا تھا تو اسے مضبوطی سے پکڑے رہتے۔ یہ کیا کہ بہو عدالت میں تماشا کرنے پہنچی تو اسے قارغ کرنے کے بجائے خود بھی تماشا بننے کو اس کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔۔۔۔۔ ارے علیہ کے سسرالی بھی بس کوئی ایسے ویسے ہی ہیں۔“

ساجد نے عدالت میں بھی علیہ سے اپنا رشتہ تسلیم نہ کرنے کا موقف اختیار کیا بلکہ شاہینہ پر بھری عدالت میں یہ الزام لگایا کہ اس سے شادی کے وقت وہ حاملہ تھی مٹی تو شادی کے سات ماہ بعد ہی ماں بن گئی تھی۔ شاہینہ، راجیل کے والد کے اصرار پر عدالت میں آ تو گئی تھی مگر اسے پہلے ہی اندازہ تھا کہ ساجد عدالت میں یہی کٹھ اٹھائے گا۔ وہ جج کے روبرو بھرائی ہوئی آواز میں اپنی مدافعت میں اتنا ہی کہہ سکی۔ ”ج صاحب! میں طلاق کے حادثے سے اتنی پریشان تھی کہ میرا المذ پریش خطرناک حد تک ہائی رہنے لگا تھا اور یہی بچی کی کل از وقت ولادت کا سبب بنا۔“

”یہ جھوٹ ہے۔۔۔۔۔ اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش ہے۔“ ساجد نے کہا۔

”یہ جھوٹ نہیں ہے۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں یہ سچ ہے۔ حقیقت ہے۔“ شاہینہ بھری عدالت میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”ج صاحب!“ علیہ نے بے آواز بلند کہا۔ ”میری اس عدالت سے گزارش ہے کہ جج اور جھوٹ میں تمیز کرنے کے لیے ڈی این اے ٹیسٹ کرا لیا جائے۔“

راجیل کے والد عدالت میں علیہ کے ساتھ کھڑے

اور یہی خواہوں کو اپنا دشمن اور بدخواہ قرار دے بیٹھتا ہے جو انتہائی حالات میں بھی دشمنی اور بدخواہی کا نہیں سوچتے۔

اسی اپنی موت تک اسی بدگمانی میں رہیں کہ وہ گمنام خط جس نے شاہینہ کا گھر اجاڑا، ان کی بہن کے گھر سے لکھا گیا تھا۔ عدالت میں علیحدہ کے جائز استحقاق کا مقدمہ جیتنے اور اپنی سرخروئی کے بعد بھی یہی بدگمانی شاہینہ کے دل میں بھی گھر کیے رہی۔

لیکن جس طرح خون چھپا نہیں رہتا، اسی طرح دوسروں کے لیے گڑھا کھودنے والے ہاتھ بھی جلد یا بدیر ایک نہ ایک دن ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ وہ ہاتھ بھی عریاں ہو کر سامنے آگئے جنہوں نے شاہینہ کے لیے گڑھا کھودا تھا۔ خالہ کے گھر والے نہیں!..... مگر وہ بھی اپنے ہی تھے!

اصل مجرم دنیا سے جا چکے تھے مگر شریک جرم جو ایک پیچیدہ بیماری کا شکار ہو چکا تھا اپنی بیماری کو گناہوں کی عزت سمجھتے ہوئے اپنے برسوں پرانے ایک جرم کا اعتراف کرنے شاہینہ کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

”شاہینہ باجی! مجھے معاف کر دیں۔ میں آپ کا مجرم ہوں۔ میرا قصور اتنا تھا کہ ان کے کہنے پر آپ کے گھر میں وہ خط میں نے گیت سے اندر ڈالا تھا لیکن اس گناہ کی بجائے اتنی بڑی سزا ملی ہے کہ جس ہاتھ سے میں نے آپ جیسی ایک بی بی کے خلاف یہ حرکت کی، وہ اتنا ناکارہ ہو چکا ہے کہ میں اس ہاتھ کو ہلاکتیں نہیں سکتا۔ کھانا بھی مجھے لٹے ہاتھ سے کھانا پڑتا ہے۔“

شریک جرم کو جو شاہینہ کا اپنا ہی دور پار کا رشتہ دار تھا، اپنے سامنے گڑگڑاتے، معافی مانگتے اور ایک ندامت بھرتے دیکھ کر شاہینہ دم بخود تھی۔ کتنی عجیب بات تھی جن پر بھولے سے بھی شبہ نہ کیا جاسکتا تھا، وہ مجرم نکلے تھے اور جن پر برسوں شہ کیا جاتا رہا، بدعا میں دی جاتی رہیں، ان کی خاموشی ان کی جیسے گناہی ثابت ہوئی تھی۔ خالہ سے تو معذرت بھی ممکن نہ تھی..... وہ کب کی مرچیں تھیں!

”لیکن ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا؟“ شاہینہ نے جو صدے اور حیرت کی ملی جلی کیفیت سے دو چار تھی، اقبال جرم کرنے والے شخص سے اصل مجرموں کی اس حرکت کی وجہ جاننا چاہی۔

”انہیں اس بات کی غلط تھی کہ آپ لوگوں نے انہیں رشتے دار ہونے کے باوجود ویسے میں کیوں نہیں بلایا، صرف برات کی دعوت کیوں دی۔“

”کیا مطلب..... میں سمجھی نہیں.....“ صدے سے شاہینہ کی حالت سکتے جیسے ہو گئی تھی..... اسے قطعاً سمجھ نہیں آ سکا کہ کہنے والا کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ بھلا اتنی سی بات اور اتنا بڑا طوفان کیسے برپا کر سکتی ہے۔

شاہینہ کو تو اپنی شادی کی ایک ایک بات ایک ایک لمحہ یاد تھا۔ ویسے میں ساجد نے ان کی طرف سے صرف پچاس افراد کو مدعو کیا تھا اور شاہینہ کو یاد تھا کہ اس حد کی پابندی کرنے کے لیے اس کے گھر والوں کو ویسے کے مہمانوں کا انتخاب کرنے کے لیے کتنی سوچ بچار کرنا پڑی تھی۔ بہت سے قرابت دار بھی ویسے میں نہ بلائے جاسکے تھے۔

”صرف..... اتنی سی بات!“ شاہینہ نے حیرت اور رنج سے کہا۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا دو بھر ہو گیا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اگر پاس پڑی کمری پر بیٹھ نہ گئی ہوتی تو یقیناً دشمن پر گر پڑتی ہوتی..... مگر کہنے والے کے پاس ابھی ایک اور روح فرسا خبر باقی تھی۔

”آپ کے نزدیک یقیناً یہ اتنی سی بات ہے مگر جن کے لیے آپ کے گھر والوں کا..... آپ کا رشتہ دینے سے انکار کر دینا برداشت نہ ہوا ان کے لیے یہ انتہائی بے عزتی کی بات تھی آپ کو یاد ہوگا کہ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے کے لیے آپ کا رشتہ مانگا تھا اور آپ کی والدہ نے انکار کر دیا تھا۔“

”ہاں..... مگر تعلیم کی کمی بنیادی وجہ تھی جبکہ ساجد نے ایم کام کیا ہوا تھا۔ صرف یہ وجہ تھی۔“

”اور صرف یہ وجہ ان کی سمجھ میں نہ آ سکی، اوپر سے انہیں ویسے میں نہ بلائے والی بات بھی اسی بات کا حوالہ تھی کہ اسی وجہ سے انہیں اتنی عزت نہ دی گئی اور پھر..... انہوں نے.....“

”واقعی؟.....“

”قسم اللہ کی صرف یہی بات تھی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔

”اتنی چھوٹی سی بات!“ شاہینہ کا بس نہ تھا کہ چھین مار مار کر روئے لگتی۔

اتنی چھوٹی سی بات اس کی زندگی کی تمام خوشیوں کو نگل گئی تھی!

انسانوں کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی سوچے سمجھے بنا دوسروں کی پوری زندگی اپنے دل کی نہایت معمولی اور بے معنی رنجش کی جھینٹ چڑھا دیتے ہیں!